جگن ناتھ آزاد نمبر

جلد نمبر ۷
شمارہ نمبر ۹
جولائی ۱۹۸۶ء
تا
فروری ۱۹۸۸ء
موجودہ شمارہ ۸۰ روپے
کتابت۔ اختر بدایونی
طباعت۔ جمال پریس رام پور
منیجر۔ ادریس ضیا

لمحے

سہ ماہی

لمحے

بدایوں

مرتبین

حسیب سوز
خان فہیم

دفتر لمحے امام باڑہ اٹلی پورہ بدایوں

اداریہ

"لمحے لمحے" (سہ ماہی) ایک [illegible] حیثیت کا حامل منفرد
ادبی جریدہ ہے جو کبھی جلد بازی میں ترتیب نہیں دیا جاتا۔ اور قریب قریب ہر شمارہ
کسی نہ کسی مشہور و معروف ادبی شخصیت کے شاہکاروں اور تعبیروں سے قارئین کو
متعارف کراتا ہے۔ یہ شمارہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نمبر ہے۔

نہ صرف ہندوستان بلکہ برِ صغیر میں چار پانچ آزاد بہت مشہور ہیں۔ شہید وطن
چندر شیکھر آزاد' مولانا محمد حسین آزاد' مولانا ابوالکلام آزاد' آزاد ہند فوج اور جگن ناتھ آزاد
اگر عمیق تجزیاتی نظر سے دیکھا جائے تو جگن ناتھ آزاد کے ادبی فن پاروں میں چندر شیکھر آزاد
کی وطن دوستی' محمد حسین آزاد کی مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی بصیرت اور آزاد ہند فوج والی
توانائی کا امتزاج ملتا ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے جگن ناتھ آزاد ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ جو
اُن کی دانشوری پر دلالت کرتی ہیں اور بھی اوصاف کے مالک ہیں۔ اُن کے ادبی
رول کو حالی اور محمد حسین آزاد کے مشترکہ رول سے کہیں زیادہ اہمیت و افادیت کا
حامل سمجھنا چاہیئے۔ حالی نے غالب اور غالبیات سے متعارف کرایا تو جگن ناتھ آزاد
نے آزادی کے بعد ہندوستان کو اقبال اور اقبالیات سے روشناس کرایا۔ جگن ناتھ آزاد
کے سامنے ہندوستان کی آزادی کے بعد مدت تک اقبالیات کو فروغ دینے کے سلسلے
میں جو رکاوٹیں تھیں وہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد کے سامنے نہیں تھیں اس سلسلے
میں جگن ناتھ آزاد کو اکثر اپنے ہم مذہب لوگوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جس کی تفصیل کی یہاں
گنجائش نہیں ہے۔ آزاد صاحب اپنے آپ میں اقبال اور اقبالیات کیلئے ایک اکیڈمی ہیں
بحیثیت شاعر اُن کا شمار ہند و پاک کے مشہور ترین شعراء میں ہوتا ہے نظم و نثر بڑی خوبصورت
لکھتے ہیں تحقیق و تنقید کے نقطۂ نظر سے بھی اُن کا مقام بہت بلند ہے۔ قارئین کرام اس پیشکش
کو بلاشبہ پسند فرمائیں گے یہ ہماری اُمید ہی نہیں بلکہ دعویٰ بھی ہے۔ ——— حبیب ساتھی

فہرست مضامین

توقیت

صفحہ

شخص و عکس

شعریات

نثریات

اِقبالیات

اقبال نمائش

ملاقاتیں

منظومات

اپنی محفل اپنے دوست

اِنتظاریہ

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو غالب ایوارڈ

یہ خبر علمی اور ادبی حلقوں میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی اور پڑھی گئی ہے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو ان کی ادبی خدمات کے احترام و اعتراف میں ۱۹۸۴ کے غالب ایوارڈ سے نوازا گیا ہے اس خوشی کے موقع پر پروفیسر آزاد کو "لمحے لمحے" کے مرتبین اور قارئین مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(ادارہ)

(جمال پریس گوتیا تالاب رامپور)
فون نمبر (۵۱۴۷)

مُرتّب

محمد اسد اللہ وانی

شعبہ اُردو ویمنز کالج ۔ گاندھی نگر ۔ جمّوں۔

بائیوڈیٹا

۱۔ پتہ : حال : ۲۵ اے گورنمنٹ کوارٹرس۔ گاندھی نگر جموں (توی) ۴۰۰۰۰ا لحجے ائینگ؛
منتقل : ۲/۲۹ شانتی نکیتن۔ نئی دہلی۔

۲۔ پیدائش : ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پاکستان)

۳۔ تعلیم : میٹرکولیشن ۱۹۳۳ء رام موہن رائے ہائی اسکول میانوالی (")
" انٹرمیڈیٹ ۱۹۳۵ء ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج۔ راولپنڈی "
" بی۔ اے۔ ۱۹۳۷ء گارڈن۔ کالج۔ راولپنڈی "
" آنرز ان پرشین ۱۹۴۲ء دارالعلوم السنۂ شرقیہ لاہور۔ "
" ایم۔ اے۔ فارسی ۱۹۴۴ء پنجاب یونیورسٹی لاہور "
" ایم۔ او۔ ایل ۱۹۴۵ء پنجاب یونیورسٹی لاہور "

۴۔ ۱۹۴۱ء قائم مقام ایڈیٹر۔ ادبی دنیا لاہور مشہور ادبی ماہنامہ (۶ ماہ کے لئے)

۵۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ اردو روزنامہ جے ہند" لاہور
انٹرنگر روزنامہ ٹریبون لاہور

۶۔ ۱۹۴۷ء (اگست سے قبل چند ماہ کے لئے)۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور (لکچرار اردو)

۷۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۸ء اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو روزنامہ "تیج" نئی دہلی

۸۔ ۱۹۴۸ء ایمپلائمنٹ نیوز کی ترتیب (۵۰، ۵۱)

۹۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی۔

۱۰۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۲ء — انفارمیشن آفیسر (اردو) پریس انفارمیشن بیورو منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا

۱۱۔ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۴ء — انفارمیشن آفیسر سینٹرل ویئر ہاؤسنگ کارپوریشن یونین منسٹری آف فوڈ (اس دوران میں انگریزی ماہنامہ "ویئر ہاؤسنگ نیوز لیٹر" بھی ترتیب دیا)

۱۲۔ ۱۹۶۴ء (جنوری تا مئی) انفارمیشن آفیسر یونین منسٹری آف ٹورازم شپنگ اینڈ ٹرانسپورٹ نئی دہلی۔

۱۳۔ مئی ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء — انفارمیشن آفیسر (اردو) منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی

۱۴۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء — انفارمیشن آفیسر یونین منسٹری آف ورکس اینڈ ہاؤسنگ۔ نئی دہلی۔

۱۵۔ جنوری ۱۹۶۷ء تا دسمبر ۱۹۶۷ء — پی۔ آر۔ او۔ منسٹری آف ہوم افیئرز گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی۔

۱۶۔ جنوری ۱۹۶۸ء تا مارچ ۱۹۶۸ء — ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی

۱۷۔ مارچ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۳ء — ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا بمبئی و کشمیر

۱۸۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۷ء — ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا سری نگر کشمیر۔

۱۹۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۰ء — پروفیسر اور صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں (جے اینڈ کے)

۲۰۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۳ء — پروفیسر اور صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی۔ آف لنگ جموں یونیورسٹی جموں (جے اینڈ کے)

۲۱- ۱۹۸۴ء تا حال ایمیریٹس فیلوشپ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی جموں (جے۔ اینڈ۔ کے)

تصنیفات و تالیفات

کتاب کا نام	سن اشاعت	ناشر
شعری مجموعے		
طبل و علم	۱۹۴۸ء	کشمیر بیورو آف انفارمیشن نئی دہلی
بیگڈیں	۱۹۴۹ء	مکتبہ قصر ادب اُردو بازار۔ دہلی
〃	۱۹۵۴ء ۱۹۵۶ء	مکتبہ شاہراہ اُردو بازار۔ دہلی
〃	۱۹۵۸ء ۱۹۶۱ء	ہندستانی ساہتیہ سمیلن بنارس (ہندی رسم الخط میں)
〃	۱۹۸۴ء	مکتبہ کاروان کچہری روڈ۔ لاہور (پاکستان)
ستاروں سے ذروں تک	۱۹۵۱ء ۱۹۵۳ء	مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی۔
وطن میں اجنبی	۱۹۵۴ء	فیض پبلیکیشنز احمدآباد گجرات (گجراتی رسم الخط میں)
〃	۱۹۵۸ء ۱۹۶۴ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی
نوائے پریشاں	۱۹۶۱ء	ادارہ انیس اردو ۴۴ چوک الہ آباد
انتخابِ کلام	۱۹۵۷ء ۱۹۶۰ء	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔
کہکشاں (انتخاب کلام)	۱۹۶۱ء ۱۹۶۳ء	اسٹار پبلیکیشنز۔ دہلی
بچوں کی نظمیں	۱۹۶۷ء	ترقی اردو بورڈ ۸ ویسٹ بلاک آر کے پورم نئی دہلی
بچوں کا اقبال (تالیف)	۱۹۷۷ء	کپور برادرس بک سیلرز اینڈ پبلشرز لال چوک سری نگر کشمیر۔

زیر طباعت

جستجو — ماڈرن پبلیکیشنز ہاؤس ۹۔گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

پیوستہ میدہ — ایوان اردو ناظم آباد کراچی (پاکستان)

طویل نظمیں

اُردو	۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۴ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی
"	۱۹۵۶ء، ۱۹۶۶ء	" " " " "
ابوالکلام آزاد	۱۹۵۸ء	ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ۔
جواہر نہرو	۱۹۶۴ء، ۱۹۶۵ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔
شاعر کی آواز	۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء	مکتبہ قصر اردو۔ اردو بازار دہلی
اجنتا	۱۹۶۶ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی
دہلی کی جامع مسجد	۱۹۶۶ء	" " " " "
" " "	۱۹۸۰ء	ادارہ تعمیر ادب کراچی (پاکستان)
شفیع صاحب کے مزار پر	۱۹۶۶ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی
مرزا غالب	۱۹۶۹ء	" " " " "

نثر

تلوک چند محروم (تالیف)	۱۹۵۹ء	ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ۔
جنوبی ہند میں دو ہفتے	۱۹۵۱ء	دہلی کتاب گھر دہلی
اقبال اور اس کا عہد	۱۹۶۰ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۳ء	ادارہ انیس اردو۔ الہ آباد
" " "	۱۹۷۷ء، ۱۹۸۴ء	ادارہ توسین لاہور (پاکستان)
اقبال اور مغربی مفکرین	۱۹۷۶ء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
" " "	۱۹۸۰ء، ۱۹۸۴ء	مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور (پاکستان)
اقبال اور کشمیر	۱۹۷۷ء	علی محمد اینڈ سنز لال چوک سری نگر۔
اقبال کی ہاؤس	۱۹۷۶ء، ۱۹۸۴ء	ترقی اردو بیورو [illegible]

[illegible]

اقبال زندگی شخصیت اور شاعری (۱۴ سے ۱۸ برس کے طلبہ کے لئے)	۱۹۷۷ء	نیشنل کونسل فار ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نئی دہلی
مرقعِ اقبال	۱۹۷۷ء	پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی
دو ریڈیو فیچر	۱۹۷۷ء	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. نئی دہلی
میرے گزشتہ روز و شب (خودنوشت سوانح حیات)	۱۹۷۵ء	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. نئی دہلی
آنکھیں ترستیاں ہیں (شخصیت نگاری)	۱۹۸۱ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولہ مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی
" " " "	۱۹۸۲ء	مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور۔ پاکستان
فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو (تالیف)	۱۹۸۲ء	شیخ غلام محمد اینڈ سنز قسمہ بازار سری نگر کشمیر
نشانِ منزل (تنقید)	۱۹۸۲ء	ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولہ مارکیٹ دریا گنج
پشکن کے دیس میں (روس کا سفرنامہ)	۱۹۸۶ء	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. نئی دہلی۔

زیرِ طباعت

ترجمہ جاوید نامہ	آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی بمبئی
کولمبس کے دیس میں (امریکہ اور کنیڈا کا سفرنامہ)	انجمن ترقی اردو اردو گھر راؤز ایونیو —— نئی دہلی
حیات محروم	" " " " " "
پھر امریکہ اور کنیڈا میں	" " " " " "
رودادِ اقبال (علامہ اقبال کی مفصل سوانح حیات) جلد اوّل ۱۹۰۵ء تک	جموں یونیورسٹی جموں. کشمیر
کچھ فراق کے بارے میں	مکتبہ جامعہ لمٹیڈ. نئی دہلی۔

مرتب کئے ہوئے شعری مجموعے

گنج معانی (محروم) (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۵۷ء دہلی کتاب گھر۔ دہلی
رباعیات محروم (تیسرا ایڈیشن) ۱۹۷۱ء مکتبہ جامعہ لمٹیڈ جامعہ نگر، نئی دہلی
نیرنگ معانی (محروم۔ دوسرا ایڈیشن) ۱۹۶۴ء " " " " " " "
شعلۂ نوا (محروم) ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء " " " " " " "
کاروان وطن (محروم) ۱۹۶۰ء " " " " " " "
بہار طفلی (محروم) ۱۹۶۰ء " " " " " " "
بچوں کی دنیا (محروم) ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء " " " " " " "

انگریزی تصانیف

Iqbal: His Poetry and Philosophy. ۱۹۸۲، ۱۹۶۵ء، یونیورسٹی آف میسور۔ میسور
Iqbal: Mind and Art ۱۹۸۳ء نیشنل بک ہاؤس اردو بازار، لاہور (پاکستان)

جگن ناتھ آزاد کے متعلق کتابیں

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری
(اردو) حمیدہ سلطان احمد ۱۹۶۴ء مکتبہ شاہراہ اردو بازار۔ دہلی
جگن ناتھ آزاد (ہندی) پرکاش پنڈت ۱۰۷۷ء، ۱۹۷۵ء، میسرز راج پال اینڈ سنز کشمیری بازار نئی دہلی
جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ (اردو) ۱۹۸۰ء علمی مجلس۔ دہلی
پرواز ادب پٹیالہ کے خاص نمبر میں
گوشۂ آزاد جگن ناتھ آزاد کو شرومنی
ساہتیہ کار ایوارڈ ملنے کے موقع پر ۱۹۸۱ء

جگن ناتھ آزاد نمبر (زیرِ طباعت) ماہنامہ سہیل (گیا)
جگن ناتھ آزاد (") ڈاکٹر رضوان اللہ ڈی۔ این کالج دربھنگہ
جگن ناتھ آزاد نمبر (ماہنامہ لعطشو) ۱۹۸۶ء مدیر راج کمار چندن۔ تہول۔ کشمیر۔

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں توسیعی اور خصوصی خطبات

۱۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد — ۱۹۵۰ء ہندوستان میں اردو کا مستقبل

۲۔ یونیورسٹی آف جموں اینڈ کشمیر سری نگر — ۱۹۵۶ء (A) اقبال اور ہندوستان
(B) اقبال کی شاعری میں تصوف
(C) اقبال اور اس کا عہد

۳۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی — ۱۹۶۰ء اقبال کا شاعرانہ فن

۴۔ کشمیر یونیورسٹی۔ دہلی — ۱۹۷۱ء (A) اقبال اور جدید مغربی مفکرین
(B) اقبال اور بیٹشے
(C) اقبال اور برگساں

۵۔ جموں یونیورسٹی جموں — ۱۹۷۱ء (A) اردو ادب کا سیکولر کردار
(B) جاوید نامہ اور ڈوانتے کی ڈیوائن کامیڈی کا تقابلی مطالعہ

۶۔ جموں یونیورسٹی جموں — ۱۹۷۳ء (A) اقبال اور اشتراکیت
(B) اقبال، حب الوطنی اور قومیت

۷۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر — ۱۹۷۳ء Iqbal and Truth of Life

۸۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ پاکستان — ۱۹۷۷ء علامہ اقبال بین الاقوامی کانگریس کے بارے میں میرے تاثرات۔

۹۔ جموں یونیورسٹی جموں (شعبہ پنجابی)	۱۹۷۸ء	اردو غزل
۱۰۔ ماسکو یونیورسٹی ماسکو (روس)	۱۹۷۸ء	Iqbal's vision of the New man
۱۱۔ ریگا یونیورسٹی لٹویا (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر)	۱۹۷۸ء	Modern Urdu Literature
۱۲۔ لینن گراڈ یونیورسٹی لینن گراڈ (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر)	۱۹۷۸ء	Ghalib As a Prose Writer
۱۳۔ تاجکستان یونیورسٹی دوشنبے (یو۔ ایس۔ ایس۔ آر)	۱۹۷۸ء	Iqbal's Philosophy of Life.
۱۴۔ میسور یونیورسٹی۔ میسور	۱۹۷۸ء	(A) Iqbal's Poetry and Philosophy.
		(B) Iqbal Poet and Politician.
		(C) Indian Back Ground of Iqbal's Poetry.
۱۵۔ بمبئی یونیورسٹی (شعبہ اردو)	۱۹۷۹ء	تخلیق کار کی اندرونی دنیا
۱۶۔ جواہر لال یونیورسٹی۔ نئی دہلی	۱۹۷۹ء	پاکستان میں بین الاقوامی اقبال کانگریس
۱۷۔ کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ (کرناٹک آرٹس کالج)	۱۹۷۹ء	(A) اقبال کا تصور انسان
		(B) اقبال کا متروک کلام
		(C) اقبال اور عظمت آدم
۱۸۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ پاکستان	۱۹۸۰ء	اقبال کا تصور زماں
۱۹۔ کراچی یونیورسٹی پاکستان	۱۹۸۰ء	اقبال کی عقویت
۲۰۔ پشاور یونیورسٹی پاکستان	۱۹۸۰ء	اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟
۲۱۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد پاکستان	۱۹۸۰ء	کلام اقبال کے نفسیاتی پہلو
۲۲۔ کراچی یونیورسٹی پاکستان	۱۹۸۱ء	ہندوستان اور پاکستان میں اقبالیات کا تقابلی مطالعہ
۲۳۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور	۱۹۸۱ء	(A) اقبال اور پریم چند
۲۴۔		(B) اقبال کا تصور زماں
		(C) اقبال کی اپنے کلام پر نظر ثانی
		(D) اقبال کا مثالی انسان

(F) اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ؟
(F) Iqbal Philosophy of Life.
Iqbal a Universal Poet
Indian Literature

۲۴۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو (امریکہ)	۱۹۸۱ء
۲۵۔ نارتھ ویسٹرن الی نائے یونیورسٹی شکاگو (امریکہ)	۱۹۸۱ء
۲۶۔ ناگپور یونیورسٹی۔ ناگپور	۱۹۸۱ء کلام اقبال کا صوتی آہنگ
۲۷۔ اودے پور۔ یونیورسٹی۔ اودے پور	۱۹۸۲ء (A) اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر ؟ (B) اقبال کا فلسفہ خودی (C) اقبال اور فنونِ لطیفہ (D) اقبال کا فلسفہ تعلیم۔
۲۸۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	۱۹۸۲ء (A) اقبال اور جوش (B) اقبال اور عظمتِ انسان
۲۹۔ اے پی ایس یونیورسٹی ریوا	۱۹۸۳ء فراق گورکھپوری کی شاعری
۳۰۔ بنگلور یونیورسٹی بنگلور	۱۹۸۵ء اقبال اور اُردو زبان
۳۱۔ میسور یونیورسٹی میسور	۱۹۸۵ء اقبال مشرق اور مغرب کے درمیان پل
۳۲۔ میسور یونیورسٹی (جے ایس کالج میسور)	۱۹۸۵ء ہندوستان میں اردو کا مستقبل
۳۳۔ بحرین یونیورسٹی (بحرین)۔	۱۹۸۶ء اقبال کی شاعری کے چند پہلو (غیر رسمی بات چیت)
۳۴۔ جموں یونیورسٹی (شعبہ پنجابی)	۱۹۸۶ء ایک ادبی اجتماع میں صدارتی خطبہ
۳۵۔ پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ	۱۹۸۶ء اقبال کی شاعری کے چند پہلو۔

ہندوستان اور باہر کے ممالک میں علمی اور ادبی اداروں اور یونیورسٹیوں کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمیناروں میں پڑھے ہوئے تحقیقی اور تنقیدی مقالات (یونیورسٹیوں میں دیئے ہوئے توسیعی اور خصوصی

لکچروں کے علاوہ)

۱۔ گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس یونیورسٹی مدراس ۱۹۵۰ء اُردو ناول ابتدا و ارتقاء

۲۔ چندرکھاٹ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ ۱۹۵۴ء اردو ناول ابتدا سے آج تک

۳۔ بھاشا وبھاگ پنجاب گورنمنٹ چنڈی گڑھ ۱۹۵۷ء اردو میں ترقی پسند ادب

۴۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد ۱۹۶۰ء عصری ادب پر اقبال کا اثر

۵۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز جموں (غالب صدی تقریبات ۱۹۶۵ء غالب اور اقبال

۶۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر (اقبال ہفتہ تقریبات) ۱۹۷۳ء اقبال اور مارکسزم

۷۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد (اقبال صدی تقریبات کے تین اجلاسوں کی صدارت ۱۹۷۳ء (A) صدارتی خطبہ

(B) اقبال کا مردِ مومن

۸۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (اقبال سیمنار) ۱۹۷۳ء جاوید نامہ

۹۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد (تقریبات یوم اقبال) ۱۹۷۴ء ہندوستان میں اقبال صدی تقاریب: ہمارا لائحہ عمل کیا ہو

۱۰۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز اور جموں و کشمیر یوم اقبال تقریبات کمیٹی سری نگر ۱۹۷۵ء اقبال اور کشمیر

۱۱۔ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ۱۹۷۵ء اقبال اور گوئٹے

۱۲۔ بزم اقبال سری نگر ۱۹۷۵ء اقبال اور گوئٹے

۱۳۔ ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد ۱۹۷۶ء اقبال اور ملٹن کی شاعری میں [illegible]

۱۴۔ کشمیر ریسرچ سوسائٹی سری نگر (سالانہ اجلاس) ۱۹۷۶ء اقبال اور شاہ ہمدانی

۱۵۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز جموں ۱۹۷۶ء اقبال مغربی مصنفین کی نظر میں

۱۶۔ کل ہند اقبال صد سالہ جشن ولادت تقریبات کمیٹی نئی دہلی (انٹرنیشنل سیمینار) ۱۹۷۷ء Iqbal, Islam and the modern age.

۱۷۔ کانگریس انٹرنیشنل علامہ محمد اقبال لاہور پاکستان سیمنار کا افتتاحی اجلاس Iqbal, his Art and thought.

۱۸۔ اسلامیہ کالج وانیم باڑی تامل ناڈو (اقبال جشن ولادت تقریبات) ۱۹۷۷ء صدارتی خطبہ

۱۹۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۷۷ء اقبال کے یہاں مابعد الطبیعاتی فکر کا ارتقا

۲۰۔ کانگریس انٹرنیشنل علامہ محمد اقبال سیالکوٹ پاکستان ۱۹۷۷ء اختتامی اجلاس کی صدارت

۲۱۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی (اقبال سیمنار) ۱۹۷۷ء اقبال کی فارسی شاعری

۲۲۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۹۷۷ء اقبال کے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اصلاح۔

۲۳۔ شاہ حسین کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان ۱۹۷۷ء ہندوستان اور پاکستان میں اقبالیات کا تقابلی مطالعہ۔

۲۴۔ بزم فروغ اردو جموں (یوم غالب) ۱۹۷۸ء صدارتی خطبہ

۲۵۔ آل انڈیا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن لکھنؤ ۱۹۷۸ء ترقی پسند ادب کی تحریک اور نئی نسل

۲۶۔ جموں یونیورسٹی جموں (اقبال یوم ولادت تقریبات ۱۹۷۸ء) اقبال کا تصور زمان و مکان

۲۷۔ اُتر پردیش اردو اکیڈمی۔ لکھنؤ ۱۹۷۸ء اقبال کا سفر کشمیر

۲۸۔ انجمن ترقی اردو بھیونڈی (مہاراشٹرا) ۱۹۷۸ء صدارتی خطبہ

۲۹۔ برہانی کالج بمبئی (بمبئی یونیورسٹی) ۱۹۷۸ء (A) استقبال (B) ہندوستان اور پاکستان میں اقبال جشن ولادت تقریبات

۳۰۔ بزم فروغ اردو جموں ۱۹۷۸ء لاہور اور سیالکوٹ کی اقبال انٹرنیشنل کانگریس۔

۴۱۔ بزم اردو جلگاؤں ۱۹۷۸ء صدارتی خطبہ
۴۲۔ مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ جبل پور ۱۹۷۸ء صدارتی خطبہ (ب) اقبال اور مغرب
۴۳۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر (اقبال انسٹی ٹیوٹ) ۱۹۷۸ء آئن سٹائن کا تصورِ زمان و مکان اور اقبال
۴۴۔ بزم فروغِ اردو جموں، یوم محمد علی جوہر ۱۹۷۸ء صدارتی خطبہ
۴۵۔ نورتھ فریڈم فورم کانپور ۱۹۷۸ء مولانا حسرت موہانی
۴۶۔ بزم فروغ اردو جموں ۱۹۷۸ء پشکن کے دیس میں
۴۷۔ انجمن حدیقۃ الادب میسور ۱۹۷۹ء (الف) استقبال (ب) صدارتی خطبہ
۴۸۔ کلچرل فورم ہوشیار پور ۱۹۷۹ء پریم کمار نظر کی شاعری
۴۹۔ بزم سپہر مظفر پور۔ بہار ۱۹۷۹ء اقبال انٹرنیشنل کانگریس لاہور
۵۰۔ کرناٹک آرٹس کالج دھارواڑ (کرناٹک یونیورسٹی) ۱۹۷۹ء (الف) انسان اقبال کے نظامِ فکر میں
(ب) اقبال کا متروک کلام
(ج) اقبال کا نظریۂ فن
۵۱۔ غالب اکیڈمی۔ نئی دہلی ۱۹۷۹ء اقبال کا تصورِ زماں
۵۲۔ دہلی یونیورسٹی دہلی (اقبال سیمنار) ۱۹۷۹ء (الف) پیریڈیم کی کیفیت
(ب) اقبال اور اس کا عہد
۵۳۔ بزم سپہر مظفر پور۔ بہار ۱۹۷۹ء پاکستان اور روس کا ادبی سفر
۵۴۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ مورشس پورٹ لوئی ۱۹۷۹ء آغا حشر کاشمیری[1]
۵۵۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۷۹ء اقبال کی شعریات
۵۶۔ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۷۹ء رام لعل اند نیا افسانہ
۵۷۔ حکومت مغربی بنگال (اقبال سیمنار) ۱۹۷۹ء اقبال کی منظر نگاری
۵۸۔ کلکتہ یونیورسٹی (اقبال سیمنار) ۱۹۷۹ء اقبال اور بحر تری ہری[2]

---

[1] آزاد صاحب مصروفیت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے البتہ مقالہ انسٹی ٹیوٹ کو بھیج دیا گیا تھا۔

[2] مقالہ یونیورسٹی کو بھیج دیا گیا تھا مگر آزاد صاحب مصروفیت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے۔

۴۹۔ اسلامک سینٹر برما رنگون	۱۹۸۰ء (A) استقبال (B) اقبال اور تصوف
۵۰۔ حلقۂ احمر برما رنگون	۱۹۸۰ء تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ
۵۱۔ حلقہ احمر برما رنگون	۱۹۸۰ء سجدۂ قرطبہ
۵۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ لاہور	۱۹۸۰ء (A) استقبال (B) میرا برما کا ادبی سفر
۵۳۔ کل ہند ادبی کانفرنس چنڈی گڑھ	۱۹۸۰ء ہندوستان میں اردو۔ حال اور مستقبل
۵۴۔ جموں یونیورسٹی جموں	۱۹۸۰ء رام لعل اور جدید افسانہ
۵۵۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور جواہر لال یونیورسٹی کے اشتراک سے بین الاقوامی سیمنار	۱۹۸۰ء اقبال اور پریم چند
۵۶۔ اقبال میموریل ٹرسٹ ملیر کوٹلہ (سالانہ اجلاس)	۱۹۸۰ء اقبال اور ہندوستان
۵۷۔ پاکستان انڈیا فرینڈشپ ایسوسی ایشن کراچی پاکستان۔	۱۹۸۰ء ہندوستان اور پاکستان کے درمیان باہمی ادبی تعاون
۵۸۔ اباسین آرٹ کونسل پشاور۔ پاکستان۔	۱۹۸۰ء اقبال اور مغرب
۵۹۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اسلام آباد پاکستان	۱۹۸۰ء ہندوستان میں اردو
۶۰۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد۔ راولپنڈی میں استقبال اور خطبہ	۱۹۸۰ء (A) استقبال (B) ہندوستان میں مطالعۂ اقبال
۶۱۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی	۱۹۸۰ء عرش ملسیانی اور اس کی شاعری
۶۲۔ انجمن ترقی اردو۔ بہار (پٹنہ)	۱۹۸۰ء (A) استقبال (B) عصر حاضر میں— پریم چند کی اہمیت (استقبالیہ کے موقع پر)
۶۳۔ راجستھان اردو اکیڈمی جے پور	۱۹۸۰ء اردو ادب میں جدید رجحانات پر گفتگو (استقبالیہ کے موقع پر)
۶۴۔ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ	۱۹۸۰ء اقبال اور پریم چند۔

۶۵۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۸۰ء حسرت موہانی اور اقبال

۶۶۔ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۱۹۸۰ء پریم چند اور اردو افسانہ

۶۷۔ انجمن ترقی اردو بہار۔ پٹنہ ۱۹۸۰ء (A) استقبال (B) پریم چند اور سیکولرزم

۶۸۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۸۱ء (A) اقبال اور عصر حاضر (B) مشاعرے کی صدارت

۶۹۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگویجز۔ جموں۔ ۱۹۸۱ء عالمی معیار اور اردو ادب

۷۰۔ اتر پردیش پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن لکھنؤ ۱۹۸۱ء صدارتی خطبہ۔ ترقی پسندی اور اس کا ہندوستان میں مستقبل

۷۱۔ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن جے پور راجستھان ۱۹۸۱ء (A) استقبال (B) ہندوستان میں ترقی پسند ادب پر گفتگو

۷۲۔ علی گڑھ یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی کراچی ۱۹۸۱ء (A) استقبال (B) مشاعرہ (C) اردو ہندوستان اور پاکستان کے مابین ثقافتی رابطہ (مشاعرے کے بعد تقریر)

۷۳۔ بزم ادب الامارات دوبئی (یو۔ اے۔ ای) ۱۹۸۱ء علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ

۷۴۔ کل ہند غیر مسلم اردو ادبا کانفرنس لکھنؤ ۱۹۸۱ء اجلاس کا صدارتی خطبہ

۷۵۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۱ء سجاد حیدر یلدرم[1]

۷۶۔ اودھ لٹریری فورم فیض آباد۔ یوپی ۱۹۸۱ء جدید اردو شاعری سیمینار کا افتتاح

۷۷۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۱ء غالب اور اقبال

۷۸۔ پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن لکھنؤ ۱۹۸۱ء صدارتی خطبہ۔ ترقی پسند اور احتجاج

۷۹۔ بزم ادب الامارات دوبئی (یو۔ اے۔ ای) ۱۹۸۱ء اقبال کا فلسفۂ حیات

---

[1] آزاد صاحب عدیم الفرصتی کی بنا پر شرکت نہ کر سکے۔ البتہ مقالہ منتدد اداروں کو بھیج دیا گیا تھا۔

۸۰۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز ان ایجوکیشن ٹورانٹو یونیورسٹی۔ ٹورانٹو (کنیڈا)	۱۹۸۱ء	مذاہب کی طرف اقبال کا رویہ
۸۱۔ پنجاب بھاشا و بھاگ چنڈی گڑھ	۱۹۸۱ء	پریم چند اور فکشن[1]
۸۲۔ راجستھان پراگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن جے پور	۱۹۸۱ء	بیسویں صدی میں اردو ادب
۸۳۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	۱۹۸۲ء	اقبال اور تصوف
۸۴۔ راجستھان اردو اکیڈمی اودے پور	۱۹۸۲ء	افتتاح ادبی سنگم اودے پور
۸۵۔ راجستھان اردو اکیڈمی اودے پور	۱۹۸۲ء	(A) استقبالیہ (B) اردو ادب حال اور مستقبل
۸۶۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی	۱۹۸۲ء	میر تقی میر اور اقبال
۸۷۔ انجمن سادات امروہہ کراچی۔ پاکستان	۱۹۸۲ء	جوش ملیح آبادی کے ساتھ ۹۰ برس
۸۸۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	۱۹۸۲ء	اقبال مغربی مصنفین کی نظر میں
۸۹۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	۱۹۸۲ء	فراق گورکھپوری شخصیت اور شاعری
۹۰۔ رائٹرز فورم آف پاکستانی کنیڈین پاکستان کنیڈا انسٹی فورم کے اشتراک سے ٹورنٹو کنیڈا (انٹرنیشنل اردو کانفرنس)	۱۹۸۳ء	(A) ہندوستان اور پاکستان میں اقبالیات (B) ایک اجلاس کی صدارت
۹۱۔ اردو رائٹرز میٹ اٹاوہ یونیورسٹی کنیڈا	۱۹۸۳ء	(A) صدارتی خطبہ (B) اردو کتاب کی رسم اجرا
۹۲۔ ادبی مرکز لندن	۱۹۸۳ء	اقبال کی اپنے کلام پر نظر ثانی
۹۳۔ ورلڈ مسلم سینٹر لندن	۱۹۸۳ء	اتحاد انسانیت
۹۴۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس لاہور	۱۹۸۳ء	(A) اقبال کا نظریہ انسان (B) اجلاس کی صدارت
۹۵۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	۱۹۸۳ء	اقبال اور نیشنلزم
۹۶۔ انجمن سادات امروہہ کراچی۔ پاکستان	۱۹۸۳ء	مصحفی کی شاعری

---

[1] آزاد صاحب عدیم الفرصتی کی بنا پر شرکت نہ کر سکے۔ البتہ مقالہ متعلقہ اداروں کو بھیج دیا گیا تھا۔

۹۷۔ راشٹریہ ایکتا مشن سیتاپور — ۱۹۸۳ء اردو اور قومی یکجہتی

۹۸۔ گورنمنٹ فورمن کرسچن کالج لاہور — ۱۹۸۳ء اقبال کا شاعرانہ کمال

۹۹۔ مرکزیہ مجلس اقبال لاہور — ۱۹۸۳ء اقبال ایک آفاقی شاعر

۱۰۰۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ — ۱۹۸۴ء جوش ملیح آبادی

۱۰۱۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر — ۱۹۸۴ء اقبال کی نظم میں ہیئتی تجربے

۱۰۲۔ سبجے۔ ایس۔ ایس۔ کالج۔ میسور — ۱۹۸۵ء ہندوستان میں اردو کا مستقبل

۱۰۳۔ پنجابی لٹریری کلچرل میٹ سری نگر — ۱۹۸۵ء تخلیقی ادب اور ماحول

۱۰۴۔ دہلی اردو اکیڈمی۔ نئی دہلی — ۱۹۸۵ء مولانا آزاد کا ادبی ذوق

۱۰۵۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی — ۱۹۸۵ء بہادر شاہ ظفر کی شاعری

۱۰۶۔ دہلی اردو اکیڈمی نئی دہلی — ۱۹۸۵ء اقبال کی غزل پر داغ کے اثرات

۱۰۷۔ دہلی اردو اکیڈمی نئی دہلی (اردو غزل پر انڈو پاک سیمنار) — ۱۹۸۵ء اقبال کی غزل کا ابتدائی دور

۱۰۸۔ نورنگ ادبی سنگم۔ جموں — ۱۹۸۵ء ادبی اجتماع کی صدارت

۱۰۹۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی — ۱۹۸۵ء سید سلیمان ندوی سیمنار کے ایک جلسہ کا صدارتی خطبہ۔

۱۱۰۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد
کراچی سیمنار (ہندوستان میں اردو ادب آزادی کے بعد) ۱۹۸۶ء اردو میں بچوں کا ادب

۱۱۱۔ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد
سیمنار (ہندوستان میں اردو ادب آزادی کے بعد) ۱۹۸۶ء اردو میں بچوں کا ادب

۱۱۲۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان کراچی — ۱۹۸۶ء ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد

۱۱۳۔ اقبال انٹرنیشنل سیمنار حیدرآباد (اقبال اکیڈمی حیدرآباد اور اقبال ٹرسٹ حیدرآباد کے اشتراک سے) ۱۹۸۶ء ہندوستان میں اقبال کی مقبولیت

نوٹ: شاد صاحب مدیر الفرقان کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے۔ مقالہ ادارے کو بھیج دیا گیا تھا۔

۱۱۳۔ اقبال انٹرنیشنل سیمنار۔ حیدرآباد
(اقبال اکیڈمی حیدرآباد اور ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے باہمی اشتراک سے) ۱۹۸۶ء نئے ہندوستان میں اقبال کی معنویت

۱۱۴۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سرینگر ۱۹۸۶ء اقبال: خطابت اور شاعری۔

۱۱۵۔ بزم اردو جموں ۱۹۸۶ء صدارتی خطبہ۔

۱۱۶۔ علمی انجمن دہلی ۱۹۸۶ء اقبال اور آموفت

۱۱۷۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال (بذریعہ ڈاک) ۱۹۸۶ء صدارتی خطبہ

۱۱۸۔ بھاشا وبھاگ (ڈیپارٹمنٹ آف لینگویجز) حکومت پنجاب پٹیالہ ۱۹۸۷ء اردو شاعری میں انسانی اخوت دسیمنار لکھنؤ میں منعقد ہوا)

۱۱۹۔ اردو اکیڈمی دہلی (ڈاکٹر ذاکر حسین قومی اور ادبی خدمات پر سیمنار) ۱۵ر فروری ۱۹۸۷ء ڈاکٹر ذاکر حسین اور علامہ اقبال (آخری اجلاس کی صدارت)

۱۲۰۔ اقبال انٹرنیشنل سیمنار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۸۷ء اقبال اور غالب ایک تقابلی مطالعہ (ایک اجلاس کی صدارت)

(۵)

علمی و ادبی انجمنوں اور اداروں کی رکنیت

۱۔ جائنٹ سکریٹری ۱۹۷۲ء کل ہند اقبال کمیٹی مجلس دہلی۔

مولانا صاحب عبدالرحمن قوشتی کی وجہ سے شرکت نہ کرسکے تھے۔ مقالہ انجمن کو بھیج دیا گیا تھا۔

عہدہ	سال	ادارہ
۲۔ ایڈوائزر فلم اقبال	۱۹۷۷ء	فلم ڈویژن حکومت ہند بمبئی۔
۳۔ رکن (منتخب ۵ سال کے لئے)	۱۹۷۷ء	انجمن ترقی اردو ہند
۴۔ رکن (نامزد) اقبال کمیٹی	۱۹۷۷ء	حکومت جموں کشمیر
۵۔ رکن (نامزد) اقبال میموریل کمیٹی	۱۹۷۷ء	حکومت جموں کشمیر
۶۔ چیرمین (منتخب)	۱۹۷۷ء	اقبال میموریل کمیٹی مالیرکوٹلہ پنجاب
۷۔ رکن (نامزد) پینل "بچوں کا ادب"	۱۹۷۸ء	ترقی اردو بورڈ حکومت ہند نئی دہلی۔
۸۔ رکن (منتخب ۵ سال کیلئے) جنرل کونسل	۱۹۷۸ء	ساہتیہ اکیڈمی دہلی
۹۔ رکن (نامزد ۵ سال کیلئے) اردو ایڈوائزری بورڈ	۱۹۷۸ء	ساہتیہ اکاڈمی دہلی
۱۰۔ چیرمین	۱۹۷۸ء	کل ہند اردو ہندی سنگم جموں کشمیر
۱۱۔ رکن اردو ایڈوائزری کمیٹی	۱۹۷۸ء	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر
۱۲۔ صدر منتخب	۱۹۷۸ء	انجمن ترقی پسند مصنفین جموں
۱۳۔ رکن انعامی کمیٹی (۵ سال کے لئے)	۱۹۷۸ء	ساہتیہ اکیڈمی دہلی
۱۴۔ رکن انعامی کمیٹی (کئی برس تک)	۱۹۷۸ء	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر
۱۵۔ رکن انعامی کمیٹی	۱۹۷۸ء	بھاشا دبھاگ پنجاب پٹیالہ
۱۶۔ رکن انعامی کمیٹی	۱۹۷۸ء	ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی چنڈی گڑھ
۱۷۔ رکن انعامی کمیٹی	۱۹۷۸ء	کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور
۱۸۔ رکن منتخب ایکزیکیوٹو کمیٹی	۱۹۷۹ء	کل ہند پریم چند صدی تقریبات کمیٹی نئی دہلی
۱۹۔ رکن منتخب نیشنل کمیٹی	۱۹۷۹ء	آل انڈیا نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز
۲۰۔ رکن (نامزد) کل ہند جشن فانی بدایونی یوم ولادت تقریبات کمیٹی	۱۹۷۹ء	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی
۲۱۔ رکن (اتفاق رائے سے منتخب) ایڈوائزری		

ایڈوٹوریل بورڈ ہفت روزہ "ہماری زبان" ۱۹۷۹ء انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی

۲۲۔ پریسیڈنٹ ان چیف (منتخب) تاحیات ۱۹۷۹ء حلقہ احمر رنگون برما

۲۳۔ رکن (نامزد) پروگرام ایڈوائزری کمیٹی

ریڈیو کشمیر جموں ۱۹۷۹ء حکومت ہند۔ نئی دہلی

۲۴۔ رکن (نامزد) پینل ماڈرن انڈین لینگویجز ۱۹۸۰ء یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نئی۔ دہلی

۲۵۔ رکن (منتخب) نیشنل انسائیکلوپیڈیا ۱۹۸۰ء نیشنل فیڈریشن آف پروگریسو رائٹرز

۲۶۔ رکن (نامزد) پینل جرنلزم اینڈ ماس

کمیونیکیشن فار پروموشن آف اردو ۱۹۸۲ء ترقی اردو بیورو۔ گورنمنٹ آف انڈیا۔ نئی دہلی

۲۷۔ رکن (منتخب ۵ سال کے لئے) ۱۹۸۲ء انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی

۲۸۔ رکن (نامزد) پینل ماڈرن انڈین لینگویجز ۱۹۸۳ء یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔ نئی۔ دہلی

۲۹۔ رکن (منتخب ۵ سال کیلئے، جنرل کونسل) ۱۹۸۳ء ساہتیہ اکیڈمی۔ دہلی۔

۳۰۔ رکن (منتخب ۵ سال کیلئے) اردو ایڈوائزری بورڈ ۱۹۸۳ء ساہتیہ اکیڈمی۔ دہلی۔

۳۱۔ رکن (نامزد) علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال ۱۹۸۴ء حکومت مدھیہ پردیش۔ بھوپال

۳۲۔ ایمریٹس فیلوشپ ۱۹۸۴ء جموں یونیورسٹی۔ جموں۔

۳۳۔ پیٹرن (منتخب) ۱۹۸۶ء کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین

۳۴۔ رکن (نامزد) آزادی کے چالیس سال

اور پنڈت نہرو صدی تقاریب نیشنل کمیٹی ۱۹۸۶ء حکومت ہند نئی دہلی۔

باہر کے ملکوں میں براڈکاسٹ اور ٹیلی کاسٹ پروگرام

اُن پروگراموں کے علاوہ جو باہر کے نشری اداروں کیلئے ہندوستان میں ٹیلی کاسٹ کئے گئے

۱۔ ریڈیو پاکستان، کراچی پاکستان	۱۹۴۹ء
۲۔ ریڈیو پاکستان، کراچی پاکستان	۱۹۵۰ء
۳۔ بی۔بی۔سی۔ لندن (یو۔کے)	۱۹۶۲ء
۴۔ ریڈیو پاکستان، لاہور پاکستان	۱۹۷۷ء
۵۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور۔ پاکستان	۱۹۷۷ء
۶۔ ماسکو ریڈیو ماسکو روس	۱۹۷۸ء
۷۔ ریگا ٹیلی وژن ریگا سٹوویا روس	۱۹۷۰ء
۸۔ پاکستان ٹیلی وژن اسلام آباد	۱۹۸۰ء
۹۔ ریڈیو شکاگو (یو۔ایس۔اے)	۱۹۸۱ء
۱۰۔ بی۔بی۔سی۔ لندن (یو۔کے)	۱۹۸۱ء
۱۱۔ بی۔بی۔سی ٹیلی وژن برمنگھم	۱۹۸۱ء
۱۲۔ ریڈیو پاکستان لاہور۔ پاکستان	۱۹۸۲ء
۱۳۔ پاکستان ٹیلی وژن لاہور پاکستان	۱۹۸۳ء
۱۴۔ ٹورنٹو ٹیلی وژن ٹورنٹو۔ کینیڈا	۱۹۸۳ء
۱۵۔ وائس آف امریکہ نیویارک	۱۹۸۳ء
۱۶۔ تھرڈ ورلڈ ٹیلی وژن نیویارک	۱۹۸۳ء
۱۷۔ بی۔بی۔سی۔ لندن (یو۔کے)	۱۹۸۳ء
۱۸۔ پاکستان ٹیلی وژن کراچی۔ لاہور۔ اسلام آباد	۱۹۸۶ء

۱۹۔ پاکستان ٹیلی وژن کراچی۔ پاکستان ۱۹۸۳ء
۲۰۔ پاکستان ٹیلی وژن اسلام آباد ۱۹۸۴ء

انعامات واعزازات

۱۔ انڈونیپالی لٹریری کانفرنس اور مشاعرہ ۱۹۶۶ء ہندوستان کی نمائندگی کی
۲۔ آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۵ء امتیاز میر ایوارڈ
۳۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۶ء اقبال اور مغربی مفکرین پر اوّل انعام۔
۴۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس لاہور پاکستان
(افتتاحی اجلاس) ۱۹۷۷ء تمغہ
۵۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس سیالکوٹ پاکستان ۱۹۷۷ء پلیک (PLAQUE) اور افتتاحی اجلاس کی صدارت
۶۔ اقبال انٹرنیشنل کانگریس سیالکوٹ مندوبین کے جلوس کی قیادت سیالکوٹ
پاکستان ۱۹۷۷ء قلعہ سے علامہ اقبال کے جدّی مکان تک
۷۔ اقبال سنٹینل کانگریس لاہور پاکستان ۱۹۷۷ء پنجاب یونیورسٹی اقبال صدی تقاریب میڈل
۸۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ
لینگویجز۔ سری نگر ۱۹۷۸ء "اقبال اور کشمیر" پر ایوارڈ
۹۔ پنجاب بھاشا دبھاگ پٹیالہ ۱۹۷۹ء "اقبال زندگی شخصیت اور شاعری" پر ایوارڈ
۱۰۔ بہار اردو اکیڈمی۔ پٹنہ ۱۹۷۹ء "اقبال کی کہانی" پر ایوارڈ
۱۱۔ حکومت پاکستان ۱۹۷۹ء صدر پاکستان اقبال میڈل
۱۲۔ حلقۂ احمر بزم شعرائے اردو رنگون برما ۱۹۷۸ء سپاسنامہ اور تاحیات حلقۂ رنگون کی
صدارت۔

۱۳۔ اسلامک سینٹر برما رنگون ۱۹۷۹ء سپاس نامہ
۱۴۔ اقبال میموریل ٹرسٹ میرکوٹلہ ۱۹۸۰ء اقبال ایوارڈ مع خلعت طشت سیمیں
۱۵۔ اقبال اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد کی ۱۹۸۰ء دورہ پاکستان

دعوت پر
۱۶۔ اباسین لٹریری سوسائٹی پشاور پاکستان ۱۹۸۰ء تحفۂ یادگار
۱۷۔ کلاکیندر چنڈی گڑھ ۱۹۸۰ء تحفۂ یادگار
۱۸۔ اقبال میموریل ٹرسٹ میرکوٹلہ ۱۹۸۱ء پانچ سال کے لئے ٹرسٹ کی صدارت
۱۹۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو امریکہ ۱۹۸۱ء سپاس نامہ
۲۰۔ اردو سوسائٹی آف کنیڈا ٹورنٹو کنیڈا ۱۹۸۱ء پلیک (PLAQUE)
۲۱۔ انجمن اردو کنیڈا ٹورنٹو کنیڈا ۱۹۸۱ء تحفۂ یادگار
۲۲۔ آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۱ء "اقبال او کشمیر" پر میر ایوارڈ
۲۳۔ حکومت پنجاب بھاشا وبھاگ ۔ ۱۹۸۱ء شرمنی ساہتکار گولڈ میڈل ایوارڈ
چنڈی گڑھ مع خلعت
۲۴۔ اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء "نشانِ منزل" پر ایوارڈ
۲۵۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر
اینڈ لینگویجز سری نگر ۱۹۸۳ء "دیکھیں تو بستیاں ہیں" پر ایوارڈ
۲۶۔ اردو انٹرنیشنل کانفرنس ٹورنٹو کنیڈا ۱۹۸۳ء پلیک (PLAQUE) ایک اجلاس کی صدارت
۲۷۔ انٹرنیشنل اردو لٹریری مسٹ یونیورسٹی
آف اٹاوہ (OTTAWA) کنیڈا ۱۹۸۳ء صدارت
۲۸۔ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۱۹۸۳ء "نشانِ منزل" پر ایوارڈ
۲۹۔ گورنمنٹ فارمن کرسچین کالج لاہور پاکستان ۱۹۸۳ء "نشانِ منزل" ایف سی کالج دلوں میں
۳۰۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ ۱۹۸۳ء "نشانِ منزل" پر ایوارڈ
۳۱۔ ورلڈ مسلم سینٹر لندن برطانیہ ۱۹۸۳ء استقبالیہ اور سپاس نامہ

ادارہ	سال	تفصیل
۳۲۔ جموں یونیورسٹی جموں	۱۹۸۴ء	ایمیرٹس فیلوشپ ایوارڈ
۳۳۔ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ	۱۹۸۴ء	محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات پر ایوارڈ
۳۴۔ بیسویں صدی ایوارڈ	۱۹۸۴	۱۹۸۳ء کا پہلا سالانہ ایوارڈ
۳۵۔ پنجاب بھاشا وبھاگ پٹیالہ	۱۹۸۴ء	نشانِ منزل ایوارڈ
۳۶۔ آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۸۵ء	افتخارِ میر ایوارڈ
۳۷۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور	۱۹۸۵ء	رضوان اللہ کے تحقیقی مقالہ "جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری
۳۸۔ ہندوستانی اردو ادیبوں کے وفد کے رکن کی حیثیت سے دورۂ پاکستان	۱۹۸۶ء	راولپنڈی لاہور اور کراچی کے اجلاسوں میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات کا اعتراف صدر پاکستان، وزیر اعلیٰ پنجاب لاہور، وزیر اعلیٰ سندھ کی تقاریر میں خصوصی ذکر۔
۳۹۔ تحفہ صدر پاکستان	۱۹۸۶ء	عمل چغتائی
۴۰۔ وزیر اعلیٰ پنجاب لاہور۔ پاکستان	۱۹۸۶ء	مینار پاکستان (ماڈل) ادبی خدمات کے اعتراف میں
۴۱۔ جناح اسلامیہ کالج لاہور پاکستان	۱۹۸۶ء	تحفۂ یادگار MEMENTO
۴۲۔ اقبال انٹرنیشنل سیمینار حیدرآباد۔ (آندھرا پردیش)	۱۹۸۶ء	تحفۂ یادگار MEMENTO

شخص و عکس

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

جگن ناتھ آزاد — میرا یار

مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

بحرِ اسود کے اندر زمین کا ایک سموسہ ہے جسے کرائمیا کہتے ہیں، پھلوں، پھولوں اور میووں سے ڈھکا ہوا۔ دنیا بھر کے لوگ وہاں غم بھلانے اور تندرستی بنانے جاتے ہیں۔ میں بھی پہنچا۔ وطن سے دور، سال بھر گزارنے کے بعد دل بوجھل تھا۔

صبح سویرے ایک بھاری بھرکم وجیہہ ڈاکٹر آئے اپنے زیرِ سایہ پہلا ہندوستانی "نوجوان" دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ یوگ کی ورزش کے بڑے رسیا تھے۔ کہنے لگے دیکھو، ۵۶ برس کا ہوں، ۵۵ سے زیادہ کا نظر نہیں آتا۔ پچھلے ہندوستان میں یوگیوں نے تنفس کے عمل کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ پوچھا کہ یوگ کا ابھیاس کیا ہے؟ میں نے حامی بھر دی۔ سیشن آسن (پاؤں اوپر سر نیچے) کر کے دکھایا۔ اور بھی خوش ہو گئے۔ لیکن دوسری شام جب انھوں نے ایک رنگین محفل میں مجھے آتشِ سیال اور تمباکو کے دھوئیں میں قہقہے لگاتے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی، کہنے لگے: یہ دونوں چیزیں تنفس کے عمل کی دشمن ہیں ان دونوں سے دور بھاگنا چاہیے۔ میں نے بھی شرمندگی کا اظہار کیا۔ بزرگ

آدمی تھے۔ جب تندرستی کے اسرار بیان کر چکے تو یہ بھی فرمایا کہ سانس کو طول دے کر گوشت، تمباکو اور شراب سے مکمل پرہیز کر کے اور فلاں فلاں ورزشوں کے ذریعہ انسان اپنی عمر سو برس تک کھینچ سکتا ہے۔

آخر میں نے نیاز مندانہ ضبط کو ایک طرف رکھا اور عرض کیا کہ سانس کے تار کو تو خوشی سے میں سو برس کھینچ لے جاؤں لیکن آپ کو میرے ملک کے حالات کا اندازہ نہیں۔ اب سے ۲۵، ۳۰ برس بعد میں اپنے وطن میں اجنبی ہو جاؤں گا۔ میرے میزبان ایک ایک کر کے اُٹھ چکے ہوں گے۔ یوگیوں نے تہذیب کے سانس سادھنے کا کوئی عمل نہیں بتایا ہے۔

میں بظاہر اُن کو تک رہا تھا لیکن درحقیقت اپنے دل کی اُداسی سے ہم کلام تھا۔ ملک کا بٹوارہ ہوا تو محلے کے محلے ہمارے لئے انجان ہو گئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ یوپی، دہلی، بنگال کے کسی شہر میں دروازے پر پہنچے۔ کھنٹی بجائی اور یہ اطلاع پا کر گھر لوٹ آئے کہ وہ جنھیں ڈھونڈتے ہو پاکستان سدھار گئے۔ دو تین برس بعد جب امامی ہو گئی، پنجاب اور سرحد کے لوگ ادھر ٹھکانے سے بیٹھ گئے تو پھر ویسی ہی محفلیں آباد ہونے لگیں خوش ذوق آنے والوں نے جانے والوں کا درد و فراق دل سے رفتہ رفتہ دھو دیا۔ دلی جاؤ تو دفتروں اور کتب خانوں میں عرشؔ ملسیانی ہیں، مالک رام ہیں، جگن ناتھ آزاد ہیں، ترلوک چند محروم، کمار شادؔ، فکرؔ تونسوی اور محمودؔ جالندھری، ساحرؔ ہوشیارپوری کھیپ کی کھیپ نرولا کے میکدے پٹیالہ ہاؤس کافی ہاؤس کے ہال میں رل جاتی ہے۔ زندہ دل، باخبر اور ہمارے بزرگوں کے ورثے میں برابر کے شریک۔

؎ عرشؔ ملسیانی، ترلوک چند کمار شادؔ، محمودؔ جالندھری اور ساحرؔ ہوشیارپوری کا تعلق اس سرزمین سے نہیں ہے جسے پاکستان کہتے ہیں۔ اس فہرست میں صرف جگن ناتھ آزاد اور فکرؔ تونسوی پاکستانی نژاد ہیں۔ (مرتب)

دِلّی، لکھنؤ، بمبئی، کلکتہ، اورنگ آباد ہر ایک تہذیبی مرکز ان دوستوں کے دم سے شاد اور بارونق بن گیا۔ ہائے کیسے لوگ آئے۔!

مجھے یالٹا (کرائمیا) کی اس سہانی رات نے بہت ستایا۔ اپنے میزبان، ہم نوا، ہم مشرب، ہم درد و ہم درماں بہت یاد آئے۔ ان سب میں جگن ناتھ آزاد کا چھریرا بدن، کشیدہ قامت، وہ اُن کا جانفزا تبسم جس نے اپنے زمانے میں کئی بیاہی بن بیاہی ہیروں کو رانجھا کا درد و فراق بانٹا ہے وہ نتھنوں اور حلق سے ایک ساوتر برآمد ہونے والا ترنم، وہ فارسی کے گاڑھے رس میں ڈوبی ہوئی اُن کی شاعری ــــ وہ ایک تکلف کے ساتھ بے تکلفی وہ پرانے وقتوں کی وضع داری سو برس تک سانس کا تار کھینچتے رہنے سے تو ایسے دوستوں کی رفاقت میں، ان کے سانسوں کی ہلکی آنچ میں پچاس ساٹھ برس جی لینا بڑی نعمت ہے۔ جو دن چار ہے ہیں غنیمت ہیں۔ ہمارے بچوں کو جگن ناتھ آزاد کے بچے اسی وراثت کی قالین پہ کودتے اچھلتے نہیں ملیں گے۔ اور اگر ہم نے زیادہ لمبا سانس کھینچا تو خود شش آسن میں معلق ہو کر رہ جائیں گے۔ مجھے جگن ناتھ آزاد اپنی شاعری کے علاوہ بھی اتنے ہی پیارے ہیں کیونکہ اُن کی گفتار میں، کردار میں بھولپن اور ہوشیاری میں، شیر وانی کی تراش اور لطیفوں کی خراش میں، شہ نشینوں کی مرصع کاری اور ایک قیمتی مگر زوال آمادہ تہذیب کا سوز ساز بھرا ہوا ہے۔ یہ پراگندہ طبع نہیں، بڑے ہی خاطر جمع لوگ ہیں جی چاہتا ہے اُنہیں آنکھوں میں چھپالو کہ اُنہیں زمانے کی نظر نہ لگ جائے۔

ترا دل تو ہے صنم آشنا۔۔۔۔۔۔۔

وہ جسے میں نے ان کا ذاتی ہنر کہا ہے کئی نعمتوں کی دین ہے اردو فارسی کے اعلیٰ ادبی ذخیرے پہ وسیع نظر، پنجاب کی مٹی کی سوندھی مہک، نفیس ادبی

ذوق رکھنے والوں کو صبح و شام صحبت، لاہور کے خوشحال متوسط طبقے کا رہن سہن
انگریزی ادبیات کے اچھے جانکاروں کی تربیت، اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ —
عاشقانہ بیتابی اور شاعرانہ برداشت، درد آشنا دل جسے چہیتی بیوی کی بیماری اور
موت، دوستوں کی جدائی اور وطن کے بٹوارے نے دکھ سکھ کی ہر کیفیت سلامت
اور اذیت کے کئی مرحلوں سے گزارا ہے۔

جسے اتنی ساری نعمتیں میسّر ہوں اُسے اچھا شاعر بننے سے کون روک سکتا
ہے۔ اُنہیں اچھے بُرے شعر کی پہچان بھی ایسی ہے کہ بایدوشاید۔ لیکن جو دولت
اُنہیں گھر بیٹھے ملتی چلی گئی وہی اُن کے شاعرانہ وجود کے حق میں دشمنِ جاں بھی بن
گئی۔ سر عبدالقادر جیسے بااثر لوگوں کی ہمت افزائی، محروم جیسے فرشتہ سیرت بزرگوں
کی سرپرستی، اقبال کی دیوزاد شخصیت اور شاعری کا گھنا سایہ اور جوش کے سیلابی وجود
کی صحبت، آزاد جب اپنے دل کا درد بیان کرتے ہیں، فریاد کو نے میں ڈھالتے ہیں
تب بھی وہ اقبال کی منطقی ترکیبوں سے، جوش کے طمطراق سے اور محروم کے ضعیفانہ
سبھاؤ سے تڑپ کر باہر نہیں نکل پاتے۔ بزرگوں کی مجلس کے آداب اتنے عزیز ہیں
کہ سینہ پھٹا جاتا ہے لیکن گریبان تک ہاتھ نہیں جانے پاتے

کسولی کی پہاڑی پر تپِ دق کی ماری بیوی "شکنتلا" کو لے کر گئے ہیں۔
یوکلپٹس کی ڈالیوں کے سائے میں وہ دنیا سے سدھار جاتی ہے۔ شاعر کی پہلی
محبت پر پہلی جان لیوا چوٹ پڑی ہے۔

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب
ایک مرجھائی ہوئی پتی کا منھ چومو گے جب

- - - - - - - - - - - - - - - -

اسے گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے
آگ کے شعلوں میں جا سوئی ہے کس آرام سے — (شکنتلا)

۱۹۵۰ء تک کی نظموں کے مجموعے "بیکراں" میں اس سلسلے کی کئی نظمیں [illegible]

اور حق یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی چند نظمیں ان کی شاعری کا حاصل شمار ہو سکتی ہیں۔
لیکن کیا مجال، جو شاعر ڈگر سے ہٹ کر اپنی جانِ بیتاب کو کھلے بندوں تڑپنے کی اجازت دے دے

توکہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار
قسمت بسیار پر دردِ نہاں کی چارہ کار
کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو؟
یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بو؟
جنتِ گم گشتہ پوشیدہ نرا زکیف بہار
جستجو میں تھک گئی ہے میری چشم انتظار
اے کہ تجھکو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند
اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھکو پسند
ہوسکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی
خاطرِ اندوہ گیں کو شادماں فرما کبھی

یہ شعر ایک نظم 'شکنتلا' میں سے کہیں کہیں سے لے لئے گئے ہیں پوری کی پوری نظم گہری دردمندی کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن قبل از وقت بزرگی، ضبط، آداب اور احتیاط کی ماری ہوئی یہ پرخلوص شاعری بھی جوش اور محروم کے دور سے آگے کا لب و لہجہ اختیار کرنے سے معذور ہے۔

اقبال نے آزاد کا دامن موتیوں سے بھر دیا لیکن وہ دامن سنبھالے اپنی چال نہیں چل سکے۔ آزاد کی نظر ہی نے اقبال کی کئی نظموں کو دوبارہ دریافت کیا ہے۔ اقبال یورپ کے سفر میں اسپین بھی گئے اور مسجد قرطبہ کو دیکھ کر ان کے دل کی جو حالت ہوئی وہ ایک بے مثل شاہکار میں ڈھل گئی۔ اگر آزاد نے اس نظم کے پہلے نہ اٹھائے ہوتے تو میں اردو ادب کے ایک شاہکار کی عظمت نہ پاسکتا

وہ اصل میں اقبالیات کے حافظ نہیں بلکہ ان کی انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ایک ایک
لفظ، حروف وصورت پر اُن کی نظر ہے اور شاید کوئی دن جاتا ہو جب وہ اپنی
جلوت یا خلوت کا کوئی لمحہ اقبال کی سانسوں کی آنچ میں بسر نہ کرتے ہوں، جب
تک جانِ پرسوز نہ ہو اقبال کو اس طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔

تو کجا بہر تماشا می روی؟

ایک خوشگوار شام کی یاد آتی ہے۔ ۱۹۴۵ء
میں برسات ڈھلے، شملہ پہاڑی (لاہور) کے
گل پوش ڈھلان پر مشاعرہ تھا۔ سر عبدالقادر صدارت کر رہے تھے۔ سید محمد جعفری سے
جو بعد میں بہت چمکے، کسی دوست نے میرا تعارف کرایا۔ اتنے میں جگن ناتھ آزاد
کا نام پکارا گیا تو سید محمد جعفری نے اپنے پہلو سے ایک ہم عمر اور ہم عصر کو ڈائس
کی طرف رخصت کیا۔ صاحبِ صدر سرپرستانہ لہجے میں حاضرین کو بتا رہے تھے
کہ یہ ہمارے عزیز دوست تلوک چند محروم کے ہونہار صاحبزادے ہیں، ایسے ہیں
اور ویسے ہیں، بہت خوب ہیں۔

آزاد نے بڑے اعتماد کے ساتھ نظم سنائی اور خوب سُنے گئے۔

میں نے اس روز صرف اتنا جانا کہ اُن کی شہرت اور مقبولیت محروم جیسے
مشہور اور مقبول شاعر کے شانوں پر سوار ہو کر پورے پنجاب میں گھوم رہی ہے
اور یہ تھوڑی سی مدت میں وہاں جا پہنچے گے جہاں پہنچنے کے لئے اہلِ کمال کو
سینے کے بل رینگنا پڑتا ہے۔ تب تک مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ خوابوں کی وہ
پری جسے کامیابی کہتے ہیں جب کسی نوجوان پر مہربان ہوتی ہے تو اُسے اپنے
اُڑن کھٹولے میں سوتے سے اُٹھا کر لے جاتی ہے پھر برسوں تک اُسے اپنا
سراغ نہیں ملتا۔

آزاد وزیروں کے ڈرائنگ روم، امیروں کے دیوان خانے اور کالجوں کے
مشاعروں میں بلائے جانے لگے اور دیکھتے دیکھتے ایسے مشہور ہو گئے کہ اُن
میں جو ذاتی ہنر کی شوخ کرن تھی وہ مترنم، مشاعرانہ، شاعری کے دھندلکے میں

چھپ گئی۔ خود جگن ناتھ آزاد بھی اپنی نیاز مندی سے آزاد ہو گئے۔ اپنی ہنرمندی کی درگاہ میں سر بسجود ہونا اور اس کے حضور آنکھوں میں رات کاٹنا بہت کٹھن کام ہے۔ ملک کی تقسیم کے فوراً بعد جب آزاد کو پنجاب چھوڑ کر دلی آنا پڑا ان کی نوعمر شہرت پہلے ہی راوی پار کر کے آ چکی تھی۔ دو سال کے اندر اندر "آجکل" کے دفتر میں جوش نے اسے اپنے پروں میں سمیٹ لیا اور اتنی سینک دی کہ وہ دوستوں کے شر اور دشمنوں کے ضرر سے محفوظ ہو گئی۔

۔۔۔۔ تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

غالب نے اپنی ایک فارسی غزل یوں تمام کی ہے۔

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او!
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

ہزار طرح کی محرومیوں کے نرغے میں رہ کر ہمارے شاعر کو یہ راحت میسر تھی کہ اس زمانے کا ایک ایک سخن فہم اور "فنِ گفتگو" کا پرکھیا ان سے واسطہ رکھتا تھا۔ اور غالب اس کی رائے سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ہم کو اپنے زمانے کے مصطفیٰ خاں نصیب ہیں۔ جگن ناتھ آزاد، ساغر نظامی، آلِ احمد سرور، احتشام حسین، سکندر علی وجد غلام ربانی تاباں جیسے دوستوں کے روپ میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت آنکے کا دور جو بھی آنکے، لیکن ان صاحب نظروں سے داد لینا اور انھیں داد دینا ایک نعمت ہے، من کے کھرے، زبان کے میٹھے، صورت شکل سے پیارے نے کی نمانہ راج دلا دے، جس محفل میں بیٹھے وہ محفل سج جائے، جس لفظ پر ٹوک دیں وہ لفظ نظر سے گر جائے۔

آزاد کو تو یاد بھی نہ ہوگا جوش کی مجلس میں ایک بار میں نے کہا "جوش صاحب ایک سوال پوچھتا ہوں ۔۔۔۔" اس سے پہلے کہ جوش کے ماتھے پر شکن آئے آزاد نے میرا ہاتھ دبایا اور میں سمجھ گیا غلطی کہاں ہوئی ہے: سوال کے لفظ میں تو خود پوچھنے کا مفہوم آ گیا، پھر "سوال پوچھنا" کیا مطلب؟ سوال کرنا البتہ ایک

بات ہوئی۔ عربی کے ترجموں کی بدولت سوال کرنا — یعنی کچھ مانگنا فارسی میں سوال کردن مانگنا بھی ہے اور پوچھنا بھی، اردو میں جب دونوں لفظ الگ الگ موجود ہیں تو ہمیں سوال کرنا ہی کہنا چاہیئے — اور مانگنے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کسی چیز کا سوال کرنا، کوئی چیز مانگنا۔ بعد میں جب یہ سوال میں نے چھیڑا تو آزاد نے پے در پے کئی سندیں پیش کر دیں، جی خوش ہو گیا۔

تو بیا بیا عراقی کہ خاصگانِ مائی خاص بمبیا لہجے میں ایک دن میں نے اُن سے بے تکلفی برتی :

"..... لے کے آیا ہوں" ..... دے کے آیا ہوں" یہ بھی کوئی ردیف ہے بھلا! اچھے بھلے شاعر ہیں، امپورٹ ایکسپورٹ کی شاعری کیوں کر رہے ہیں؟ انھوں نے بڑے ضبط سے کام لیا لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اس ریمارک پر آزردہ ہو گئے ہیں۔ اب جو میں اُن کا کلام دیکھتا ہوں تو اس دن کی آزردگی کا سبب سمجھ میں آتا ہے اور پشیمانی ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ہند کے ساتھ ترک وطن کا درد اُن کی قریب قریب بتیس برس کی شاعری کے رگ و ریشہ میں بھرا ہے، اوروں کے ہاں جنھوں نے اس ٹریجڈی کو موضوعِ سخن بنایا، یہ درد دغمزدگی یا احتجاج کے لہجے میں ظاہر ہوا۔ آزاد کے ہاں یہ آنکھوں کی کھٹک بن گیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک انھوں نے چاہے غزل کہی ہو، نظم لکھی ہو، اپنے ہمنواؤں سے خطاب کیا ہو یا نصیحت کی ہو، اُن کی آنکھ سے پانی بہتا رہا ہے، ہوا پُروا چلے یا پچھوا، اُن کے درد کو ٹھیس لگاتی ہوئی چلتی ہے، یا دل قبلے سے اُٹھے یا کاشی سے اُن کی چوٹ ہری ہو جاتی ہے۔ "وطن میں اجنبی" کی ساری نظمیں، غزلیں، رباعیات اس پر گواہ ہیں کہ راوی پار کے ہر موسم اور ہر مجلس کو آزاد کے دل کی رگوں سے ایک ساز ہے اور صحیح معنی میں اس شخص پر یہ واردات گزری ہے کہ :-

نے تابِ وصل دارم، نے طاقتِ جدائی

وہ اس درد کے بیان میں شاعرانہ دیانت داری اور فنکارانہ سوز سے کام لیتے رہے ہیں اور ان کی آواز کی لرزش ان ٹوٹے ہوئے دلوں کی بے نام صدائیں اپنے اندر جذب کر کے گنگا جمنا کی وادیوں سے، آم کے گھنے باغوں سے اور گنگا جمنی تہذیب کے لوچ لچک سے وداع ہو کر مغربی یا مشرقی پاکستان کی انجانی سرزمینوں کو بسا لیا۔ ایک خاص راگ میں بدل گئی ہے۔ ایسا راگ جسے وہی گنگنا سکتے ہیں، جو ٹکڑوں میں بٹ چکے ہیں۔ ایسا راگ جسے ۲۰، ۲۵ برس بعد کی نسل نہ تو گا سکے گی نہ سن سکے گی، پرانی وضع کے گھرانوں میں جس طرح بیٹی کے رخصت ہونے پر بین کئے جاتے ہیں، آزاد جب اس طرح بین کرتے ہیں تو وہ جن کے دل روتے تھے اور زبانوں پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ تھا، جنھیں خبر نہ تھی کہ تاریخِ ہند کا یہ عظیم الشان المیہ رونے کا مقام ہے یا خوشی کا وہ ادھر جانے والے یا رہ جانے والے لوگ جگن ناتھ آزاد کے برہا راگ پر اپنے رومال تر کرتے ہیں اور شاعری مرگِ انبوہ کے جشن میں شریک ہو جاتی ہے۔

آزاد اب ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد اس قسم کی نظمیں نہیں لکھتے، وقت کے پاس یوں تو ہر طرح کے زخم کا مرہم ہے لیکن آزاد کے زخم اب وقت کی چوٹ کھا کھا کر سلنے کا داغ بن چکے ہیں۔

بو بھی اسے چارہ گر نہیں آتی

نرگس کو چشمِ بیمار کہا گیا ہے اور دلنواز آنکھوں کا حسن بیماری میں کچھ اور بھی دلنواز ہو جاتا ہے۔ اسی طور سے جگن ناتھ آزاد کی وہ شاعری ہے جس نے یہ خاص برہا روگ اپنایا ——— سرحدوں کے دونوں طرف اس نے ایک زمانے تک اثر دکھایا۔ البتہ آزاد کئی بار اس شاعری کی بدولت آنکھوں میں کھٹکے بھی ہیں اور مجھے ذاتی علم بھی ہے کہ ان کی پیشہ ورانہ ترقی میں شاعری ایک بار سے زیادہ حائل ہوئی ہے۔ وہ زبان سے نہیں کہتے لیکن خوب جانتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگِ ہند و پاک کے بعد سے

.......ان شکوہ ہائے ہجر کی تاثیر الٹی ہے

اور وہ احتیاط کے آزمودہ نسخے سے کام لیتے ہیں۔ ان کے معاملے میں احتیاط ایک آزمودہ نسخہ بھی ہے اور طبیعت کی افتاد بھی۔ کسی عالم میں بھی انہیں بے قابو ہوتے نہ تو دیکھا ہے، نہ سُنا ہے۔ ضبط اور احتیاط کا یہ عمل عام شہریوں کے اخلاق و اطوار پر صیقل کرتا ہے تو شاعر کے جوہر پر زنگ چڑھا دیتا ہے اور آپ جانیے، سخت سے سخت دھات بھی زنگ کی خوراک بن جاتی ہے

اقبال کے فکر و فن پہ لیکچر

اقبال ہفتے کے سلسلے میں کل یہاں ٹیچرس ٹریننگ کالج سری نگر میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد ہوا جس میں شری جگن ناتھ آزاد نے "اقبال کا فکر و فن" کے عنوان سے کے تحت ایک مقالہ پڑھا جسے سامعین نے خوب سراہا۔ اقبال ہفتے کی اس خصوصی تقریب کی صدارت شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ شیخ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس قسم کا پُر مغز مقالہ لکھنے پر آزاد صاحب کی تعریف کی اور کہا کہ اقبال کو صحیح ڈھنگ سے جاننے کے لئے لازمی ہے کہ اسلام کا مطالعہ کیا جائے اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر غور کیا جائے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ آزاد صاحب نے اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر جتنا خوبصورت مقالہ آج پڑھا ہے اُتنی ہی خوبصورتی سے اقبال نمائش کا اہتمام بھی کیا ہے۔

روزنامہ "آفتاب" سری نگر
یکم نومبر ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر ملک حسن اختر

بڑے باپ کا بڑا بیٹا

کسی بڑے شخص کی شخصیت کا احاطہ کرنا بے حد مشکل کام ہے کیونکہ اس کے کئی پہلو اور ہر پہلو کی ہزار جہتیں ہوتی ہیں۔ بڑے آدمی کے پاؤں چھو لے جا سکتے ہیں، اس کے قدموں میں بیٹھا جا سکتا ہے مگر اس سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس کی باتیں سننے کو جی چاہتا ہے اپنی بات کہتے ہوئے گلا رندھ جاتا ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی والی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی موجودگی میں میری بھی یہی حالت ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان سنے سنتے رہیں مگر جمیل الدین عالی صاحب بار بار کہتے ہیں کہ کچھ تو کہیئے کہ آپ گونگے نہیں ہیں۔ میں نے بہتیرا کہا کہ میں جگن ناتھ آزاد کے سامنے عجمی ہوں اور بہتر ہوگا کہ ہم انہیں دیکھتے رہیں، سنتے رہیں اور سر دھنتے رہیں مگر پبلشر کی ہٹ اپنا کام کر گئی اور اس عجمی کو بھی زبان مل گئی۔ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے اور ہر پہلو اپنے اندر حسن و جمال کی اتنی کشش رکھتا ہے کہ نظریں اسی پر تا دیر جمی رہتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر پاکستان، اقبال اور اردو کی محبت سے ہوئی ہے۔ یہ وہ تکون ہے جس کے [illegible] جگن ناتھ آزاد ہے اور وہ ان تینوں سے اپنی شکتی حاصل کرتا ہے۔ [illegible] [illegible] آزاد، اردو، پاکستان اور اقبال تینوں ایک دوسرے کا روپ ہیں [illegible]

کی تحریروں میں ان تینوں کا رس ملتا ہے جو ہمیں فرحت تازگی اور توانائی بخشتا ہے
اردو سے ہم سب محبت کرتے ہیں اور اس میں کمال کا کوئی پہلو نہیں پاتے
اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں یہ کام آسان ہے۔ ہندوستان میں اور خصوصاً قیام
پاکستان کے فوراً بعد اردو کا نام لینا اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا لیکن عشق تو مشکلوں اور
صعوبتوں کی راہ پر چلنا سکھاتا ہے اور آزاد عشق اردو سے سرشار تھا۔ لہٰذا اس نے
اردو کا نعرہ لگایا اور بہت سے لوگوں کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کر لیا بلکہ قافلۂ اردو میں
شامل کر لیا۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں اردو پر ایک نظم لکھی جس کے آخری چار شعر
ملاحظہ ہوں ؎

ریاضِ ہند میں اردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے
جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے
مرے اہلِ وطن! یہ آدمیت کا تقاضا ہے
محبت کا، حمیت کا، شرافت کا تقاضا ہے
کہ ہم پامال جورِ آسماں ہونے نہ دیں اس کو
خزاں کے دور میں وقفِ خزاں بننے نہ دیں اس کو
وطن بھی ایک ہے اپنا زباں بھی ایک ہے اپنی
چمن بھی ایک ہے طرزِ بیاں بھی ایک ہے اپنی

جگن ناتھ آزاد اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں
انھوں نے شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں عقاب کا نشیمن عقاب
ہی کے تصرف میں ہے۔ وہ عیسیٰ خیل کے رہنے والے تھے مگر والد کی ملازمت
کی وجہ سے زیادہ عرصہ راولپنڈی میں گزارا۔ لاہور میں بھی تعلیم حاصل کی اور
تقسیم ملک نے انھیں ہندوستان کے حصے میں دے دیا۔ جو لوگ پاکستان سے
ہندوستان گئے ان میں سے بیشتر غم و غصے کا شکار ہو گئے مگر آزاد کی محبت
نے ان کو بچا لیا۔ وہ اب بھی پاکستان کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔ اس کی فضاؤں

اور خوشبوؤں سے الفت کا دم بھرتے ہیں اور اس کا دکھ سکھ اُن کے جسم و روح کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں پاکستان پھلے پھولے، ترقی کرے، آگے بڑھے۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں سنّتے پہ پاکستان کے عنوان سے ایک نظم کہی جسے پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک سچے پاکستانی کا کلام ہے۔ نظم کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے وطن، ارضِ وطن، اے ارضِ پاکستاں سلام
بھیجتا ہے آج تجھ پر تیرا اک مہماں سلام

اور خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے۔

اے وطن، جو کچھ کہا ہے میں نے ان اشعار میں
بیش قیمت ہیں یہ باتیں زیست کے بازار میں
یہ فقط رنگینیٔ گفتار کی باتیں نہیں
یہ حقیقت ہے فقط اشعار کی باتیں نہیں
ختم ہے اب رات کی ظلمت سحر ہونے کو ہے
رات کا ہنگامہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
جلوہ آرا ہے اُفق پر صبح کی تنویر دیکھ
آنے والے دور کی روشن ترین تصویر دیکھ

یہ ناممکن ہے کہ پاکستان کا ذکر آئے اور اقبال کی تصویر آنکھوں سے اوجھل رہے۔ اس نظم میں جا بجا اقبال کے اثرات نظر آتے ہیں اور آخری شعر تو ایک دم ہمیں اقبال کی آغوش میں لیجاتا ہے۔ پاکستان اور اردو سے محبت لازمًا اقبال کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری اور نثر دونوں کا بہت بڑا موضوع اقبال ہیں۔ اُنھوں نے شاعری میں اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور نثر میں اُن کے افکار کی اشاعت کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اقبال کو مسلسل نظرانداز کیا گیا اور اگر کچھ لکھا بھی گیا تو وہ مخالفانہ انداز لئے ہوئے تھا۔ آزاد نے اقبال کی شاعری کے پس منظر اور پیش منظر کو درست تناظر

میں پیش کیا اور آہستہ آہستہ لوگ اقبال کی طرف آنے لگے۔ پہلے جھجکتے اور ڈرتے ہوئے اور پھر دوڑتے ہوئے آئے لہٰذا وہ دن گئے کہ آزاد انجمن میں تنہا تھے۔ اب وہاں اُن کے اور بھی بہت سے رازداں پیدا ہو گئے تھے۔ انھوں نے علامہ اقبال کو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ امریکہ، کنیڈا اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی روشناس کرانے اور تفہیمِ اقبال کو عام کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اس کا ایک بڑا سا اندازہ (IQBAL MIND AND ART) کے مطالعے سے ہو گا جس کی رونمائی کی تقریب میں ہم سب یہاں جمع ہیں۔ اس کتاب سے پہلے بھی اُن کی چار کتابیں اقبال اور اُس کا عہد اور اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال کی کہانی، اقبال اور کشمیر شائع ہو چکی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں آزاد اور اقبال کے تعلق کو بیان نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے لئے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے جو زندگی نے فرصت دی تو مستقبل قریب میں لکھوں گا۔ یہ مضمون تو زرہِ امتثال امر لکھا گیا اور جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ ہم تو آزاد کی دل موہ لینے والی باتیں سننے کے مشتاق ہیں اور اپنی لکنت زدہ تحریر کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

اقبال اور مغربی مفکرین

پروفیسر آزاد گلاٹی۔

یہ کتاب جہاں آپ کے بے پناہ مطالعے اور ذہانت پر دال ہے وہاں اس بات کی بھی مکمل طور پر نفی کرتی ہے کہ اقبال صرف اسلامی فلسفے کا شاعر ہے۔ اقبال یقیناً ایسے شاعر تھے جنھوں نے اپنے ذہن کے دریچے وا کئے اور میرا خیال ہے کہ اس دور میں بھی جبکہ محض Pan-Islamism نظر آتے ہیں انھوں نے اپنے زاویہ نظر کو تنگ نہیں ہونے دیا۔

آپ کی یہ کتاب اقبالیات میں یقیناً ایک قابلِ قدر اضافہ ہے کیونکہ آپ نے اقبال سے متعلق ایک ایسی [illegible] کو چھوا ہے جو ابھی تک virgin [illegible] تھی۔ میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

راج کمار چندن

جگن ناتھ آزاد

(جناب راج کمار چندن ایم اے نے ۱۹۸۶ء میں اپنے موقر جریدے ماہنامہ "العطش" (جموں) کا جگن ناتھ آزاد نمبر شائع کیا تھا۔ اس خاص نمبر کے حرف اوّل میں مدیر محترم نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی زندگی اور شخصیت کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی تھی جن سے ہم لوگ ابھی تک بے خبر تھے ہم اس مضمون کے چند اقتباسات مدیر "العطش" کی اجازت سے زیرِ نظر جگن ناتھ آزاد نمبر میں شامل کر رہے ہیں)

(مدیر)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے متعلق اس پیش کش میں تاخیر تو کچھ زیادہ ہی ہو گئی جس کا ہمیں پورا احساس ہے۔ کوشش صرف یہ رہی کہ جہاں تک ممکن ہو آزاد صاحب کے کام کی مختلف جہتوں پر رائے زنی ہو سکے۔

اس خصوصی اشاعت کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ آزاد صاحب کے بارے میں کچھ معلومات یکجا کی جائیں اور دوسرا یہ کہ جموں سے انھیں جو تعلق خاطر رہا ہے اس پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

بطور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی مقبولیت کا اندازہ تو اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت پہلا ترانہ پاکستان جو ریڈیو پر سنایا گیا۔ وہ انہیں کا لکھا ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک وہ مشاعروں کے مقبول شاعر ہیں۔ لاہور میں ان کی مقبولیت کا وہ زمانہ ہماری نسل کے جنم سے بھی پہلے کا زمانہ ہے۔

عیسیٰ خیل (پاکستان) میں ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم
کے گھر میں جس بیٹے کا جنم ہوا وہ جگن ناتھ آزاد کے نام سے مشہور ہوا۔ ایم۔ اے فارسی کرنے
سے بھی بہت پہلے وہ حافظ اقبال ہو گئے اور اتنے شعر ازبر تھے کہ ان کے اپنے استاد
بھی اس پر اعتراض کرتے تھے ۱۹۴۱ء میں وہ مقام ایڈیٹر ماہنامہ "ادبی دنیا" لاہور۔ ۱۹۴۵ء
اسسٹنٹ ایڈیٹر "جے ہند" لاہور ۱۹۴۷ء
اسسٹنٹ ایڈیٹر "ملاپ" نئی دہلی ۱۹۴۸ء ایڈیٹر ایمپلائمنٹ نیوز نئی دہلی سے ۱۹۴۸ء تا
۱۹۵۵ء وزارت اطلاعات و نشریات میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۶ء [illegible] تا
۱۹۶۸ء انفارمیشن آفیسر اردو ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر ۱۹۷۳ء تا
۱۹۷۷ء ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز پریس انفارمیشن بیورو کے عہدوں پر فائز رہے ۱۹۷۷ء میں
پروفیسر و صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی مقرر ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۸۳ء میں ریٹائر ہوئے
۱۹۸۴ء میں جموں یونیورسٹی کی طرف سے ایمریٹس فیلوشپ کے اعزاز سے نوازے گئے۔ دوسرے
اعزازات انعامات و تصنیفات کی تفصیل اگلے صفحات پر درج ہے۔

ابھی تھوڑا عرصہ پہلے جموں کے ایک مشاعرے میں محمود سعیدی نے آزاد صاحب کے بارے
میں کہا "جموں و کشمیر کا نام عالمی سطح پر روشن کرنے میں دو آدمیوں نے بڑا کام کیا ہے
سیاسی سطح پر شیخ محمد عبداللہ نے اور ادبی سطح پر جگن ناتھ آزاد نے۔ مشاعروں میں تعارف
کرانے میں جس طرح تعریفی جملے استعمال ہوتے ہیں یہ جملہ ان میں سے نہیں بلکہ اس میں صداقت
ہے۔ جموں یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے انہوں نے جموں یونیورسٹی کا نام دنیا
دنیا کے بیشتر ممالک میں جن میں روس، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، مصر، برما، نیپال، متحدہ
عرب امارات اور مغربی یورپ کے کئی ممالک شامل ہیں روشن کیا ہے۔ وائس آف
امریکہ اور بی بی سی لندن سے جموں یونیورسٹی کے کاموں پر روشنی ڈالی ہے۔ پاکستان
کا ذکر اس لئے نہیں کیا کیونکہ پاکستان تو وہ یوں جاتے ہیں جیسے دوسرے لوگ دلی یا بمبئی

میں نے آزاد صاحب کو پہلی بار ۱۹۵۸ء کے قریب جموں ریڈیو سٹیشن کے
احاطے میں مشاعرے کے دوران دیکھا۔ فراق بھی مشاعرے میں تھے جب مقامی شعراء

کلام سنا چکے تو آزاد صاحب خود ہی کھڑے ہو گئے کہ میں بھی مقامی شاعر ہوں لہٰذا میں اپنا کلام پیش کرتا ہوں۔ دوسروں کے اصرار کے باوجود انہوں نے کلام سنایا۔ میں اس وقت یہ سمجھا کہ آزاد صاحب جموں کے ہیں اور کرشن چندر، کیدار ناتھ ساغر، نظم پکچر، اوم پرکاش اور دوسرے کئی لوگوں کی طرح جموں سے باہر رہتے ہیں۔ اس کے بعد بھی انہیں مشاعروں ہی میں دیکھا۔ ایک بار بزم فروغ اردو کی میٹنگ میں بھی ہمارے درمیان آئے اور مجھے وہ اپنے سے بڑے مگر اپنے پن سے خالی نظر نہ آئے۔ لیکن اس بات کا علم مجھے بعد میں جا کر ہوا کہ وہ جموں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ جب جموں یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تو مقامی اخباروں میں اُن کا نام زیادہ آنے لگا۔ جتنے اہلِ علم و فن آزاد صاحب کی صدارت شعبۂ اردو کے وقت جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آئے۔ یہ اپنے آپ ہی ریکارڈ ہوگا۔ انھوں نے طلبہ کو شاید پہلی بار متعدد تخلیقی فنکاروں سے شعبۂ اردو میں ملوایا۔ اور اُن کے فن کے متعلق جانکاری دی جو بھی اچھا شاعر ادیب جموں آتا وہ ڈیپارٹمنٹ میں بلا کر اس کی عزت افزائی کرتے اور طلبہ کو اس سے فیضیاب کراتے۔ ان چار برسوں میں قرۃ العین حیدر، رشید حسین خاں، علی سردار جعفری، ڈاکٹر وحید اختر، شہریار، محمود سعیدی، نفیس جعفری، اکمار یاشی، زاہدہ زیدی، پریگا ریانا تاشا (روس) پروفیسر فن تھیس (شعبہ اردو یونیورسٹی آف کوپن ہیگن ڈنمارک) ڈاکٹر ینا گوری شینا (ماسکو یونیورسٹی) ڈاکٹر بالن لینن گراڈ یونیورسٹی (لینن گراڈ) ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر عبدالحق رام لعل، جوگیندر پال، ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر حکم چند نیر، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن، ستیش بترا اور ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات شعبۂ اردو میں آئے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کو VISITING PROFESSOR کے طور پر بھی بلایا گیا اور وہ آ بھی رہے تھے مگر موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُن کو اردو دنیا سے چھین لیا اور ہم ان کی رہنمائی سے محروم رہ گئے۔ سردار جعفری اور رشید حسن خاں صاحب سے تو آزاد صاحب نے ۲ اور ایک ۱۰ کا وقت لیا جس سے تحقیق کے

طلبہ کو رہبری ملی۔ جو کام تین سالوں میں مکمل نہ ہوئے تھے وہ چھ ماہ میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ مجھے خود ان دونوں حضرات سے جب اپنی تحقیق کے سلسلے میں رہنمائی ملی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک بہت بڑا تجربہ ہے۔ شعبہ میں ایک ماہ کے لئے ہی سہی محقق کی خدمات حاصل کی جاتیں اور سارے رُکے ہوئے کاموں کو ایک رفتار دی جائے۔ نہ ہم لوگ دہلی یا بمبئی جا کر ان لوگوں سے فیضیاب نہ ہو پاتے ہیں۔ میں نے ایک بار کہا کسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو بلائیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ فاروقی صاحب کو VISITING PROFESSOR کے طور پر دعوت نامہ بھیجا گیا تھا مگر انہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے اجازت نہ ملی۔

اتنی مقبولیت حاصل ہونے، اتنے اعزازات و انعامات حاصل کرنے، نامور ادبی شخصیتوں کی داد و تحسین حاصل ہونے کے باوجود ان میں تکبّر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنے طالب علموں سے بھی مخاطب ہوتے وقت وہ کوشش کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد میں بڑی دیوار حائل نہ رہے۔ متحدہ عرب امارات سے واپس آئے تو میں اُن سے ملنے گیا۔ ایک خاتون بھی تھوڑی دیر بعد شریک گفتگو ہو گئیں۔ میں نے شاید پوچھا متحدہ عرب امارات میں عورتیں کیسے رہتی ہیں۔ اُن کی شکل و صورت کیسی ہے وغیرہ۔ ان کے جواب سے میں حیران ہوا کہ "وہاں تو میں نے عورتیں دیکھی ہی نہیں۔ وہ ایرکنڈیشنڈ کوٹھیوں سے نکلتی ہیں اور ایرکنڈیشنڈ کاروں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ عموماً کاروں کے شیشے بھی رنگین ہوتے ہیں۔ اتنے میں وہ خاتون بولیں وہاں ویسے بھی عورتوں کو دیکھنے پر سزا ہوتی ہوگی۔" آزاد صاحب بولے: "سزا تو ہم بھگت لیتے ہیں کوئی عورت نظر تو آتی" گفتگو کو رنگین بنا کر ماحول کو گھٹا گھٹا رکھنے کی بجائے ہلکی پھلکی گفتگوؤں سے معطّر کرنا آزاد صاحب کی عادت میں شامل ہے۔ ایسے کتنے ہی واقعات یاد آتے ہیں۔

جموں ہوٹل میں (جموں کا ایک مشہور ہوٹل جو اس پہاڑی پر بسے ہوئے شہر کی چوٹی پر گھنے جنگلوں میں گھرا ہوا ہے اور قدرتی مناظر شہر کے تینوں طرف

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی نہر تھی (تو تی اب بھی ہے۔ یہ دہلی نظامت اور تمام تر سبزیوں سے مزین ہے) کچھ منتخب شہریوں کی طرف سے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ میں اس مشاعرے میں جاتے ہوئے راستے میں مہاراجہ کے محلوں کے حسن میں کھویا رہا اور اتنی تاخیر کر بیٹھا کہ وہاں میں پہنچنے تک آزاد صاحب بھی اپنا کلام سنا کر بیٹھنے ہی والے تھے۔ ظاہر ہے مشاعرہ ختم تھا۔ مگر میرا نام پکارا گیا میں نے یہ کہہ کر معذرت ظاہر کی کہ "اب تو آزاد صاحب بھی اپنا کلام سنا چکے ہیں" آزاد صاحب فوراً مائک پر آئے اور بولے "ایسا ہی واقعہ فراق صاحب کو بھی پیش آیا تھا۔ انھوں نے اس عزیز شاعر سے کہا کہ اگر تم میرے بعد پیدا ہو سکتے ہو تو میرے بعد کلام کیوں نہیں سنا سکتے" ساری محفل ہنسی کے فواروں میں ڈوب گئی۔ اور میں نے ایک دو غزلیں سنائیں۔

طالب علموں اور عزیزوں کی حوصلہ افزائی میں وہ پیچھے نہیں رہتے۔ اقبال اور مغربی مفکرین" پڑھنے کے کچھ دن بعد میں آزاد صاحب کے یہاں گیا۔ کتاب کے متعلق بات چیت کے دوران میں نے کہا۔ "اقبال کا فارسی کلام اس کتاب میں زیادہ زیر بحث آیا ہے جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ اس سے کیسے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کتاب میں سب سے بے مثال حصہ وہ ہے جس میں "آدم و خدا" نظم ہے جس کا ترجمہ آپ نے ساتھ ساتھ دیا ہے۔ میرے سامنے ہی انھوں نے یہ بات نہیں نوٹ کی کہ آئندہ ایڈیشن میں اس بات کا خاص لحاظ رکھا جائے گا کہ مشکل فارسی اشعار کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ اسی طرح ایک دفعہ میں نے کہا۔ "بطور شاعر جگن ناتھ آزاد کا نام کم ہو رہا ہے اور بطور ماہر اقبالیات زیادہ" آپ شعری مجموعے مرتب کریں۔ فوراً کہا یہ بات مجھے دو روز پہلے دہلی میں شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھی کہی ہے۔ میں اب پہلی فرصت میں شعری مجموعے مرتب کروں گا۔" پچھلے دنوں مجھے ایک خط میں لکھا۔ "۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۹ء تک کے کلام پر مشتمل شعری تخلیقات "جستجو" کی صورت میں پریم گوپال متل شائع کر رہے

ہیں اور "بوئے رمیدہ" کے نام سے ایک شعری مجموعہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک کے کلام پر مشتمل پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد ناظم دیوان اردو کراچی شائع کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنے آپ میں ایک تاریخ ہیں۔ ان کی یادداشت حیران کن ہے۔ چالیس پچاس برس پرانی باتیں بھی اُن کے نزدیک کل کی باتیں ہیں اس شمارے کے لئے جب کچھ خطوط نکالے تو گویا ہزاروں خطوط میں سے بغیر تلاش کئے جو خطوط ہاتھ آئے اُنہیں پر اکتفا کیا کیونکہ من مرضی کے خطوط فائیلوں کے انبار میں سے منتخب کرنا ممکن نہ تھا۔ پطرس کا خط پڑھ کر میں اُلجھ گیا کہ خط کے اوپر تو نیویارک لکھا ہے نیچے کسی مشاعرے کا ذکر ہے۔ میں نے کہا خط مبہم سا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا اس کے نیچے فٹ نوٹ لکھوا دیں جس سے پتہ چلے مشاعرہ کہاں ہوا خط کہاں سے لکھا گیا۔ بولے بھئی یہ تو خوب کہی اس سے تو اُلجھن ہی پیدا ہوتی اور وہ سارا واقعہ سنایا۔ میں نے کہا اسے لکھ دیں یا مجھے لکھوا دیں تو بہتر ہو۔ اسی فرمائش کا ثمر "پطرس کی یاد میں" سامنے آیا جو اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

میں اپنی طرف سے ان حضرات کا نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میرے ناتواں کندھوں کو سہارا دیا۔ میری دستگیری کی اور اس شمارے کو تکمیل تک پہنچایا۔ اُن کے نام اگر لکھوں تو اس سے بھی حق ادا نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ انھوں نے تو میرے ساتھ ساتھ محنت کی ہے۔

کتنی ہی باتیں کتنے ہی گوشے آزاد کے کام کے متعلق ایسے رہ گئے جن پر کچھ لکھا نہیں جا سکا۔ ایک ہمہ گیر شخصیت کے سارے کارنامے چند صفحات پر لانا مشکل کام ہے۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انتظار حسین (لاہور)

پاکستان کا سفر روحانی سفر

اقبال کانگریس سے پہلے بھی ہندوستان سے مختلف ادیب پاکستان آتے
ہمعصروں اور مداحوں سے گھلے ملے داد لی اور رخصت ہو گئے۔ اقبال کانگریس کی
تقریب میں بھی مختلف ادیب آئے ہوئے ہیں۔ ہمعصروں اور مداحوں سے مل رہے
ہیں۔ کلام سنا رہے ہیں اور داد لے رہے ہیں مگر ایک شاعر ہے جو کہتا ہے کہ
میرے لئے یہ سفر روحانی سفر ہے۔

یہ جگن ناتھ آزاد ہیں۔ میانوالی کی مٹی تلوک چند محروم کے فرزند جگن ناتھ آزاد
خود مشہور ہیں اور اب تو وہ علامہ اقبالؒ کے حوالے سے محقق اور نقاد کی حیثیت
سے بھی جانے جاتے ہیں۔ مگر مشہور باپ کا بیٹا خود کتنا ہی مشہور ہو جائے اس
کے تعارف میں باپ کا نام آتا ہی ہے بعض بیٹے اس پر کڑھتے دیکھے گئے ہیں
مگر جگن ناتھ آزاد اس پر مطلق نہیں کڑھتے اور کیوں کڑھتے۔ وہ خود کم مشہور نہیں
اور پھر بیٹے کے واسطے سے باپ کا بھی ذکر خیر ہو جائے تو اچھی ہی بات ہے

پنڈت تلوک چند محروم اسی شہر لاہور میں رہتے تھے اور ہم عصر شاعر
ہونے کے ناطے علامہ اقبال سے ربط و ضبط رکھتے تھے ادھر بیٹے نے علامہ کی نظمیں
پڑھ کر ان کا ایک تصور دل و دماغ میں لے لیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ باپ کا بھی
[illegible] تھا اور استاد کا بھی مگر جگن ناتھ آزاد نے علامہ اقبال کو بھی

نہیں دیکھا۔ بتانے لگے کہ علامہ تاجور نجیب آبادی مجھ سے بار بار کہتے کہ تمہیں علامہ کا اتنا کلام یاد ہے جتنا اور کسی کو یاد نہیں ہوگا چلو میں تمہیں اُن کے پاس لے چلوں مگر میری اُن کے حضور جانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی میں تو عام انسانی سطح پر اُن کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے دل و دماغ میں تو وہ انسان سے بڑھ کر ایک پیکر کے طور پر بسے ہوئے تھے۔

جگن ناتھ آزاد یہ باتیں ایم اے او کالج کی اس تقریب میں کر رہے تھے جو وہاں کی مجلس اقبال کے زیر اہتمام ان کے اعزاز میں احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔

جگن ناتھ آزاد اب سے بہت پہلے ۱۹۴۷ء تک بھگ اس شہر میں اپنی دھوم مچا چکے ہیں۔ تقسیم سے پہلے بھی انہوں نے ضرور اس شہر میں شہرت پائی ہوگی۔ مگر شاید اپنا لوہا پہلی مرتبہ اسی زمانے کے مشاعروں میں منوایا۔ نقل وطن کے دکھ نے ان کی شاعری میں روح پھونکی۔ بس وہ اپنے شعر سناتے تھے۔ اور مشاعرے پر چھا جاتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد تب کے گئے ہوئے اب اس شہر میں آئے۔ اس عرصے میں انہوں نے علامہ اقبال کے بارے میں تنقید لکھی اور بہت تحقیقی کام کیا۔ تو اس مرتبہ وہ شاعر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اقبال کے نقاد اور محقق کی حیثیت سے یہیں شہر میں وارد ہوئے۔

اس محفل میں انہوں نے باتیں کیں۔ اپنے کام کے بارے میں اور اس کام کے بارے میں جو علامہ اقبال پر ہندوستان میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ بتاتے تھے کہ ہندوستان کی کم و بیش پچپن یونیورسٹیوں میں اردو کا مضمون پڑھایا جاتا ہے اس میں سے بیالیس تینتالیس یونیورسٹیوں میں اقبال کا خصوصی مطالعہ مضمون میں شامل ہے۔ پس ہمیں یہ پتہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان میں اقبال پر کیا کام ہو چکا ہے اس سے ہمیں مدد ملے گی اور آپ کو بھی پتہ چلنا چاہیئے کہ ہندوستان

ں کیا کام ہو رہا ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں کا تبادلہ پھر سے شروع ہو جائے۔

اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں جگن ناتھ آزاد نے ایک بھلی بات یہ کہی کہ ہمیں اپنے چوکھٹے میں اقبال کو فٹ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان کی پوری فکر کا مطالعہ کر کے اس کے مطابق چوکھٹا بنانا چاہیئے مثلاً سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کو لے کر ان کی حب الوطنی پر مقالے باندھے جائیں تو یہ بھی صحیح بات نہیں اور انہیں مغربی علوم کا دشمن ثابت کیا جائے تو یہ بھی درست بات نہیں یہ ہمیں مان لینا چاہیئے کہ ان کی فکر کا اصل سرچشمہ اسلام تھا مگر وہ مغربی علوم کے بھی بہت قائل تھے۔ ہاں مغربی تہذیب نے جو شکل اختیار کی ہے اس پر نکتہ چیں تھے۔

کچھ باتیں کچھ یادیں کچھ شعر۔ مل جل کر جگن ناتھ آزاد اچھے آدمی لگے۔

جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں مشاعرہ

کوئٹہ (اسٹاف رپورٹر) پیر کی شام دبستان بولان کے سربراہ رشید انجم کی رہائش گاہ پر محفل شعر منعقد ہوئی جس میں بھارت کے ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد سمیت پاکستان کے مختلف صوبوں سے آنے والے شعراء کے علاوہ مقامی شعراء کی اکثریت نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت بلوچستان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کی۔ جب کہ مہمانِ خصوصی جگن ناتھ آزاد تھے۔

جنگ کوئٹہ

۲۸ اپریل ۱۹۷۷ء

غلام رسول زنیز و (آئی۔ اے۔ ایس)
سری نگر

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد ــــ ایک مطالعہ ۔ آزاد پر لکھے ہوئے تین درجن کے قریب مضامین کا مجموعہ ہے، جو آپ کے مداحوں، رفیقوں اور نقادوں نے لکھے ہیں۔ جناب محمد یوسف واقف اس خوب صورت گلدستہ مضامین کے مولف ہیں۔ جملہ معترضہ کے طور پر کہہ دوں کہ واقف صاحب نے آزاد کو "ستر بہتر" کے زمرے میں شامل کر دیا ہے۔ وہ یوں کہ میرے گذشتہ شب و روز کو غلط کوٹ کر کے آزاد کا سنہ پیدائش ۱۹۱۰ء لکھا ہے حالانکہ آزاد نے اپنا سنہ پیدائش ۱۹۱۸ء کہا ہے وہ اسی سال عیسیٰ خیل کے چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے آزاد کی عمر ۶۳ برس کی ہونے لگی ہے۔ گو چشم بد دور، وہ ۵۰ ــ ۵۵ برس کے نظر آتے ہیں۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

آزاد ــــ ایک دوست ایک انسان ۔ آزاد کافی دیر سری نگر میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے متعین رہے ہم بھی کچھ دیر ریاست کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ منسلک رہے اور اس لحاظ سے ہمیں انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

نظریہ کے لحاظ سے آزاد اس بات کے قائل ہیں کہ ملک تقسیم ہو سکتے ہیں پر آدمیت تقسیم نہیں ہو سکتی۔ پتھر اور اینٹ کی دیواریں انسانوں کو بانٹ سکتی ہیں لیکن انسانی تہذیب اور انسانیت کے رشتوں کو بانٹ نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ہند میں ۳۳ برس سے رہ رہے

ہیں۔ یہاں گھر بنایا گھر بسایا لیکن جب وہ راولپنڈی کے عیسیٰ خیل گاؤں سے لے کر لاہور کی نگینہ بیکری اور عرب ہوٹل تک کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کی روح تڑپ اُٹھتی ہے وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جیسے وہ وہیں ہیں اور وہاں کے شاعروں اور ادیبوں کی صحبت میں بیٹھے ہوں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید بھٹی، اختر شیرانی، حمید نسیم، ہری چند اختر کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں مولانا صلاح الدین، عبدالمجید سالک اور صوفی تبسم کے دربار میں شامل ہوں یا علامہ تاجور نجیب آبادی کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے ہوئے ہوں۔ آزاد اب بھی اپنے آپ کو وطن میں اجنبی خیال کرتے ہیں حالانکہ ہند کو اپنا وطن جانا کر وہ دن رات اس کی محبت میں سرشار اس کے گیت گاتے رہتے ہیں

ایک رفیق اور دوست کے طور پر ہم نے آزاد کو ایک منفرد شخصیت پایا۔ پُرخلوص، خوش مذاق، خوش سلیقہ، مہذب اور دوستوں کی صحبت کو پسند کرنے والے زندہ دل ایسے کہ جس محفل میں ہوں، لطیفہ گوئی سے محفل کو زعفران زار بنا دیں۔ شریف اور منکسرالمزاج جو اپنے علم و فن کی برتری کا احساس کبھی دوستوں کو نہ ہونے دیں بلکہ اس طرح سے معصوم نظر آئیں جیسے وہ اُن سے کم تر ہی ہوں۔

بہرحال آزاد کی ذات وصفات و کمالات کے لئے الگ مضمون درکار ہوگا۔ یہاں اس مضمون کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ آزاد اس وقت نہ صرف ہندوپاک کے ہی بلند پایہ ادیب، شاعر، ماہر اقبالیات و محقق ہیں بلکہ آپ کا شہرہ ان ممالک کی حدود کو بھی پار کر گیا ہے یہاں ہمارا مقصد اس گلدستہ مضامین کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا ہے جو واقف صاحب نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

ایک مطالعہ۔ آزاد کے بارے میں اس مجموعہ یا گلدستہ مضامین میں جو مضمون و مقالات لکھے گئے ہیں، اُن میں آزاد کی شاعری، ان کے ادیب اور ماہر اقبالیات ہونے پر خوب بحث کی گئی ہے لیکن ہمیں تشنگی محسوس ہوئی کہ آزاد کے بارے میں ایک محقق کی حیثیت سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ آزاد تحقیق کے میدان میں جس انہماک اور لگن کے ساتھ کام کرتے

ہیں۔ اس کا ہمیں ذاتی طور پر علم ہے۔ وہ تحقیق کی دنیا میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ باقی دنیا سے بے نیاز معلوم دیتے ہیں۔

آزاد جب محکمہ اطلاعات میں ملازم تھے تو آپ کو بہت دکھ تھا کہ وہ ادیب و شاعر کہاں اس افسری کے جھمیلے میں پھنس گئے۔ آزاد بھر کر تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ وہ ملازمت کی قید سے رہا ہو جائیں اور اُن کو ایسا ماحول نصیب ہو جس میں وہ علم و ادب۔ تحقیق و تجسس کا کام کر سکیں۔ یونیورسٹی میں آکر آزاد کو یہ ماحول میسّر ہو گیا اور اب وہ اپنے کام میں مگن ہیں۔ آزاد کے کام کرنے کا ڈھنگ سری نگر میں یہ تھا کہ شام کو جب وہ سرکاری کام اور گھر گرہستی کے جھمیلوں سے فراغت پاتے گھر کے تمام افراد سو جاتے۔ ہر طرف سکون و خاموشی کا عالم ہوتا تو وہ تحقیق و مطالعہ کا کام میں مگن ہو جاتے۔ یہ سلسلہ صبح کے دو تین بجے تک جاری رہتا۔ صبح جب آپ دفتر آجاتے تو ایسے لگتا تھا کہ جیسے کوئی مجرم عدالت میں حاضری کے لئے آیا ہو۔ بہر حال ملازمت کے دوران میں بھی وہ اپنا کام قابلیت اور انہماک سے کرتے رہے۔ لیکن اُن کی روح تحقیق کے میدان میں ہی خوش رہتی تھی۔ جس کو وہ لگن کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھے امید ہے اس انہماک کا اب بھی وہی عالم ہوگا۔

آزاد کی تحقیق و تجسس کا کام صرف کتابوں تک ہی محدود نہیں اس لگن میں وہ جہاں گردی بھی کرتے ہیں اور کوچہ گردی بھی۔ مسجد قرطبہ، جس کے بارے میں اقبال نے نظم کہی تھی دیکھنے آپ ہندوستان سے اسپین چلے گئے۔ اسپین میں جس طرح انھوں نے مسجد قرطبہ کو پا لیا اس کی تفصیل ہم خود آزاد کی زبانی سن چکے ہیں۔ اس تلاش کی روداد اس قدر دلچسپ تھی کہ جیسے آزاد مسجد قرطبہ تلاش کرنے نہ گئے ہوں کسی کھوئے ہوئے محبوب کی تلاش میں نکلے ہوں۔ جس کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ اسپین میں کہیں آباد ہے۔ یہ لگن اور یہ انہماک آزاد کا حصّہ ہے۔ جس کی شاید ہمسری نہیں ہو سکتی۔

کشمیر پر کام

کشمیر میں رہ کر آزادؔ نے اقبالؒ اور کشمیر پر جو تحقیق کی وہ بے مثال ہے۔ اقبال کو کشمیر کے ساتھ دلی لگن تھی۔ وہ حد سے زیادہ خواہش مند تھے کہ کشمیر کے لوگ عزت سے دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ اُن کو تن ڈھانپنے کیلئے کپڑا نصیب ہو اور ان "چرب دست و تر دماغ" لوگوں کو عزت کا مقام ملے۔ فرمایا۔

بریشم قبا خواجہ از محنت او　　　نصیب تنش جامۂ تار تارے

کشمیر میں تحریک آزادی شروع ہوئی تو اقبال نے اس کو اپنا آہنگ اور جوش دے دیا۔

باد صبا! اگر بہ جنیوا گذر کنی　　　حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گوی

دہقان و کشت و جوئے و خیابان فروختند

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ہم نے اس آہنگ کو نعرۂ مستانہ بنالیا اور جد و جہد آزادی لڑی۔

اقبالؒ کے اس قلبی تعلق اُن کا سفر کشمیر، اس کی رموز و کنایات اس کی تفاصیل کے بارے میں جس طرح آزادؔ نے تحقیق کی ہے وہ یقیناً بے مثال ہے۔ سوال یہ تھا کہ آیا اقبالؒ ایک ہی بار کشمیر آئے ہیں یا ایک سے زیادہ مرتبہ۔ آزاد اس چھوٹے سے نقطے کے لئے جگہ جگہ گھومے۔ مفتی جلال الدین، پیر عبید الاحد شاہ، محمد امین داراب، غلام نبی سوگامی سے فرداً فرداً ملے۔ اُن کی تفصیلی بیانات کا تجزیہ کیا اور نتیجہ اخذ کیا کہ اقبال غالباً ایک ہی بار کشمیر آئے ہیں۔ ایک سے زیادہ بار نہیں اس تحقیق کا حال آزاد نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ہم اُنکی زبانی بھی سن چکے ہیں۔

بہرحال محمد ایوب واقف نے آزادؔ کے بارے میں جو مجموعہ مضامین شائع کیا ہے وہ قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ ستائش بھی۔ ابھی البتہ اس موضوع پر بہت سا کام کرنے کی ضرورت ہے توقع رکھنی چاہیئے کہ علم و ادب کے شائقین اس طرف پوری توجہ دیں گے۔ آزادؔ کی ذات اور اس کا کام ہمارے لئے باعث فخر و افتخار ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی کوتاہی رہی ہے کہ فنکار زندہ ہو تو اس کے بارے میں ہم بات نہیں کرتے وہ مر جاتا ہے تو پھر اس کی قبر ڈھونڈنے کے لئے ریسرچ شروع ہوتی ہے۔ آزادؔ تو ہیں جنکی ان کی

رام لعل - لکھنؤ

جگن ناتھ آزاد ـــــ ایک اجنبی

آزاد کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ اس بات کا ڈر کہ وہ نہ جانے کس بات پر کس طرح سے "ری ایکٹ" کر بیٹھے۔ اس کا کچھ ٹھیک نہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ آپس میں گپ ہو رہی ہے، علم و ادب پر بحث چل رہی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے لطیفے ہنس ہنس کر سنائے جا رہے ہیں۔ اچانک بات کسی محاورے پر آ کر اٹک گئی۔ میں نے کہا میں تو کبھی پرانے فرسودہ محاورے استعمال کرنے سے گریز کیا کرتا ہوں۔ انھوں نے میری گفتگو ہی سے کچھ محاورے نوچ کر میرے سامنے رکھ دیئے! لیجئے بحث اب بے تکلف قہقہوں کی سرحد سے نکل کر سنجیدہ جنگلوں میں داخل ہو گئی۔ اب پتہ نہیں کس طرف سے کون سا جنگلی جانور اوپر کود پڑے۔ آخر ہم محاوروں سے گریز کیوں برتیں؟ یہ تو ہمیں وراثت میں ملے ہیں۔ میرؔ، حالیؔ، غالبؔ، محمد حسین آزادؔ اور چکبستؔ وغیرہ سے! یہ ہماری زبان کا حسن ہیں۔ ہمارے منتہائے مقصود کے ابلاغ میں ممد ثابت ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں کہہ رہا ہوں۔ ہم اپنی زبان کو خوبصورت بعد میں، پہلے اُسے مکمل بنائیں گے۔ اپنے اظہار کے لئے صرف وہی الفاظ اور محاورے پیش کریں گے جو ہماری زندگی اور اس کی سوچوں اور اس کے محسوسات کے ہم معنی ہوں گے۔ چاہے وہ کتنے ہی مختصر اور کھردرے ہوں یا نہ ہوں

ایک بار آزاد کے دفتر میں ہی چائے کا دور چل رہا تھا۔ پانچ سات ادیب، شاعر اور محقق دہلی، لکھنؤ، بمبئی سے آ کر اُن کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ذکر چھڑ گیا قیامت

کا! یعنی شاعری اور افسانوں کے مجموعوں کی اشاعت کا۔ کچھ مسائل ناشرین کے، کچھ مسائل قارئین کے لیکن سب سے اہم مسائل لکھنے والوں کے، وہیں ایک صاحب نے مجھ سے میرے افسانوں کے ایک مجموعہ مانگ لیا۔ میں نے معذرت پیش کر دی۔ یعنی اس کا تو اب ایڈیشن بھی ختم ہو چکا ہے۔ وہ صاحب تو یقین کر کے خاموش ہو گئے لیکن آزاد کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ دیر تک اکیلے ہنستے رہے پھر انھوں نے کسی شاعر کے ایڈیشن ختم ہونے کا ایک بہت ہی دلچسپ لطیفہ سنا دیا، جس پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ یوں بات پہنچی تری جوانی تک! اپنی خفت مٹانے کے لئے مجھے پنجابی کے ایک مشہور لکھاری کا واقعہ سنانا پڑا جس کے افسانوں کے ایک مجموعے کی کسی پبلشر نے صرف آٹھ کاپیاں شائع کرائی تھیں۔ وہ اس کتاب کو یونیورسٹی میں لگوانا چاہتا تھا جب کامیاب نہ ہوا تھا اس نے اپنی نیک خواہشات کے ساتھ آٹھوں کاپیاں یعنی پورا ایڈیشن موصوف کی خدمت میں پیش کر دیا۔!

آزاد صاحب کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے وقت بہت ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ اپنی فطری لطیفہ گوئی کی حس کو مطمئن کرنے کی لئے اچانک کچھ بھی کہہ سکتے ہیں ایک بار وہ اور میں اُن کے دفتر جا رہے تھے اچانک آکاش وانی بھون کی سیڑھیوں کے درمیان دلی کے ایک بزرگ افسانہ نگار سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جو نیچے جا رہے تھے انھوں نے مجھے بڑی شفقت سے گلے لگایا اور شکایت کی کہ دلی جا کر کبھی اُن سے نہیں ملتا۔ میں جواب دینے کے لئے ابھی کوئی بات سوچ ہی رہا تھا کہ آزاد صاحب اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولے۔ ان سے آپ کی ملاقات نہیں ہو سکتی اب! کیونکہ آپ نیچے جا رہے ہیں اور یہ اوپر جا رہے ہیں۔ بات بڑی بے ساختہ تھی۔ بیحد دلچسپ بھی لیکن مجھ سے کہیں زیادہ پریشانی اُن بزرگ افسانہ نگار کو محسوس ہوئی وہ کچھ مسکراتے کچھ جھنجھلاتے ہوئے جلدی جلدی سیڑھیوں سے نیچے اُتر گئے۔

کوئی کچھ کہنا آزاد صاحب کی عین خوش مزاجی کی دلیل ہے جو اُن کی کمزوری بھی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان کی کمزوری اقبال ہیں۔ کیونکہ اُن کے ساتھ گفتگو کرنے والا اقبال کے ذکر کو کتنا ہی بچانے کی کوشش کرے لیکن آزاد گھیر گھار کر اپنی بات کی تان اقبال پر ہی

سے آکر ٹوٹتے ہیں۔

اُن کی زبان سے اقبال کا ذکر تو میں نے بھی کئی مرتبہ سنا ہے۔ اقبال پر ان کی نظمیں بھی پڑھی ہیں اور اُن کے مضامین بھی۔ اُن کی شاعری میں اقبال کے آہنگ کا جو ٹریس ملتا ہے میں اُسے بھی پہچانتا ہوں

سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسم گنبدِ حیات — ہمیشہ راز رہا عقل پر فنا و ثبات
خرد اگرچہ رہی کی جستجو میں مدام! — مگر نہ کھول سکی عقدۂ حیات و ممات
طواف کر کے نگاہِ عمیق لوٹ آئی — عجیب گنبدِ بے در ہے جلوہ گاہِ صفات

فریب ہے کہ حقیقت حیات کیا شے ہے — کھلا نہ راز فنا کیا ثبات کیا شے ہے

ترے ماحول میں اک بے بسی محسوس کرتا ہوں — کہ ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کرتا ہوں

دل پہ تری تجلیاں راز یہ کر گئیں عیاں — اور بھی ہیں ترے مقام رفعتِ طور کے سوا

آزاد ہے محوِ جہد و عمل انجام پہ کب ہے اس کی نظر
یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اس کشت کا حاصل کیا جانے

اس سلسلے میں میں ڈاکٹر وزیر آغا سے سو فیصد متفق ہوں۔ کئی دوسرے شعراء — (جوش، حفیظ، مصطفےٰ زیدی، جعفر طاہر، شورش علیگ — عبدالعزیز خالد، رفیق خاور وغیرہ) کی طرح جگن ناتھ آزاد کے ہاں بھی اقبال کے لہجے کی بلند آہنگی اور لفظوں کا شکوہ اور کرّ و فر موجود ہے لیکن اُن کی شخصیت کی کمزوری نہ محض اقبال ہیں اور نہ ہی محض لطیفہ گوئی ہے۔ اس خوش پوش اور خوش مزاج ادھیڑ شاعر کو بہت قریب سے دیکھنے سے (اور بار بار دیکھنے سے) جس بات کا شدید احساس ہوتا ہے وہ ہے اس کی اجنبیت! گویا

اس کے ساتھ کتنا ہی بے تکلف کیوں نہ ہو وہ کسی کے قریب نہیں ہو سکتا۔ یہ کیفیت اس کی آنکھوں اور باتوں سے ہمیشہ جھانکتی ہے وہ آپ کے ساتھ ہر ماحول میں اڈجسٹ کرے گا اور آپ کی بیہودہ باتوں کا کبھی برا نہیں مانے گا۔ لیکن پھر بھی آپ سے الگ ہی نظر آئے گا الگ ان معنوں میں کہ وہ آپ کے ساتھ کسی بات پر بے اختیار نہیں کبھی اداس نظر آتا ہے۔ آپ کا مذاق اڑا کر بھی اپنے لہجے کی دھیمی دھیمی معذرت خواہی کو چھپا نہیں پاتا ہے۔ آپ سے مل کر وہ جس قدر خوشی دکھاتا ہے وہ اس کی اندرونی تنہائی کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ جس مزاج رکھنے والا درحقیقت تنہا اور اداس ہی تو ہوتا ہے اپنی اندرونی کیفیتوں پر تابو پانے کی خاطر ہی دوسروں پر پھبتیاں کستا اور قہقہے لگاتا ہے۔ آزاد کا ہی ایک شعر اس وقت یاد آگیا ہے۔

اگرچہ شہر میں میلا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک شخص اکیلا دکھائی دیتا ہے

کسی شاعر کے لئے اجنبیت اور تنہائی کا شدید احساس ہی اس کا تخلیقی سرچشمہ ہوتا ہے۔ تقسیم ملک میں ہمارے ادب پر بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اگر انہیں نقوش کو یکجا کرلیں تو ان سے ایک چھوٹا سا ایپک تو مرتب ہو ہی جائے گا اور آزاد کی طویل نظم " وطن میں اجنبی" اس چھوٹے سے ایپک کا قابل قدر حصہ قرار پائے گی۔ اسی نظم نے آزاد کو اردو شاعری میں صحیح طور پر روشناس کرایا۔ جو لوگ تقسیم کی اس جذباتی کشمکش سے بالکل دور رہے ان کے نزدیک ہو سکتا ہے یہ نظم بہت زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو لیکن جن کروڑوں انسانوں نے اس المیے کو جسمانی اور ذہنی طور پر بھگتا ہے وہ اس طویل نظم کا مطالعہ کرتے وقت اس نظم کے اشعار پر سے سرسری طور پر نہیں گزر سکتے۔

جس طرح چلے لعل یمن ملک یمن سے   یا جیسے چلے دُرّ عدن کانِ عدن سے
اُٹھ ہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے   آزاد ! ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے

جس گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم
اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

آزاد کا حقیقی وطن پنجاب تھا۔ ملک کی تقسیم کا سب سے زیادہ اثر پنجاب ہی پر پڑا۔ جو صدیوں پرانی ادبی و تہذیبی روایات کا بہت بڑا مرکز تھا۔ زیادہ تر پنجاب کے ہی اردو ادیبوں نے اس عظیم المیے کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی، قاسمی، خواجہ احمد عباس، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اور جمیلہ ہاشمی کی کہانیاں اور فیض، ساحر، قاسمی، آزاد، نریش کمار شاد کی منظومات اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس المیئے سے متاثر ہونے والے دوسرے بھی کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں نے شوکت صدیقی، جوش، جگر، غلام ربانی تاباں، علی سردار جعفری، معصوم رضا راہی اور وامق وغیرہ جن کا پنجاب سے علاقائی تعلق تو نہیں تھا لیکن ایک ذہنی رشتے کی بنا پر ہی کئی شاہکار تخلیقات پیش کیں جو آج بیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنے اندر وہی واقعاتی تازگی قائم رکھے ہوئے ہیں۔

بعض لوگوں نے جس طرح کرشن چندر کا مذاق اڑایا کہ وہ تو ہاتھ میں ایک ترازو لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ملک کے دونوں حصوں میں رونما ہونے والے واقعات کو ایک مصنوعی توازن سے پیش کر دیتے ہیں جو تخلیقی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ اس طرح آزاد بھی ان لوگوں کے نزدیک جو آفاقی انسانی قدروں میں یقین نہیں رکھتے تھے قابلِ طنز ٹھہرتے ہیں ان کے بارے میں اکثر کہا گیا کہ وہ ہر بار جب لاہور جاتے ہیں تو سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں شامِ غریباں لے کے آیا ہوں جیسی شاعری ساتھ لے جاتے ہیں، آزاد کی شاعری کا مطالعہ میں نے بھی کیا ہے لیکن اپنے اندر کبھی بوریت یا اکتاہٹ محسوس نہیں کی بلکہ ہر بار اسے پڑھ کر ایک نیا ہی کرب جاگتا ہوا محسوس کیا ہے

مٹی ہوئی تقسیم، محبت ہوئی رخصت	اخلاص گیا مہر و مروت ہوئی رخصت
چہروں پہ ہنسی دل سے صداقت ہوئی رخصت	پنجاب کی دیرینہ شرافت ہوئی رخصت

اک حشر کا ساماں اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
اک آگ کا طوفاں اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
انساں پریشاں اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
ہر روح میں پیکاں اِدھر بھی تھا اُدھر بھی

ہر سمت مرا رقص قضا ناچ رہی تھی
دریاؤں کی موجوں میں بلا ناچ رہی تھی

معلوم اگر ہو تو بتا دو در زمانہ
اُجڑے ہوئے یہ لوگ ہیں کس سمت روانہ
اب کون سی بستی میں کریں گے یہ بسیرا
راتوں کے مسافر ہیں نہ دیکھیں گے سویرا

جن ہاتھوں نے صد چاک کئے ماؤں کے سینے
سینے ابدی مہرِ محبت کے دفینے
لوٹے ہیں جنھوں نے یہ وفاؤں کے خزینے
وہ ہاتھ ہیں کس درجہ شفقی اور سجیلے
ان ہاتھوں کو ہو دامنِ مذہب کا سہارا
دیکھو تو ذرا اہلِ جہاں یہ بھی نظارا

اس خاک میں پانی سی تب و تاب نہیں ہے
دو آب ہے سرآب ہے پنجاب نہیں ہے

اک شمع سی دل میں مرے جلتی ہے اے ہم چمن اہلِ وطنا
اس شمع سے زنداں کا دیا اندھے چراغاں روشن ہے

یوں گلستاں میں آئی بادِ نسیم
ہم صفیروں کا ساتھ چھوٹ گیا
میں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے
ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

یہ تنہائی کا عالم ڈوبتے تاروں کی خاموشی
بتا اے جذبِ دل اس وقت کتنی رات باقی ہے

خود اپنے ہاتھ سے میں نے بہ قیدِ ہوش و حواس
اسی زمیں پہ تجھے آگ کے سپرد کیا
اسی زمیں پہ تجھے ڈھونڈنے کو آیا ہوں
عجیب مجھ سے مقدر نے انتقام لیا

فراقؔ صاحب نے لکھا ہے دلّی اجڑنے کے بعد جو شعرائے دلّی لکھنؤ آ بسے تھے یا لکھنؤ اجڑنے کے بعد جن شاعروں کو رام پور و حیدر آباد کا منھ دیکھنا پڑا۔ اُن کے کلام میں اپنی جنم بھومی کے لئے اتنے چٹیلے اشعار نہیں ملتے جتنے آزادؔ کے کلام میں پنجاب کی یاد سے پیدا ہوئے اشعار ملتے ہیں۔

ہر طرف ایک پُر اسرار خموشی ہے محیط　　نہ وہ بے باک سا ٹھہراؤ نہ بدمست خرام
ہوگئے کون سی راتوں کا طرب ناک نصیب　　وہ چمکتے ہوئے ساگر وہ کھنکتے ہوئے جام

آزادؔ کے دل و دماغ پر صرف ملک کی تقسیم نے ہی اپنا اثر نہیں ڈالا ان کی زندگی میں اور بھی کئی ایسے حادثات آئے ہیں جن کی پرچھائیاں اُن کے اشعار میں جا بجا ملتی ہیں اُن کی اہلیہ تپ دق کے عارضہ میں مبتلا رہی وہ اس کے علاج کے لئے جگہ جگہ بھٹکتے رہے تھے۔ آخر اُسے کسولی کے سینی ٹوریم میں لے گئے جہاں اس کا انتقال ہو گیا اس حادثے کا بھی ان پر بہت اثر پڑا۔

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہوا جاتا ہوں میں　　ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

سینی ٹوریم کی فضا میں چیل کے اونچے تناور درخت اور صحت افزا درختوں کی کمی نہیں تھی۔ جنھیں وہ اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

میں نے کھایا ہے تمہاری دلربائی کا فریب　　رنگ و بو کا تازگی کا جانفزائی کا فریب

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب　　ایک مُرجھائی ہوئی پتّی کا منھ چومو گے جب
وہ تمہارے لمس سے اک شادمانی پائے گی　　شادمانی سے سرورِ زندگانی پائے گی

میں اسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا　　پتھروں پر ڈگمگاتا جا بجا گرتا رہا

پھر وہ مرحومہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ایک مدت تک تجھے درد و الم سہنا پڑا　　دور گھر سے ہسپتالوں میں تجھے رہنا پڑا

اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے　　اب نہ بیماروں کے بستر پر سُلائیں گے تجھے
سے کہ گھبراتی تھی تو کڑوی دوا کے نام سے　　آگ کے شعلوں میں جا سوئی ہے کس آرام سے

کیا خبر مسکن ہے تیرا آج کل کس دیس میں　　کونسی خوابوں کی دنیا میں ہے کیسے بھیس میں

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب　　کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

یہ اشعار آزاد کی ذاتی زندگی کے بارے میں ہیں۔ بقول سید احتشام حسین "آزاد کے شعروں کی نرم آواز اور دھیمی کسک جو بظاہر ایک قسم کے شخصی اظہار اور ذاتی افتادِ طبع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ ان کا کلام سننے اور پڑھنے والے کے احساس کا جزو بن جاتی ہے۔"

کسی حساس و جذباتی شاعر کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے دکھ سے تب تک متاثر نہیں ہو سکتا جب تک وہ خود اسی قسم کے کرب میں سے نہ گزر جائے۔ یہ بات سو فیصدی صحیح نہ بھی ہو پھر بھی جب کوئی شاعر اپنے حادثات میں سے گزر کر دوسروں کے درد و الم کا گواہ بنتا ہے تو اس کی شہادت اور لہجے میں زیادہ جذب و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ سب کچھ میں ایسے شخص کے بارے میں لکھ رہا ہوں جسے میں نے آغازِ مضمون میں Unpredictable ان پری ڈکٹیبل بتایا تھا۔ ہنسی مذاق کے معاملے میں کسی ادبی موشگافی کے معاملے میں بھی اور اچانک سنجیدہ ہو کر اپنا یا اقبال کا کوئی درد بھرا شعر پڑھ دینے کے معاملے میں بھی۔ یہ سب ایک ہی شخصیت کے مختلف رُخ ہیں جو بے حد پیارے ہیں۔ یہ مختلف رُخ ہمیں اپنے عہد کے ایک حساس باشعور اور بیدار ذہن شاعر کو سمجھنے میں پوری پوری مدد دیتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی (لاہور)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی آمد

بھارت کے ممتاز شاعر اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد گزشتہ ہفتے کراچی کے ایک پاک و ہند مشاعرے میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے اور مشاعرے سے فراغت کے بعد وہ لاہور چلے آئے جہاں اُن کے دوست اور مداح اُن کے لئے اپنے بازو وا کئے ہوئے تھے۔ یہاں اُن کا پورا ہفتہ اس درجہ مصروف گزرا اور وہ احباب کی طرف سے منعقدہ تقریبات کے حصار میں کچھ اس درجہ رہے کہ اس ہفتے کو "ہفتہ جگن ناتھ آزاد" کہا جا سکتا ہے ایک تقریب گورنمنٹ ایم۔ اے۔ او کالج کی مجلس اقبال کی طرف سے تھی، مگر آزاد صاحب کراچی سے بروقت لاہور نہ پہنچ سکے تاہم باقی جلسوں میں آزاد صاحب شریک ہوئے۔ اور یوں لاہور والوں کو ایک بار پھر اُن کی دل نشیں گفتگو سننے کا موقع ملا۔ ایف۔ سی کالج میں حسن رضوی اور سلیم منصور خالد نے اُن کے اعزاز میں ایک غیر رسمی نشست کا انعقاد کیا۔ گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے کولیگز کے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صحبت میں چند گھڑیاں گزار سکیں۔ اورینٹل کالج میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اُن کے میزبان تھے جنہوں نے مجلہ "تحقیق" کے پرچے اُن کی نذر کئے۔ اِدھر علامہ اقبال ٹاؤن میں دائرہ مصنفین نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور اُن سے اُن کا کلام سُنا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے جناب آزاد کے اعزاز میں ایک پُرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں احمد ندیم قاسمی، مسعود اشعر، ڈاکٹر آغا سہیل، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر معین الرحمان، اشفاق نقوی، امجد اسلام امجد، حسن رضوی، سید سرفراز، احمد صادق، جاوید

اور ظاہر تو نسوی کے علاوہ لاہور میں جناب جگن ناتھ آزاد کے میزبان نواب زادہ عبدالغفور خاں نے شرکت کی۔ نواب زادہ عبدالغفور خاں جگن ناتھ آزاد کے بچپن کے دوست ہیں اور پرانی شرافتوں اور وضعداریوں کا زندہ نمونہ ہیں۔ ایک تقریب خود نواب زادہ صاحب نے بھی جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں منعقد کی جس میں شہر کے چیدہ چیدہ اہلِ قلم شریک ہوئے۔ ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام جناب صلاح الدین نے بھی اپنی قیام گاہ "عیسیٰ خیل لاج" میں کیا تھا جو عشائیے کی صورت میں تھی اور اس عشائیے میں بیسیوں ادیبوں اور ادب سے تعلق رکھنے والوں اعلیٰ حکام اور دیگر معززین نے شرکت کی۔ یہاں جناب آزاد سے پہلے امجد اسلام امجد اور اسلم کمال نے اپنا کلام سنایا۔ بعد میں آزاد صاحب نے حاضرین کے اصرار پر اپنی متعدد غزلیں سنائیں اور آخر میں انہوں نے اقبال اور اقبالیات کے حوالے سے قریباً پون گھنٹے گفتگو کی۔ اس کی تفصیل تو ہم کسی دوسرے کالم میں پیش کریں گے۔ تاہم یہاں اتنا بتاتے چلیں کہ سامعین کا خیال تھا کہ انہوں نے اقبال پر اس سے بہتر گفتگو بہت کم سنی ہے اور اس تقریب کے حوالے سے ایک لطیفہ بھی سن لیں۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے بتایا کہ وہ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" پڑھ کر اس درجہ مسحور ہوئے کہ وہ لندن سے پیرس، پیرس سے میڈرڈ اور میڈرڈ سے قرطبہ جا پہنچے مگر چونکہ اسپینش نہیں آتی تھی۔ لہٰذا انہیں یہاں اپنا مدعا سمجھانے میں سخت دشواری پیش آئی۔ اس پر ایک ستم ظریف نے اپنے دوست کے کان میں کہا کمال ہے مستقر حسین تارڑ کو تو اس طرح کی کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ خیر! "ہفتہ آزاد" کے سلسلے کی ایک اور تقریب ڈیفیئر ہوٹل میں مکتبہ عالیہ کے جمیل الفتی کی طرف سے تھی اور یہ دراصل آزاد صاحب کی ان دو کتابوں کی رونمائی تھی جو پاکستان میں شائع ہوئی ہیں۔ اور جو ادیب ملنے سے رہ گئے تھے انہوں نے اسی بہانے یہاں آزاد صاحب سے ملاقات کی۔

مرسلہ۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

نوائے وقت لاہور کے ادبی ایڈیشن پر تاریخ درج نہیں ہوئی مجھے بھی تاریخ یاد نہیں رہی

۔ رفیع الدین ہاشمی۔

یوسف ناظم (بمبئی)

ایک آزاد مطالعہ

اردو ادب میں یوں تو آزاد خیال، آزاد منش اور آزاد رَو لوگوں کی کمی نہیں بلکہ اب تو ایک لحاظ سے آزادی ہی آزادی ہے کیونکہ اردو ادب میں جتنی آزادی شاعروں اور ادیبوں کو حاصل ہے یا یوں کہئے کہ شاعروں نے حاصل کر لی ہے ویسی آزادی دوسری زبانوں میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے لیکن اس وقت میرا موضوعِ سخن ادب میں آزادی نہیں ہے بلکہ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ صحیح معنوں میں اُردو ادب میں تین ہی آزاد ہیں۔ سب سے پہلے محمد حسین آزاد جنھیں آزاد رہنے کے لئے غدر کے بعد بھیس بدل کر اِدھر اُدھر گھومنا پڑا۔ (اردو ادب کے ادیبوں پر اگر افتاد نہ پڑے تو نظامِ قدرت متاثر ہو جاتا ہے) دوسرے ابوالکلام آزاد۔ یہ ایسے آزاد تھے کہ برسوں اسیر کی حیثیت سے جیل میں رہے اور وہ بھی اس طرح کہ اپنی رفیقۂ حیات کے آخری دیدار سے بھی محروم رہے[1] اور تیسرے جگن ناتھ آزاد۔

---

[1] اپنی اہلیہ کے انتقال پر مولانا احمد نگر جیل میں تھے۔ ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب کے صفحہ ۱۹۰ پر لکھا ہے۔ "اپریل میں ایک دن دوپہر کے وقت چیتا خاں میرے پاس آئے۔ یہ بہت ہی غیر معمولی بات تھی اس نے بغیر کچھ کہے مجھے ایک تار دیا یہ مخفی تحریر میں تھا مگر انگریزی میں اس کی نقل ساتھ تھی۔ تار کلکتے سے بھیجا گیا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ میری اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے" صفحہ ۲۰۷ پر لکھا ہے: "جس وقت کار پُل (ہاوڑہ پل) پر سے گزر رہی تھی مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ تین سال پہلے کا وہ دن یاد آیا جب میں

محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" ابوالکلام آزاد کی "ہماری آزادی" اور جگن ناتھ آزاد کی "آنکھیں ترستیاں ہیں"۔ ان تینوں کتابوں کا موضوع الگ ہے لیکن ان میں عجیب قسم کی مماثلت ہے اور وہ ہے مشترک جذبہ یعنی بے اختیار محبت اور عقیدت۔ "آبِ حیات" زبان اور استادِ کرم سے محبت کی آئینہ دار ہے۔ "ہماری آزادی" وطن سے محبت کا بے بہا خزانہ ہے (اس میں شاعری یا مبالغہ کا ذرہ برابر دخل نہیں ہے) اور "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں بزرگوں اور دوستوں سے بے پناہ عقیدت، ارادت اور محبت کے وہ پانچوں دریا ہیں جن سے مصنف کی نسبت واضح رہی ہے۔ (جگن ناتھ آزاد عیسیٰ خیل ضلع میانوالی کی پیداوار تھے) بعد میں پاکستانی ہوئے اور پھر از سر نو ہندوستانی ہے۔

میں نے جگن ناتھ آزاد کا نام ابوالکلام آزاد کے ساتھ لیا۔ آپ کو شاید برا معلوم ہوا لیکن ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ خود جگن ناتھ آزاد کیسا محسوس کرتے ہیں، ہمارے جارپا اور جانبہ آزاد صاحب جب اپنا مجموعۂ کلام لے کر ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو — لیکن میں یہ منظر خود جگن ناتھ آزاد کی زبانی یوں نقل کر رہا ہوں۔

"ایک سادہ سے کمرے میں صحن کا ایک دروازہ ایک باغ میں کھلتا تھا۔
مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مولانا کی پروقار شخصیت سارے
ماحول پر اثر انداز تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس
ہوا۔ میری کیفیت اس وقت وہی تھی، جو علامہ اقبال نے اس شعر میں بیان

(بقیہ صفحہ ۷۳ کا) ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگرس کے اجلاس میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں جا چکی تھیں اور میرا گھر خالی تھا مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا۔

مگر وہ اب اپنی قبر میں ہے اور آہ ۔ میری دنیا کیسی بدل گئی ہے

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار روک دینے کے لئے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھا۔

کی ہے ؎

من حضورِ آں شہِ والا گہر — بے ہنر مردے بہ دربارِ سحر

میرے آداب عرض کے جواب میں مولانا نے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے کہ مولانا کے حضور مجھے اُن کے قدموں میں فرش پر بیٹھنا چاہیئے ، کرسی پہ بیٹھ گیا۔"

یہی حفظ مراتب ، مشرقی تہذیب ، لحاظ اور تمیز جگن ناتھ آزاد کی زندگی ہے ۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کو اپنا مرشد مانا اور عقیدت و ارادت میں اتنی گرمجوشی اور استواری دکھائی کہ اقبال اگر اللہ کچھ دن زندہ رہتے تو جاوید نامہ کے بعد ایک آزاد نامہ ضرور لکھتے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ جگن ناتھ آزاد کی اقبال صدی میں اُن کی اقبال پرستی کا بڑا دخل ہے تو غالباً یہ پہلا سچ ہے جو میں بولوں گا ۔ پاکستان میں اقبال کے وارث اگر جاوید اقبال ہیں تو ہندوستان میں جگن ناتھ آزاد ۔ اقبال صدی کے دوران پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے "اقبال اور عالمی ادب" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا اور اس میں وہی لکھا جس کی اُن سے توقع کی جاتی تھی ۔ اس وقت بھی اس مقالے کے جواب میں اگر کوئی سینہ سپر ہوا تو وہ یہی جگن ناتھ آزاد تھے لیکن اس بحث کا یہاں کیا ذکر ہے ۔ میں تو اُن کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" کا ذکر کر رہا تھا جس میں انہوں نے ہر طرف محبت کے پھول بکھیرے ہیں اور کہیں کہیں تو وہ خود بچھ گئے ہیں ۔ یہ کتاب اصل میں مجھ جیسے بے حس لوگوں کے پڑھنے کے لئے ہے بھی نہیں جس میں جگہ جگہ بے غرض بے لوث بلکہ بے سبب دوستوں اور عاشقوں کے واقعات لکھے ہیں ۔ مثال کے طور پر عبدالمجید سالک کے تذکرے میں جو ایک خط کی شکل میں ہے لکھا ہے ۔

"خوشتر صاحب میں اس خط میں اتنا کچھ کیوں لکھ گیا یہ مجھے خود نہیں معلوم ۔ کل صبح پھر دوپہر کو آپ ٹیلی فون پر جس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں اس میں مجھے اس دور کے خلوص و محبت کی ایک تابناک تصویر نظر آئی ہے جو اس وقت بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے ۔"

اسی خط میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

"انہوں نے (سالک نے) مجھے اقبال کے وہ نادر اور غیر مطبوعہ اشعار سنائے جو اقبال کی تصانیف میں موجود نہیں ہیں۔ میں ان نوادر اقبال کو جو تمیذ سالک صاحب کے ذریعہ مجھ تک پہنچے ہیں آج بھی اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں جہاں میں اس بات پر نازاں ہوں کہ آج میری بیاضیں اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہیں جو اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہے وہاں اس بات پر میری حیرانی اپنی جگہ بدستور ہے کہ سالک صاحب کو اقبال کا کتنا کلام زبانی یاد تھا۔"

عبدالمجید سالک صاحب سے اپنی بے شمار ملاقاتوں کے بارے میں مصنف کے ان الفاظ پر بھی غور کیجئے۔

"وہ فکر و معانی کے علم و ادب کے، فنِ گفتگو کے ایک بحر بے کنار تھے ان کے ساتھ تو جتنی ملاقاتیں ہوئیں کم تھیں اور گزشتہ بیس برس میں یہ ملاقاتیں تھوڑے ہی تھیں یہ تو ایک جلوہ بے پایاں کی محض ہلکی سی جھلک تھی۔ جسے ملاقاتوں کا نام دے کر شاید میں اپنے ہی جذبۂ انا کی تسکین کر رہا ہوں۔"

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ　　　ذرہ آفتاب تابانیم

میں جگن ناتھ آزاد کو حافظِ اقبال سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اقبال کے کلام کا صرف مطالعہ نہیں کیا ہے۔ (بعض لوگوں نے صرف اُسے ملاحظہ کیا ہے) بلکہ باضابطہ اس کی صبح شام تلاوت کی ہے۔ انہیں اقبال کے اردو فارسی اشعار اس طرح حفظ ہیں جیسے وہ اقبال کے نہیں خود اُن کے اپنے شعر ہوں اور یوں دیکھا جائے تو شاعر اپنے اشعار بھی اتنی محنت اور توجہ سے یاد نہیں کرتا۔ اگر جگن ناتھ آزاد نے اس معاملے میں مولانا عبدالمجید سالک کا لوہا مانا ہے تو کہنا چاہیئے کہ جگن ناتھ آزاد اس دوڑ میں مولانا سالک سے تقریباً چار قدم پیچھے رہ گئے۔ لیکن اس میں اُن کی سبکی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا کہ ان دونوں کے بیچ میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔

اپنے (ادبی) استاد مولانا تاجور نجیب آبادی اور فارسی کے استاد صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ذکر میں بھی آزاد زانوئے تلمذ تہہ کئے بیٹھے ہیں۔ ان خاکوں کو پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس چونسٹھ سالہ شخص کے اندر آج بھی ایک طالب علم زندہ و سلامت موجود ہے وہ طالب علم نہیں جسے غلام مصطفیٰ تبسم نے ایک ادبی شرارت کی بنا پر اُسے کلاس سے گیٹ آوٹ کر دیا تھا۔ کیونکہ اس ادبی شرارت میں نظیری کے ساتھ بے ادبی کی جھلک آگئی تھی) بلکہ وہ طالب علم جو نہایت شلفتہ، مہذب اور مؤدب طالب علم کے سرٹیفکیٹ کا مستحق ہو یعنی بجا طور پر مستحق ہو۔

جگن ناتھ آزاد نے اپنی اس کتاب کو اپنی یادوں کا مجموعہ کہا ہے اور کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر نے ان مضامین کو شخصیت نگاری کی صف میں شامل کیا ہے، میں کسی کے پیچھے چلنے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا، ان مضامین کو خاکہ نما تذکرے یا تذکرہ نما خاکے کہنا پسند کروں گا۔ میرا خیال ہے شخصیت نگاری میں شخصیت نگار خود اسٹیج پر نہیں آتا جب خاکہ نگاری میں صاحبِ مضمون یعنی ممدوح اور خاکہ نگار دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے منظر عام پر آتے ہیں۔ "آنکھیں ترستیاں ہیں" کے مضامین میں یہ بے تکلفی نہیں ہے۔ اس لئے اگر انہیں تذکرہ نما خاکے کہا جائے تو ادب کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ بہ ہر حال اپنی رائے پر اس لئے اصرار نہیں ہے کہ پہلی نظر میں ناقص معلوم ہوئی ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے لحاظ اور مروت کو اپنا لباس بنایا ہے لکھتے ہیں جاں نثار اختر اور کرشن چندر میرے بے تکلف دوست ہی نہیں تھے بلکہ میری زندگی میں مینار نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج نور کے یہ مینار بجھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود میرے جادۂ حیات کو منور کر رہے ہیں۔ ان تذکرہ نما خاکوں میں جو تعداد میں ۲۲ ہیں (لیکن مقدار میں اس سے زیادہ) انشا پردازی یا ادبی شعبدہ بازی کی مثالیں نہیں ملیں گی۔ لیکن دوست داری، سلیقہ، محبت و قوت اور بے پناہ خلوص کے شجر سایہ دار ضرور ملیں گے۔ یہ ہرے بھرے درخت اور اُن کے تروتازہ پتے اس بات کا ثبوت ہیں

کہ جگن ناتھ آزاد تو بس برائے نام آزاد ہیں ورنہ جتنوں کے ریشمی بلکہ نقرئی اور طلائی تار انہیں ہر طرف سے باندھے رہتے ہیں۔

حفظِ مراتب اور اپنے اساتذہ سے ارادت کا سبق آزاد نے یقیناً محمد حسین آزاد سے سیکھا ہوگا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کا حقِ شاگردی جس طرح ادا کیا یعنی کس طرح ادا کیا سب جانتے ہیں۔ تاہم احتشام صاحب کے الفاظ میں سن لیجئے کہ محمد حسین آزاد نے یہ حق کس طرح ادا کیا ہے۔

"آزاد نے اُن کی (ذوق کی) صحبت میں کیا پایا کیا نہیں یہ بتانا تو مشکل ہے لیکن ان کی صحبت اور احسان مندی کا احساس یقیناً اتنا تھا کہ جب غدر میں گھر کا مال اسباب چھوڑ کر اور باپ کو گولی لگتے چھوڑ کر دہلی سے نکلنا پڑا تو انہوں نے اُستاد ذوق کا وہ کلام جو بکھری ہوئی شکل میں اُن کے پاس تھا اپنے ساتھ لے لیا اور اُسے سینے سے لگائے پھرے، اور جب آبِ حیات لکھنے بیٹھے تو اُنہیں ایسا خراجِ عقیدت پیش کیا ــــ کہ شاگردی کا حق ادا کیا۔"

مولانا تاجور نجیب آبادی کے بارے میں آزاد یعنی جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

"ظاہر ہے اس فہرست میں والدِ محترم کے بعد اگر کسی شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اثر میری طبیعت اور میرے مزاج نے قبول کیا ہے تو وہ مولانا کی شخصیت ہے۔"

اس کتاب میں مصنف کے ہم عمر بلکہ اُن سے کم عمر لوگوں کے بھی خاکے (یا تذکرے) شامل ہیں اور اُن خاکوں میں بھی (حد ہو گئی) مصنف نے اپنے قلم کو بے باکی تو چھوڑیئے بے تکلفی کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ خاکوں میں اتنا سخت ڈسپلن ــــ اقبال کے پرستار جگن ناتھ آزاد کی ہر تحریر پر پاسبانِ عقل کی تحدید شدید ہے۔ (اس رائے پر بھی مجھے اصرار نہیں ہے) جگن ناتھ آزاد شخصیت نگاری کے معاملے میں اتنے ہی شریف اور مہذب ہیں جتنے کہ اپنی کتابوں کا نام تجویز کرنے میں۔ "نشانِ منزل" کے

بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"علامہ اقبال مرحوم نے اپنی اول "ضرب کلیم" کا نام "شانِ خلیل" ہی تجویز کیا تھا۔ اب یہ نام اگر علامہ اقبال کا پسندیدہ نام ہے تو ناسازی ہے مجھے اس سے زیادہ اور کیا نام پسند آ سکتا ہے۔ اور اگر ان کی کتاب کا متروک نام ہے تو بھی میرے لئے محبوب ہے بقول جگرؔ
تری خاکِ پا جسے چھو گئی وہ برا ہوا تو برا نہیں

ظریفانہ ادب میں کچھ خاکے شامل ہیں جیسے فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ یا عصمت چغتائی کا "دوزخی" اور دیگر وغیرہ لیکن ظریفانہ ادب میں جو خاکے شامل ہیں اُن میں آزاد کے کم سے کم دس خاکے تو شامل ہونگے ہی۔ دس کی تعداد مقرر کرتے ہوئے میں نے اس شرط کو ملحوظ رکھا ہے کہ اس تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ البتہ اضافہ منظور ہے۔

اقبال اور مغربی مفکرین

ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔

آپ نے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے اس کے لئے آپ کو بہت پڑھنا پڑا ہوگا۔ آپ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ دلائل اور تجزیہ پر مبنی ہیں۔ میں بڑی حد تک ان سے متفق ہوں۔ اقبال نے اپنے خودی کے تصور میں نیٹشے سے بڑی حد تک فیض اٹھایا ہے آئندہ ایڈیشن میں اس پر مفصل بحث ہو تو مناسب ہے۔ ویسے آپ نے دوسرے جن جن مفکرین کو چنا ہے ان کے تصورات کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۷۶ء (ایک خط کا اقتباس)

لہ جگنو۔ کنڈ آزاد کے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام

حکیم محمد سعید (کراچی)

ایک اقتباس

[حکیم محمد سعید چیرمین ہمدرد دواخانہ کراچی ایشیا کی ایک معروف علمی ادبی اور سماجی شخصیت ہیں۔ اور متعدد کتابوں کے مصنف۔ مندرجہ ذیل اقتباس اُن کی ایک تصنیف چار ملک ایک مسافر سے لیا گیا ہے۔]

(مدیر)

میں نے جہاز میں ایک کتاب مطالعہ کے لئے نکالی "میرے گزشتہ روز و شب" اس کے مصنف جگن ناتھ آزاد ہیں۔ ان دنوں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں انھوں نے مجھے اپنی یہ کتاب جموں سے بھجوائی ہے۔ میں اس ہدیۂ علمی پر حیران ہوا اور اب تک حیران ہوں۔ میرا اس واجب الاحترام ادیب و شاعر سے اب تک شخصی تعارف نہیں ہے۔ میری اُن سے کبھی کوئی خط و کتابت بھی نہیں ہے۔ دو سال ہوئے جشن صد سالہ اقبال پر پاکستان آئے تھے اُن سے ملنے کا مجھے شوق تھا مگر میں اُن سے مل نہ سکا۔ وہ لاہور سے عشق رکھتے ہیں۔ میں عاشق و معشوق کے معاملات میں حارج نہ ہوا۔ مگر میں جگن ناتھ آزاد کا قدرداں ضرور رہا ہوں۔ ویسے میں ہر اُستاد کا احترام کرتا ہوں اور معاشرے کا اُسے بلند و ارفع فرد قرار دیتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ یہ دُکھ رہا ہوں کہ میرے وطن میں استاد کا مقام اعلیٰ ہنوز متعین نہیں ہو سکا ہے۔ ہر چند کہ اُستاد نے اپنے مقام رفعت کا پورا تحفظ نہیں کیا بایں ہمہ

ہم نے اس کو گرتے ہوئے سہارا کبھی نہیں دیا ہے۔ اور بلندیوں سے پستیوں کا یہ دردناک عمل ہنوز جاری ہے۔

میں اپنے وطن میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہاں یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقامِ شرف و عز سے محروم ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہاں وزیرِ تعلیم کہ جو عموماً غیر معلم ہوا کرتا ہے، مقامِ بلند پر سرفراز ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں عالم و فاضل وائس چانسلر کو صفِ اول میں جگہ میسر نہیں ہوتی تو میں یہ جانتا ہوں کہ معاشرہ ترقی پذیر نہیں ہے بلکہ پستی کی طرف جا رہا ہے۔ گزشتہ ۲۲ سال سے ہم اپنے عالم کی ناقدریاں کر رہے ہیں اور جہلا مقامِ عروج حاصل کر رہے ہیں کیا ہم پاکستان کی موجودہ پستیوں کا ذمہ دار اس صورتِ حال کو قرار دینے کو واقعی تیار نہیں ہیں؟ پاکستان میں آج تعلیم کی پستی معیار اور عالم و علم کی ناقدری نے ہمیں قعرِ مذلت میں گرا دیا ہے اور دنیا کے علم و حکمت کے نقشے پر پاکستان کا نام گھٹ چکا ہے اس میں جو کمی یا کسر باقی رہ گئی ہے وہ وزارتِ تعلیم وغیرہ کے بیوروکریٹس پوری کر رہے ہیں۔ اور ان برادرانِ بیوروکریسی نے عالمی اجتماعاتِ علم و حکمت میں علمائے پاکستان کی شرکت کی راہوں کو مسدود کر کے رکھ دیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کتاب "میرے گزشتہ روز و شب" ۱۹۶۷ء میں ان کے سفرِ پاکستان کی دلچسپ داستان ہے۔ کتاب مختصر ہے، مگر اس کو پڑھ کر جگن ناتھ آزاد سے پہلی بار تعارف حقیقی حاصل ہوا۔ مجھے اب تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ وہ کیا محرک ہے کہ اس استادِ بزرگ نے مجھے یہ کتاب بھجوائی ہے۔ مگر اب ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔ شاید کوئی صورت بھی نکل آئے۔ میں ایک "انٹرنیشنل اردو کانگرس" اپنے ذہن میں رکھتا ہوں۔ اگر میں نے اپنی اس تجویز کو جامۂ عمل پہنایا تو مدعوئین کی فہرست میں جگن ناتھ آزاد ضرور شامل ہوں گے۔

اشرف قادری

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد کی آواز کئی بار ریڈیو پر سننے کا اتفاق ہوا تھا مگر تمام کوششوں کے باوجود اُن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا تھا۔ مجھے اُن سے ملنے کی بیحد خواہش تھی۔ ۱۹۵۵ء میں حلقۂ ادب بہار کا دوسرا سالانہ اجلاس منعقد ہوا اور خوش قسمتی سے اسکی صدارت کے لئے جگن ناتھ آزاد ہی منتخب ہوئے۔ اس انتخاب سے مجھے بے حد مسرت ہوئی

اجلاس کے دن آزاد صاحب کی مہماں نوازی کی خدمت میرے سپرد کی گئی اور میں نے نہایت خندہ پیشانی سے اُسے قبول کیا، اور فوراً اس ہوٹل کی جانب بھاگا جہاں وہ مقیم تھے۔ اُن سے ملنے کا تصور دل و دماغ پر طاری تھا اس لئے یہ خیال جاتا رہا کہ میں کم سے کم ان کی شکل و شباہت کے متعلق کچھ پوچھ تو لیتا، مگر کیا کیجئے کہ راستے میں یہ بات یاد آئی۔ اب میں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور ہوٹل کی طرف برابر بڑھتا ہی رہا۔

ہوٹل آ گیا۔ میں اپنے دل میں ایک ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ بہر صورت تصور میں انکی تصویر ہزار انداز سے کھینچتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا اور سیدھا منیجر کے کمرے کی طرف جانے لگا ابھی میں منیجر کے کمرے تک پہنچ بھی نہ سکا تھا کہ ایک صاحب نے میری طرف رُخ کرتے ہوئے آداب عرض کہا۔ میرے جواب کے ساتھ ہی اُنہوں نے فرمایا "آپ حلقۂ ادب کی جانب سے تشریف لائے ہیں؟" میں حیران تھا کہ اُنہوں نے کیسے جان لیا پھر خیال آیا کہ حلقۂ ادب کا نشان میرے شانے پر موجود ہے۔ جواب کے طور پر میں نے کہا "جی ہاں"۔ اُن کے سب و لہجے سے مجھے

اندازہ ہو رہا تھا کہ میں آزاد صاحب سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اور میرا خیال صحیح نکلا۔ ایک لمبا چوڑا انسان میرے سامنے موجود تھا تھوڑی دیر کی گفتگو سے یہ اندازہ ہو گیا کہ آزاد صاحب اخلاقیات کا مرقع ہیں اور خلوص و سادگی کا ایک مجسمہ۔ دو روز تک اُن کا ساتھ رہا اس دوران میں میں اُن کی سادگی اور خلوص کا قائل ہو گیا اور بیحد معترف!

حلقۂ ادب بتیا کا تیسرا سالانہ اجلاس و مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا اس لئے میں نے اُن سے اس کا ذکر کیا اور شرکت کی دعوت دی۔ اُنہوں نے بغیر کسی قیل و قال کے گرمی کے صبر آزما زمانے میں طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے بتیا کے اجلاس میں شرکت کرنے کا وعدہ کیا۔ آپ ہی اس جلسے کے صدر تھے۔ اُنہوں نے اپنی پر مغز تقریر اور بلند پایا کلام سے سامعین کو سرفراز فرمایا۔ آج بھی اُن کا کلام اس فضا میں گونجتا ہے اور ایک عجیب چاشنی پیدا کرتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا وطن پنجاب ہے جس کو آج کل مغربی پنجاب کہتے ہیں مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے اس پار عیسیٰ خیل نامی ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کی صبح کو اُنہوں نے آنکھ کھولی۔ چار پانچ سال کی عمر میں اُن کے والد بزرگوار جناب تلوک چند محروم کا جو عیسیٰ خیل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے کا تبادلہ کلور کوٹ ہو گیا۔ اسی وجہ سے آزاد صاحب کو اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کلور کوٹ آنا پڑا۔ کلور کوٹ سے اُنہوں نے آٹھویں درجہ کا امتحان بارہ سال کی عمر میں پاس کیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے میانوالی میں میٹرک کی سند حاصل کی اور پھر اس شہر کو خیرباد کہہ کر راولپنڈی گارڈن کالج میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخلہ لیا۔ جہاں سے آپ نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ راولپنڈی میں بی اے کے بعد تعلیم کا انتظام نہیں تھا چنانچہ آپ وہاں سے لاہور آئے اور وہاں اورینٹل کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ اس سوچ میں رہے کہ آخر کون سا ایسا کام انجام دیا جائے جس سے قوم و ملک کا فائدہ ہو سکے اور سب سے زیادہ انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ ابھی اسی سوچ بچار میں تھے کہ سر سکندر حیات خاں مرحوم وزیر اعظم پنجاب نے تحریک رفاقت کی بنیاد ڈالی۔ یہ تحریک جگن ناتھ آزاد کے مزاج کے بالکل مطابق تھی اس لئے وہ اس تحریک میں شامل ہو کر پنجاب کے

گوشے گوشے میں دورہ کرتے رہے۔ انہوں نے تحریک رفاقت کی جانب سے ہندو مسلم اتحاد کا کام شروع کر دیا جس زمانے میں اُنہوں نے اس کام کو انجام دینا شروع کیا وہ دور فرقہ وارانہ کشیدگی کا تھا۔ اس لئے یہ تحریک بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کا مقابلہ نہ کر سکی اور آخر کار اس تحریک نے کارکنوں کے عزم و استقلال، جوش و خروش رواداری اور خلوص نیت کے باوجود فرقہ پرستی کی تاریک اور مسموم فضا میں دم توڑ دیا آزاد صاحب نے اب پنجاب کے ایک کانگریسی اخبار "جے ہند" سے وابستگی حاصل کی اور ۱۹۴۷ء تک اس کام کو انجام دیتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کو مجبوراً دہلی آنا پڑا دہلی آنے کے بعد آپ نے چند ماہ تک منسٹری آف لیبر میں کام کیا۔ اس کے بعد منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ سے وابستہ ہو کر "آج کل" اردو ماہنامہ دہلی کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ ابھی تک وہ رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔[1]

ہندوستان اور پاکستان کا کون ایسا شخص ہے جو اُن کا نام نہیں جانتا اور اُن کے حسن سلوک کا دلدادہ نہیں۔ آزاد صاحب کو اُن کے والد بزرگوار نے ابتدائی تعلیم خود دی بلکہ بی اے کی تعلیم تک اپنے ہی سلسلے میں رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ میانوالی سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے آزاد صاحب نے جب ۱۹۳۳ء میں گارڈن کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا تو اُن کے والد بزرگوار جناب تلوک چند محروم نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ بھی راولپنڈی ہی کرا لیا۔

شاعری کا ذوق۔

جگن ناتھ آزاد ایک پیدائشی شاعر ہیں انھوں نے ایک بلند پایہ شاعر کے گھر میں جنم لیا اور اُن کی آغوشِ شفقت میں آج تک پرورش پا رہے ہیں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُن کے والد بزرگوار کی بیحد خواہش تھی کہ آزاد ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہو۔ آزاد صاحب نے ابتدا ہی سے شاعرانہ طبیعت پائی اور لڑکپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا آزاد بتاتے ہیں کہ سب سے پہلا مصرع میں نے پانچ برس کی عمر میں کہا تھا۔ یہ پہلا مصرع

---

[1] اس وقت آپ اسی منسٹری میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ (ع۔ س۔ ا)

کہنے کا واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ اسی ملاقات کے دوران انھوں نے مجھے بتایا۔ کہ چار پانچ
سال کی عمر میں عیسیٰ خیل شہر مجھے چھوڑنا پڑا مگر اس وقت کے بعض نقوش یادوں کے
شبستان میں اس طرح جگمگا رہے ہیں گویا ابھی کل ہی کی بات ہے" اور اس سلسلے
میں دو ایک واقعات بھی مجھے سنائے تھے۔ اوّل یہ کہ عیسیٰ خیل شہر میں رہنے کے بعد
میں ایک مرتبہ اُن کے والد محترم نے دیوانِ غالب کھول کر اُن کے سامنے رکھا۔ اور
مندرجہ ذیل غزل پڑھنے کو کہا۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور آزاد نے یہ غزل پڑھ دی۔ اس پر محروم صاحب نے فرمایا کہ تلوکچن! اب تم پاس ہو
گئے ہو"۔ اصرار کرنے پر اُن کے والد نے بتایا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم صحیح اور موزوں
پڑھ سکتے ہو یا نہیں۔ تم نے بالکل صحیح غزل سنائی ہے۔ اور دوسرا واقعہ یوں سناتے
تھے کہ والد کے عیسیٰ خیل سے تبادلے کے بعد کلور کوٹ جانے کے لئے کالا باغ کے مقام پر
دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ ہماری کشتی روانہ ہی ہوئی تھی کہ پہاڑ پر بنے ہوئے
مکانوں کو دیکھ کر والد نے ایک مصرع پڑھا کہ پہاڑوں کے اُوپر بنے ہیں مکان اور مجھ
سے دوسرا مصرعہ لگانے کو کہا۔ میں نے فوراً کہا "عجب ان کی صورت عجب ان کی شان"۔

گویا آزاد صاحب کی طبیعت لڑکپن ہی سے موزوں اور شاعرانہ تھی۔ سات آٹھ
برس کی عمر میں جب آپ کلور کوٹ میں مقیم تھے، موزوں اشعار کہہ لیا کرتے تھے مگر سچ
پوچھئے تو اُن کی شاعری کی ابتدا راولپنڈی ہی سے ہوئی۔

حضرت عبدالحمید عدم اُن کی تعلیم کے زمانے میں راولپنڈی ہی میں رہا کرتے
تھے۔ یہ جناب محروم کے خصوصی دوستوں میں سے تھے۔ عدم صاحب کا بیشتر وقت
محروم صاحب کے ساتھ ہی اُن کے گھر پر بسر ہوتا تھا۔ آزاد صاحب کے دل و دماغ میں
جو ذوقِ ادب اور شوقِ مطالعہ پیدا ہوا تھا اس کو حضرت عدم کی مسلسل صحبت نے پھلنے
پھولنے میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن آزاد کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے
کہ آزاد کی شاعری عدم کے اسلوبِ سخن سے متاثر نہیں ہوئی بلکہ آزاد نے اپنے لئے بالکل ہی

ایک الگ راستہ اختیار کیا۔ آزاد نے اپنے خونِ جگر کی آمیزش سے اپنی شاعری کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تین سال کی مدت میں عدم صاحب اور مخدوم صاحب کی ملاقاتوں کے ذریعہ سے آزاد کو ہندوستان کے شاعرانہ ماحول سے کسی حد تک آگاہی حاصل ہو چکی تھی۔

آزاد ابھی تک ادبی محفلوں سے دور ہی رہتے تھے۔ جناب عبدالعزیز فطرت کے اصرار پر اُنہوں نے شہر کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنا شروع کیا۔ جناب فطرت راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں کی جان تھے۔ اُن کے ساتھ مل کر آزاد نے ادبی سرگرمیوں میں بڑا حصّہ لیا۔ آپ نے اپنے کالج میں بزمِ ادب کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت متعدد ادبی اجلاس منعقد کئے۔ اسی زمانے میں یہ اپنے کالج میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں اُن کی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ "ادبی دنیا" لاہور اور "زمانہ" کانپور میں کلام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

راولپنڈی کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جب لاہور آئے تو ان کی اڑان کی پرواز کے لئے کھلی فضائیں میسّر آئیں۔ خطّۂ مینو سوادِ لاہور ہمیشہ سے اردو ادب کا مرکز رہا ہے۔ لاہور پہنچنے کے بعد آزاد صاحب نے دیکھا کہ یہاں ہر فرد ایک انجمن ہے اور ہر گوشہ ایک بساطِ ادب۔ یہاں آکر آپ نے مولانا تاجور نجیب آبادی سے فیض حاصل کیا۔ تاجور صاحب کے متعلق آزاد اپنی طویل نظم "وطن میں اجنبی" میں کہتے ہیں۔

اے رہنمائے قافلۂ شعر السّلام | اے زندہ دارِ دولتِ شعر السّلام
مجھ میں ہے تجھ سے دولتِ شعر السّلام | آساں تجھی سے مرحلۂ شعر السّلام

کھینچے گی اک نگاہِ محبت سے پھول کر
آزاد کا سلام عقیدت سے قبول کر

اس کے علاوہ آزاد پر ڈاکٹر اقبال کا بہت اثر ہے۔ اس کا انہوں نے کئی موقعوں پر اعتراف بھی کیا ہے۔ آزاد صاحب نے "مزارِ تاجور پر چند لمحے" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں روحِ تاجور کی آواز یہ کہتی ہے کہ :-

فیض گر تو نے اٹھایا ہے مرے اشعار سے　　دل ترا وابستہ ہے اقبال کے اشعار سے

اے پسر یہ ہے ترے حق میں دعائے تاجور　　فکر ہو تیری مصافِ دہر میں سینہ سپر

تا قیامت دل ترا تاثیر کا مسکن رہے　　ہاتھ میں اقبال کے افکار کا دامن رہے

روشنی اقبال کے افکار کی، اشعار کی　　ہر گھڑی ہو رہنما تیرے دلِ بیدار کی

گلشنِ لاہور کے پھولوں کا اے رنگیں بہار

گلستانِ ہند کی تجھ کو فضا ہو سازگار

شاعری کے دو دور

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کے دو خصوصی دور ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے پہلے اور بعد۔
پہلا دور لاہور میں قیام کا ہے جہاں کا چپہ چپہ دبستان تھا اور جہاں فضا جوہرِ قابل کے لئے ہر اعتبار سے سازگار تھی۔ آزاد صاحب کی اس دور کی شاعری بھرپور اثر رکھتی ہے۔ مضامین کی شوخی و رعنائی، طرزِ ادا کی جدت اور زبان کی شیرینی سے اس دور کی شاعری بھرپور ہے۔ آزاد کہتے ہیں:

تجھے کیا بتاؤں ہمدم کہ قفس میں کیا کشش تھی

یہ بجا مری نظر سے نہ پرے تھا آشیانہ

یہ بھی بھی فضائیں، یہ گھٹا گھٹا سا عالم

مرے نطق چھیڑ کوئی طرب آفریں ترانہ

قفس کی دل کشی میں تو کمی کوئی نہیں لیکن

نہ آئے گی قفس میں رہ کے یادِ آشیاں کب تک

خزاں آئی گلستاں میں تو ہم سمجھے بہار آئی

نگاہِ شوقِ آخر یہ تری خوش فہمیاں کب تک

علم ہے کیفِ بے ثبات عشق ہے گرمیِ حیات　　زیست کی یہ حقیقتیں طاق کے قریب آ کے دیکھ

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں | اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں
یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے | نزدیک آ سکوں نہ کہیں دور جا سکوں

آزاد صاحب تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کے سیلاب میں بہتے بہلتے لاہور سے دہلی آئے۔ اس دوران میں بے بسی اور پریشانی رفیقِ غربت رہی۔ ایک طرف وطن کی محبت دامنِ دل اپنی طرف کھینچ رہی تھی تو دوسری طرف اجنبی ماحول کا تصور سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ ان تمام دقتوں کے بعد دہلی کی اس اجنبی فضا میں سانس لینے لگے تو قدرے دل و دماغ ٹھکانے لگا مگر اب یہاں شعر و سخن کی مانوس فضا کہاں تھی۔ ہر گھڑی ہنگامی کیفیات اور بے سروسامانیاں پیشِ نظر تھیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس سازگار ماحول نے ان کو اپنا لیا۔ اور پھر یہ اس سے گھل مل گئے۔ پھر بھی اُن کے دل و دماغ پر اس ہجرت اور پریشانی کا بے حد اثر تھا۔ اس کا ان کی شاعری پر بھی بہت اثر پڑا۔ اب یہاں جذبات کی شورش اور طبیعت کے گداز کی جگہ فکر اور سوجھ بوجھ نے لے لی۔ ان کی شاعری اس کے تاثرات کی آئینہ دار ہے اس لئے اس دور کی شاعری میں مفکرانہ مضامین آگئے اور طرزِ بیان میں بھی سنجیدگی آگئی۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہجرت کا ہنگامہ پیدا ہو گیا تھا۔ آزاد اس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
اِدھر دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
جہاں زیرِ سر کے بھی قدم رکھنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

اپنے وطن کو یاد کر کے کہتے ہیں۔

وطن سے دوریٔ منزل کا یہ سوال نہیں
وہ بے وطن ہوں کہ جن کا نہیں ہے کوئی وطن

کنارِ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
وہ تجھ میں بات کہاں اے دیارِ گنگ و جمن

اس طرح اور بھی اکثر غزلیں اور نظمیں ہیں جو صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ غربتِ وطن نے ان کو بیقرار کر دیا ہے۔ آزاد کا نیا ماحول سازگار سہی سکون آمیز نہیں ہے۔ ان تمام ہنگاموں کے باوجود آزاد ہر دور میں انسانیت کے علمبردار رہے۔ اس جھنڈے کو پریشانی کے دور میں بھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔ سچ پوچھئے تو آزاد نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ وہ ان تعصبات سے الگ ایک انسان ہیں محض انسان۔ اسی انسانیت کے پرچم کو بلند کرنے کے لئے وہ کوشاں ہیں محشر جالندھری کہتے ہیں "آزاد نے اپنے ہی نہیں پوری انسانیت کے دشمن کو پہچان لیا ہے انھوں نے اس دشمن کو آپ ہی نہیں دیکھا اوروں کو بھی دکھایا ہے۔ وہ خود فریب کھانے سے بچے ہیں دوسروں کو بھی فریب سے دور رہنے کی تلقین کر رہے ہیں"۔ آزاد کے یہ شعر دیکھئے

حیف صد حیف کہ انسان کا یہ فکرِ منیر
تندِ طوفاں پہ ذرا سا بھی اثر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (اقبال)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

تباہ خوشیِ آرزو نگاہ جستجو — پکار اٹھی ہے زندگی کہاں ہے کارواں بہار
قریب ہے دور ظلمتیں نئی ظلمتیں ہیں چار سو — یہ اور بات ہے کہ اپنے گھر کا راز دار ہیں

اے دل الجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں — منزل کہاں ہے یہ حسن رہنما کہاں

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا محسوس کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

آزاد واقعی اسم با مسمّیٰ ہیں۔ وہ ایک بہادر اور دلیر انسان کی طرح اظہارِ حقیقت سے کبھی گریز نہیں کرتے ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر حق بات کہہ جاتے ہیں۔ "بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے انہوں نے جو نظم کہی ہے اس کے دو تین بند آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں　　کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
دانش کدۂ دہر کی اے شمعِ فروزاں　　اے مطلعِ تہذیب کے خورشیدِ درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں

ہر ذرۂ دہلی ہے تری ضو سے منوّر　　پنجاب کی مستی اثرِ جذبِ قلندر
گنگوہ کی تقدیس ہے قدوسِ مطہر　　پٹنے کی زمیں نکہتِ خواجہ سے معطّر
مدراس کی مٹی میں نہاں تاجِ شہیداں

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے　　نفرت سے پرے اس کا ہر اک طور ہے پیارے
مذہب پہ تعصب تو بڑا جور ہے پیارے　　عقل و خرد و علم کا یہ دور ہے پیارے
اس دور میں مذہب کی صداقت ہو نمایاں

اسلام تو مہر اور محبت کا بیاں ہے　　اخلاص تو روداد مروّت کا بیاں ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے　　اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے
کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت کی فروزاں

آزاد غزل، نظم، قطعہ اور رباعی کہتے ہیں اور ہر صنفِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری جو براہِ راست قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ معاملہ بندی، راز و نیاز، خلوص، شکایتِ زمانہ، اخلاق، خودداری، عشق و محبت، سوز و گداز، آہ و فغاں اور اظہارِ حقیقت سے مملو ہے۔ ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) نے آزاد کے متعلق ایک بار لکھا تھا۔ "جگن ناتھ آزاد کا کلام غزل، نظم، قطعہ، رباعی ادبیت میں رچا ہوا ہے۔ اس کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، چکبست، حسرت موہانی اور جوش میں وجہِ مشترک ہیں۔ الگ الگ شخصیت اور طرزِ اظہار کے باوجود یہ ایک گدازِ طبیعت، دردمند دل، احساس شخصیت کا کلام ہے"۔ ایک صاحب نے کہنے

ذات عالی ظرف دوست کی گفتگو ہے جو بہت سی باتیں چشم سخن گو اور جنبشِ ابرو سے کہہ جاتی ہے۔ وہ جسے بلاغت کہا جاتا ہے آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے۔ یعنی دل و دماغ دونوں کا نور ہے۔ اس ہیجانی دور میں صحیح ادبی توازن کو برقرار رکھنا بڑی خوش فہمی عظمت کی نشانی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی"۔

آزاد صاحب کی غزلوں اور نظموں کے چند اشعار دیکھئے :-

جب جوشِ جنوں ہو گرمِ سفر وہ بند و سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندیٔ ساحل کیا جانے
جو برق میں ضو ہے شمع میں لو پارے میں تڑپ کندن میں چمک
پابندِ طلسمِ دیر و حرم وہ دردِ ترا دل کیا جانے
وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو
اس راز کو رہبر کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلزار میں رقصاں دیکھیں گے
اے شاخِ فسردہ مایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے
ظلمات کی ہر اک موج کہن سورج کی کرن بن جائے گی
اے شامِ الم اک روز تجھے ہم صبحِ درخشاں دیکھیں گے
اے رازِ محبت بول ذرا یہ عقدۂ نازک کھول ذرا
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے
اس وقت جو اپنی فکر میں ہے اس وقت جو اپنے عزم میں ہے
اس طرح کی اک تصویر تری اے عالمِ امکاں دیکھیں گے

اک بار اگر قفس کی ہوا راس آ گئی
اے خود فریب پھر ہوسِ بال و پر کہاں
مانا چمن میں حکم زباں بندیوں کے ہیں
رازِ جنوں کو فاش کریں ہم مگر کہاں

داغ ہے دل کا کسی روز چمک اُٹھے گا — یہ کوئی درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
صدمۂ ہجر ترا ایک قیامت ہے مگر — نہیں احسان کسی کا کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

آزاد کی شاعری عصرِ حاضر کی آواز ہے۔ ایک دل نشیں آواز۔ آن کے پہلو میں ایک ترقی پسند اور درد مند دل دھڑکتا ہے۔ آزاد کے اسلوبِ سخن کے بارے میں کنہیا لال کپور لکھتے ہیں۔

"جگن ناتھ آزاد دبستانِ اقبال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں دعوتِ فکر ہے دعوتِ نشاط نہیں۔ اُن کی چند نظمیں بالخصوص "شکنتلا"، "ماتمِ اقبال" اور "بہادر شاہ ظفر کا مزار" شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔"

آزاد جہاں ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر ہیں وہاں انھوں نے ایک بے لوث فطرت بھی پائی ہے۔ آزاد کی شخصیت میں بلا کی مجلسی کشش ہے اور پڑھنے کو بھی ایک نرالا طرز ہے۔ جو محفل میں اُن کی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ آپ مشاعروں، ادبی نشستوں اور محفلوں پر چھا جاتے ہیں۔

ہند و پاکستان میں جگن ناتھ آزاد کی شہرت ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے ہے۔ لیکن اُن کے نثری کارنامے بھی کم اہم نہیں۔ اُن کی کتاب "جنوبی ہند میں دو ہفتے" اُن معدودے چند ادبی رپورتاژوں میں سے ہے جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ علمی ادبی موضوعات پر آزاد کے مقالات کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں لیکن اُن پر ہر طرح سے بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کی مثل صادق آتی ہے۔

تصنیفات

آزاد صاحب کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ بہت سی زیرِ طبع ہیں۔ ایسی بھی ہیں جو زیرِ ترتیب ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں اُن کا پہلا مجموعہ "بیکراں" شائع ہوا۔ اب یہ مجموعہ نایاب ہے۔ عنقریب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا۔[1] دوسرا مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذرّوں تک" شائع ہو چکا ہے

[1] اب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے (ج۔ س۔ ا) اس کے بعد اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ پانچواں ہندی رسم الخط میں بنارس سے شائع ہوا ہے۔ اور چھٹا ایڈیشن پاکستان سے چھپا ہے۔ جو پہلا پاکستانی ایڈیشن ہے، پاکستانی ایڈیشن مکتبہ کاروان لاہور سے شائع ہوا ہے۔

(مدیر مجلّے)

حال ہی میں مکتبہ شاہراہ نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ "وطن میں اجنبی" ایک طویل نظم ہے یہ نظم اُن تاثرات کا مجموعہ ہے جو تقسیم ہند کے بعد متعدد بار مشاعروں اور محفلوں میں شرکت کرنے کے لئے پاکستان جانے سے پیدا ہوئے۔ دو طویل نظمیں "اردو" اور "اجنتا کے غاروں میں" الگ الگ کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا چوتھا مجموعۂ کلام "جاوداں" زیرِ طبع ہے۔ نثر میں "جنوبی ہند میں دو ہفتے" کے نام سے ایک طویل رپورتاژ اور "پٹنے کی ایک رات" چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ دو سفرنامے "مشرقی بنگال میں چند روز" اور "یاں سے وہاں تک" زیرِ طبع ہیں۔ نثر کا ایک مجموعہ "نشانِ منزل" کے عنوان سے زیرِ ترتیب ہے جو مقالات اور ریڈیو سے نشر شدہ تقریروں پر مشتمل ہے۔

جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں: "میری مادری زبان پنجابی ہے۔ لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے صحیح یا غلط اسی میں شعر کہتا ہوں اور اسی کے ذریعے سے اپنا مافی الضمیر پڑھنے والوں اور سننے والوں تک پہنچاتا ہوں۔ اس زبان کو ایک ایسی زبان سمجھتا ہوں جس کی ترقی میں مجھے ہندوستان کی ترقی پنہاں نظر آتی ہے۔ اُردو کی قومی روایات کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتا ہوں اور ایک محبِّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے ان پر فخر کرتا ہوں۔"

بتیا۔ مارچ ۱۹۵۱ء

اقبال اور مغربی مفکرین

محمد ایوب واقف۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں جس خلوص اور محبت کے ساتھ آپ نے اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کسی اور نے نہیں کی اور ماشاء اللہ کام بھی اتنی ہی لگن سے کیا ہے اقبال کی روح یقیناً آپکو دعائیں دیتی ہوگی۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ماہرینِ اقبالیات میں آپکا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ اگلے دن اعجاز صدیقی آپکے علمی اور ادبی کاموں کی داد میرے سامنے دے رہے تھے ہندوؤں میں اسلامی علوم وفنون کا ایسا ماہر اور قدردان میری نظر سے نہیں گزرا۔

بمبئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۶ء (ایک خط کا اقتباس)

عقیل عیسیٰ خیلوی

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد اُردو کے اُن نامور شاعروں اور نثر نگاروں میں سے ہیں، جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یکساں مقبول ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے جن شعراء کو پاکستان کی ادبی انجمنوں نے لاتعداد بار اپنے مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی۔ ان میں جگر مراد آبادی مرحوم اور جگن ناتھ آزاد کے نام سرِفہرست ہیں۔

جگن ناتھ آزاد ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء عیسیٰ خیل ضلع میانوالی (پاکستان) میں پیدا ہوئے آپ کے والد جناب تلوک چند محروم اُردو کے نامور ترین شعراء میں تھے۔ آزاد نے تعلیم و تربیت کی ابتدائی منزلیں اُنہیں کی زیرِ نگرانی طے کیں۔ لاہور میں مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید عابد علی عابد سے اکتسابِ فیض کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ تقسیم کے بعد دہلی میں تھوڑی مدت انگریزی ہفت وار "ایمپلائمنٹ نیوز" کے ایڈیٹر بنے۔ پھر چند برس 'آج کل' اور 'بساطِ عالم' کے مدیر معاون رہے۔ جون ۱۹۵۵ء میں وزارتِ اطلاعات و نشریات میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں یورپ کا سفر کیا۔ واپسی پر آپ نے کافی دن ہسپانیہ کی سیاحت میں صرف کئے اور قرطبہ غرناطہ، اشبیلیہ، مدینۃ الزہراء اور مسلمانوں کے دوسرے تاریخی مقامات دیکھے جن کا مفصل ذکر آپ نے سفرنامہ "سیرِ فرنگ" میں موجود ہے۔ ہندوستان واپس آکر سینٹرل ویئر ہاؤسنگ کا [illegible] انگریزی ماہنامہ مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں آپ کا تبادلہ منسٹری آف ٹرانسپورٹ

میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے ہوگیا۔ مارچ ۱۹۶۶ء سے پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا" سری نگر میں ڈپٹی پریس انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ جہاں سے آپ ۱۹۷۷ء میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

ہند و پاک مشاعروں کے ایک مقبول شاعر ہونے کے علاوہ آپ نظم و نثر پر مشتمل چھوٹی بڑی پینتیس کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں[1]۔ علمی اور ادبی کارناموں کے سلسلے میں اور مختلف ادبی دعوتوں پر روس، امریکا، کنیڈا، نیپال، برطانیہ، مصر، برما، متحدہ عرب امارات، بحرین، مغربی یورپ کے اکثر ممالک کا اور کئی بار پاکستان کا سفر کر چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں انہوں نے لاہور اور سیالکوٹ میں اقبال عالمی کانگرس میں شرکت کی۔ ۱۹۷۸ء میں آپ نے روس کا دورہ کیا اور وہاں چار یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے علاوہ متعدد ادبی انجمنوں میں اپنا کلام سنایا اور تقریریں کیں۔

اپریل ۱۹۸۱ء میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اسلام آباد کی دعوت پر پاکستان کا دورہ کیا اور پنجاب یونیورسٹی لاہور، کراچی یونیورسٹی کراچی، پشاور یونیورسٹی پشاور اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر چار لیکچر دیئے۔ یہاں بھی متعدد ادبی انجمنوں میں انھوں نے اپنا کلام سنایا اور تقریریں کیں۔ اس سفر میں آپ اپنی زاد بوم عیسیٰ خیل بھی تشریف لائے اور ضلع کے صدر مقام میانوالی بھی۔ دہلی واپس پہنچ کے آپ نے ایک بیان میں بتایا کہ میرا یہ سفر آنسوؤں کی وادی کا سفر تھا اور بالخصوص عیسیٰ خیل اور میانوالی کا سفر محض ایک جذباتی سفر نہیں تھا بلکہ ایک روحانی سفر تھا۔

انہیں ادبی کارناموں کے سلسلے میں کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی کی جنرل کونسل ساہتیہ اکیڈمی اُردو ایڈوائزری بورڈ اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی جنرل کونسل کے رکن ہیں۔ اقبال کمیٹی جموں و کشمیر کے بھی رکن ہیں اور جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی اردو ایڈوائزری کمیٹی کے بھی۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کے "بچوں کا ادب" کمیٹی کے بھی آپ رکن ہیں۔

---

[1] اس وقت جگن ناتھ آزاد کی تصانیف کی تعداد تینتالیس سے تجاوز کر چکی ہے۔ (مدیر)

اردو کے علمی اور ادبی حلقوں میں آزاد کو ہند اور پاکستان کے درمیان ایک جذبۂ خیر سگالی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام "وطن میں اجنبی" جو پاکستان کے متعدد شہروں کی یادوں سے معمور ہے۔ دونوں ملکوں میں بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ مجموعہ کلام گجراتی رسم الخط میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مجموعہ کلام "بیکراں" کا ایک ایڈیشن ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی اکثر نظموں کے ترجمے انگریزی، روسی، بنگالی، اڑیا اور گجراتی میں ہو چکے ہیں۔

علامہ اقبال کے کلام سے آزاد کو والہانہ عشق ہے۔ علامہ مرحوم کے فکر و فن کے متعلق آپ کی تصانیف "اقبال اور اس کا عہد"، "اقبال اور مغربی مفکرین"، "اقبال اور کشمیر"، "بچوں کا اقبال"، "اقبال کی کہانی" اور "اقبال زندگی شخصیت اور شاعری" ہندو پاک کے نامور نقادوں کے نزدیک اقبالیات میں گراں بہا اضافے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر اس وقت تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" (حمیدہ سلطان احمد) "جگن ناتھ آزاد" (پرکاش پنڈت) اور "جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ" (محمد ایوب واقف) اکثر رسالوں کے جگن ناتھ آزاد نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں آپ نے اقبال نمائش مرتب کی جس کا افتتاح سری نگر میں ہوا سری نگر کے بعد یہ نمائش ہندوستان کے متعدد شہروں مثلاً علی گڑھ (دوبار) دہلی (تین بار) حیدرآباد، بھوپال، پٹنہ، بمبئی، پونا، ونیم باڑی، مدراس، چنڈی گڑھ، لکھنؤ اور اجمیر شریف میں دکھائی گئی۔ حال ہی میں جگن ناتھ آزاد نے اسی نمائش پر مبنی ایک البم "مرقع اقبال" کے نام سے مرتب کیا ہے جو پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد اس وقت جموں یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو ہیں۔ اقبال آپ کا خاص موضوع ہے اور اقبال اور اقبالیات کے موضوع پر ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں لیکچر دے چکے ہیں۔

نسیم کنّاھی

جگن ناتھ آزاد کا ورودِ لکھنؤ

عزیز دوست جگن ناتھ آزاد سے ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی اور لاہور کی کتنی ہی محفلوں کی یادوں کے زخم ہرے ہو گئے۔ آزاد آج کل حکومتِ ہند کے بہت بڑے افسروں میں ہیں۔ مگر اخلاقِ عالیہ اور شاعرانہ عظمت اُنہیں ورثہ میں ملی ہے۔ آزاد نے بارہ سال کے اس قلیل عرصہ میں ارتقاء کے جو منازل طے کئے ہیں اور ادب و شعر کی جن بلندیوں کو چھو لیا ہے وہاں تک ہر کسی کی رسائی نہیں ہوتی۔ آزاد شاعر ابنِ شاعر ہیں اور ایسے شاعر کہ خود فنِ شعر کو اُن پر ناز کرنا چاہیئے۔ لکھنؤ میں اُن کی تشریف آوری ہر چند کہ بسلسلۂ کارِ سرکار تھی مگر اُن کے مخلصین و مداحین کو جیسے ہی اطلاع اُن کے آنے کی ملی پروانہ وار ٹوٹ پڑے۔ مجھے اپنے فاضل وقت کے استعمال کا حق اگرچہ انہوں نے اخلاقاً مجھے عطا کر دیا تھا مگر اُن کے معتقدین کے سامنے میری کیا چل سکتی تھی۔ لہٰذا نظم و ضبط کے سارے دعووں کو بالائے طاق ہی رکھنا پڑا۔ اور ابتدا محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ سے ہوئی۔ جن کے آدابِ مہمان داری اور مدارات شفقت آمیز سے جی بیحد متاثر ہوا۔ اس دعوت میں جناب ماتھر انچارج پریس انفارمیشن بیورو اور مسز ماتھر بھی شریک تھیں۔ ۵ نومبر کی رات کو چند نگر عالم باغ لکھنؤ میں ایک ادبی نشست کا اہتمام و انتظام افسانہ نگار رام لعل نے کیا۔ محفل کہانی کار سردار رتن سنگھ کے دولت کدے پر منعقد ہوئی اور بڑی رات گئے تک سامعین کا ذوقِ شعر و ادب جناب آزاد کے کلامِ میخانہ نظام سے سیراب ہوتا رہا۔ شرکائے بزم میں ڈاکٹر ملکانی، ڈاکٹر رام لعل

بہار، پران ناتھ، سیٹھی وکیل خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ۸ نومبر کو محترم حیات اللہ صاحب انصاری نے آزاد صاحب کے اعزاز میں دعوت چائے دی۔ جہاں ایک مختصر سی نشست کے بعد یہ قافلہ یو پی پریس کلب لکھنؤ پہنچا، جہاں لکھنؤ کے انگریزی، ہندی، اردو کے دیگر رسائل و جرائد کا اجتماع تھا۔ جناب منظر سلیم صاحب نے آزاد صاحب کا تعارف حاضرین مجلس سے کرایا اور محترم حیات اللہ صاحب انصاری مدیر قومی آواز لکھنؤ کی صدارت میں بزم سخن آراستہ ہوئی۔ آزاد صاحب نے اپنی بے پناہ نظموں اور غزلوں سے سماں باندھ دیا ایک ایک شعر پر سبحان اللہ کے ڈونگرے برستے رہے۔ اختتام محفل پر جناب صلاح الدین صاحب رکن ادارہ نیشنل ہیرالڈ نے آزاد صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ اور چائے کا دور شروع ہوا جس کے دوران میں خوش مذاق سامعین نے آزاد صاحب کو ایک صوفیانہ غزل سنانے پر مجبور کر دیا جس کے محرک جناب رضا انصاری صاحب تھے۔ جن کو باوصف علالت و نقاہت کے اُن کا خلوص اس محفلِ ادب میں کھینچ لایا تھا۔ غزل کیا تھی بادۂ حافظ کا ایک جام تھی۔ یہاں سے فرصت ہوئی تو اب یہ کاروانِ شعر و ادب چودھری محمد محمود صاحب کرسی والا کے دولت کدہ ڈیلگنج پہنچا، جہاں چودھری صاحب نے آزاد صاحب کے اعزاز میں دعوت طعام کا انتظام کر رکھا تھا۔ شرکائے ضیافت میں جناب حیات اللہ صاحب انصاری مدیر قومی آواز، جناب رضا انصاری، جناب رام لعل صاحب اور جناب منظر سلیم صاحب بھی تھے۔ چودھری محمد محمود صاحب بڑے ہی مخلص اور ادب دوست بزرگ ہیں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ عزیز دوست جگن ناتھ آزاد کو رخصت کرتے ہوئے دل بے اختیار بھر آیا۔ اور بے ساختہ یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

بفرو خلند مبارک باد   بسلامت روی و باز آئی

دیکھئے خدا کب پھر بچھڑے ہوؤں کو ملاتا ہے۔ فی الحال تو

ہزار زہد و عبادت نثار ہیں اُن پر   حضورِ دوست جو گزری ہیں ساعتیں خوش خوش

"مادرِ وطن" لکھنؤ۔ ۹ نومبر ۱۹۵۹ء

اعجاز نسرین
(شکاگو - امریکہ)

شکاگو میں اردو مشاعرہ

گزشتہ سال اکتوبر نومبر ۱۹۸۰ء میں ہونے والے مشاعروں کی نغمگی ابھی فضاؤں میں رچی بسی تھی کہ اردو سوسائٹی آف امریکہ اور کینیڈا نے ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور سرزمین شکاگو ایک بار پھر اردو ادب کے درخشندہ ستاروں سے جگمگا اٹھی۔ اہلِ شکاگو کی خوش قسمتی سمجھئے کہ پاکستانی شعراء کے علاوہ بھارت سے جگن ناتھ آزاد جیسی جانی پہچانی بلند و بالا شخصیت بھی ان مشاعرے میں شامل ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد الیسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے سالانہ ڈنر کے موقع پر علامہ اقبال کے بارے میں چند لیکچر دینے کے لئے مدعو تھے انہیں دنوں میں چونکہ مشاعرہ بھی تھا اس لئے احمد خاں آرگنائزر مشاعرہ اور افتخار نسیم کی درخواست پر جگن ناتھ آزاد نے کمال مہربانی سے مشاعرے میں شمولیت کی دعوت قبول کر لی

یہ مشاعرہ پاکستانیوں کے لئے اس لحاظ سے بھی یادگار مشاعرہ تھا کیونکہ اس میں پہلی بار پاکستان کے چند چوٹی کے شاعر اکٹھے شامل ہو رہے تھے اور وطن سے دور رہنے والے اپنے محبوب شاعروں کو سننے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کو بے چین تھے۔

خیر خدا خدا کر کے ساڑھے نو بجے پردہ اٹھا اور قتیل شفائی، ضمیر جعفری، جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، صہبا اختر اور پروین فنا سید دکھائی دیں۔ لوگوں نے پر جوش تالیوں سے خیر مقدم کیا جناب عابد اللہ غازی نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اپنے شاعروں کو سننے کے اشتیاق کا عالم یہ تھا کہ لوگوں نے سپاسنامہ بھی بمشکل سنا۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض رحیم اللہ نے نہایت کامیابی سے ادا کئے۔ صدارت

کے لیے جناب جگن ناتھ آزاد کا نام تجویز کیا گیا جس پر سب نے خوشی کا اظہار کیا۔

اس مشاعرے میں جمیل الدین عالی نے اپنے مشہور ترانہ جیوے جیوے پاکستان سنایا ترانہ شروع کرنے سے پہلے عالی جی نے کہا۔

میں ہندوستانیوں سے تو نہیں' پاکستانیوں سے کہونگا کہ وہ ترانے میں میرا ساتھ دیں؛ اور جب عالی جی نے ترانہ شروع کیا تو ان کی آواز کے ساتھ ہر پاکستانی کی آواز شامل ہو گئی۔ بین کنگ ہائی اسکول کے در و دیوار "جیوے جیوے پاکستان" کی آواز سے گونج اٹھے۔ وطن کی سلامتی اور بقا کے لئے مانگی جانے والی دعا میں ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن شامل تھی اور جس جوش جذبہ اور والہانہ عقیدت سے یہ ترانہ گایا جا رہا تھا اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جب آزاد صاحب مائک پر آئے اور انہوں نے کہا۔

جمیل الدین عالی نے کہا ہے کہ میں ہندوستانیوں سے تو نہیں پاکستانیوں سے کہوں گا میرا ساتھ دیں تو حضرات میں تو اس ہندوستانی کو ہندوستانی ماننے کو بھی تیار نہیں جو جیوے جیوے پاکستان کے جذبہ کا ساتھ نہیں دیتا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب عالی جی اپنی جگہ سے اٹھے اور بے اختیار آزاد صاحب سے لپٹ گئے سارا ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔

جگن ناتھ آزاد نے اس زمانے کی یاد کو تازہ کیا جب دنیا کے نقشے پر ہندوستان دو آزاد ملکوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بھارت اور پاکستان۔ اور آزاد ۱۹۴۸ء میں اپنے وطن اور پیارے لاہور میں ایک مہمان کی حیثیت سے مشاعرے میں آئے۔ وہی غزل انہوں نے سنائی۔

تری بزم طرب میں سوز پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّام بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

سامعین کی فرمائش پر آزاد صاحب نے اپنی پرسوز آواز میں تین چار غزلیں سنائیں جو بے حد پسند کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی مشاعرے کا پہلا دور ختم ہوا۔

حمیدہ سلطان احمد
(دہلی)

جگن ناتھ آزاد ——— میرا بھائی

آزادی کے سہانے خواب کی تعبیر دلّی کے لئے بڑی دل شکن آئی۔ اس کی گود کے پلے اکثر دلّی کی گود خالی کر گئے اور جو باقی رہے وہ اس ہنگامہ میں ۱۸۵۷ء کے خونی دور کو بھی بھول گئے۔ آخر کار ہندوستان کی عظیم ترین ہستی نے اپنی جان دلّی کو تباہ ہونے سے بچانے کی خاطر قربان کر دی اور اس بڑے انسان کی شہادت کے بعد یہ طوفان تھم گیا۔ دلّی والوں نے پھر سُکھ کا سانس لیا۔ اس قیامت میں شکر ہے ہم لوگ دلّی میں نہ تھے۔ حسبِ معمول شیلانگ گرمیاں گزارنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ وہیں دلّی کی بربادی کی خبریں ملتی رہیں۔ ہمارا گھر بھلا اس داروگیر میں کیسے بچتا۔ وہ بھی لُٹا اور میں دلّی اجڑنے اور اپنی قیمتی قلمی کتب کے ضائع ہونے پر شیلانگ میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ جی یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح دلّی پہنچ جاؤں۔ لیکن بھلا ان حالات میں مجھے کون دلّی آنے دیتا۔ امن ہوتے ہی ۱۹۴۸ء کے اکتوبر میں اور گھر والوں کے ہمراہ میں دلّی پہنچ گئی۔ ویسے تو دلّی اب بھری پری نظر آتی تھی لیکن ماحول بالکل بدلا ہوا سا تھا۔ ہر جانب نئی صورتیں دکھائی دیتی تھیں اور فضا اداس سی تھی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی نشستیں ڈاکٹر عبادت بریلوی دلی کالج میں ان دنوں کرتے تھے اور وہاں اکثر پنجابی شاعر و ادیب کبھی آجاتے تھے اور ہم سب مل کر اس کی پریشان حالی کا ماتم کرتے رہتے تھے کہ خبر ملی کہ اردو کو بھی دیس نکالا دیا جا رہا ہے۔ علامہ کیفی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے عرض کیا۔ "قبلہ اجازت دیجئے آپ کی سرپرستی میں اردو مجلس قائم کی جائے تاکہ اردو کے تحفظ کے لئے کچھ کام ہو سکے۔" کیفیؔ نجھانی کا وجودِ بابرکت اس لامحدود اندھیرے میں ـ

منارۂ نور کے مانند تھا۔ اگلے وقتوں کے آدمی اور اس دلّی کے شیدا تھے جہاں ہندو مسلمانوں نے مل کر اردو کو کنگھی چوٹی سے سنوارا۔ ان کو اس انقلاب پر حیرت بھی تھی اور افسوس بھی۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ دہلی کے بعض ادیب دونوں کی امداد بھی شامل حال ہوئی اور اردو مجلس ہارڈنگ لائبریری میں باقاعدہ جم گئی۔ اس کی نشستوں میں دلّی کے ادیبوں شاعروں سے زیادہ پنجاب والے آتے تھے۔ غالباً نومبر ۱۹۴۹ء کا مہینہ تھا۔ اس دن انجمن کے اراکین میں میرے اور علامہ مرحوم کے علاوہ اور کوئی کافی وقت گزر جانے پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ علامہ سرنگوں بیٹھے غالباً اس ادبی چہل پہل کے زمانے کو یاد کر رہے تھے جب دلی کے ہر دیوان خانے میں شعروادب کے تذکرے رہتے تھے۔ اور میں یہ سوچ کر گھبرا رہی تھی کہ شاید آج کوئی بھی نہیں آئے گا۔ قدموں کی آہٹ ہوئی میں نے نظر اٹھائی اک کھلتے ہوئے سانولے رنگ کا نوجوان جس کے خط و خال سے ذہانت ٹپک رہی تھی مبہم سی مسکراہٹ لبوں پر لئے کالی شیروانی زیب تن کئے کالے فریم کا چشمہ لگائے سامنے کھڑا تھا اس نوجوان نے پہلے علامہ کیفی کے سامنے جھک کر ادب سے سلام کیا اور پھر مجھے کیفی صاحب نے مسکرا کر کہا "آؤ آزاد آؤ۔ شکر ہے یہاں کا سکوت تو اب ٹوٹا۔ ہاں بھئی سناؤ کوئی اپنی تازہ چیز" اور آزاد نے بہت خوب کہہ دونوں زانو بیٹھ کر سنانا شروع کیا۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

آزاد کا دلکش سوز میں ڈوبا ہوا ترنم مجھے بہت اچھا لگا۔ ان کے شائستہ انداز اور مستعلیق طور طریقوں نے مجھ پر یہ واضح کر دیا کہ ان کا شمار بھی اس غنیمت میں ہے جو پنجاب سے دلّی کو ملا ہے۔ اس کے بعد اکثر آزاد اردو مجلس کی نشستوں میں شریک ہوتے اور جان محفل بنے رہتے۔ میں فطری طور پر رکھ رکھاؤ کی ایسی عادی ہوں کہ اکثر لوگوں سے بہت دنوں تک ملتے رہنے کے بعد بھی کھل کر بات نہیں کرتی اور بہت سئے دیئے رہتی ہوں لیکن چند شاعر اور ادیب ایسے بھی ہیں جو کچھ ملاقاتوں کے بعد بھی میرے بے تکلف دوست بن جاتے ہیں۔ میری پسندیدہ ادبی شخصیتوں میں آزاد کا شمار بھی ہے ۱۹۵۰ء سے تو آزاد انجمن ترقی اردو کی شاخ دہلی کی انتظامیہ کمیٹی کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے میرے ادبی کاموں میں ایک ساتھی ہیں۔

ملنے کے چند مہینے بعد ہی آزاد نے مجھے آپا جان کہنا شروع کر دیا تھا اور میں بھی چھوٹے بھائیوں

کی طرح آزاد کو چاہتی ہوں۔

والدہ صاحبہ مرحومہ کے تو آزاد بہت چہیتے تھے۔ وہ اُن سے اکثر شعر سنتیں اور خوش ہوتیں۔ آزاد کبھی کبھی مشاعروں کے چکر میں پھنس کر بہت دنوں تک نظر نہ آتے تو مرحومہ ناراض ہو کر فرماتیں "اسے نوج آج کل کے مشاعرے بھی موئے جان کا عذاب ہو گئے ہیں۔ خدا جانے یہ آزاد کہاں مارا مارا پھر رہا ہے کہ مہینوں سے شکل بھی نہیں دکھائی" اور جب آزاد کو اس خفگی کی خبر ملتی وہ فرصت پاتے ہی ایک عجب مسکراہٹ لبوں پر لئے سمہ تن انفعال بنے موجود ہو جاتے اور اُن کی صورت دیکھتے ہی فرمائشوں کی بوچھار شروع ہو جاتی۔ والدہ صاحبہ فرماتیں "ہاں سلام سناؤ" آزاد مؤدبانہ انداز سے سلام پڑھتے۔ میں کہتی بھئی میں تو وہ پٹنے کے مشاعرے والی غزل سُننا چاہتی ہوں" اور نجمہ فرمائش کرتیں بھیں تو آپ کی وہ چیز بہت پسند ہے۔

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں "

شہید اختر بھولا منہ بنا کر کہتی" چھوٹی بہن کی بھی تو سُن لیجئے! بھائی مجھے تو وہ غزل بالکل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ ع اے دل الجھ گیا ہے مذاقِ نظر کہاں۔ بس میں تو وہی سنوں گی اور بڑے بھائی کے کان آپ کے خلاف بھروں گی"

آزاد مسکرا کر کہتے "اچھا بہت اچھا" اور دل نشیں انداز میں سب کی فرمائش پوری کر دیتے

کوئی شاعر بھی اس دور میں وقتی تحسین و ستائش کے سہارے زیادہ دن نہیں چل سکتا جب تک اس کے کلام میں حقائق نہ ہوں۔ غمِ دوراں میں پھنس کر آج کا انسان غمِ جاناں کو بھول سا گیا ہے اس لئے اب ہمارے شعر و ادب سے بھی رندی مستی کے عناصر بالکل خارج تو نہیں ہو گئے لیکن اب ذوق بالکل بدل گیا ہے۔ اس ماحول میں صرف چھلکتی ہوئی گردن اور تھرکتے ہوئے قدموں کی کہانی سنانے والا شاعر پنپ نہیں سکتا۔ آزاد صرف رسمی شاعری نہیں کرتا بلکہ ان طوفانوں سے بھی کھیلتا ہے جو انقلاب کے دھارے میں بہا کر اس کو کہاں سے کہاں لے آتے ہیں۔ قدرت نے آزاد کو حساس دل بھی دیا ہے اور متفکر دماغ بھی۔ صحیح روحانیت کے ساتھ پاکیزگی تخیل اور

حسنِ بیان کی دولت سے بھی آزاد کی شاعری مالا مال ہے۔

موجودہ دور کے اضطراب نے آزاد کو رومان کی وادیوں میں گھومنے کے لئے زیادہ وقت نہیں دیا۔ اس دوران جب ہر طرف بھیانک حقیقتیں مونھ پھاڑے ڈائن کی طرح کھڑی ہیں تو کوئی مفکر انسان رومان کی افیون کھا کر غافل نہیں رہ سکتا۔ لیکن اقبال کے مدح خواں اور پنجابی ہونے کے باوجود آزاد کی شاعری اقبال سے متاثر نہیں ہے۔ آزاد کا لب و لہجہ دل نشین انداز، ایک معتدل مزاج انسان کی تصویر ہے۔ بپھرے ہوئے انقلابی کے روپ میں آزاد کبھی نظر نہیں آتے۔ آزاد کی شاعری میں درد آمیز گھلاوٹ ہے، ہلکی سی افسردگی ہے اور یہ کیفیت ۱۹۴۷ء کے بعد کی نظموں میں اور بھی زیادہ ہے۔ جب آزاد کو تقسیم ہند کے بعد بہ مجبوری اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ لیکن آزاد کا شعور پختہ ہے اس لئے اس افسردگی کے باوجود ان کی شاعری میں خود اعتمادی کا جذبہ بھی ہے۔ اردو سے آزاد کو عشق ہے حالانکہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے مگر ان کو اردو سے لگاؤ اتنا ہے جیسا کسی اہلِ زبان کو ہونا چاہیئے اور ان کا لب و لہجہ بھی دلی والوں کا سا ہے۔ یہ رائے صرف میری نہیں اردو کے اور بلند پایہ ادیبوں کی بھی ہے۔

آزاد کی طویل نظم "اردو جواب" چھپ چکی ہے اور جس کو قبول عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے سالانہ جلسہ ۱۹۵۲ء میں آزاد نے پڑھی تھی۔ ہندوستان کے اکثر مشاعروں میں یہ نظم آزاد سے فرمائش کر کے سنی گئی اور پسند کی گئی۔ اس نظم کے متعلق قاضی محمد عبدالغفور صاحب نے فرمایا تھا۔

"یہ نظم جواب شائع ہوئی ہے اردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ میری مادری زبان اردو ہے یا میں انجمن ترقی اردو کا سکریٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ کا ایک جزو ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے۔ اس کے چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے سیلوک دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے انکار کر دینا ان کو باطل نہیں کر سکتا

تاریخ کے گواہ تعصب پسند اور سخن ساز سیاست کی سخت ترین ضربیں کھاکر بھی
زندہ رہا کرتے ہیں۔

آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء
کے فرقہ واری فتنہ کی آگ میں گزر کر اور آوارۂ وطن ہوکر ہندوستان آئے
اور پھر بھی ادنیٰ تعصبات کی اس گندگی سے انھوں نے اپنا دامن بچا لیا جس
سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام
ہے۔ ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ
تو غیب کی آواز ہے۔"

آزاد کی شاعری جدید ہے اور ارتقا پسند۔ اس ادبی آشوب کے زمانے میں اُن گنتی
کے شعراء میں آزاد کا شمار کیا جاتا ہے جن کی قادر الکلامی کا سکّہ دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ آزاد کی
وہ نظمیں بھی جو خالص سیاسی ہیں لوچ اور دل کشی سے لبریز ہیں۔ بعض دوسرے نوجوان شعراء
کی طرح اُن کا لہجہ کبھی کرخت نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ سخت سے سخت بات بھی شیریں اور دل آویز
انداز میں کرتے ہیں۔ مجھے دراصل آزاد کی شاعری پر تنقید کرنا نہیں، میں تو آزاد کی دل کش
شخصیت کا تعارف کرا رہی تھی لیکن ہر لکھنے والے کی تحریریں اس کے کردار کی آئینہ دار ہوتی
ہیں۔ اس لئے مجھے بھی آزاد کی شاعری کا ذکر سرسری طور پر کرنا پڑا۔ آزاد کی متعدد نظموں سے
اُن کے عالی ظرف اور صاف دل ہونے کا اعلان ہوتا ہے: "بھارت کے مسلمان"، "شہادت حسین"
"اے کشورِ ہندوستان"، "تقسیم پنجاب"، "اجنتا کے غاروں میں"، "دہلی کی جامع مسجد"، "بہادر
شاہ ظفر" اور "گاندھی" یہ نظمیں صرف بلند پایہ ادبی شاہکار ہی نہیں بلکہ آزاد کے فکرِ بلیغ اور
صاف ذہنی کی ایسی روشن تحریریں ہیں جن کی تابانی سے اردو ادب کی فضا منور ہو رہی
ہے۔ اس وقت ہند و پاک کے چند رسائل میرے سامنے ہیں۔ ایک نظر اُن کے اقتباسات
دیکھئے جن سے میرے ان خیالات کی بڑی حد تک تائید ہو رہی ہے۔

"جگن ناتھ آزاد بھارت کا نوجوان شاعر جو پنجاب کے نغمے گاتا ہے اس کا
جسم دلّی میں ہے اور روح لاہور میں۔ وہ پنجاب کا بیٹا تھا وہ وطن چھوڑنے

پر مجبور ہوا۔ دلّی اس کا نیا وطن ہے مگر پرانے وطن کی یاد جب زیادہ ستاتی ہے تو وہ اپنے وطن میں آجاتا ہے جہاں اب وہ "پردیسی" ہے اسی ہفتے وہ لاہور آیا۔ میاں بشیر احمد سابق سفیر ترکی نے اس کے چند احباب اور رفیقوں کو اس سے ملاقات کرنے کے لئے جمع کیا۔ ان میں جسٹس رحمان، جسٹس جان، خلیفہ عبدالحکیم، حکیم احمد شجاع اور چغتائی صاحب ایسے بزرگ بھی تھے اور نوجوان شاعر بھی۔ چند پروفیسر اور صحافی بھی تھے ان سب نے آزاد کا کلام سنا۔ سنا ہوا کلام بھی سنا اور آزاد کے اخلاص کی تاثیر تھی کہ لوگ چاہتے تھے کہ سنیں اور سنتے جائیں مگر وہ تھک گیا وہ چاہتا تھا کہ دوسرے شعراء حضرات بھی کچھ پڑھیں اور کئی شاعر پڑھنے کے لئے پر تول کر صوفوں پر بے قرار بھی تھے مگر چند دوراندیشوں نے اس محفل کو مشاعرہ بننے سے روک لیا۔ اور جب حکیم احمد شجاع صاحب آزاد کے پاس آکر بیٹھے اور فرمایا کہ مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ آپ حضرت محروم کے فرزند ہیں۔۔۔۔۔۔۔

(قندیل لاہور ۱۸ رنومبر ۱۹۵۲ء)

"جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو حمرا (آرٹ کونسل) کے زیر اہتمام منعقد شدہ ایک محفل ایسی پرسکون اور منفرد محفل کہی جا سکتی ہے جو شعرو ادب کے شائقین کو موجودہ دور میں بہت کم میسر آتی ہے۔ "آج کل" کے ایڈیٹر جگن ناتھ آزاد اور پنڈت لبھو رام صاحب جوش ملسیانی انجمن ترقی اردو کی گولڈن جوبلی میں شرکت کی غرض سے کراچی جاتے ہوئے دو ڈھائی گھنٹے کے لئے لاہور بھی ٹھہرے اور اسی دوران میں یہ محفل بھی برپا ہوئی۔ جگن ناتھ آزاد کو تقسیم ملک کے دور کا سب سے بڑا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ انہیں ملک کے ساتھ تہذیب و تمدن زبان و قلم اور سب سے زیادہ دلوں اور محبتوں کی تقسیم و تفریق کا شدید احساس ہے

برسوں کی جمی ہوئی جڑیں اکھیڑنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو صدمہ پہنچا ہے اس کا بیان جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا موضوع ہے۔ اور اسے انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اپنایا ہے۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کر دلّی پہنچ چکے ہیں اُن کے راوی اور چناب کے پیدا کردہ پرجوش بے باک اور تند جذبات میں اب گنگا جمنا کی پروردہ تہذیب کی جلا شامل ہو گئی ہے۔ ان کا خالص ہندوستانی طرز کی شیروانی پہنے وضع دار مشرقی لوگوں کی طرح وارد ہونا انگریزی لباس کے دلدادہ مہمانوں پر ایک طنز معلوم ہو رہا تھا۔

وطن میں ایک غریب الدّیار آتا ہے
خدا کرے کہ اُسے یاں کوئی نہ پہچانے

یہ شعر اُنھوں نے بعد میں سنایا مگر دیکھنے والے آزاد کی ایک ایک ادا سے ایک غریب الدّیار کے جذبات پڑھ رہے تھے۔ وہ نئے نئے چہروں کے درمیان کھویا ہوا سا آکر کھڑا ہو گیا اور یکایک پچھلی سیٹوں پر احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کو دیکھ کر اِن سے لپٹ گیا۔"

(بنت راوی لاہور یکم نومبر ۱۹۵۳ء)

"چند روز ہوئے رات کے دس بجے انارکلی کے ایک چھوٹے سے چائے خانے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں آزاد بھی تھا۔ وہ تمام دن دعوتیں کھانے اور شعر سنانے کے بعد تھک ہار کر یہیں آ بیٹھا تھا۔ وہاں چند دوست پہلے سے جمع ہو گئے تھے۔ رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ دوسرے لوگ آتے جاتے چائے پیتے اور چلے جاتے۔ کسی کو احساس تک نہ ہوتا کہ ہوٹل میں ایک ہندو بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد نہ ہندو ہے نہ مسلمان وہ ایک انسان ہے اور ایک شاعر چونکہ وہ انسانیت کا شاعر ہے اس لئے بڑا شاعر ہے۔ وہ اردو کے مسلم الثبوت شاعر تلوک چند محروم کا بیٹا ہے اور بقول سردار جعفری شاعری اُسے ورثہ میں ملی ہے لیکن وہ اس

پر قانع نہیں ہے۔ وہ زندگی کی رفتار کا ساتھ دے رہا ہے اور مشرقی نئی قدروں کا نقیب ہے۔۔۔۔"

(ہفت روزہ "برق" لاہور۔ سالنامہ ۱۹۵۴ء)

"پچھلے دنوں دہلی سے پاک و بھارت کے مقبول شاعر جگن ناتھ آزاد ــــ پاکستان تشریف لائے تھے اور پاکستان کے ہر شہر میں اُن کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ حاضرین نے ان کے کلام کو جی کھول سنا اور جی کھول کر داد بھی دی گئی۔ آزاد کو پنجابی تقسیم سے پہلے کا جانتا ہے۔ تقسیم نے کئی دلوں میں جدائی کی ایک آگ سی سلگائی ہے اور اس آگ کے سب سے بلند شعلے جگن ناتھ آزاد کے دل میں روشن ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ پاک اور بھارت میں بے حد مقبول ہیں اور اُن کا کلام ایک بار پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں"

(پندرہ روزہ "احساس" لاہور۔ ۱۵ نومبر ۱۹۵۵ء)

"مشاعرے کی مختصر کارروائی میں جو تشنگی کا احساس باقی تھا اُسے آخری شاعر جگن ناتھ آزاد نے پورا کر دیا۔ پروفیسر تلوک چند محروم کے صاحبزادے آزاد کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی شاعری میں جذبۂ حبِ وطن کی حلاوت ہے۔ اُن کے اشعار سے وطن کی محبت اس حد تک ٹپکتی ہے کہ ہر شخص کو اُن کی وطن سے دوری شاق گزرتی ہے۔ آزاد صاحب نے اپنی مشہور طویل نظم میں تقسیم ملک کے واقعات جس انداز میں بیان کئے ہیں اُن سے ہر شخص اس جنون پر ندامت محسوس کرتا ہے۔ بیحد ندامت کے بعد ان کی آواز کے ارتعاش میں گھلی ہوئی برادرانہ محبت کے جذبات ہمارے ضمیر کو

مجبور کر دیتے ہیں۔ کہ اُٹھ کر اُن سے لپٹ جائیں اور کہیں۔ آزاد صاحب! آپ اجنبی نہیں۔ آپ کی طرح ہمیں بھی گذشتہ واقعات نے بہت دکھ پہنچایا ہے۔ آیئے۔ اب تلافی کر دیں اور بھائیوں کی طرح رہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے کلام کے ماثر سے رفاقت کا جو جذبہ بیدار کر دیا ہے اس کی بنا پر انہیں ہم دونوں ممالک کے درمیان "امن اور خیرسگالی کا رابطہ" قرار دے سکتے ہیں۔ جب آپ نے اپنی نظم کے چند بند پڑھے تو دل پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

آزاد اپنی نظم میں کہتے ہیں

وطن کو یہ پیامِ جانفزا دینے کا وقت آیا
کہ اب بچھڑوں کو آپس میں ملا دینے کا وقت آیا
سیاست سے کہیں ہے رتبۂ انسانیت اونچا
یہ بات اہلِ سیاست کو سنا دینے کا وقت آیا ......"

(اقدام لاہور۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء)

"کل کے مشاعرے میں بھارت کے شاعر جناب آزاد نے (جن کا وطن پنجاب ہے) پاکستان کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا کا اظہار کیا ہے اور جس بلند حوصلگی اور خلوص کے ساتھ پاکستان کا ذکر کیا ہے وہ نہ صرف اُن کے اپنے جذبات تھے بلکہ وہ بھارت کے عام آدمیوں کی ترجمانی بھی تھی اور ان جذبات کا موثر نہ ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ یہ وہ دلی جذبات تھے جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہیں۔ محبت کسی پابندی کو قبول نہیں کرتی۔ محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہ عالمگیر ہے، وہ دوامی ہے۔ وہ

پاسپورٹ بلکہ دیر و دگیر کے بندھنو سے بھی بے نیاز ہے ..... "

(اقبال۔ کراچی۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

"لیجئے اب جگن ناتھ آزاد آتے ہیں۔ آزاد صاحب سال میں ڈیڑھ دو تین پھیرے پاکستان کے ضرور کرتے ہیں۔ اور ان کی شاعری میں جو سوز گھلاوٹ بڑھ رہی ہے اس میں احساس وطن کا بڑا حصہ ہے اور پھر پڑھیئے بہت خوب ہیں ایک دو شعر سنیئے۔

سُنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ منزل کو بھی ہم تو جادۂ منزل سمجھتے ہیں
ہمیں نے اے محبت قدر پہچانی ہے کچھ تیری
تجھے طوفاں تجھے کشتی تجھے ساحل سمجھتے ہیں "

(قومی زبان کراچی۔ یکم دسمبر ۱۹۵۳ء)

"حضرت جگن ناتھ آزاد جو اپنے سفر کی تکان دور کرنے کے لئے لیٹے ہوئے تھے ہم لوگوں کو دیکھتے ہی خندہ پیشانی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے اور ملے۔ پھر کیا تھا۔ آزاد صاحب سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ کبھی امرا دتی کے احباب اور شعراء کا تذکرہ رہا تو کبھی اردو کے بقاء و تحفظ کا مسئلہ۔ بہر حال میں نے آزاد صاحب کے دل میں اردو کے لئے تڑپ اور اس کی بقاء و تحفظ کا بے پناہ جذبہ موجزن پایا۔ یہ بھی دیکھا کہ — مشاعرے کے دوران میں صدر کی حیثیت سے اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے حاضرین مشاعرہ میں اردو سے ہمدردی کا جذبہ کس طرح بیدار کرتے رہے ..... "

(الفاروق کامٹی۔ ۹؍ دسمبر ۱۹۵۳ء)

"۲۲ نومبر کی رات کو پردرشنی (نمائش) میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں سب سے اچھی دین جگن ناتھ آزاد کی ہوئی۔ ان کی کہی

ہوئی چیزوں نے سُننے والوں کو اونچے نیتک دھراتل پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ مست بھی بنا دیا۔۔۔۔"

(ہندی دینک "پرتاپ" کانپور ۵ نومبر ۱۹۵۲ء)

"تقسیم ہند اور اس کے پیدا کردہ فرقہ وارانہ فسادات نے لاکھوں انسانوں کے جان و مال کی کثیر قربانی لی اور انہیں اپنا گھر بار چھوڑ دینے پر مجبور کیا اس تباہی کا جو لوگ شکار بنے اُن کا ہوش و حواس کھو بیٹھنا اور ایک طرح کی فرقہ وارانہ تنگ نظری اختیار کر لینا ایک حد تک فطری تھا لیکن جگن ناتھ آزاد ان گنے چنے بالغ نظر افراد میں سے ہیں جنھیں اس سیاسی انتشار اور ذہنی پریشانی کا نشانہ بن کر اپنا وطنِ عزیز ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ لیکن پھر بھی ان کے زاویۂ نظر اور اندازِ فکر میں ذرا سا بھی فرق نہ آنے پایا۔ بلکہ آزاد نے تو اس ہنگامۂ قتل و غارت سے ایک طرح کی تعلیم روحانی حاصل کی تقسیم ہند کے تباہ کن اثرات کی وجہ سے جگن ناتھ آزاد کو اپنا وطنِ عزیز مغربی پنجاب بادلِ ناخواستہ چھوڑنا پڑا۔ تقسیم ہند کی تباہ سامانی آزاد کی زندگی کا سب سے بڑا المناک حادثہ تھی جس نے اُن کے قلب و نظر پر ایک گہرا نقش چھوڑا ہے جو اُن کے کلام کے بڑے حصے سے جھلکتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے کلام کو سوز و گداز اور انسانیت سے معمور کر دیا ہے۔"

(سیاست حیدر آباد ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء)

"سیاست سے کہیں ہے رتبۂ انسانیت اونچا
یہ بات اہلِ سیاست کو سنا دینے کا وقت آیا"

کہنے والا شاعر پیغمبرِ انسانیت ہے۔ اس ہنگامی دور میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی بہت ضرورت ہے جو عوام کے مشتعل جذبات کو محبت کے نغموں سے ٹھنڈا کر دیں اور آزاد کی والہانہ شاعری ۱۹۴۷ء کے بعد سے یہ کام برابر انجام دے رہی ہے۔ آزاد کی معصوم فطرت اور عالی ظرفی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں یقین ہوں کہ آسمانِ ادب پر ایک درخشندہ ستارا چمکا

ہے جس کی تابانی روز افزوں ہے جس طرح جواہر لال نہرو نے اپنے محترم والد موتی لال نہرو کے نام کو اپنے بے نظیر کاموں سے اجاگر کیا اس طرح جناب تلوک چند محروم کے نام کو ان کے اکلوتے ہونہار لائق فرزند جگن ناتھ آزاد نے اپنی ادبی شہرت سے چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آزاد مجلسی آداب کے بہت قائل ہیں اور آپ بالکل پسند نہیں کرتے کہ کسی شاعر کے کلام سنانے کے دوران میں بے موقع بات کی جائے میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی نے ایسے موقع پر بے محل بات کی تو آزاد کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ پھر اُن کی مسکراتی ہوئی صورت پر ایک دم سنجیدگی کا غبار چھا جاتا ہے اور وہ اپنا کلام سنانے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔ پھر کوئی کتنا بھی منائے وہ نہیں سنتے۔ ان دنوں فقرے بازی، بے موقع مذاق اور بے محل بات چیت کرنے کا ایک سلسلہ مشاعروں میں چل گیا ہے حالانکہ مشاعرے ہماری تہذیب اور کلچر کا ایک بہت بڑا نشان ہیں وہاں اس قسم کے مظاہرے اور عامیانہ انداز کے مذاق بالکل اچھے نہیں لگتے۔ لیکن خدا جانے کیوں یہ وبا پھیلتی جا رہی ہے اور خود شعراء چونکہ اکثر نشے میں پی کر بہکے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے صورت حال ہی ابتر ہوتی ہے۔ یہ ہمارے شعراء جو قوم کے کردار بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود ہی اپنے حال سے غافل ہوں تو اور کسی کو کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آزاد کو میں نے کبھی نشستوں میں یا ادبی مشاعروں میں ناشائستہ فقرے بازی کرتے نہیں دیکھا۔ خود کو انہوں نے آج تک اس روشِ عام سے الگ رکھا ہے۔ اور تھوڑی سی عمر میں آزاد نے ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام بنا لیا ہے یقین ہے کہ عمر کے ساتھ ان کا شعور ترقی کرے گا اور فن بھی

میں اپنے ان ساتھیوں کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں مجھے ہر طرح مدد دی اور اپنے پرخلوص مشوروں سے میرے کام کو آسان بنایا۔ دہلی کے بعض ادیبوں کی بھی میں ممنون ہوں جنھوں نے آزاد کی شاعری پر ایک کتاب مرتب کرنے کی تجویز میرے سامنے رکھی یہ کام میرے لیے بہت خوشگوار دہی میری مرضی کے عین مطابق ہے۔ آزاد کی شاعری سے اردو ادب کی بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی لگن سے گیسوئے اردو سنوارتے رہیں۔ آمین ثم آمین

حمیدہ سلطان احمد

۲۵ مارچ ۱۹۵۷ء

شعریات

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے
ڈائریکٹر دار المصنفین اعظم گڑھ

جگن ناتھ آزاد — ذوقِ تجسس کا شاعر

شبلی کالج کے ایک سابق طالب علم محمد ایوب واقف بی۔ اے نے جگن ناتھ آزاد کے کلام کا انتخاب کیا ہے انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس انتخاب پر تقریظ لکھوں شعر و شاعری پر میں بہت کم لکھتا ہوں اب سے کچھ پہلے فارسی شعراء میں تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، شمس دبیر اور امیر خسرو اور اردو شعراء میں شرف علی فغاں، بہادر شاہ ظفر، جگر اور شاد عظیم آبادی پر کچھ خامہ فرسائی کی تھی لیکن ان شعراء پر لکھتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ فارسی اور اردو شعراء کو میرے قلم کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ پر میرے قلم سے معلوم نہیں بھلی بُری کتنی تحریریں نکلتی رہی ہیں اور اب میں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے کہ اس عہد کی تاریخ کے مختلف موضوعوں پر برابر کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا، تاکہ اس عہد کے روشن پہلوؤں کا شاید واضح نقشہ سامنے آجائے۔

اس پابندی کے باوجود جب مجھ سے کہا گیا کہ میں جگن ناتھ آزاد پر لکھوں تو میرے دل نے کہا ضرور کچھ لکھنا چاہئے، کیوں ؟ میں خود نہیں بتا سکتا یہ ضرور ہے کہ جب کبھی جگن ناتھ آزاد غائبانہ طور پر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں تو میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں جگن ناتھ آزاد سے ایک شاعر کی حیثیت سے متاثر ہوں یا ایک بہت ہی اچھے انسان کی حیثیت سے ان کی قدر کرتا ہوں یا ان کی درد بھری آواز کا گرویدہ ہوں یا ان تینوں خوبیوں نے اُن میں جو مقناطیسیت پیدا کر دی ہے وہ دوسرے لوگوں کی طرح مجھ کو بھی ان کی طرف

کھینچتی ہے۔

میں اُن کا مدّاح اور معترف اس وقت ہوا جب ۱۹۵۲ء میں اُن کی نظم "بھارت کے مسلمان" دہلی کے اخبار الجمعیۃ میں پڑھی۔ تقسیم ہند کے بعد یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے بڑی پریشانی اور مایوسی کا تھا۔ وہ طرح طرح کے مسائل و مصائب میں گھرے ہوئے تھے، جب یہ نظم شائع ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مسلمانوں کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے، اس میں مسلمانوں کی عظمت گزشتہ کی حدی خوانی تھی، اور ایک للکار کے ساتھ رجز خوانی بھی۔ دردمند شاعر نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ دانش کدۂ دہر کی شمع فروزاں، مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں، ازل سے درد و محبت کے طلب گار، مہر و مروت کے پرستار، قدرت اسرار کے محرم، قاسم نانوتوی و سید کے خزانے کے نگہباں، بسطامی، بصری، معری اور غزالی کے فقر و علم کے وارث ہیں۔ اجمیر کی درگاہِ معلی، کلیر کے ذرات اور ہانسی کی فضاؤں میں ان کے کیف کی تاثیر اب بھی موجود ہے۔ سرہند کی مٹی ان کے دم سے فروزاں ہے۔ دہلی کا ہر ذرہ ان کی قوت سے منور ہے، پنجاب کی مستی اور گنگوہ کی تقدیس ان کی ہی وجہ سے ہے پھر یہ کہہ کر غیرت دلائی کہ وہ اسلام کی تعلیم اور تنظیم کو کیوں بھول بیٹھے ہیں۔

حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالم نسیاں

بھارت کے مسلماں!

پھر مسلمانوں کو یہ کہہ کر ڈھارس دلائی۔

ممکن ہے کہ ساحل ہو پسِ پردۂ طوفاں

بھارت کے مسلماں!

اس شورش اور اخوت کے جذبات سے بھری ہوئی اس نظم کو پڑھ کر قلبی تسکین اور ذہنی تسلی ہوئی اور میں نے جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین کو یہ نظم دکھائی تو وہ بھی میری ہی طرح پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور ہم دونوں نے طے کیا کہ اس کو "معارف" میں شائع کیا جائے۔ حالانکہ "معارف" میں کوئی مطبوعہ چیز شائع نہیں ہوتی۔ چنانچہ فروری ۱۹۵۲ء کے "معارف" میں یہ نظم شائع ہوئی اور جناب شاہ معین الدین صاحب

ندوی نے اس پر یہ نوٹ بھی لکھا:

"یہ نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہوگئی ہے اس نظم کی قدر و قیمت اس لئے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ اس کا لکھنے والا گزشتہ انقلاب کا ستایا ہوا مغربی پنجاب کا ایک بے خاناماں ہندو ہے۔ یہ نظم اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گزرے۔ اس لئے اس کو اخبار الجمعیۃ سے نقل کیا جاتا ہے ہم کو امید ہے کہ انسانی اخوت و محبت کی اس آواز کا جواب پاکستان سے بھی دیا جائے گا۔"

یہ نظم "معارف" میں چھپی تو ہر حلقہ میں شوق سے پڑھی گئی اور "اعتراف و تشکر" کے عنوان سے اس کے جواب میں یحییٰ اعظمی نے ایک نظم لکھی جو اگست ۱۹۵۲ء کے معارف میں چھپی، یہ گویا ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی طرف سے ان جذبات کا اظہار تھا جو ان کے دلوں میں اس نظم کے پڑھنے کے بعد پیدا ہوئے۔ اس پوری نظم کو ایک "نغمۂ دلکش"، "نالۂ دل دوز"، "فغانِ اثر" اور "جگر سوز" کہا گیا، جو بالکل صحیح ہے۔ یحییٰ صاحب نے جگن ناتھ آزاد کو مخاطب کر کے کہا۔

بھارت کے مسلمان پہ ہے یہ ترا احساں ممنون ترا کیوں نہ ہو بھارت کا مسلماں

اور اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ جگن ناتھ آزاد نے اپنی نظم سے مسلمانوں کو مدہوشی و غفلت سے جگایا، اُن کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا، ماضی کی روایات کا افسانہ سنایا عظمتِ پارینہ کا راز بتایا، اسلام کی، قرآن کی اور ایمان کی تعلیم دی اور پھر یہ کہا سنتا تھا جسے حاملِ قرآں کی زباں سے وہ درس ملا اس کو نئے سوزِ فغاں سے

جگن ناتھ آزاد نے اپنے دلِ رنجور اور جذبۂ عالی سے مسلمانوں کے غم کی جو شرح کی تھی اس کی ممنونیت کا اظہار اس طرح کیا۔

حیرت ہے یہ آوازِ حق اِس دورِ فتن میں　　ہے شکر کہ ایسے ہیں جواں اب بھی وطن میں

جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم "معارف" سے کراچی کے رسالہ دعوت الحق نے نقل کی اور اس کو بہت ہی "پسندیدہ"، "ہمدردانہ"، اور "مخلصانہ" جذبات سے معمور بتایا۔ پھر اس کے جواب میں اسد ملتانی نے اپنی ایک طویل نظم لکھی۔ اس میں جگن ناتھ آزاد کو انسان کی دل سوزی اور غم خواری کا پیکر کہا اور اُن کی نظم کے ہر نکتہ کو نشترِ فصاد سے بھی تیز، ہر حرف کو فکر و نظر کے لئے مہمیز اور ہر نغمہ کو ولولہ انگیز و جنوں خیز اور ہر شعر کو جذبۂ اخلاص سے لبریز بتایا اور اُن کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ

جس دور میں نازاں ہو تعصب پہ زن و مرد　　جس دور میں ہر راہ سے نفرت کی اٹھے گرد
جس دور میں دل مہر و محبت سے ہٹے سرد　　اس دور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہمدرد

ہوں دیر میں یہ رنگ حرم دیکھ کے حیراں
ہمدردِ مسلماں

جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ اسی سال جناب نیاز احمد صدیقی پرنسپل محمد حسن انٹر کالج جونپور نے اس کو علیحدہ چھپوایا اور اپنے کالج کے سالانہ مشاعرہ میں اس کو مفت تقسیم کیا۔ اس مشاعرہ میں جگن ناتھ آزاد بھی شریک تھے مشاعرہ میں یہ نظم حاضرین نے خود شاعر کی زبانی بھی سنی۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور جگن ناتھ آزاد کو پہلی دفعہ دیکھا تھا اور جب ان کی درد بھری آواز مشاعرہ میں سنی تو بار بار دل سوال کر رہا تھا کہ اُن کی آواز زیادہ دل کش ہے یا اُن کی شاعری اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ دونوں ہی دلکش ہیں۔ وہ اپنی درد بھری آواز میں جب یہ نظم سنا رہے تھے تو سامعین میں زندگی کے پورے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اور جب اُنہوں نے یہ سنایا۔

اور عزم سے پھر تھام ذرا دامنِ ایماں
بھارت کے مسلماں!

اور پھر یہ کہا:

ممکن ہو تو پھر ڈھونڈھ کے کھوئے ہوئے ساماں

بھارت کے مسلماں!

تو اس ملتانی کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آرہا تھا۔

ہوں دیر میں یہ رنگ حرم دیکھ کے حیراں

ہمدردِ مسلماں!

اسی مشاعرہ میں انھوں نے اپنی وہ غزل بھی سنائی جس کا مطلع یہ ہے۔

تری بزم طرب میں سوزِ پنہاں لیکے آیا ہوں — چمن میں یادِ ایّام بہاراں لے کے آیا ہوں

یہ وہ غزل ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور جا کر ایک مشاعرے میں پڑھی۔ ان کا مولد مغربی پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر عیسٰی خیل ہے لیکن ان کی نشوونما لاہور میں ہوئی۔

ان کو لاہور سے بڑی شیفتگی ہے، اس کو خیرباد کہنے کے بعد بھی ان کو اس کے جیسا شہر ہندوستان کیا یورپ میں بھی نظر نہ آیا۔ وہ اس کو تہذیب و ادب کی منزل گاہ سینۂ پنجاب کا دل، بلدہ مینو سواد اور جنّتِ دیگر سمجھتے ہیں۔ ان کو اس کی بادِ نسیم میں تاثیرِ شراب اور اس کے ذرّوں میں بجلیوں کی آب و تاب نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حالات کے تحت میں خود دہلی آگیا لیکن میرا دل لاہور میں رہا، مدتوں تک پارلیمنٹ اسٹریٹ کے بجائے مال روڈ کا نام زبان پر آیا۔ چاندنی چوک کا لفظ بڑی مشکل سے زبان پر چڑھا بلا ارادہ جو نام زبان پر آتا تھا وہ انارکلی کا تھا، بات جمنا کی ہوتی تھی تو زبان پر لفظ راوی کا ہوتا تھا۔

اپنی نظر کا کیا علاج اپنی نظر کو کیا کروں — اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر

ان جذبات کے ساتھ جب وہ دہلی سے پہلی دفعہ لاہور پہنچے اور ایک مشاعرہ میں مذکورہ بالا غزل پڑھی تو اس غزل کا ہر شعر ان کے اصلی وطن کے ہجر و فراق میں ان کے خونِ دل کا ایک قطرہ اور ان کے آنسو کی ایک بوند معلوم ہوئی جس کا اعتراف خود لاہور والوں نے بھی کیا، عبدالمجید سالک مرحوم نے لکھا ہے کہ جب پاکستان اس

شاعر کو دعوت دی کہ پھر اپنی چھوڑی ہوئی انجمن کو واپس آ تو لاہور کو جو شاعر کے نزدیک کعبۂ علم و فن ہے، مخاطب کر کے کہتا ہے۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو — کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا — وطن کی صبح تک شامِ غریباں لیکے آیا ہوں

عبدالمجید سالک کا یہ بھی بیان ہے کہ اس سادہ سلیس اور سہل ممتنع کو پاکستانیوں نے جتنی دفعہ آزاد کے پر درد لہجے میں سُنا ان کے دلوں میں ہوکیں اُٹھیں

عبدالمجید سالک کو اس کا احساس ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی شاعری تقسیم ہند کے بعد جذبۂ فراقِ وطن کی آہوں اور سسکیوں کی سرمایہ دار بن گئی اور یہ خیال بالکل صحیح ہے۔

آزاد اپنے نئے وطن ہندوستان کی عظمت کے ہر حال میں قائل ہیں۔ اس کو وہ خطۂ جنت نشاں، سجدہ گاہِ قدسیاں، منبعِ انوارِ حق، قبلۂ عرفانیاں، وقارِ علم و فن سمجھتے ہیں۔ بنارس کی صبح، اودھ کی شام، بنگال کی رعنائیاں اور پنجاب کی زیبائیاں دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں۔ اُن کو فخر ہے کہ یہ کرشن، گوتم اور نانک کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں اجمیر کی درگاہ ہے، یہاں صابر عنبر چکاں اور کاکی گوہر فشاں رہے۔ یہ میر و غالب کا وطن ہے، یہاں علم و ہنر کا کارواں ایران سے آیا اور اس کی فضا کو چمکا گیا۔ یہاں عرفی جیسا شیریں زباں، فیضی جیسا جادو بیاں، مشہدی جیسا نکتہ داں، سرمد، کلیم اور آملی جیسے شاعرانِ دُر فشاں، ٹیگور جیسا ہم زباں، اور قاضی جیسا نغمہ خواں ہوا۔ غرض کہ ایک وطن سے محبت کرنے کے لئے جتنی چیزیں اُن کے لئے ہونی چاہئیں وہ سب اُن کے لئے یہاں موجود ہیں، لیکن وہ جب بھی اپنے پُرانے وطن پاکستان کی طرف روانہ ہوئے تو اُن میں جذبات کا طوفان اُمڈ پڑا ہے۔ وہ دہلی آنے کے بعد پہلی دفعہ پاکستان کے قرب و جوار میں پہنچے تو اُن کو یہ ارضِ وطن بھی ایک ارضِ پاک نظر آئی۔ ان کو یہاں بھی قلبِ عالم کا ضمیر، تابناک نور کا جوہر اور ادراک میں عشق رقصاں دکھائی دیا۔ ان کو یہ اب بھی اس کے

پسند ہے کہ یہ ہیر رانجھے کی سرزمین ہے، سوہنی و مہینوال کی بزم حسین ہے وارث شاہ کی فکر کا مسکن ہے، یہ نانک کی نظر سے فیضیاب ہے، اس پر رام تیرتھ نور افشاں رہا ہے اور پھر اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

میں کہ تیرا ہی گلِ صد پارہ ہوں　　نکہتِ گل کی طرح آوارہ ہوں
دشتِ غربت میں وطن سے دور ہوں　　پھول ہوں اپنے چمن سے دور ہوں

اور جب وہ واہگہ کی سرحد پہ پہنچے تو اُن کی پلکوں پر اشک رواں ہو گئے جو ہزاروں تلخ حقائق اور ہزار ہا افسانے سنا رہے تھے۔ اسی عالم میں وہ کہہ اُٹھے:

وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے　　خدا کرے کہ اُسے یاں کوئی نہ پہچانے

لیکن اُن کا وطن اُن کے غم سے بے خبر نہ تھا۔ اس لئے اُن کے وطن کی روح بھی پکار اُٹھی:

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ　　غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ
اُداس ہیں ترے پھول اور چپ ہیں مرغِ چمن　　تو اے بہارِ چمن پھر چمن کو واپس آ
ترے فراق میں گریاں ہیں چشم راوی و سندھ　　اسی فضا اسی بزمِ کہن میں واپس آ
الٰہی اپنی انجمن آرائیوں کی تجھ کو قسم
پھر اپنی اجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ

اور جب وہ لاہور پہنچے تو پھر وہ غزل کہہ کر خود روئے اور سننے والوں کو بھی رلایا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

وہ اپنے معنوی استاد اقبالؔ کی لحد پر بھی سلام کرنے کے لئے پہنچے۔ جن کو وہ ایک شاعرِ روشن ضمیر، کاروانِ فکرِ تاباں کے امیر، محرمِ رازِ حیات، واقفِ سرِّ مقاماتِ حیات اور سینۂ مشرق کا قلبِ سلیم کہتے ہیں، اور ان کو یہ کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے　　وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند
مہ و ستارہ و برق و طپاں و مہرِ مبیں　　تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں یہ کمند

اور پھر بڑی کشادہ دلی سے یہ اعتراف بھی کرتے ہیں:

سکونِ صبح میں پایا ہے میں نے دل کا ضو ترے کلام میں پائی ہے میں نے دل کی کشاد

اور جب لاہور سے لائل پور جاتے ہیں تو اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد کر کے بےچین ہو جاتے ہیں۔ اُن کی نظریں اُن کو ڈھونڈتی ہیں مگر نہیں پاتیں۔

جن کے طفیل بلغ و بہاراں تھی زندگی وہ دوست وہ حبیب نہ جانے کہاں گئے
ملتا نہیں چمن میں کہیں ان کا اب نشاں اے بجلیو! تمہارے نشانے کہاں گئے

وہ اسی طرح راولپنڈی اور مری کو یاد کر کے اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہیں اُن کو حفیظ جالندھری کی یاد تڑپاتی ہے، فیض احمد فیض کو یاد کر کے بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اب بھی احمد ندیم قاسمی کو اپنے گوشۂ دل میں جگہ دیئے ہوئے ہیں ممتاز حسین کو اپنی نگاہوں کے سامنے پاتے ہیں۔ ان کو دکھ ہے کہ وہ ظہیر کاشمیری سے بچھڑ گئے، وہ عبدالعزیز فطرت، اظہر امرتسری، ضیا سرحدی مختار قریشی، فضل الرحمٰن شمس، وقار انبالوی، عبدالمجید سالک مرحوم، اختر شیرانی مرحوم احسان دانش، محمد حسین اقبال (وائس پرنسپل اورینٹل کالج) سید عابد علی اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی گزشتہ صحبتوں کی یادوں کے چراغ اب بھی اپنے دل میں روشن کئے ہوئے ہیں جیسا کہ اُن کی نظم "جمنا کے کنارے" ۱۹۴۷ء اور کتابچہ "میرے گزشتہ روز و شب" سے ظاہر ہو گا۔

اس سلسلے میں اُن کی نظموں میں وہ نظم زیادہ قابلِ توجہ ہے جو انہوں نے اپنے استاد تاجور نجیب آبادی کے مزار پر پہنچ کر کہی تھی۔ اُن کو تاجور نجیب آبادی سے بڑی عقیدت تھی جن کے افکار سے انہوں نے پورا فیض اُٹھایا۔ تاجور بھی ان کو اپنا "پسرِ نورِ نظر" ہی سمجھتے رہے، مزار پر آزاد اپنے گوشِ دل سے اپنے اُستاد کی نصیحت سُنتے ہیں کہ وہ کسی اور باغ کے پھول تھے لیکن کسی اور جگہ جا کر مہکے۔ اب اُن کی تہذیب کی انجمن ایک نئی دنیا ضرور ہو گئی ہے لیکن کسی حال میں اُن کا گزر تنگئ دل کی طرف نہ ہو اور افکار کی پستی اس کے دل کے مسکن میں نہ ہو اور نا رواداری کا

کانٹا اس کے گلشن میں نہ ہو۔ اس کے بعد کے ٹکڑے یہ ہیں:

ہند میں مسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے
یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے
اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں
جس طرح رہتا ہے بچہ اپنی ماں کی گود میں
بے خطر ہو جان بھی مسلم کی اور ایمان بھی
مال بھی اس کا حفاظت میں ہو اس کی آن بھی

اس کے بعد جو اشعار ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی جذبات اور حقیقی احساسات کی بالکل صحیح ترجمانی اور آئینہ داری ہے۔ شاعر نے گویا مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھ کر یہ بات لکھی ہے۔

یہ تحفظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ
دیکھ اپنے خون سے پھر اس کی گلکاری کو دیکھ
جاں لڑا دے گا یہ پھر ہندوستاں کے واسطے
جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے
یہ سراسر پیکرِ جذبات ہے دیوانہ ہے
شمع ہو اخلاص کی روشن تو یہ پروانہ ہے
اس طرح مرتا ہے یہ جذبۂ وفا کے نام پر
عورتیں جس طرح مرتی ہیں حیا کے نام پر
اس کی فطرت سے بعید ہے عہد نو کے جوڑ توڑ
اس کو میں کیا کہوں تو پھر جس طرح چاہے اس کو موڑ
شرط صرف اتنی ہے اس کو اس قدر احساس ہو
بس یقیں کا اس قدر سرمایہ اس کے پاس ہو

اس وطن میں یہ حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں
یہ اسی گلشن کا ہے اک پھول بیگانہ نہیں

اوپر کے تمام اشعار کو پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد ہندوستانی ہونے کے بعد بھی پاکستانی ہیں، ہندوستان کے سیاسی اخلاق میں کسی ہندوستانی کا پاکستانی ہونا بہت بڑا جرم ہے لیکن جگن ناتھ آزاد کے لئے یہ بڑا وصف ہے۔ ہندوستان میں پاکستان کے خلاف نفرت، پاکستان میں ہندوستان کے خلاف بیزاری کو وطن دوستی سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں جگن ناتھ آزاد نے پاکستانی بن کر جن شریفانہ جذبات سے اخلاص، محبت، مروت، مودت، انسانیت، ہمدردی، دلنوازی، دلداری، دردمندی، فراخدلی اور وسیع المشربی کی قدروں کو ابھارا ہے وہ سیاسی معاہدات اور

تحفظات سے زیادہ موثر ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعہ سے ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آزاد کو جو تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے وہ اُن ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

مشاعروں کے سلسلے میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق کئی بار ہوا۔ بعض دفعہ تو سال میں تین تین چار چار چکر لگے لیکن ہر بار جا کر تشنگی اور بڑھتی ہی رہی۔ یوں تو میرا سارا کلام ان ہی تاثرات سے بھرپور ہے لیکن طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا پس منظر خاص طور سے یہی ہے۔ اس نظم کی تشکیل میں لاہور اور راولپنڈی سے میرا احساس جدائی ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اس پذیرائی اور محبت کا رد عمل بھی جاری و ساری ہے جس کا احساس مجھے مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں متعدد بار جا کر ہوا۔ یہ شہر صرف لاہور اور راولپنڈی ہی نہیں بلکہ کراچی، ملتان، لائل پور اور جوہر آباد کے علاوہ مشرقی پاکستان کے بعض شہر ڈھاکہ، نرائن گنج، چٹاگانگ اور کھلنا وغیرہ بھی اسی فہرست میں شامل ہیں جن کے ساتھ تقسیم ہند سے پہلے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

اتنے ہی پر آزاد اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے تاثرات کا اظہار اور بھی واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہر مشاعرے میں یہ تاثر لے کر آیا کہ تقسیم کے باوجود کوئی نہ کوئی رشتہ و مودت ایسا ہے جو ان دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ کئے ہوئے ہے خدا جانے اس کا سبب وہ انسان دوستی ہے جس سے اردو کا خمیر اٹھا ہے یا پاکستان والوں کا وہ جذبہ مہماں نوازی ہے جس کے

متعلق علامہ اقبال مرحوم فرما گئے ہیں۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

لیکن کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو اتنی تقسیم کے باوجود دلوں کو

ملائے ہوئے ہے"

اور یہ "کوئی نہ کوئی بات" زیادہ چھپی ڈھکی نہیں ہے۔ آزاد دلدار اور دلنواز بن کر گئے تو ان کو بھی دلداری اور دلنوازی ملی۔ اس جنس کی جہاں کمی ہوگی وہاں شرافت اور محبت کا بھی فقدان ہوگا۔ ہندوستان یا پاکستان میں جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں ان کی فطرت کا صحیح اندازہ خود آزاد نے دکھایا ہے کہ وہ سراسر جذبات ہوتے ہیں اگر ان کو اخلاص کی شمع کہیں مل جاتی ہے تو وہ دیوانہ وار اس کے پروانے بن جاتے ہیں۔ اور جذبہ وفا کے نام پر اس طرح مرتے ہیں جس طرح عورتیں حیا کے نام پر مرتی ہیں۔ آزاد نے پاکستان میں جاکر اخلاص کی شمع روشن کی تو پروانے بھی جمع ہو گئے۔ خود ان کی وفا کو دیکھ کر پاکستان کا بھی جذبۂ وفا بیدار ہوا۔ آزاد کی حسب ذیل تحریر کی دل لگی کی بات سے دل کی لگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مشاعرے میں شرکت کے بعد دہلی واپس آرہا تھا۔ میرے دوست محمد طفیل مدیر "نقوش" نے مجھے رخصت کرتے وقت مٹھائی کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا تمہیں تو ہم یوں رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے"

ایک ہندوستانی ہندو اور ایک پاکستانی مسلمان کے یہ شریفانہ جذبات سیاسی اور وقتی مصلحتوں سے نہیں پیدا ہو سکتے ہیں بلکہ اسی وقت ابھر سکتے ہیں جب دونوں کے دلوں کے پیمانے شراب محبت سے لبریز ہوں۔ ان دونوں کے دلوں میں محبت کی ارغوانی شراب بھری ہوئی تھی جو ملنے سے ابل پڑی ہندوستان و پاکستان کے لوگوں کے ہاتھوں میں جب محبت کے مینا و ساغر ہوں گے تب ہی دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں۔

اس لحاظ سے جگن ناتھ آزاد ہندوستان و پاکستان کے درمیان جو خوشگوار تعلقات کے قابلِ قدر قاصد کہلانے کے مستحق ہیں، لیکن اس وقت جب کہ تعصب، نفرت اور عداوت کا طوفان دونوں طرف امنڈ رہا ہے، اُن کے شریفانہ جذبات کی قدر نہیں ہو سکتی، اور اُن کو خود اس کا احساس ہے۔

جنوں ہی کارفرما ہو جہاں اطرافِ عالم میں
وہاں ہم عقل کی محفل سجائیں بھی تو کیا ہوگا
جہاں ماحول پر نفرت ہی نفرت راج کرتی ہو
وہاں ہم پیار کی دنیا بسائیں بھی تو کیا ہوگا

پھر بھی اُنھوں نے عزم کی مشعل ہاتھ میں لے کر اپنے دل ہی کو اپنا راہنما بنا لیا ہے یہ لکھتے وقت بے اختیار قلم سے یہ بات نکل رہی ہے کہ آزاد کے اس عزم اور راہنمائی میں وہی روح کام کر رہی ہے جو آج سے ساڑھے سات سو برس پہلے امیر خسروؒ کی بعض مثنویوں اور نظموں پر چھائی ہوئی تھی۔ ان دونوں کا موازنہ ہرگز مقصود نہیں لیکن یہ لکھے بغیر بھی نہیں رہا جا رہا ہے کہ امیر خسروؒ عشقِ الٰہی، عشقِ رسول اور عشقِ مرشد کے کشتہ ہوتے ہوئے بھی وطن کی محبت میں شاعرانہ زبان میں پکار اٹھے تھے۔

کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آرے آرے (ہاں ہاں) کنم با خلق و عالم کار نیست

اسی طرح جگن ناتھ آزاد ہندوستانی ہو کر پاکستان کی محبت میں سرشار ہیں۔ وہ بھی امیر خسرو کی طرح کہہ گئے ہیں۔

نہ فریب دے مجھے دیر کا نہ مجھے طلسمِ حرم دکھا
میں پرے ہوں دیر و حرم سے اب مجھے شوقِ دیر و حرم نہیں

امیر خسروؒ جب دہلی سے کچھ دنوں کے لئے باہر جاتے اور واپس آتے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ ایک پرندہ خزاں کی صعوبتیں برداشت کر کے پھر ایک پر بہار باغ میں پہنچ گیا ہے، وہ دہلی کو جنتِ عدن اور باغِ ارم سمجھتے تھے، اُن کو دہلی کی گرم ہوا بھی پسند تھی، غایتِ محبت میں اس کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آفتاب کو اس زمین سے عشق ہے۔ عشق کی گرمی کی وجہ سے یہاں کی ہوا گرم ہو گئی ہے وہ دہلی کو بغداد، مصر، خطا، خراسان، تبریز، ترمذ، بخارا

اور خوارزم وغیرہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اسی طرح جگن ناتھ کو اگر لاہور یورپ کے تمام شہروں سے زیادہ خوبصورت نظر آیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وطن پرستی کا یہ جذبہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ یہ لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ خسروؒ جن سلاطین سے وابستہ رہے انھوں نے جنگ کے سلسلے میں ہندو راجاؤں کے خلاف بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں جن میں ہر طرح کی خونریزی اور غارت گری ہوئی۔ اس کے باوجود امیر خسروؒ کو ہندوؤں سے محبت رہی۔ اس لئے کہ وہ اُن کے ہم وطن تھے۔ وہ اپنی مثنوی "دول رانی خضر خاں" میں لکھتے ہیں کہ ہندو آگ کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ اس میں امیدِ وصل فروزاں رہتی ہے اور آگ میں فنا ہوکر بقا حاصل ہوتی ہے، خسروؒ نے اس جذبہ کی قدر کرنے کا مشورہ دیا ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندو مرد اور عورت دونوں میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لئے جان کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے، لیکن یہ بڑی کارگزاری ہے، اگر اسلام اس کی اجازت دیتا تو بہت سے مسلمان اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کر دیتے۔

جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنی آنکھوں سے ہندو مسلمان کے درمیان خونریزی اور فسادات دیکھے ہیں، دھرم اور مذہب کی دنیا میں تہذیب کو جنون کی لہر میں بہتے دیکھا ہے۔ معین الدین چشتیؒ کی زمین پر اور کرشن کے گھر میں مسرت کو الم کی داستان کہتے ہوئے سنا ہے۔ انس و وفا کی جس زمین میں گرو نانک نے اپنے دلنشیں نغمات سنائے تھے۔ وہاں ابنِ آدم کو ایسے افعالِ زبوں کرتے ہوئے دیکھا، جن سے درندوں کو کیا ابلیس کو بھی شرم آئے، پھر جہاں قاضی نذر الاسلام کے پیار کے ترانے گائے گئے وہاں جنون انگیز نعرے بلند ہوئے جہاں ٹیگور کا جام وفا چھلکتا رہا وہاں انسان کے خون کی بارش ہوئی۔ ان نظاروں کے دیکھنے کے باوجود جگن ناتھ آزاد کا دل خسروؒ کی طرح اپنے ہم وطنوں کی محبت سے سرشار رہا جس طرح خسروؒ

اپنے ہندو ہم وطنوں کی اچھائیوں کے معترف رہے، اسی طرح آزاد بھی اپنے مسلمان ہم وطنوں کی خوبیوں کا راگ الاپتے ہیں، خسرو نے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود ہندؤں کی بُت پرستی میں اخلاص، وفا اور امید وصل کی شمع کو فروزاں پایا، تو جگن ناتھ آزاد نے بھی ہندو ہونے کے باوجود اسلام کی تعلیم میں مہر، محبت، اخلاص، مروت صداقت کی حقیقت کو فروزاں دیکھا۔

اسلام تو مہر و محبت کا بیاں ہے　　　اخلاص کی روداد مروت کا بیاں ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے　　　اک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے

کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں
بھارت کے مسلماں

جس طرح خسرو عورتوں اور مردوں کے جذبۂ وفا شعاری کے مداح رہے اسی طرح جگن ناتھ آزاد کو بھی اس کا احساس ہے کہ ایک مسلماں جذبۂ وفا کے نام پر اس طرح مرتا ہے جس طرح عورتیں حیا کے نام پہ مرتی ہیں جگن ناتھ آزاد کی یہ نظم پہلے ناظرین کی نظر سے گزر چکی ہے۔

خسرو فارسی کے جلیل القدر شاعر تھے، فارسی ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن وہ ہندوستان کی تمام زبانوں مثلاً سنسکرت، ہندی سندھی، دھور سمندری تلنگی، گجری، گوری، بنگالی، اودھی وغیرہ کی بھی رمز شناس تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے۔ فارسی کے مقابلے میں دوسری زبانوں سے تعصب اس لئے پسند نہیں کیا کہ وہ اس زبان کے شاعر ہیں یا یہ اُن کی مادری زبان ہے یا اس وقت کی سرکاری زبان ہے، وہ دل کھول کر ہندوستانی زبانوں کی تعریف کرتے ہیں۔ اپنی مثنوی میں اعتراف کرتے ہیں کہ سنسکرت فارسی سے برتر زبان ہے ہندی کے بہت بڑے شاعر تھے، اور بڑے فخر کے ساتھ کہتے ہیں۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرسی　　　ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ شور و غل کہ میری زبان دوسروں کی زبان سے بہتر ہے

یا وہی شربت قند ہے اور دوسری سرکہ ایک بیہودہ گفتگو ہے۔

جس جذبے نے خسرو کو ہندوستان کی زبان میں سنسکرت اور ہندی سے محبت کرنا سکھایا، اسی جذبہ نے جگن ناتھ آزاد کو بھی اردو کا قدرداں بنایا وہ لکھتے ہیں:

"میری مادری زبان پنجابی ہے۔ لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے... اس زبان کو اپنی زبان سمجھتا ہوں جس کی ترقی میں مجھے ہندوستان کی ترقی پنہاں نظر آتی ہے۔ ہم اردو کی ادبی روایات کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتا ہوں" اور ایک محبِ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اس پر فخر کرتا ہوں۔"

اُن کو اردو سے صرف اس لئے محبت نہیں کہ وہ اس زبان میں شعر کہتے ہیں اور اسی کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو پڑھنے والوں اور سننے والوں تک پہنچا دیتے ہیں بلکہ اس لئے بھی اس کے قائل ہیں کہ اُن کو اس کے طرزِ تکلم میں اخلاص اور بولی میں پیار محسوس ہوتا ہے۔

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلم پیار کی بولی

اُن کو اس سے اس لئے بھی محبت ہے کہ یہ ہندوؤں کی بھی زبان ہے، اس دعوے کے ثبوت میں اپنی نظم اردو میں ان تمام ہندو شاعروں، افسانہ نویسوں، ناول نگاروں، مصنفوں اور مقالہ نگاروں کا ذکر کرتے ہیں۔ جنھوں نے چمنِ اُردو کی آبیاری کی ہے ہم ان ناموں کی محض فہرست یہاں درج کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین متیجر ہو کر اُن کے نام پڑھیں اور پھر ان کے کارناموں کو جاننے کی کوشش کریں۔

مہاراج بہادر برق، برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، رگھوپتی سہائے فراق، ہرگوپال تفتہ، تلوک چند محروم، میلا رام وفا، ہری چند اختر، عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، پریم چند، پنڈت یوگ راج نظر،

بشیشور پرشاد منور، نوبت رائے نظر، دوارکا پرشاد وافق، سورج نرائن مہر، گوپی ناتھ امن، دیا نرائن نگم، جواہر سنگھ جوہر، مہاراجہ کشن پرشاد، گنگا پرشاد اوج، رگھناتھ مجبور، راجہ نول رائے وفا، کنہیا لال دل، آنند رام مخلص، ٹیکا رام تسلی، جگت موہن لال رواں، جانکی ناتھ مدن، امرناتھ ساحر، رائے سرب سنگھ دیوانہ، راجہ جیونت سنگھ پروانہ، لچھمن پرشاد صدر، مادھو رام جوہر، بنواری لال شعلہ، چندر بھان برہمن، راجیندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، کنہیا لال کپور، مہیندر ناتھ اشک، راما نند ساگر، بلونت سنگھ، کرشن چندر، ستیارتھی، ریوتی سرن شرما، محمور جالندھری، نرلش کمار شاد، گوپال متل، تاجور سامری، فکر تونسوی، رام کرشن مضطر، کرتار سنگھ دگل، آنند نرائن ملا، پرکاش پنڈت، ہنس راج رہبر، رام چندر سنگھ شیدا اور پنڈت برج موہن کیفی۔

آزاد نے ان ناموں کے ذکر میں کسی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا ہے بلکہ جیسے جیسے اُن کے نام اُن کے خیال میں آتے گئے وہ نظم میں شامل کرتے گئے لیکن جس اختصار سے اُن کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایجاز کی ایک روشن مثال ہے یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ امیر خسرو اور آزاد کا موازنہ بالکل مقصود نہیں۔ دونوں کے شاعرانہ کمالات میں کوئی مماثلت نہیں، لیکن دونوں کی وطنی محبت میں بڑی فراخدلی اور رواداری ہے۔ چنانچہ خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف تھے۔ کہتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں لیکن اُن کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں وہ خداوند تعالیٰ کی توحید، اس کی ہستی، اور قدم کے معترف ہیں۔ اس کی قدرتِ ایجاد، اس کے رازقِ عالم، خالق، افعال، فاعل مختار اور عالم جزو کُل ہونے کے قائل ہیں۔ جس طرح خسرو نے ہندوؤں کی مذہبی خوبیوں کا اعتراف کرکے اپنی وسیع المشربی کا ثبوت دیا ہے اسی طرح آزاد اپنے مسلمان ہموطنوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جلووں کے قائل ہیں اور انہوں نے اپنی نظم "سلام" میں جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کو پڑھ کر ہندو پاک کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی جو جگہ پیدا ہوئی ہے قلم کے ذریعہ اس کا اظہار نہیں کیا جاسکتا

اس نظم کے دو چار اشعار یہ ہیں۔

سلام اس پر کہ جس کے نور سے پر نور ہے دنیا
سلام اس پر کہ جس کے نطق سے مسحور ہے دنیا

سلام اس پر جلائی شمع عرفاں جس نے سینوں میں
کیا حق کے لئے بیتاب سجدوں کو جبینوں میں

سلام اس پر فقیری میں نہاں تھی جس کی سلطانی
رہا زیر قدم جس کے شکوہ قیصر و خاقانی

میلاد النبی کے عنوان سے ایک طویل ترکیب بند لکھا ہے جس کے پہلے بند کے دو شعر یہ ہیں۔

آج کا دن تھا کہ توحید کا نغمہ سن کر
زندگی چونک اٹھی خواب سے بیدار ہوئی

آج کا دن تھا کہ خورشید حقیقت چمکا
دور عالم سے توہم کی شب تار ہوئی

تیسرے بند کے اشعار یہ ہیں۔

تیرہ و تار فضاؤں میں تجلی چمکی
کس کا اعجاز تھا یہ ایک بشر کا اعجاز

ہاں یہ اعجاز اسی صاحب اعجاز کا تھا
آج بھی محفل گیتی کا جو ہے چہرہ طراز

تو نے انساں کو انساں سے آگاہ کیا
اے ترے نام سے پیدا ہے سینے کا گداز

دہلی کی جامع مسجد نے بھی اُن کا دل اپنی طرف کھینچا ہے، اس کو دیکھ کر ان کے شاعرانہ جذبات اُبھر آئے ہیں۔ ایک نظم میں کہتے ہیں۔

ہے آج بھی تسکین نظر تیرا سہارا
تو آج بھی ہے روح کی دنیا کا سہارا

دامن میں سنبھالے ہوئے صدیوں کی امانت
پاکیزگی قلب و نظر روح کی عفت

اس دور میں تو منبع انوار ہے اب بھی
تاریکی عالم میں ضیا بار ہے اب بھی

رقصاں تری دنیا میں ہیں آیات تجلی
اللہ رے تیرے یہ مقامات تجلی

سچ تو یہ ہے کہ آزاد میں ہندوستان و پاکستان کی ارضیت کے بجائے انسانیت کی آفاقیت ہے۔ اسی لئے وہ اپنے قدیم اور جدید دونوں وطنوں کے تمام قابل قدر اشخاص سے اپنی محبت کا اظہار کر کے وہی سرور حاصل کرتے ہیں جو کسی کو مے دو آتشہ میں حاصل ہوتا ہے۔ وہ اقبال کا ماتم اس طرح کرتے ہیں۔

معنی کو تجھ پہ فخر تخیل کو تجھ پہ ناز
نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار

تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا — تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار

رنگیں تھا جس کے حسنِ تخیل سے برگِ گل — جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش
سینوں میں جس نے قوتِ گفتار سے بھرا — صہبائے بیخودی کا سرورِ دو عمل کا جوش
تھا جس کے سانس سانس میں میخانۂ حیات — تربت ہے اس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں نزاعِ شرفِ معانی ہزار حیف
اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف

ٹیگور کی موت پر بھی اسی طرح رو رہے ہیں۔

منزلِ پایندہ تر در نگہِ خویش داشت — شاعرِ قدسی نژاد عالمِ خاکی گذاشت
عالمِ خاکی گذاشت عالمِ بالا گزید — سوئے گلستانِ خود طائرِ معنی پرید
عالمِ خاکیِ ما در خورِ طبعش نہ بود — چشم بر این خاک بست بر طبقِ آں کشود
بود نہ از خاکِ ما رشتہ و پیوندِ او — از دو جہاں بے نیاز خاطرِ خورشیدِ او
گلشنِ شعر و سخن از نفسش پُر بہار — عالمِ روحانیاں از نگہش آبدار
اہلِ وطن مضطرب اہلِ جہاں بیقرار — آہ ز تو اے حیات اے نفسِ مستعار

انہوں نے یکساں عقیدت کے ساتھ گرو نانک، رام تیرتھ، غالب، تاجور نجیب آبادی، ٹیپو سلطان، سبھاش چندر بوس اور آزاد ہند فوج پر نظمیں کہہ کر آندھی میں چراغ روشن کیے ہے وہ ہندو مسلمان کی تفریق سے بالاتر ہو کر ایک غم خوار اور دل سوز انسان کی طرح گلستانِ محبت کی بہار کا نغمہ الاپنے ہی میں زندگی کا راز سمجھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں جو کچھ ہوا اُس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے اس محبوب خطے کی تباہی اور بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی اس چمن زار کی ہر شاخ میں کانٹے اور ہر پھول میں شرارے نظر آئے احباب کی آنکھوں سے شرارے برسے۔ محبت کے سہارے جل کر راکھ اور انسانیت خون کے سیلاب میں غرق ہوئی۔ معصوموں کی لاشوں سے کوچہ و بازار پٹے تھے۔ ہنستے بستے ہوئے گھر بم کا نشانہ بن رہے تھے۔ بہن کا دامنِ عصمت پارہ پارہ ہو رہا تھا اور بھائی بھٹو

دیکھ رہا تھا۔ لیکن آزاد نے اپنی فراخ دلی سے اِن جرائم کا الزام کسی ایک فرقہ پر نہیں رکھا ہے۔ بلکہ نانک کے دھرم کے ماننے والے، گیتا کا اپدیش دینے والے اور شریعت کے احکام پر چلنے والے، تینوں کو موردِ الزام ٹھہرایا اور کتنی دردمندی کے ساتھ کہا ہے

ہندو نے لیا وید کی عظمت کا سہارا　　قرآں کے تقدس کو مسلماں نے پکارا
سکھ پنتھ سے دور کہاں اس کو گوارا　　یوں لے کے زمانے میں مذاہب کا اجارا

فردوس میں ان سب نے جہنم کو بسایا
پنجاب میں سامانِ قیامت نظر آیا

اس کے بعد اُن کے نغمات کے انوار پر آہوں کا دھواں چھا گیا لیکن اُن کی فریاد و فغاں میں ایک فکرِ جمیل ہے، اور اُن کا نغمۂ انسانیت، مہر و محبت کی خوشبو میں بسا ہوا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

روحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدت سے　　ذہنِ انساں کو اب اِس دور میں بیدار کریں
دامِ انوار کا پستی و بلندی پہ بچھائیں　　اس میں دنیا کے اندھیروں کو گرفتار کریں
دہر پر عدل و مساوات کا پرچم لہرائیں　　پرچمِ ظلم کو دنیا میں نگوں سار کریں
ابنِ آدم کا نئے دور میں غم خوار نہیں　　آکہ انسان کو انسان کا غم خوار کریں

وہ خود ایک بیدار انسان ہیں اور دوسروں کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ روئے عالم پر جو پامالِ نظر ہیں اُن کو روئے عالم کا مالک و مختار کریں، جن پر نعمتِ عالم کے دروازے بند ہیں اُن کو ہر نعمت کا سزاوار کریں۔ اس سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

دوست ظاہر میں چمن کے جو ہوں وہ باطن میں عدو
زندگی اُن کی چمن زار میں دشوار کریں

اُن کو احساس ہے کہ۔

جس دشت میں بس بھری ہوا چلتی ہے　　اس دشت میں سانس لے رہا ہوں آزاد

لیکن اسی کے ساتھ اُن کے یہ عزائم بھی ہیں

راہ میں گر حادثے آتے ہیں آنے دو انہیں　　حادثوں پر قہقہے پیہم لگاتے جائیں گے

نام لیوا درد کا کوئی یہاں ہو یا نہ ہو　　　دوستو! ہم درد کی دولت لٹاتے جائیں گے

وہ ایک شاعر کے بلند رتبہ کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

میں ایسے شاعروں کو عمر بھر شاعر نہ سمجھوں گا　　　جو بن کر زخم عالم کے لئے مرہم نہیں آتے

آزاد نے یہ سب کچھ یا تو غزل میں یا نظموں میں کہا ہے، اُن کی غزلوں میں ترنم بھی ہے، جذبہ بھی ہے، کیف بھی ہے۔ اُن کو شعر و ادب سے شیفتگی ہے اور اُن کے کلام میں ایک خاص قسم کی شیریں دیوانگی ہے۔ اُن کی نظموں میں غزل اور غزلوں میں نظم کا لطف ہے میرا خیال ہے کہ وہ نظم گو پہلے ہیں اور غزل گو بعد میں، وہ اپنی نظموں میں تغزل کی شان پیدا کر دیتے ہیں اور نظمیں زیادہ کہتے رہے۔ لیکن وہ جہاں بھی جاتے ہیں اُن کی دو غزلیں ضرور سُنی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ غزل جو اُنہوں نے لاہور میں پڑھی جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے۔

تری بزم طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں

دوسری وہ غزل جو اُنہوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے عنوان سے کہی۔

ان دونوں غزلوں میں آنسوؤں میں تبسم ہے اور تبسم میں آنسو ہیں۔ وہ بزم طرب میں سوزِ پنہاں کا اظہار خوب کر سکتے ہیں۔ اُن کے یہاں ایک دردِ پنہاں ہے، جس کی کھٹک اور کسک سے اُن میں لطافتوں کا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے اسی لئے اُن کے غم و الم کے اظہار میں احساس جمال بھی ہوتا ہے، وہ المناک بن کر زندگی سے اس کے حوصلے چھیننے کے بجائے اس کو طربناک بنانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غم ناکی میں زندگی کو انقباض کے بجائے انشراح حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں یہی فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی غزلوں کی لطیف اور بھینی ہوئی غمناکی سے درد و تپش کی نوا بلند کرنے ہی میں اپنی غزل گوئی کی کامیابی سمجھتے ہیں

مٹ سکتا نہیں درد و تپش سازِ نوا اُن کا
جو اپنے دل کے پردوں میں بسا کر غم نہیں آتے

اس لئے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں کا نغمہ اُن کے دردِ دل کا ترانہ ہے۔

اسے اب جنوں ہی سمجھے کہ خود سے ماورا ہے ۔۔۔ وہی زندگی کا نغمہ مرے درد کا ترانہ

اسی کے ساتھ اُن کے تخیل میں انسانیت کی رعنائیوں اور دل آویزیوں کا ایک شاداب سمن زار ہرا بھرا آباد رہتا ہے۔ جس میں جب کبھی کوئی المناک حادثہ پیش آجاتا ہے تو اس کی غمخواری ہی میں اپنی زیست کا مزہ پاتے ہیں۔ اُن کی یہ غمخواری کلکتہ کے فسادات میں ابھری، جس میں یہ کہتے ہیں

وہ آگ کے شعلوں میں تڑپتے ہوئے انساں ۔۔۔ وہ خون کے دریاؤں میں بہتے ہوئے لاشے

دنیا ہے انھیں دیکھ کے انگشت بدنداں ۔۔۔ اے اہلِ وطن تم نے دکھائے جو تماشے

پھر یہ غم خواری ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء والی غزل میں زیادہ تیز ہوئی جس میں آزادی کے بعد ہندو مسلم فسادات پر آہ و فغاں سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا ۔۔۔ بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ ۔۔۔ ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری

اسی کی بازگشت اُن کی مختلف غزلوں اور نظموں میں نظم "آزادی کے بعد" وغیرہ سنائی دیتی ہے۔ مثلاً

ابھی دل میں ہیں بے تاب تکلم نالے ۔۔۔ اور سینے میں دلِ زار طپاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں ۔۔۔ درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

یہ غمِ دوراں اور بھی الم انگیز ہو جاتا ہے جب وہ پنجاب کے فسادات پر نوحہ کہتے ہیں جو میر انیس کے مراثی کے رنگ میں ہے، بعض بند تو ایسے ہیں جن پہ میر انیس کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کا ہر بند فریاد و فغاں کی آتش سوزاں ہے جس میں اُن کے ہر بُنِ مو سے آہ نکلی ہے۔

معصوموں کے اجسام ہیں نیزے کی انی پر ۔۔۔ تلواروں پہ پیرانِ کہن سال کے ہیں سر

خنجر وہ گیا سینۂ عورت سے گزر کر ۔۔۔ غش کھا کے گرے دیکھ کے جو شیطان یہ منظر

یا آزادئ نے دور کی تہذیب کا نقشہ
تعمیر کا عالم ہے کہ تخریب کا نقشہ

بڑے اضطراب کے ساتھ یہ کہہ کر چیخ اُٹھتے ہیں۔

انسان کا دل اور ہو اِتنا ستم ایجاد — انسان ہی مقتول ہو انسان ہی جلّاد
انسان ہی خود صید ہو انسان ہی صیّاد — فریاد ہے فریاد ہے فریاد ہے فریاد

"وطن میں اجنبی" اُن کی آہوں اور سسکیوں کا مجموعہ ہے، جس میں اُن کے کلام کا ساز بھی سوز بن گیا ہے۔

اُن کی شاعری کی دردبھری لے گاندھی جی کے مرثیہ میں زیادہ تیز ہو گئی ہے جس کو پڑھنے کے بعد دیا نرائن چکبست کے وہ تمام مراثی یاد آجاتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے زمانہ کے مشاہیر قوم و ملک پر لکھے تھے۔ گاندھی جی کی کیسی سچی تصویر کھینچی ہے۔

آیا وہ خواب مست غلاموں کے دیس میں — بیداریٔ حیات کی دنیا لئے ہوئے
ہاتھوں میں لے کے پرچم آزادیٔ بشر — بھرتا رہا خلوص کا جذبہ لئے ہوئے
اُس نے طلسم توڑ دیا سامراج کا — انساں کی عظمتوں کا سہارا لئے ہوئے
وہ پیکرِ نحیف وہ اک ناتواں سا جسم — آدم کی قوتوں کا خزانہ لئے ہوئے

جن لوگوں کو گاندھی جی کی شاندار زندگی کے آخری لمحے سے واقفیت ہے اُن کے لئے یہ شعر کس قدر پُرکیف ہو جاتا ہے۔

اور زندگی کے درد کا پالا ہوا بشر — رخصت ہوا شہید کا رتبہ لئے ہوئے

جس بے دردانہ طریقہ سے گاندھی جی ملک و قوم سے چھین لئے گئے اس کی کسک ہر ہندوستانی کے دل میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہی کسک جگن ناتھ آزاد کے دل میں بھی ہے۔ اس لئے ایک دوسرے موقع پر گاندھی جی کو یاد کر کے لکھتے ہیں۔

ہاتھ جب تیرے لئے بہرِ دعا اُٹھتے ہیں — دل مرا جُرم کے احساس سے ڈر جاتا ہے
کہ دُعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھوں پہ مجھے — محسنِ دہر! ترا خون نظر آتا ہے

مولانا حالیؔ نے لکھا تھا کہ قوم میں قومیت کی روح پھونکنے کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبر کے، ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں، اُن کی مساعیٔ جمیلہ کی قدر کریں، اُن کی نیکیوں کو جگائیں، اُن کے کمالات کو

شہرت رہی اور اُن پر مرثیہ لکھیں، ان ہی شریفانہ جذبات کے تحت آزاد نے مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی ایک مرثیہ لکھا، جس کے شروع اور آخر کے بند یہ ہیں۔

وہ خبر آئی کہ بزم زندگی تھرا گئی
جس کا ڈر تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آگئی
ظلمتِ مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی
روشنی جس کی حریمِ مدح کو چمکا گئی
جس سے روشن اپنے سینے تھے منور تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا حکمت کا دانش کا چراغ

آگ سی الفاظ میں برسانے والے الوداع
اے غلاموں کا لہو گرمانے والے الوداع
اے جگا کر ملک کو سو جانے والے الوداع
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے الوداع
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

یہ شدید ردِ عمل پنڈت جواہر لال نہرو کے نوحہ میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس میں اُن کا طوفانِ غم تھمتا نظر نہیں آتا۔ اُنہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو جانِ چمن — وقارِ وطن، فخرِ ہمالیہ، نازشِ گنگ و جمن، مشرق کا سوزِ نہانی، ہندوستاں کے دل کی کہانی ذوقِ گلابِ سرخ کا مظہر اور موجِ شمیم کہہ کر پورے ہندوستان کے دل کی ترجمانی اپنے صرف ایک شعر میں کر دی ہے۔

تیری جو موت ہے وہ اک انسان کی موت ہے
ہندو کی موت ہے نہ مسلماں کی موت ہے

اور شاید جواہر لال نہرو کی موت پر کسی اور شاعر کی نوحہ خوانی میں اتنی تاثیر نہیں ملے گی جو حسبِ ذیل بند میں ہے۔

محسوس یوں ہوا کہ چمن خاک میں ملا
جب راکھ ہو کے تیرا بدن خاک میں ملا
سارا جمالِ گنگ و جمن خاک میں ملا
رفعت سے گر کے تاجِ وطن خاک میں ملا
اے خاکِ ہند آج بس اتنا خیال کر
محسن کی راکھ ہے اسے رکھنا سنبھال کر

آزاد کی یہ غم خواری غمِ دوراں کی شکل میں زیادہ ہے، لیکن فطری طور پر اُن

کے یہاں غمِ جاناں بھی ابھر آتا ہے جس کا نمونہ اُن کی نظم "شکنتلا"، "سوئی"، اور "ایک آرزو" ہے۔ شکنتلا اُن کی رفیقۂ زندگی تھیں۔ اُن کی موت پر ایک لمبی اور دردناک نظم لکھی تھی۔ اُن کو یاد کر کے کہتے ہیں۔

کیا خبر کس کیفیت میں گم ہوا جاتا ہوں میں
ایک طوفاں ہے کہ جس میں ڈوبتا جاتا ہوں میں

اور بہت ہی الم ناک طریقے پر اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

آب گوہر میں ہے دریا کی روانی میں ہے تو
یا مرے ٹوٹے ہوئے دل کی کہانی میں ہے تو
تتلیوں کے خوشنما رنگوں میں آکر لپٹ ہے
وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے
جنتِ گم گشتہ پوشیدہ تراز کیفِ بہار
جستجو میں تھک گئی ہے میری چشمِ انتظار
اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند
لے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند
ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی
خاطرِ اندوہ گیں کو شادماں فرما کبھی

لیکن وہ غمِ دوراں کے تاب و تب ہی میں غمِ جاناں سے زیادہ سوزِ ازل محسوس کرتے ہیں۔

غمِ دوراں غمِ جاناں کا بدل ہے کہ نہیں
اس میں بھی تاب و تب سوزِ ازل ہے کہ نہیں
جو حدودِ غمِ جاناں سے پرے جا نہ سکے
آج اس ذہن میں اے ندرتِ خلق ہے کہ نہیں

غمِ دوراں کے سوزِ ازل کی وجہ سے اُن کا غمِ جاناں دب کر ضرور رہ گیا ہے لیکن وہ صحت کے لحاظ سے ابھی تک جوان ہیں۔ اس لئے زندگی کا جمالیاتی پہلو اپنی تمام رعنائیاں لئے ہوئے اُن کے سامنے آجاتا ہے، تو شاید شکنتلا کے علاوہ بھی کبھی کبھی غمِ جاناں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے علاوہ ایک اور غمِ پنہاں بھی ہے جس کو وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

غمِ جاناں سے بھی آگے غمِ دوراں سے بھی آگے
اک ایسا غم بھی ہے الفاظ میں جو آ نہیں سکتا
نہیں ممکن کہ میں اس کو لباسِ نطق پہناؤں
سمجھ سکتا ہوں لیکن میں اسے سمجھا نہیں سکتا
جب اپنے آپ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں
گماں ہوتا ہے یہ اب میں سفینہ پا نہیں سکتا

آزاد کے اس اندرونی اور غیر شعوری غمِ پنہاں اور سوزِ نہاں کی سپردگی ہی سے

اُن کی نظموں اور غزلوں میں جان پیدا ہوتی ہے۔

یہ مضمون طویل ہوتا جاتا ہے، لیکن قلم رُکتا نظر نہیں آتا' یہ سوال ذہن میں آ
رہا ہے کہ آزاد نے اپنے ذوق میں پاکیزگی آخر کہاں سے پائی۔ وہ مشہور شاعر اور
اُستادِ فن جناب تلوک چند محرومؔ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ اس لئے شاعری کا اعلیٰ ذوق
اُنہوں نے وراثت میں پایا ہے۔ اُن کی بعض نظمیں مثلاً "ایک منظر"، "چاندنی اُتری ۔
پھلواری میں"، "راوی کا کنارا"، "چاندنی رات" اور "لارنس باغ میں ایک لمحہ" میں اُن
کے والد بزرگوار کی رہنمائی اور فیضِ صحبت کی محض جھلکیاں ہیں، لیکن اُن کا خود بیان ہے
کہ اُنہوں نے فیض اپنے اُستاد تاجور نجیب آبادی سے حاصل کیا اور اُن کو اقبال کے
افکار سے روشنی ملی۔ اقبال کا نغمہ اُن پر کیف برساتا رہا ہے۔ وہ جب اپنے استاد
تاجور نجیب آبادی کے مزار پر حاضری دیتے ہیں تو وہ خود کہتے ہیں کہ اُن کی روح اُن
سے اس طرح گویا ہوتی ہے

فیض تو نے گرچہ پایا ہے مرے افکار سے — دل ترا وابستہ ہے اقبال کے اشعار سے
تا قیامت دل ترا تاثیر کا مسکن رہے — ہاتھ میں اقبال کے افکار کا دامن رہے
روشنی اقبال کے افکار کی، اشعار کی — ہر گھڑی ہو رہنما تیرے دلِ بیدار کی
نغمۂ اقبال تجھ پر کیف برساتا رہے — تو اسی نغمے کی دھن پہ ناچتا گاتا رہے

سوال یہ ہے کہ اُن کی شاعری میں اقبال کے افکار نظر آتے ہیں؟ اُن کو اقبال
کے کلام نے تو مذاقِ سخن ضرور بخشا ہے وہ اُن کے حسنِ تخیل سے بھی مسحور ہیں۔ وہ اُن
کے کلام کو فکر و معانی کا ایک سمندر سمجھتے ہیں جس سے اُن کے خیال کے مطابق تشنگانِ
علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ اُن کو دُکھ ہے کہ اقبال کے پرستاروں نے
اُن کو غلط سمجھا اور سمجھایا اور وہ محض اسلامی شاعر سمجھے گئے، لیکن آزاد اُن کو محض ایک
اسلامی شاعر سمجھنے کے لئے تیار نہیں، اس سلسلہ میں اُنہوں نے جس وسعتِ نظر کا ثبوت
دیا ہے، اور اقبال سے متعلق جو بات کہی ہے اس کی طرف کم لوگوں کا ذہن منتقل ہوا
ہوگا، وہ لکھتے ہیں۔

"اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اوّل سے آخر تک نمایاں ہے لیکن یہ اقبال اور کلامِ اقبال سے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ نہ اس بنا پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر کر سکتے ہیں۔ ملٹن اور ڈانٹے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے، تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشقِ بے پایاں کا ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، عشقِ مذہب، عشقِ بنی نوعِ انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو اسے کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔"

آزاد کو اس بات کا دکھ ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان نے اقبال سے بے اعتنائی برتی۔ اُن کے معترضین اُن کے ذکر کو ایک تبرّا سمجھتے ہیں، آزاد کے نزدیک اقبال ہندوستان کے لئے اتنے ہی باعثِ افتخار ہیں جتنے غالب، میر، تلسی داس، نذر الاسلام اور رابندر ناتھ ٹیگور، اس حقیقت کو اُنہوں نے اپنے مقالے "اقبال اور اُن کا عہد" میں ظاہر کیا ہے، جو اُنہوں نے جموں کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھا، اُس میں اُنہوں نے بعض قابلِ قدر نکتے پیدا کئے ہیں جو اقبال کے مطالعے کے سلسلے میں اب تک کسی نے پیدا نہیں کئے تھے۔ وہ جاوید نامہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فلسفہ کے ان باریک نکات کو جو ہندوستانی فلسفہ یا ہندو فلسفہ کہا جاتا ہے، اقبال نے شیوجی کی زبان سے بیان کر کے جس طرح فارسی شعر و ادب میں زندۂ جاوید کر دیا ہے، اُس کی سعادت اقبال کے علاوہ کسی دوسرے ہندوستانی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور بھارتی سنسکرتی کے تحفظ اور نشر و اشاعت کا دعویٰ کرنے والے تو شاید اس مقام کے قریب بھی نہ پہنچے ہوں گے۔ گیتا کی تعلیم فارسی شاعری

میں غالباً صرف دو بار منتقل ہوئی۔ ایک تو فیضی کے ذریعے کہ
انھوں نے شہنشاہ اکبر کے کہنے پر گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا' دوسرا
اقبال کی اس نظم میں جو بہ طرز ترجمہ بہرتری کی زبان سے کہلائی گئی ہے۔"
انھوں نے اقبال کی تحریر وہ ہے جو حسب ذیل نمونہ عام لوگوں کے سامنے
لاکر رکھ دیا ہے وہ اس کو پڑھ کر اقبال کی نظر کی بلندی اور رواداری کے بھی قائل
ہوں گے۔ اقبال رقمطراز ہیں۔

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ادب و احترام
سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب
پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس
حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترک عمل سے مراد ترک کلی نہیں ہے کیونکہ
عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے' بلکہ
ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے تعلق دل بستگی
نہ ہو' سری کرشن کے بعد سری رامانج بھی اسی رستے پر چلے۔ مگر
افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو سری کرشن اور سری رامانج بے
نقاب کرنا چاہتے تھے' سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب
کر دیا۔ اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم ہو گئی"

آزاد کی نظر میں اقبال کی شخصیت ایک جلوۂ صد رنگ نہیں بلکہ جلوۂ
ہزار رنگ کا مرقع ہے اور وہ اقبال ہی سے متاثر ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

بستۂ مسائل سے ہے عشق کے دم سے کشود — عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود
عشق تو ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

اقبال کی تقلید میں وہ بھی عقل کے بجائے عشق کے قائل ہیں۔

عشق کی رزم گاہ میں کتنا سرور و کیف ہے — عقل کی بزم گاہ سے دامن ہٹا کے دیکھ
علم ہے کیف پے ثبات عشق ہے گرمیٔ حیات — زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

عشق اور خرد میں جو تفاوت ہے تو یہ ہے
عشق ایک حقیقت ہے خرد ایک افسانہ

اُن کے یہاں بھی خودی اور بیخودی کی صہبا کا کبھی کبھی سرور ملتا ہے فکر کی بلندی تک پہنچنے میں آزاد نے بڑی رکاوٹ محسوس کی ہے جس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے۔

ابھی راہ سے واقف نہیں دل ۔۔۔ خودی کی چاہ سے واقف نہیں دل
ابھی دل میں ہے خاشاکِ من و تو ۔۔۔ کہ تیری آہ سے واقف نہیں دل

پھر داخلی اور خارجی واردات کی بنا پر اقبال کی شاعری کی آفاقیت سے دور ہوتے گئے وہ خود لکھتے ہیں۔

"میں شاعری کے متعلق کسی زمانے میں یہی سمجھتا تھا کہ یہ ایک الہامی کیفیت ہے اور آسمان یا اس سے بھی اونچی بلندیوں سے یہ شاعر کے دل پر نزول کرتی ہے۔ اور وہاں سے صفحۂ قرطاس پر، لیکن اب داخلی اور خارجی واردات نے میرے اس نظریے کو ختم کر دیا ہے اب شعر کہنے کے لئے میں اس آسمانی برکت کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اب تو جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔"

اس میں شک نہیں کہ اُن کا دامن بے مقصد شاعری سے بچا ہوا ہے اور اس کا اکثر حصہ انسانی زندگی کے درد کا درماں ہے، اس میں اخلاص شمع فروزاں ہے پھر بھی اُن کی اندرونی خواہش یہ رہی کہ اقبال کی طرح اُن کی شاعری کا بھی نزول اُن کے دل پر آسمان یا اس سے بھی اونچی بلندیوں سے ہوتا رہے لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور غالباً اسی بے کسی کا خوشگوار غم اُن کی پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے جو ایک لحاظ سے اُن کی شاعری کا بڑا وصف ہو گیا ہے۔

آزاد کی زبان بھی بڑی صاف ستھری اور سلیس و رواں ہے۔ سر عبدالقادر نے
...کے والد بزرگوار تلوک چند محروم کے متعلق لکھا تھا کہ وہ پنجاب کے اس گوشے کے
...نے والے ہیں جہاں اردو کا چرچا بہت کم ہے، لیکن اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے
...ہ صوبجات متحدہ کے کسی حصہ کے رہنے والے ہیں۔ یہی بات آزاد کے متعلق
...ہی جانی چاہیئے، لیکن ان کے بعض مصرعے اُن کی نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔

اِک ضیا اُبھری تو تھی نظریں بھی چندھیائی تو تھیں

...مصرعے میں لفظ چندھیائی آزاد کے گلدستۂ شاعری میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے
...غ اور تسلیم کے یہاں بھی یہ لفظ ملتا ہے، لیکن آنکھیں چندھیاتی ہیں، نظریں
...یں چندھیاتی ہیں۔

سنبھال کر ہم نے پھر بھی رکھا ہوا ہے آزاد غم کسی کا

...ے رکھا ہوا ہے' پنجاب کی عام زبان ضرور ہے، لیکن شاعری کی زبان نہیں۔

اے رہنمائے قافلۂ شعر السلام

...شعر کی ترکیب درست نہیں، شعراء کا قافلہ تو ہو سکتا ہے، شعر کا قافلہ صحیح نہیں

غنچے کو اِک نگاہِ محبت سے پھول کر

...ل کرنا فصیح روز مرہ نہیں۔

معراجِ درد نیند ابدی سو رہی ہے آج

...بدی کی ترکیب فصیح نہیں ہے۔

ع۔ میرے نغمے کی چمکتی ہوئی تلواروں سے
ع۔ دندناتی ہوئی آئی ہے خزاں یہ بھی تو دیکھ

...چمکتی ہوئی تلوار" یا "دندناتی ہوئی خزاں" جیسے فقرے کسی صاحبِ ذوق کے
...شعر نہ آئیں گے۔

تو اگر محو رہا سکوں کی جھنکاروں کے ساتھ

...شاعرانہ زبان نہیں، سکوں کی کھنکھناہٹ ہوتی ہے، جھنکار نہیں ہوتی تلوار

کی جھنکار تو صحیح ہے۔

ع۔ محفلِ احباب کے اِس بے صِسے ماحول میں

نغمہ یا باجے کے ساتھ بے سُرا لکھنا تو درست ہے لیکن بے سُرے ماحول... صحیح نہیں ہے

ع اب یہ افسانۂ مجروح سناؤں کس کو

ع میرے چمن کی زخمی بہار دو

افسانۂ مجروح اور زخمی بہار دو' وغیرہ جدید اردو ہی کہلائی جا سکتی ہے

ع آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط

پردے کے لئے پڑا ہونا روزمرہ ہے' محیط ہونا صحیح نہیں۔

لیکن ان تسامحات سے آزاد کے شاعرانہ کمالات پر کوئی اثر نہیں پڑتا یہ نہ ہونے تو اچھا تھا۔ اُن کی طرف اس لئے اشارا کر دیا گیا ہے کہ اُن کا پاکیزہ ذوق خود بھی زبان اور محاورے کی پاکیزگی کا قدر شناس ہے۔ اُنہوں نے "میرے گذشتہ شب و روز" میں لکھا ہے۔

"چراغ حسن حسرت مرحوم ریاست پونچھ کے رہنے والے تھے لیکن زبان پر ان کو جو گہری نظر حاصل تھی' وہ دہلی اور لکھنؤ والوں کیلئے باعثِ رشک و حیرت تھی ایک بار حمید نسیم نے اُن سے کہا' مولانا کیا آپ ہر وقت صحیح زبان کی بات کرتے رہتے ہیں آپ تو ننانوے کے چکر میں پڑے ہیں۔ حسرت صاحب نے فرمایا۔ بیٹا ننانوے کا پھیر ہوتا ہے' چکر نہیں ہوتا۔" (ص ۵۰)

آخر میں آزاد سے یہ کہنا ہے کہ اُن کی شاعری کے معترف اُن کے اُستاد... تاجور نجیب آبادی رہے' ظفر علی خان بھی' قاضی عبدالغفار بھی' اختر شیرانی بھی' مجاز بھی' عبدالمجید سالک بھی اور مہر بھی ہیں' ندیم بھی فراق بھی' خواجہ غلام السیدین بھی اور یہ راقم بھی۔ اُن کو اسی شاعری کی بدولت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اب ایک اچھی سرکاری ملازمت پر ہونے کی وجہ سے مالی فراغت بھی ہے

حاصل ہو گئی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے نغمۂ و ترنم، غمِ دوراں، غمِ نہاں، دل سوزی، فراخ دلی اور کشادہ چشمی سے نہ صرف اردو شاعری بلکہ فنِ شاعری کو جو فوائد پہنچ رہے ہیں، وہ مشاعروں کی رنگین محفلوں، سرکاری دفتر کی بے کیف فائلوں اور بدلے ہوئے حالات کی مسموم فضاؤں میں اُرک نہ جائیں۔ یا کسی اور رُخ کی طرف مُڑ نہ جائیں وہ ایک جوان شاعر ہیں، جوانی کی سرشاریوں میں بہت سی نیرنگیوں کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ اُن کی جوانی میں اُن کے اُستاد نے اُن کو جو نصیحت کی تھی اس کا ایک مصرع یہ بھی ہے۔

ہو بہت محتاط اپنی زیست کے ہر طور میں

اُن کی یہ بھی نصیحت تھی

تیرا نغمہ فکر کی دنیا میں آوارہ نہ ہو
آسمانِ علم کا ثابت ہو سیارہ نہ ہو
مقصدِ اعلیٰ ترے نغمے سے وابستہ رہے
اپنے دل میں سوچ لے اچھی طرح جو کچھ کہے
تیرا نغمہ زندگی کے درد سے معمور ہو
ظلمتوں کو چیرتا جائے سراپا نور ہو

اسی نصیحت پر وہ اب عامل ہیں اور امید ہے آئندہ بھی رہیں گے۔ اُن کی تمنا ہے کہ۔

شمیم جانفزا سے بزمِ عالم کو بسا جاؤں

خدا کرے اُن کی یہ تمنا ہر حال میں پوری ہوتی رہے۔ میری بھی آخر میں ان کے لئے ان ہی کی زبان سے یہ دعا ہے۔

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گزر جا
ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانا

پروفیسر سید احتشام حسین

نوائے پریشاں

کچھ دن پہلے یہ بات اکثر کہی جاتی تھی کہ اچھے شاعر کا اچھا انسان ہونا لازمی ہے یا دوسرے الفاظ میں کہ صرف اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ اگر اچھے انسان کی صحیح تعریف ہو سکے تو شاید اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہا جا سکے ورنہ نظر تو یہی آتا ہے کہ عرفِ عام میں جنھیں ہم شاعر کہتے ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں اچھا انسان کہنا مشکل ہے اور لاکھوں اچھے انسان شاعری کی دولت سے محروم ہیں۔ تاہم یہ بھی غلط نہیں ہے کہ کئی اچھے شاعر اچھے انسان ہیں اور معلوم نہیں ان کی شاعری نے انھیں انسان بنایا ہے یا انسانیت نے شاعری کو رنگ و روپ دیا ہے۔ موجودہ دور کی یہ بھی ایک خوش فکری ہے کہ بہت سے لوگ انسانیت کے لفظ سے چڑھتے ہیں اور اگر کہیں شعر و ادب کے سلسلے میں ان کا تذکرہ کر دیا جائے تو انھیں انسان اور شعر دونوں کی رسوائی نظر آنے لگتی ہے۔ شاعری کے لیے ایک قسم کا خللِ اعصاب ایک خاص انداز کی ذہنی کج روی غیر متوازن زندگی اور غیر ذمہ دارانہ تصورِ آزادی' ساری باتیں ضروری ہیں' ورنہ شاعری میں انفرادیت اظہارِ شخصیت اور جدت کا فقدان ہوگا۔ اسے تسلیم کر لیا جائے تو شاعری اور [illegible] میں کوئی فرق نہیں رہے گا کیونکہ تخلیقِ شعر کا جذبہ ایسی حالت میں صحت مند شعور یا اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کے اظہار کی خواہش پر مبنی نہیں ہوگا بلکہ اس نامعلوم ہیجان کا نتیجہ ہوگا جو سماج اور اس کے مسائل کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

میں جگن ناتھ آزاد کے نئے مجموعۂ کلام کا تعارف کراتے ہوئے یہ بظاہر غیر ضروری باتیں جان بوجھ کر کہہ رہا ہوں کیونکہ انھوں نے اس غیر معمولی ذہنی کرب اور کشمکش کو جو اُن کے خیالات میں عدم توازن اور محرومی کا سبب بن سکتے تھے، اپنی شعوری کوششوں سے ارتفاع کی اس منزل پر پہنچایا ہے جہاں آنکھیں کھل جاتی ہیں اور انسان اپنے دکھ درد، محرومیوں اور ناکامیوں، آرزوؤں اور خواہشوں کو ایک وسیع تر دائرے میں اور ایک بلند تر اُفق میں دیکھنے لگتا ہے۔ اس کے اندر کا بنیادی صحت مند جذبہ وقتی ہیجانات اور دل شکن افکار پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہاں انسان کی شعوری کوشش کی فتح ہوتی ہے اور وہ بہت سے اس زہر کو پی کر اپنے ہی اندر فنا کر لیتا ہے جس کی تلخی اور سمیت سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا بڑا حصّہ اس اجمال کی تفصیل ہے۔ اُنھوں نے کرب کے اندر سے سکون اور یاس کے اندر سے رجائیت، نفرت کے اندر سے محبت اور جذبے کے اندر سے ادراک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہمارے پاس سماجی، تہذیبی اقدار کا کوئی تصور ہے تو ہم اس کوشش کی عزت کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کوشش چاہے شاعری ہو یا کسی اور سماجی اور تہذیبی عمل میں۔

ایک صاحب نظر نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ہر شخص علاوہ دو زندگیاں بسر کرتا ہے۔ ایک عام سطحی اور معمولی زندگی، جو اسے کھانے کی میز پر اور دفتر لے جاتی ہے اور دوسری اس کے خوابوں اور خیالوں کی زندگی، آرزوؤں اور خواہشوں کی زندگی، جس کے سہارے وہ درحقیقت اپنے اندر جینے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کے بہترین لمحوں اور خوبصورت یادوں کی تو سیع کرتا اور خوش ہوتا ہے ان یادوں کی تکلیف اور اُن کی تلخی آہستہ آہستہ سرمایۂ زندگی بن جاتی ہے اور ماضی کے دکھوں کو گوارا بناتی ہے۔ کشمکش حیات میں جمع کئے ہوئے افکار اور خیالات عزیز تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور اُن کے اظہار میں لذت محسوس ہوتی ہے اُن کے لئے جینے اور ایثار کرنے اور اُنھیں دوسروں تک پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے

انسان اور انسان میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اس کی شخصیت اور انفرادیت متعین ہوتی ہے۔ اس سے زندگی کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اہمیت اور انفرادیت اختیار کرنے کے لئے اعصابی خلل کی ضرورت نہیں ہے۔ خلوص، ریاضت اور غور و فکر سے انسان اپنی زندگی کی سطح کو بلند کر سکتا ہے۔ آزاد کی زندگی اور شاعری دونوں سے اس کے ثبوت ملتے ہیں۔ زندگی میں حسن نہ ہو، خلوص نہ ہو، گہرائی نہ ہو، عالی ظرفی نہ ہو تو فن میں بھی ان کی مخلصانہ جھلک نہیں دکھائی جا سکتی۔ آزاد نے دونوں کو اس سطح پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں سے اس ہم آہنگی کا نظارہ کیا جا سکے۔

آزاد کی شاعری کا مطالعہ کرنے یا اُن سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے جہاں اُن کے مزاج اور اُن کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے وہاں کم سے کم اس واقعہ کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو بہت سے لوگوں کی طرح انہیں بھی اپنی خوشی اور خواہش کے برخلاف ایک حصّے سے دوسرے حصّے میں منتقل ہونا پڑا۔ یہ اُن کی جذباتی زندگی کے لئے ایک ایسا انقلاب تھا جس کے شعوری اور غیر شعوری اثرات اُن کے افکار و خیالات کا جزو بن چکے ہیں۔ وہ اپنی جذباتی دنیا کا ایک حصہ وہاں چھوڑ آئے اور وہاں کی یادوں کا ایک بڑا حصّہ سینے میں چھپا کر یہاں آ گئے۔ اس میں لاہور کے باغ، گلی کوچے، دوستوں سے ملنے جلنے کے مقامات، شناساؤں اور رفیقوں کے مکانات، اخبارات و رسائل کے دفاتر، کتابوں کی دکانیں، درس گاہیں، راوی کا کنارہ سب موجود ہیں اور تخیل کی ذرا سی چھیڑ سے سب موجود ہو جاتے ہیں۔ جمنا کا کنارہ دیکھ کر انھیں راوی کی یاد آتی ہے اور راوی کے ساتھ اُن کے تاثرات کی جو ماضی کا حصہ بن جانے کے باوجود حال میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جذبات کی اس دنیا میں جو آبادی ہے اُسے نہ تو ویران کہہ سکتے ہیں نہ آباد۔ اس لئے اس کے ہر بیان میں غم اور خوشی کا امتزاج ملتا ہے۔ یہ بات اُن کی بہت سی نظموں میں واضح طور سے نمایاں ہوتی ہے اور بعض میں پس منظر کے طور پر کبھی خیالوں کے نیچے دبی دبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کبھی صدائے بازگشت

بن کر غیر واضح علامتوں کی شکل میں، بہر حال یہ بنیادی امر اور مرکزی نقطہ ہے جس کے مثبت یا منفی اثرات آزاد کی پوری شاعری میں نظر آتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ یہی اُن کی پوری کائنات ہو۔ بلکہ (کم سے کم) اس مجموعے میں اُن کی بہت سی ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جو اس دائرے کے باہر نکل جاتی ہیں پھر بھی ان کے لہجے میں جو کسک اور گداز ہے، جو اثر انگیزی اور گھلاوٹ ہے وہ اسی عہد آفریں وقت کی غمازی کرتا ہے جب گوشت کو ناخن سے جدا کر دیا گیا۔ اس لمحۂ جدائی نے ان میں محبت اور انسانیت کے ایک وسیع تر تصور کو جنم دیا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ تقریباً ایسی ہی کوئی بات اُنہوں نے خود کہیں کہی ہے اور اس کا اعتراف کیا ہے کہ تقسیم ہند کے واقعے نے ان کی جذباتی زندگی کی سطح کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کے دل میں نئے تصورات اور خیالات کے چشمے پھوٹ پڑے۔ آزاد نے اُن کا جو اثر لیا ہے اس کا تقاضا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک قنوطی، یاس پرست اور غم دوست انسان بن جائیں۔ لیکن چونکہ اُنہیں اس دنیا اور اس کے انسانوں سے محبت تھی اس لئے انھوں نے عظمتِ آدم کے گیت گائے۔ دوسرے کے غم کو اپنانے کی کوشش کی، ایشیائی ممالک کے جذبۂ بیداری کو اُبھارا۔ گداگر کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا۔ اور ایورسٹ کی چوٹی فتح کرنے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ ساری باتیں ایک ہی سمت اشارہ کرتی ہیں۔ آزاد میں انسان دوستی کا عنصر نہایت قوی ہے۔ جہاں بلندی حاصل کرنے، ظلم سے جدوجہد کرنے، روشنی کی تلاش میں نکلنے، دوستوں کی محبت کی قدر کرنے کا سوال ہے، وہاں آزاد کی آواز ضرور بلند ہوتی ہے۔ یہ سارے عناصر صحت مند ہیں اور انہی سے ان کے افکار کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو ان خیالات [illegible] شاعری کا موضوع ہی نہیں سمجھتے اُنہیں یقیناً اس بات سے الجھن ہوگی کہ [illegible]ئی شاعر زندگی کے کسی اعلیٰ نصب العین سے کیوں دلچسپی رکھتا ہے۔

نوائے پریشاں، جگن ناتھ آزاد کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا تیسرا مجموعہ[1]

۱۔ اصل میں یہ آزاد کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ تیسرا مجموعہ "وطن میں اجنبی" ہے۔ بعض وجوہ کی بنا پر "نوائے پریشاں" کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ (محمد ایوب واقف)

ہے اور تازگی' تنوع' قدرت بیان' فکری رجحان اور رنگینی اظہار کے لحاظ سے پچھلے دونوں مجموعوں سے بہت بہتر ہے۔ چند ایسی نظموں کو چھوڑ کر جن سے شاید ہر شخص لطف اندوز نہ ہو سکے (جیسے بعض دوستوں کے نوحے نعتیہ نظمیں) زیادہ تر نظموں کا موضوع شخصی یا آفاقی حیثیت سے اہم ہے۔ اس تعارف کو مثالوں سے گرانبار بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر پڑھنے والا اپنے ذوق کے مطابق نظموں کا انتخاب کرے گا لیکن اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ قاری کی جذباتی اور وقتی پسندیدگی ہی کسی شاعر کی فکری اور فنی حیثیت کا تعین کرنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس سے ماوراء وہ اصل صلاحیت ہے جو کسی شاعر کو اہم اور پسندیدہ بناتی ہے اس صلاحیت کا ادراک ہر شخص نہیں کر سکتا کبھی کبھی وہ پڑھنے والے کے فکری یا فنی تعصبات کے نیچے دب جاتا ہے۔ اسی لئے سرسری طور سے نظموں یا اُن کے بعض حصوں کا مثال کے طور پر پیش کرنا شاید آزاد کی پوری تصویر بنانے کے لئے کافی نہ ہو۔ بہر حال یہ کہنا نامناسب نہیں ہوگا کہ اس مجموعے کے ذریعہ آزاد نے اپنے فن کی دنیا میں جھانکنے کا موقع بھی فراہم کیا ہے اور اپنے دماغ کے دریچے بھی کھول دیئے ہیں اپنے شعورِ فن کا پتہ بھی دیا ہے اور اپنے سوزِ دروں کو حرارت بھی ظاہر کر دی ہے۔ یہ درست ہے کہ شاعر کی شخصیت آسانی سے داخلی اور خارجی دائروں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی پھر بھی موضوع کے اعتبار سے مطالعہ کے لئے انہیں الگ کہہ سکتے ہیں۔ خارج اپنا مادی وجود رکھتا ہے۔ داخلیت اس کا ردِ عمل ہوتی ہے۔ اس طرح خیال سے جذبے کی راہ نکلتی ہے اور جذبہ بھی ذہن کا غماز بن جاتا ہے۔ موضوع کے انتخاب اور جذبات کے اظہار دونوں سے شاعر کے متعلق رائے قائم ہو سکتی ہے۔ آزاد کے یہاں انتخاب و اظہار دونوں میں حسن ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کے لئے مناسب اندازِ بیان بھی تلاش کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسی نظمیں بھی جو بادی النظر میں کسی وقتی موضوع سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اپنا خوبصورت لباس رکھتی ہیں۔

آزاد کی غزلوں اور نظموں دونوں میں لطافت ملتی ہے کیونکہ وہ نظموں میں بھی اس غنائیت اور تغزلانہ کیفیت کو برقرار رکھتے ہیں جس سے غزل خالص داردانی چیز

بنتی ہے۔ ایسی نظموں میں یادِ رنگ و بو، مژدہ اے آزاد، یقین بے گماں، ربودگی کا ایک لمحہ، صدائے بازگشت، جمنا کے کنارے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ایسی نظمیں جو فکری تناسب زیادہ رکھتی ہیں وہ بھی طرزِ اظہار کی رنگینی اور ترنم کی وجہ سے بے حد دل کشی رکھتی ہیں۔ جیسے ذرہ، عظمتِ آدم، بھارت کے مسلمان، ڈونٹ ایڈ ورسٹ

آزاد کی شاعری ہمارے دور کے اس مخلص انسان کی آواز ہے جو انسان کی عظمت اور نیکی پر بھروسا رکھتا ہے اور جسے خیالات کے اظہار پر قدرت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ ان کے دوسرے مجموعوں سے بھی زیادہ مقبول ہوگا۔ ایک مخصوص مفہوم میں آزاد کے اس مجموعے کے لئے بھی اقبال کی زبان میں کہا جا سکتا ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اقبال اور مغربی مفکرین

رشید احمد صدیقی:۔

اقبال پر آپ کی نظر جس طرح عالمانہ اور Reverential ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ میرا خیال ہے اور دعا بھی کہ آپ کو اقبال پر کہنے کا استناد کا درجہ حاصل ہو جائے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے۔ آدمی طرح طرح سے پہچانا جاتا ہے اس میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کا محبوب شاعر کون ہے۔

علی گڑھ

(ایک خط کا اقتباس) ۱۳ مارچ [illegible]

پروفیسر گیان چند
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ

جگن ناتھ آزاد کی غیر مطبوعہ مثنوی
جمہور نامہ

فارسی میں قدیم مثنوی کے کچھ مخصوص موضوعات تھے۔ بزم، رزم، معرفت اخلاق۔ اُردو کی بیشتر طویل مثنویاں منظوم فوق الفطرت داستانیں ہیں۔ حالی و آزاد کے عہد سے جب شاعری کی دنیا زندگی کی طرح وسیع ہونے لگی تو مثنوی کا پیمانہ اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ موضوع کا انقلاب ہیئت میں بھی انقلاب لایا۔ یہاں تک کہ بعض طویل نظمیں آزاد نظم کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دس پانچ سالوں میں مثنوی کا پھر سے احیا ہو رہا ہے۔ کئی شاعروں نے اس فراموش شدہ صنف کی طرف توجہ کی ہے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد بھی ہیں۔

تخلیقِ کائنات و ارتقائے بنی آدم سے مہتم بالشان کوئی اور موضوع نہیں ہو سکتا۔ اس کو دو زاویوں سے دیکھنا ممکن ہے۔ ایک عقیدت و مذہب کی آنکھ سے دوسرے حقیقت و تعقل کی نظر سے جیسا کہ سائنس و تاریخ کا شیوہ ہے۔ آزاد نے اس عظیم کہانی کو تاریخ کے آئینے میں دیکھا ہے اور اس کی روداد مثنوی میں پیش کی ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا بقول مصنف ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ اس کا بیشتر حصہ ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا اور اس کے بعض اجزا مختلف رسالوں میں مثلاً نقوش، نگار،

معارف وغیرہ میں شائع ہوئے۔ ذکی الحس شاعر نے محسوس کیا کہ اس کی جگر کاوی کی داد ملنی چاہیئے نہ ملی۔ اہلِ نقد نے ادھر چشمِ اعتنا نہ کی۔ اس بددلی نے عزائم کی طناب توڑ ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظم نامکمل پڑی ہے۔ کوئی تین ہزار اشعار کہہ کر شاعر نے اسے طاقِ نسیاں پر ڈال دیا ہے اگر سخن فہموں نے اس کی طرف التفات نہ کی تو اردو ایک بڑے کارنامے سے محروم رہ جائے گی۔ میں آزاد صاحب کے لطف خاص کے لئے مشکور ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر نظم کے بیشتر حصوں کی نقل مجھے عنایت کی

جوشؔ کی "حرفِ آخر" کا موضوع بھی یہی ہے شاید اس موضوع کی عظمت اور وسعتِ لحاظ نظم پر سمٹ آنے کو تیار نہیں کیونکہ بیسیوں سال گزر جانے کے باوجود حرفِ آخر کا کبھی "حرفِ آخر" نہیں لکھا جا سکا۔ اس کے جستہ جستہ نمونے جو شائع ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس موضوع پر "حرفِ آخر" ہو گی۔ کیونکہ جوشؔ کا یہ شاہکار نہ تو مکمل ہوا ہے نہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس لئے آزاد نے اسی موضوع پر طبع آزمائی کی تو بُرا نہیں کیا۔ میرے استفسار پر آزاد نے مجھے بتایا کہ انہیں اس نظم کی تحریک جوشؔ کی حرفِ آخر سے نہیں بلکہ اقبال کے جاوید نامے سے ہوئی گو اس کا موضوع مختلف ہے۔

مثنوی "جمہور نامہ" ہزج مثمن سالم یعنی مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کے وزن میں لکھی گئی ہے اس بحر میں دوسری مشہور مثنوی حفیظ جالندھری کا "شاہنامۂ اسلام" ہے۔ غالباً آزاد نے بحر کا انتخاب حفیظ کی تقلید ہی میں کیا ہے۔ میں نے اپنے وطن میں مولود شریف پڑھنے والوں کو سُنا ہے ان کی نظمیں اس بحر میں ہوتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ وہ "شاہنامہ اسلام" ہی کے اجزا ہوتے ہوں۔ یہ بحر اس موضوع کو راس آ گئی ہے، لیکن آزاد کے جمہور نامہ میں بالکل بے محل لگتی ہے۔ آزاد صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بحر کا انتخاب موزوں ترین نہیں اس لئے اب وہ بحر بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ واقعہ نگاری کے لئے کوئی چھوٹی بحر زیادہ موزوں

رہتی ہے۔ مثلاً سردار جعفری کی مثنوی جمہور کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے — جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے
زمانے کے دریا کی موجِ جواں — ازل سے ابد تک رواں اور دواں
ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم — کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم
ہمیشہ سے سرگرم پیکار ہیں — تواریخ کی تیز تلوار ہیں

انیسویں صدی کے وسط تک طویل نظموں کے لئے صنفِ مثنوی کا اجارہ تھا۔ مرثیہ گویوں نے مسدس کا استعمال کیا۔ حالی نے بھی مدو جزر اسلام کی داستان مسدس میں لکھی۔ دورِ حاضر میں ترقی پسند شعراء نے طویل نظمیں آزاد نظم کی ہیئت میں پیش کی یا ایسے قالب میں کہ حسبِ موقع ردیف قافیہ اور بحر بدلتے رہیں۔ یعنی طویل نظم کے لئے منظوم ڈرامے یا سنگیت روپک کی ہیئت اختیار کی گئی۔ اس میں حسب دلخواہ بحر اور قافیوں کا تنوع جائز ہے۔ مثنوی میں غضب کی یکسانیت اور ایک آہنگی ہوتی ہے۔ بار بار وہی شعر میں قافیہ کی تبدیلی۔ بند کی تقسیم نہ ہونا۔ سیکڑوں صفحے پڑھ جایئے کوئی زیر و بم ہی نہیں۔ طبیعت اوب جاتی ہے۔ ایک رنگ کے پھولوں کے چمن میں وہ دعوتِ نظر نہیں ہوتی جو گوناگوں پھولوں کے خیاباں زار میں ممکن ہے ایک ہی بحر، ایک ہی نظام قوانی مختلف جذبات و کیفیات کے بیان کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے۔

ایک دفعہ گو بحر نہ بھی بدلے تب بھی نظام قوانی کا بدلتے رہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس طرح طویل نظم چھوٹی چھوٹی نظموں کا گلدستہ ہو جاتی ہے جن میں سے کوئی قطعے کی حیثیت سے ہوتی ہے، کوئی مثنوی کی کوئی مسدس کی، کوئی ان سب سے الگ نو وضع ہیئت میں۔ جس طرح ناول میں واقعات کا آئندہ موڑ معلوم نہ ہونے پر ہر بیان کا اچانک پن ایک آسودگی بخشتا ہے۔ اسی طرح نظم کی ساخت میں بھی اگر قافیوں کا آئین حسبِ موقع بدلتا رہے تو ہر تبدیلی اپنے نئے پن کی وجہ سے فرحت زا ہوگی۔ وادیٔ گنگا کے طویل و عریض میدان میں ریل گاڑی سے گزر

جاتے ہیں۔ ہزاروں میل تک ایک ہی سطح زمین تک ہزار زرخیز سہی لیکن جنت نظارہ نہیں۔ ناہموار پہاڑوں اور گھاٹیوں میں ہر قدم پر سیر کا لطف ہے۔ کاش "جمہور نامہ" مثنوی کی سپاٹ ہیئت میں نہ لکھی جاتی۔

بحر اور قافیے کی تبدیلی کے خوش آئند اثر کا ثبوت اسی مثنوی میں ملتا ہے۔ مختلف فصلوں کے سرنامے کے طور پر آزاد نے دوسرے بڑے شعراء مثلاً میر، اقبال یا جگر کے بعض اشعار لکھے ہیں جو علیحدہ بحر و قافیہ ہونے کی وجہ سے خوشگوار معلوم ہوتے ہیں جیسے ظہور آدم سے پہلے صفحے پر میر کا یہ شعر ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یا: ہمارے اولین اجداد سے پہلے اقبال کے یہ اشعار ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

مثنوی کی اکتا دینے والی یکسانی کے بعد یہ قاری کے حوصلے کو سنگِ میل کی طرح سہارا دیتے ہیں۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس عظیم آبادی پرنسپل کالج آف کامرس پٹنہ کی تصنیف مثنوی حیات و کائنات شائع ہوئی۔ گلزار نسیم کی بحر میں ۷۰ صفحات کی مثنوی ہے اس کا موضوع بھی عین وہی ہے جو آزاد کی مثنوی کا ہے۔ دونوں کا نقطۂ نظر بھی یکساں ہے۔ یعنی دونوں نے سائنسی زاویے سے ارتقاء کا بیان کیا ہے لیکن اس کے باوجود دونوں نظموں میں خاصہ فرق ہے۔ آزاد کی نظم بڑی مفصل ہے۔ اس لئے انہوں نے بیان کو شرح و بسط سے لکھا ہے۔ ایسے شاعرانہ بیانات ہر چار پانچ صفحات کے بعد آتے رہتے ہیں اور شاعر انہیں سرسبز کرنے میں پورا زور صرف کر دیتا ہے جس کی وجہ سے "جمہور نامہ" محض منظوم تاریخِ عالم نہیں ایک شاعرانہ کارنامہ ہے۔

تخلیقِ کائنات وارتقائے آدم کی داستان بڑی رومانی ہے۔ مذہب کی اساطیر میں تو یہ بالکل طلسم ہوشربا کی داستان بن جاتی ہے۔ خاک سے آدم کی تخلیق۔ ایک فرشتے کا اُسے سجدہ کرنے سے انکار کرنا، اور مردود قرار پانا، آدم کا احساسِ تنہائی اور اس کے بدن سے حوّا کی نمود، شیطان کے ورغلانے سے پہلا گناہ اور پھر جنّت سے نیچے گرنا۔ سلیمان، خلیل، کلیم اور مسیح کی رو داد وغیرہ۔ اس قصّے میں شاعرانہ رنگ آمیزی کی کیا ضرورت، یہ تو خود ہی شاعری ہے۔ اس پر کسی طرح بھی طبع آزمائی کی جائے شاعری کا حق ادا ہو جائے گا۔ جوشؔ نے حرفِ آخر میں اسی کو لیا۔ اِس کے مقابل سائنس کی پوست کندہ حقیقت ہے۔ سمندروں میں نباتات کا پیدا ہونا، اس سے حیوانی شاخ کا پھوٹنا۔ ابتدائی جلیے سے درجہ بدرجہ حیوانات کا ارتقار اور اس سے آگے مصر، بابل، یونان اور ہندوستان کی تاریخ، جدید ذہن عقبیت غیر حقیقی داستانوں سے آسودہ نہیں ہو سکتا۔ وہ طبعی سائنس کی ثابت شدہ تاریخ سے قائل ہو سکتا ہے۔ یہاں شاعری کی سمائی نہیں۔ آزادؔ نے صاف صاف کہہ دیا ہے ؎

تخیّل کی فسوں کاری اسے سمجھا نہیں سکتی
خرد سائنس سے ہٹ کر یہ نکتہ پا نہیں سکتی

اسے رنگِ تغزّل میں بیاں کرنا نہیں ممکن
یہ پتھر ہے اِسے آب رواں کرنا نہیں ممکن

یہ باریکی ہے وہ جو علم کی رگ رگ میں سمائی ہے
ترنّم اس کو محفل میں بیاں کرنے سے عاری ہے

یہ ہے بس غور کا گفتار کا ساماں نہیں ہے یہ
یہ عنواں فکر کا ہے ذکر کا عنواں نہیں ہے یہ

خرد جب تک درِ تحقیق پر چل کر نہ جائے گی
یہ رمزِ ارتقار اس کے تصوّر میں نہ آئے گی

سائنس اور تاریخ کی بے رنگ حقیقت کو شاعری کے شفق زار میں سمونا ایک چیلنج ہے، جسے آزادؔ نے قبول کیا اور سرخرو نکلے۔ انھوں نے رامائن، مہابھارت اور گیتا کو سراہا ہے۔ مہاویر سوامی اور گوتم بدھ کا ذکر کیا ہے لیکن کہیں کوئی ضعیف روایت نظم نہیں کی۔ ابواب کے عنوانات سے جمہور نامے کے حصار کا اندازہ ہوگا۔ نمبر میرے دیئے ہوئے ہیں۔

(۱) حرفِ اوّل:
نظریۂ ارتقا۔ بہ نام ابنِ آدم

(۲) ظہورِ آدم:
کرۂ ارض۔ ایک سوالیہ نشان اور عقل انسانی کی نارسائی

(۳) ہمارے اوّلین اجداد:
وادیٔ نیل میں ابنِ آدم کے قدم۔ تہذیب کی اوّلین جھلک

(۴) بابل، اشور، نینوا اور ہندوستان میں تہذیب کی کرنیں

(۵) دنیا کی اوّلین کتاب وید

(۶) رامائن

(۷) مہابھارت

(۸) گیتا

(۹) گیتا کے طوفانِ نور کے بعد ظلمت کی یورش اور ظلمت میں روشنی کی کرنیں۔ مہاویر سوامی اور مہاتما بدھ

(۱۰) نور، ظلمت کی کشمکش
ترقی و تنزل کے متضاد دھارے۔ مہاتما بدھ کا زمانہ۔ اس دور کے فنونِ لطیفہ۔ علم و ادب سماجیات اور اقتصادیات پر ایک نظر۔

(۱۱) ولادت باسعادت

(۱۲) ہندوستان ہمارا

حرفے از خاندانِ چشتیہ

کالیداس

(۱۳) ابراہیم سے کلیم تک
خاندانِ چشتیہ کا ذکر ایسے موقع پر قبل از وقت ہے۔ کیونکہ آئندہ باب میں

ابراہیم و کلیم کا ذکر ہے۔ میں نے یہ ترتیب مسودے سے لی ہے۔ اس لئے اسے قطعی اور آخری نہیں مانا جا سکتا۔ اس کے علاوہ آخری تین باب میرے پیش نظر نہیں۔ آزاد صاحب کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت تک تین ہزار سے زیادہ اشعار ہو چکے ہیں۔ اگر کالیداس اور کلیم تک کا بیان تین ہزار اشعار پر محیط ہے تو دورِ حاضر تک آتے آتے پوری نظم دس ہزار اشعار سے کم میں نہ سمائے گی۔

نظم کی ابتدا میں تخلیقِ کائنات کے مذہبی نظریات پر سائنسی نظریے کی ترجیح کی وجہ اور اس کے مشکلات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے آگے اصل موضوع کی ابتدا ہوتی ہے۔ مروجہ مثنویاں حمد و نعت، مناجاتِ عشق، تعریفِ سخن و صفِ نامہ یا ساقی نامے میں سے کسی ایک سے شروع ہوتی تھیں۔ آزاد نے یہ جدت کی ہے کہ اپنی نظم کو ابنِ آدم کے نام سے شروع کیا ہے۔

بشر کے نام سے آغاز ہے جمہور نامے کا — بشر کی عظمتوں کا ذکر ہے مقصود خامے کا
بشر کیا ہے یہ جائے گا کہاں آیا کہاں سے ہے — یہ بطنِ خاک سے ہے یا فرازِ آسماں سے ہے

اشرف المخلوقات ہی مرکزِ کائنات ہے۔ آزاد نے انتسابِ نظم کے طور پر اس کی مفصل مداح سرائی کی ہے۔ آگے ارتقائے آدم کے ذکر میں پھر اس موضوع پر رطب اللسان ہوں گے۔

پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ آزاد کی اس نظم میں قدم قدم پر مفصل شاعرانہ اندازِ بیان ملتا ہے۔ آغاز و ارتقائے کائنات کا موضوع سائنس و تاریخ کی حقیقت کے طور پر بیان کیا جائے تو بھی کم از کم عہدِ عتیق میں کسی فسانے سے کم دلآویز نہیں۔ آزاد نے کرۂ ارض کے بیان سے ابتدا کی ہے۔ میرے علم میں اردو شاعری میں زمین کو ایک کرہ کے طور پر پہلے کبھی موضوعِ فکر نہیں بنایا گیا

ہماری یہ زمیں یہ غم کا گھر خوشیوں کا گہوارہ — خلا میں رقص کرتا گھومتا روشن ترین تارہ
تمدن کا مہکتا بوستاں تہذیب کا گلشن — ہنر کی آبرو سائنس کا گھر علم کا مسکن
یہ دنیا شاعروں کی اور افسانہ نگاروں کی — یہ مسکن حسن بینوں کا یہ محفل حسن کاروں کی

یہ آگ کا کرہ جب ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو عرصے تک زندگی کے نور سے محروم رہتا ہے۔ ایک لامتناہی خاموشی میں لپٹا ہوا۔

تپش کو چھوڑ کر اب تھی ہماری خاک خاموشی ۔۔۔ چٹانوں کی بھیانک اور ہیبت ناک خاموشی
مکاں سے لامکاں تک ایک خاموشی ہی خاموشی ۔۔۔ زمیں سے آسماں تک ایک خاموشی ہی خاموشی
جہاں بس خامشی کی داستاں ہی سے عبارت تھا ۔۔۔ یہ منظر اک سکوت بیکراں ہی سے عبارت تھا

بارش نے چٹانوں کو کاٹ کر مٹی کو جنم دیا۔ چٹان مردہ ہے، لیکن مٹی زندگی کی امین ہے۔ سننے میں آیا تھا کہ جوش نے حرف آخر میں آگ کی دریافت کا ذکر کرتے ہوئے اس منبع تاب و تب کی مدح میں اچھے اشعار لکھے ہیں۔ آزاد نے مٹی کی تعریف کی ہے

یہ مٹی جس کو پہلی زندگی کی یاد آتی تھی ۔۔۔ لئے پھر آرزو اک روشنی کی گنگناتی تھی
تمنا کے تجلی پھر سے بیتاب رکھتی تھی ۔۔۔ تمنا خاک میں بیتابی سیماب رکھتی تھی

چٹانوں کے نشیب میں بارش کا پانی اکٹھا ہو گیا۔ کروڑوں سال گزرنے پر اس میں نباتاتی حلیہ پیدا ہوا۔ یہ زندگی کی پہلی نحیف کرن تھی۔ نباتاتی شاخ سے حیوانی شاخ پھوٹی جس کے ارتقاء کا نقطۂ انتہا انسان ہے۔ اس موقع پر دخل در معقولات کے طور پر آزاد نے تصویر کا دوسرا رخ کے عنوان سے بیدا عہد نامۂ قدیم اور قرآن کے بموجب انسان کی تخلیق کے نظریات مختصراً درج کئے ہیں۔ یہ نہ لکھتے تو اچھا ہوتا۔ جب نظم میں سائنس اور تاریخ کا زاویہ ملحوظ رکھا گیا ہے تو کیا ضروری ہے کہ دوسرے تمام نظریات بھی پیش کئے جائیں۔ آزاد نظم لکھ رہے ہیں تخلیق آدم پر کوئی مدلل جامع نثری مقالہ نہیں۔ بہر حال اس بہت مختصر بے کیف استدلالی بیان کے بعد پھر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

میں شاعر ہوں مجھے اس بحث سے کیا کام ہے ساقی ۔۔۔ اٹھا انساں کی عظمت کا چھلکتا جام اے ساقی

چند اشعار کے ساقی نامے کے بعد انسان کی جناب میں ایک ولولہ آمیز سلام عرض کیا ہے

سلام اے آدم فانی! سلام اے جلوہ باقی! ۔۔۔ سلام اے بزم ہائے دہر! سلام اے بزم کے ساقی
سلام اے آدم خاکی! سلام اے میر آفاقی! ۔۔۔ سلام اے راز خود بینی! سلام اے روح بیباکی

مرقع ولولوں کا حوصلوں کا عزمِ انساں کا — صحیفہ شاعری کا علم و فن کا حزمِ انساں کا
توہم کی اندھیری رات میں پہلی تجلی ہے — بشر کے واسطے یہ اوّلیں حرفِ تسلی ہے
زمیں تیرے کتب خانے کا پہلا صحیفہ ہے — نوا سنجوں کا نغمہ ہے فقیروں کا وظیفہ ہے
اسی نے زندگی کو فکر کے کانٹے میں تولا ہے — اسی نے اوّل اوّل رازِ ہست و بود کھولا ہے
ترانے حمد کے اس میں دعا کے زمزمے اس میں — ولیکن سیدِ ابن آدم کے پیاپے ہیں جھمیلے اس میں
اسے کوئی گڈریوں کی زباں سمجھا تو کیا سمجھا — حقیقت کو یہ کوئی داستاں سمجھا تو کیا سمجھا

وید کی طویل والہانہ توصیف کی ہر سطر شعریت آمیز ہے۔ وید کی اگلی منزل رامائن ہے۔ اس کا خلاصہ شاعر نے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ اگر مجھے غمِ دوراں سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی تو اس واقعے کو سو طریقوں سے بیان کرتا۔ پھر اس واقعہ کے جزئیات بتاتا جاتا ہے اور سب کچھ کہہ دینے کے بعد اعترافِ عجز کر لیتا ہے۔ اس فنکارانہ روئیداد کے بعد مہابھارت اور گیتا کے ابواب ہیں۔ ان تمام صحیفوں میں گیتا کا بیان سب سے تفصیلی ہے۔ عقیدت کی گرامی ملاحظہ ہو۔

اسی کانِ سخن کا لعلِ عالم تاب ہے گیتا — ہمارے فلسفے کی آبرو ہے آب ہے گیتا
یہ عظیم فانی سات سو اشعار کی دنیا — زمانے کی نظر میں رفعتِ افکار کی دنیا
یہ نغمہ جنگ کے میدان میں گایا ہوا نغمہ — زمیں پر رفعتِ افلاک سے لایا ہوا نغمہ

شانِ نزول کے ساتھ اس کا پورا فلسفہ کئی چند صفحات میں افشا کر دیا ہے۔

بتایا ہے یہ بیگانہ فقط اک وہم ہے تیرا — یہ اک تمثیل ہے جس میں نہ میں تیرا نہ تو میرا

روح کی مفصل حقیقت بیان کرکے عمل کا فلسفہ بیان کرتے ہیں اور اس ضمن میں اقبال کے مشہور شعر کے دونوں مصرعوں کی بڑی برجستہ تضمین کی ہے۔

عمل اک خیر کی دنیا بھی ہے اک شر کا عالم بھی — "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"
"یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے" — عمل ہی خامکاری ہے عمل ہی پختہ کاری ہے

کرم یوگی کرشن کے بعد اہنسا کے ہادی مہاویر سوامی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

وطن میں پھر سے دورِ راحت و آرام آپہنچا	پیامِ امن بن کر دہر کا پیغام آپہنچا
جو تھا گم کردہ رستہ کاروانِ امن کا میر آیا	ستم گاروں کی دنیا میں اہنسا کا سفیر آیا
صداقت کی خبر دیتا ہوا پھر آیا بصیر آیا	ریاضت کے جہاں کا تاجدارِ بے نظیر آیا

اور ان کے بعد امن کے پیغمبر مہاتما بدھ کی سوانح ہے وہ جب دنیا پہ رات ملد کر رات کو اپنے محل سے نکلتے ہیں اس سمے کا بیان اس باب کا حاصل ہے۔

سہانی رات تھی اک خواب میں مدہوش تھی دنیا	دلِ بیتاب کی لیکن بڑی پر جوش تھی دنیا
وہ اُٹھا زندگی کے لطف کو آرام کو چھوڑا	رفیقِ زیست کو معصوم گل اندام کو چھوڑا
وہ یوں نکلا کہ جیسے روح پیکر سے نکلتی ہے	اندھیرے میں کلی جیسے خاد سے نکلتی ہے

اس کے بعد کے باب میں بدھ کے دور کے فنونِ لطیفہ، علم و ادب، سماجیات اور اقتصادیات پر ایک نظر ہے۔ کیونکہ آج کا بیدار مغز شاعر سماجی شعور سے بیگانہ نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں شاعر کا یہ بیان کہ ہندوستان میں حکومت کی بنیاد عوامی مجلس پر تھی محلِ نظر ہے۔ احیا پرست حضرات یہ دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ آج کل کے تمام قابلِ ستائش سیاسی تصورات و سائنسی اختراعات پراچین بھارت روش میں موجود تھے یہ عقیدت ہی عقیدت ہے حقیقت نہیں۔ آزاد صاحب کا جو خیال ہے کہ راجہ ووٹ سے منتخب ہوتا تھا محض خوش عقیدگی ہے۔ لکھتے ہیں :-

یہ راجے سب عوامی رائے کے پابند رہتے تھے	نتیجہ تھا کہ جتنے لوگ تھے خورسند رہتے تھے
عوامی رائے کا اظہار اک مجلس میں ہوتا تھا	وہ ہو اقرار یا انکار اک مجلس میں ہوتا تھا
ہمیشہ منتخب سردار صدرِ بزم ہوتا تھا	یہ صدرِ بزم اہلِ عقل و اہلِ عزم ہوتا تھا
یہی سردار اہلِ ملک راجہ جس کو کہتے تھے	عوامی رائے ہی کے دم سے اس منصب پہ رہتے تھے
حکومت اصل میں یہ اکثریت کی حکومت تھی	شرافت کی صداقت کی عدالت کی حکومت تھی
نظامِ امروز کا یعنی نظامِ پارلیمانی	اسی بھارت کا ہے وہ ہے نہ امریکی نہ برطانی

تاریخ اس دعوے کی موید نہیں۔ ممکن ہے کسی نچلی سطح پر عوامی رائے سے پنچ وغیرہ چنے جاتے ہوں۔ لیکن بڑے بڑے راجہ دو لوگوں کے سہارے نہیں وراثت یا طاقت

کے بل پر تخت حاصل کرتے تھے۔ اکثریت کا جہاں تک تعلق ہے اکثریت شودروں کی تھی اور انھیں حکومت میں کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن اس باب کے اگلے حصّہ میں آزاد نے ذات پات کی تقسیم، شودروں سے ناانصافی اور برہمنا کے پندار اور احساس برتری پر سخت تنقید کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ہند قدیم کے ہر ادارے کے وکیل اور پرستار نہیں۔

اس کے آگے کے ابواب میرے سامنے نہیں۔ ہندوستان اور ہندو صحیفوں کے بیان میں شاعر نے بڑی گرم جوشی دکھائی ہے۔ شاعر کی وسیع مشربی کو دیکھتے ہوئے یقین کامل ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں بھی اس سے کم جوش نہ ہوگا۔ وہ ابنِ آدم کو سلام کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے بانیوں کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

سرمیدانِ حسین ابنِ علی کا حوصلہ تجھ میں	علی کا علم تجھ میں زورِ تجھ میں حوصلہ تجھ میں
سلام اے آدمِ خاکی بسلام اے آدمِ فانی	فروزاں ہے محمدؐ کی ضیا سے تیری پیشانی

اس طویل نظم اور اس کے متنوع بیانات کو دیکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آزاد کو مسلسل بیان پر بڑی قدرت ہے۔ طویل نظم کے وسیع و عریض میدان میں وہ تھک نہیں جاتا۔ دروبست الفاظ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ بیٹھتا بلکہ ہر جگہ پوری قدرت اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے چستی بندش میں فرق نہیں آتا بھرتی کے الفاظ کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ پیچھے جو نمونے دیئے گئے ہیں اُن سے شاعر کی قادر الکلامی اور پختہ کاری کا اندازہ ہوا ہوگا۔ کئی ہزار اشعار کے مسودے میں ایسے اشعار جو محلِ نظر ہوں صرف اتنے ہیں کہ ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

وہ تاریخی حقائق جن پہ قائم ہے مہابھارت
جو امن و جنگ کے لب پہ ہے رودادِ مہابھارت

اس شعر میں ردیف ہے قافیہ غائب۔[1]

---

[1] مسودہ صاف کرتے وقت آزاد سے یا نقل نویس سے غلطی ہوئی ہوگی۔ میرے پاس جو نقل ہے اُس میں مصرعِ اول یوں ہے: وہ تاریخی حقائق جو ہیں رودادِ مہابھارت۔ (مرتب)

یہاں ہوتا تھا اوّل متفقہ فیصلہ اگر
وگرنہ منتخب کرتے تھے یہ دو ایک کو مل کر

"متفقہ" بروزن مفتعلن ہے۔ اس کے "ت" کو مشدّد باندھنا صحیح نہیں۔

مری خاکِ وطن پہ ایک دورِ خوش گوار آیا
کہ یا تپتے ہوئے صحرا میں ہنگام بہار آیا

"کہ" اور "یا" میں سے صرف ایک لفظ چاہیئے تھا۔ وزن کے جبر نے دونوں کو استعمال کرنے پہ مجبور کر دیا۔

برہمن، کھشتری، ویش اور شُودر میں بٹا بھارت یہ ایک مجموعۂ خوبی ہوا اس طرح سے عبارت "شودر" میں دال ساکن ہے نہ کہ متحرک۔ آزاد سنسکرت الفاظ کے صحیح تلفظ کا کم خیال رکھتے ہیں۔ ذیل کے مصرعوں میں دیکھیئے

ع سبھا نے یہاں دھرت راشٹر سے جو گفتگو کی ہے
ع کوئی بھی کرب ہو جب کرشن کا پیغام ملتا ہے
ع یہاں تھی وید گیتا ساستر کے سننے پہ پابندی

دھرت راشٹر، کرشن اور ساستر کے صحیح تلفظ میں جو حروفِ صحیح دب کر ادا ہوتے ہیں انہیں گرا دیا گیا ہے۔ پھر شودر کی دال کو متحرک کیوں کیا جائے۔ ایک مسودے کے تسامحات کی نشاندہی کرنا مصنف کے ساتھ انصاف نہیں کیونکہ ابھی اس نے نظم کو آخری شکل نہیں دی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے قطع نظر بہت کم اشعار ایسے ہیں جہاں شبہ ہو سکے کہ بعض الفاظ یا فقرے وزن کی خاطر لائے گئے ہیں اور یہ ہیں بھی تو اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ عام قاری اُن کی گرفت نہیں کر سکتا۔

دنیا کی اکثر بڑی رزمیہ نظمیں ایک قوم کے کسی ایک دور سے متعلق ہوتی ہیں۔ آزاد نے پوری بنی نوعِ انسان کے پورے ارتقا بلکہ قبل ارتقا کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ اتنا وسیع پس منظر حرفِ آخر یا شمس عظیم آبادی کی مثنوی حیات و کائنات ہی کا ہے۔ لیکن حرفِ آخر ابھی سامنے نہیں آیا اور ڈاکٹر شمس کی مثنوی اجمالی ہے۔ آزاد کی نظم بھی

جستہ جستہ حصوں کے سوا منظرِ عام پر نہیں آئی لیکن مجھے اس تک رسائی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ جمہور نامہ کا سرمایۂ فخر اس کے متعدد اشعار بیانات ہیں۔ بشر کی توصیف، مٹی کی عظمت، انسان پر سلام، قلوپطرہ کا خیرہ کن حسن، دیدار گیتا کی عظمت اور اس قبیل کے دوسرے بیانات نے اس مثنوی کو خارجی بیانیہ نہیں رہنے دیا بلکہ سراپا شعر بنا ڈالا۔ انھوں نے نظم میں کہیں خالص دیو مالائی واقعات اور تلمیحات سے رنگ آمیزی نہیں کی بلکہ صرف انھیں واقعات اور شخصیات کو لیا ہے جن سے تاریخ منکر نہیں۔ اس پابندی کے ساتھ شاعری کو باقوت نہ جانے دینا بڑا کارنامہ ہے۔ وہ کیسی کیسی شاعرانہ تشبیہیں لاتے ہیں:

ع سفینے عقل کے چھوڑ دیے جنوں کی تیز دھاروں پر

کبھی وہ دن بھی تھے یہ مادۂ بے جان تھا گویا
دلِ گیتی میں اک سویا ہوا ارمان تھا گویا
خدا تک یوں پہنچتے ہیں ہمارے گیت کے دھارے
پہاڑوں سے نکل کر جیسے ندی منزلیں مارے
یہ ضو روشن ہے اب بھی عالمِ ظلمات میں ایسے
ستاروں کے دیئے چمکیں اندھیری رات میں جیسے

یہ نظم ابھی تین ہزار اشعار پر محیط ہے اسی نہج سے پوری ہوتے ہوتے بات کوئی دس ہزار اشعار پر ٹھہرے گی۔ کتنی جگر کاوی اور دماغ سوزی درکار ہے کتنی راتوں کو زندہ کر کے خون جلانا ہوگا۔ کیا اسے مکمل کرنا چاہیئے؟ کیا اس کا اصل اس کی کاوش کے ہم پلہ ہوگا؟ کیا زمانہ اس نظم کو کوئی بلند مرتبہ دیگا؟ یہ سوالات شاعر کے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کا جواب فراہم کرنا چاہیئے۔

آزاد نے بحر اور صنعت کا انتخاب موزوں ترین نہیں کیا۔ میری رائے میں اگر کسی مخصوص بحر اور مخصوص ہیئت کی پابندی نہ کی جائے تو اسی قدر سعی سے بہتر نتائج

برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ رِیَت موجودہ بھی نظم کہ مکمل ہونا چاہیئے۔ اردو کا دامن ایک بہت طویل بہت عظیم نظم سے خالی ہے۔ کیا عجب ہے کہ "جمہور نامہ" اس خلا کو پُر کر سکے۔ اس کے موضوع کی عظمت اور وسعت اس نظم کی بقا کی ضامن ہے۔ آزاد کی شاعرانہ صلاحیت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ "جمہور نامہ" اردو کی "ایلیڈ" اوڈیسی یا شاہنامہ ہوگی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی باک نہیں کہ جوشؔ کے "حرفِ آخر" کے جو نمونے سامنے آئے ہیں "جمہور نامہ" اُن تک نہیں پہنچ پاتا۔ آزاد جوشؔ کے حریف نہیں۔ اس کے باوجود میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اپنی موجودہ شعری متاع کے پیشِ نظر اردو ادب "جمہور نامہ" کو گوشۂ نسیاں میں نہیں ڈال سکتا۔

اگر یہ مکمل نہ ہو سکی تو اس کے موجودہ اجزا بھی شائع نہیں ہونگے اور یہ شائع نہ ہوئے تو شائقینِ ادب ایک اچھے شعری کارنامے کی سیر سے محروم رہ جائیں گے۔

جون ۱۹۷۶ء

پروفیسر جگن ناتھ آزاد پر تحقیقی کام :-

مظفرپور : (ڈاک سے) بہار یونیورسٹی مظفرپور نے مسٹر رضوان اللہ لیکچرر شعبۂ اردو۔ آر۔ این۔ اے۔ آر کالج سمستی پور کو "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کے علاوہ ہندوستان کی چار اور یونیورسٹیوں میں بھی پروفیسر آزاد کے علمی اور ادبی کام پر تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ "ہماری زبان" نئی دہلی ۸ اگست ۱۹۸۰ء

خواجہ غلام السیدین

وطن میں اجنبی

ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والوں پر گزشتہ بیش سال میں جو گزری اس کی وجہ سے بہت سے شریف اور دردمند دلوں میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید انسانیت کی وہ قدریں، جو اس کا سب سے بیش بہا سرمایہ ہیں، اس طوفانِ بدتمیزی میں ہمیشہ کے لئے بہہ گئی ہیں۔ شاید اب انہیں من مندر کے سنگھاسن پر بٹھانا بہت مشکل ہوگا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کے لئے ایسے نیک بندے اب بھی موجود ہیں دونوں ملکوں میں جنھوں نے اُن قدروں کا دامن نہیں چھوڑا، جو انسان کو عالم کائنات میں سربلند کرتی ہیں۔ جن کے قدم سچائی کے راستے سے نہیں ڈگمگائے۔ اُنہی کا فیض ہے کہ نفرت کی آگ محبت کی بستی کو تہس نہس نہیں کر سکی۔ ان میں کچھ شاعر اور ادیب اور کلاکار ہیں۔ کچھ سیاست داں اور لیڈر ہیں۔ (لیکن کسی قدر کم) عام لوگ ہیں لیکن ان کے خیالات اور جذبات کب اخباروں کی سرخیاں بنتے ہیں) اور انھیں کے فانوس میں امید کی شمع روشن ہے اور آندھی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ انھیں چند روشن ضمیروں میں جن کے دل میں گداز ہے اور آنکھوں میں انسانیت کے غم کے آنسو، جگن ناتھ آزاد بھی ہیں۔۔۔۔۔۔۔

اس مجموعے کی تمام نظموں میں ایک خاص کیفیت اور جذبہ جاری و ساری ہے خواہ وہ سرزمین پنجاب کو الوداع ہو، یا پرانے دوستوں سے خطاب، یا اقبال کی بارگاہ

میں نذرِ عقیدت یا پاکستان کو پیام۔ ایک حساس شاعر جس کے قدم تقسیم ہند کے المیوں کے باوجود محبت اور شرافت کے راستے سے نہیں بھٹکے کئی سال کے بعد اپنے قدیم وطن پاکستان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے آتا ہے اور دل میں جذبات کا ایک طوفان لے کر آتا ہے۔ جو اس کے شعروں میں خلوص اور محبت کے موتی بن کر چمکتے ہیں اور اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی شبنم میں ڈھل جاتے ہیں، وہ اس کے دل میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور دوستی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے ایک شیرازۂ محبت میں سمیٹ لیتا ہے۔ وہ پاکستانی دوستوں، ادیبوں، اور شاعروں کی دعوت پر "مغربی پنجاب" آیا ہے جس کو وہ اب بھی "وطن" کے پیارے لفظ سے خطاب کرتا ہے جس کی محبت چنگاری اب بھی اس کے دل میں روشن ہے جس کے بارے میں وہ "مشرقی" اور "مغربی" کی تمیز نہیں کرتا جس کی تہذیب اور روایات کے بنانے میں ہر مذہب اور ملت کے معماروں نے اپنے دماغ کی روشنی اور دل کا خون صرف کیا ہے۔ وہ اس سرزمین کو بڑے جوش اور خلوص سے مخاطب کرتا ہے

اے وطن۔ اے فخرِ اقطاعِ جہاں — خاک تیری سجدہ گاہِ قدسیاں
حق پرستوں کے فقیروں کے وطن — دہر کے روشن ضمیروں کے وطن
نور کا جوہر ہے تیری خاک میں — عشق رقصاں ہے ترے ادراک میں
اے وطن، اے ہیر رانجھے کی زمین — سوہنی مہینوال کی بزمِ حسین
اے محبت کے پرستاروں کے دیس — اے شعاعوں کے جگرداروں کے دیس
فکرِ وارث شاہ کا مسکن ہے تو — قلبِ حق آگاہ کا مسکن ہے تو
تو ہے نانک کی نظر سے فیض یاب — قطبِ دوراں کے اثر سے فیضیاب

اور جب وہ اس محبوب سرزمین کو چھوڑ کر مجبور ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے — یا جیسے چلے دُرِ عدن کانِ عدن سے

آہوئے ختن یا ہو رواں دشت ختن سے　　آزاد ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے

جس گھر کی فضاؤں میں جئے او رپلے ہم
اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

اور پھر واہگہ کی سرحد پر پہنچ کر، جہاں سیاست نے وحدت شعور پر حد بندیاں قائم کر دی ہیں، جہاں اجنبیت کے بھیانک احساس سے دل کو ٹھیس لگتی ہے، یہ جذبات بیچین ہو کر ضبط سے رشتہ توڑ کر بہہ نکلتے ہیں۔

ہیں آج رقص میں عہد طرب کے میخانے　　چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
جہان شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے　　یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشک رواں　　ہزار تلخ حقائق، ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے　　خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

کس قدر مختلف ہے یہ انداز فکر، یہ جذبہ ہند اور پاکستان کے ان یک چشم ادیبوں، شاعروں اور اخبار نویسوں اور سیاست دانوں سے جو نہ تہذیب کی وحدت کے قائل ہیں، نہ انسانیت کے مشترک رشتوں کا پاس کرتے ہیں جو سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یا ذاتی مفاد کی خاطر لوگوں میں تعصب کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ دشمنی اور مغائرت کے طوفان پر بند لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے اکثر نے مصلحت کے خیال سے ذرا ادبی زبان اور محتاط قلم سے کام لیا ہے۔ شاید کسی نے بھی اس فرض کی علم برداری نہیں کی۔ اس صاف گوئی اور قوت کے ساتھ جو آزاد نے دکھائی ہے جی چاہتا ہے کہ پاکستان کا کوئی شاعر بھی اس شان کے ساتھ محبت کی رسم و راہ کو، انسانیت کے ان مشترک رشتوں کو اجاگر کرے اور اس جذباتی خلیج کو پاٹنے میں قیادت کا فخر حاصل کرے جو دونوں ملکوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

آزاد کے کلام پر اقبال کا بہت گہرا اثر ہے، جس کا اس نے ہر مقام پر بہت فخر کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ اس نے اقبال کے کلام سے انداز فکر اور

انداز بیان لیا ہے، موضوع لئے ہیں فکر کے سانچے اور زبان کی آب و تاب لی ہے۔ "مریدِ ہندی اور پیرِ رومی" کے انداز میں اقبالؔ سے گفتگو کی ہے، اور اس کے مزار پر جا کر نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ دل میں جو سوال کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے اُن کا جواب طلب کیا ہے۔ اقبالؔ کے ایک شعر میں خفیف سا تصرف کر کے آزادؔ نے اُن سے اپنا فکری رشتہ یوں بیان کیا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں
مرے لئے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل

ظاہر ہے کہ یہاں شاعر جس قافلے کی طرف اشارا کرتا ہے وہ ہندوستان یا پاکستان، ہندو یا مسلمان، مشرق یا مغرب کا قافلہ نہیں بلکہ اُن شریف اور پاکباز اور فراخ دل انسانوں کا قافلہ ہے جن میں قدرِ مشترک محبت اور انسانیت ہے نا کہ رنگ یا نسل یا قومیت یا مذہب۔ اُس نے ان بنیادی قدروں کی علم برداری کی ہے جو اقبالؔ کے کلام اور فلسفہ کو عالم گیری بخشتی ہے۔ اُستاد کی مخصوص سرزمین میں قدم رکھنا اور اُس کے خاص میدان میں طبع آزمائی کرنا ایک جراُت طلب کام ہے۔ "جس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"۔ لیکن آزادؔ بڑی حد تک ان خطروں سے دامن بچا کر گزرا ہے۔

"روحِ تاجور کی آواز" کے عنوان سے شاعر نے خود کو خطاب کر کے ہندوستانیوں کو خاص طور سے دعوت دی ہے کہ وہ انسانیت کے جذبے کو پالیں اور ہر قسم کے بھید بھاؤ اور ناروا داری اور تنگی سے اپنے دامنِ دل کو پاک رکھیں۔ اس نے جراُت کے ساتھ اُنہیں یہ پیغام سنایا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جو اقلیت میں ہیں، خاص طور پر دل نوازی کا سلوک کریں تاکہ وہ بھی شمعِ وطن پر پروانوں کی طرح نثار ہوں۔ اور یہ کون سا وطن ہے۔

یہ نئی دنیا تری، نہ خطۂ گنگ و جمن — یہ دیارِ بدھ، یہ گاندھی کا، نہرو کا وطن
گلستانِ علم و حکمت کا مہکتا پھول ہے — مہر و الفت کا، محبت کا مہکتا پھول ہے

یہ نئی دنیا تری تہذیب کی ہے انجمن — دیکھ پاکیزہ رہے اس انجمن کا بانکپن
پستیٔ افکار تیرے دل کے مسکن میں نہ ہو — ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو
ہند میں مسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے — یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے
اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں — جس طرح رہتا ہے بچّہ اپنی ماں کی گود میں
یہ تحفظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ — دیکھ اپنے خون سے پھر اس کی گلکاری کو دیکھ
جاں لٹا دیگا یہ خود ہندوستاں کے واسطے — جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے

اس مجموعہ کا وہ حصہ بھی قابلِ ذکر ہے جس کا عنوان ہے "عالمِ خیال کی چند ملاقاتیں" یہاں وہ سجاد ظہیر، فیضؔ، احمد ندیم، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے ملتا ہے، اور اپنی گرم جوشی انسان دوستی، اخلاص اور محبت کا خزانہ اُن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ نظمیں (جن کے ساتھ ساتھ اس نے ان شاعروں کی بھی چند نظمیں شامل کی ہیں) اس ہم آہنگی اور وحدتِ خیال کا پتہ دیتی ہیں، جو اب بھی ہند اور پاکستان کے بعض انسان دوست ادیبوں اور شاعروں میں پائی جاتی ہے اور اس برِ صغیر کے مستقبل کے لئے ایک تابناک شگون ہے اُن کے کلام میں ایک صبحِ نو کے طلوع کی آرزو اس طرح جھانکتی ہے جس طرح صبح سویرے برسات کے اندھیرے بادلوں میں سے کبھی کبھی سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے۔ ہر وہ ادبی کاوش، جو اس محبت اور انسان دوستی کی تحریک کو آگے بڑھائے ہماری تائید اور اعتراف کی مستحق ہے۔

آزادؔ نے اس مجموعے کا نام "وطن میں اجنبی" رکھا ہے۔ مجھے اس نام کی موزونیت میں شبہ ہے۔ جو شخص "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا ایسا انمول خزانہ لے کر کسی دیس میں جائے، وہ اس میں اجنبی نہیں ہو سکتا، محبت کی شمع اس کو پردیس میں بھی راستہ دکھائے گی، اور شیریں کلامی اور خلوص قدم قدم پر اس کے لئے دوست پیدا کریں گے، اور پھر پنجاب میں آزادؔ کس طرح بیگانہ ہو سکتا ہے، جس کی محبت اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، اور جس کی تہذیب کے نغمے اور یاد اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے من مانی اجنبیت کی زنجیروں کو توڑ

کر "پاکستان کی آواز" ان لفظوں میں آزاد کا خیر مقدم کرتی ہے۔

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ ۔۔۔ غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ
اُداس اُداس ہیں پھولوں کے چہرے اے جمیل ۔۔۔ تو اے بہارِ چمن پھر چمن کو واپس آ

ترے فراق میں گم یاں ہے چشمِ راوی و سندھ
اسی فضا، اسی بزمِ کہن کو واپس آ

شملہ - ۱۷ر جون ۱۹۵۷ء

شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی
دہلی
۱۰ر جنوری ۱۹۷۴ء

۔۔۔۔۔۔۔۔ نمائش بہت اچھی رہی۔ ہر شخص نے آپ کی بے پایاں محنت کی داد دی۔ پروفیسر فاروقی صاحب نے تو اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ اتنی اچھی نمائش کے لئے جناب جگن ناتھ آزاد کو مبارک باد ہو۔ ڈاکٹر ظہیر صاحب نے بر سر منبر پروفیسر مسعود صاحب و سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے آپ کی کوششوں کو تہہ دل سے سراہا اور نمائش کے دن ہی رات کو انہوں نے ایک دوسرا خط لکھا جس میں آپ کا تفصیلی شکریہ بھی ادا کیا تھا۔

(اقتباس)

ڈاکٹر (عبدالحق)

پروفیسر ارشد کاکوی
ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ۔

جگن ناتھ آزاد

ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو و فارسی کا دفتر تھا۔ دو چار اشخاص بیٹھے تھے عندلیب شادانی نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ لو بھئی خاور کے لئے آزاد نے ایک اچھی سی غزل بھیجی ہے۔ اسے رکھ لو۔ پھر کہا کہ دیکھنا کیا خوب کہا ہے کس بلا کا شعر ہے۔

بتایا جا رہا ہے قافلہ منزل پہ آپہنچا
مگر اس قافلے کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

میں نے غزل پڑھی اور لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ میرے ایک دوسرے باذوق دوست نے غزل مجھ سے مانگی اور اُسے پڑھ کر کہا کہ بھئی سچ پوچھو تو شعر یہ ہوا ہے ؎

تمہاری برق رفتاری بجا اے قافلے والو
مگر رفتارِ میرِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

لیکن ایک تیسرے صاحب نے شعر میں ایک خاص کیفیت پائی ؎

مرے دل سے بہارِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر آزاد یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

اس اختلافِ پسند کے باوجود جو عنصر اس پسند میں مشترک ہے وہ ایک خاص قسم کا رچا ہوا طنز ہے جس میں تلوار کی کاٹ نہیں نشتر کی چبھن ہے اور یہی کلام آزاد کی

نمایاں خصوصیت ہے۔ اُن کا طنز اُبل پڑنے کا طنز نہیں بلکہ اس میں ایک ضبط و پندار ہے۔ مندرجہ بالا واقعے کے بعد میں نے قصداً اسی قسم کا ایک تجربہ ادا کیا۔ بہت دن ہوئے آزاد نے مجھے ایک غزل بھیجی تھی میں نے وہ غزل فرداً فرداً دو تین باذوق لوگوں کے سامنے رکھی تو اختلافِ نظر کا ایک اور تجربہ ہاتھ آیا۔ ایک صاحب اس شعر پر جھوم اُٹھے

زمانے بھر کو جب محویتوں میں بھول جاتا ہوں
تو اک تیرے جُدا ہونے کا منظر یاد ہوتا ہے

دوسرے صاحب اپنی مہاجرانہ بود و باش کے زیرِ اثر اس شعر پر تڑپ اُٹھے۔

بہارِ جانفزا آنے پہ بھی ناشاد ہوتا ہے
جسے اپنے نشیمن کا اُجڑنا یاد ہوتا ہے

اور جب شمعِ انتخاب میرے سامنے لائی گئی تو میں نے کہا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو خود آزاد سے جاکر پوچھو تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ دراصل ان سے اس شعر نے غزل کہلوائی ہے

خدا جانے یہ کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اُٹھالیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

ان تجربوں سے آزاد کے حلقۂ تاثر کا تھوڑا بہت اندازہ آپ کو بھی ہو گیا ہوگا اور وہ یہ کہ آزاد اس دور کے محض ان احساسات کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں جو عبارت ہے غمِ جاناں اور غمِ دوراں سے۔ یہ تو سبھی شاعر کرتے ہیں آزاد کے کلام میں اس درد کے اس درد کا بھی درماں اور اس زخم کا بھی مرہم ہے جو غمِ عشق و غمِ روزگار دونوں سے یکسر مختلف ہے اگر آپ اس غم کو کوئی نام دینے پر مصر ہیں تو اسے "غمِ آشیاں" کہہ لیجئے۔ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

آزاد کے یہاں یہ "کبھی" ایک دائمی خلش بن گئی ہے۔ وحید اللہ الہٰ آبادی کا ایک شعر ہے اور بے پناہ شعر ہے کہ ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

آزاد کے یہاں یادِ وطن' وادیٔ غربت تک ساتھ آگئی ہے۔ وہ اکثر ارباب واحباب وطن کی یاد پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وطن کی سرزمین اور شاید وہاں کی کسی مہ جبیں کی بھی یاد اُن کی سانسوں میں بس گئی ہے۔ فراقِ وطن کا یہ احساس کہ یہ فراق دائمی ہے اور اب یادِ وطن پر بھی احتساب ہے۔ آزاد کے غم کا المناک پہلو ہے اور یہی وہ "سکونِ یاس" ہے جس نے اُن کے غمِ وطن میں بھی ایک ضبط کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ محرومیِ جاوید نے آزاد کے غم کو ایک پندار دے دیا ہے وہ اپنے وطن کی یاد اسی ضبط واحتیاط کے ساتھ کرتے ہیں جیسے کوئی بوڑھا اپنے شباب کو یاد کرتا ہے اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے اور وہ یہ کہ قفس پر قناعت کرنے یا قفس میں جی لگانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے جو ناطق کے اس شعر میں ہے کہ سے

صیّاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں
ہم نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

یہ بڑے جگر اور حوصلے کا کام ہے لیکن اس سے زیادہ حوصلے کا کام یہ ہے کہ قفس کو۔ آشیاں ہی سمجھ لیا جائے دوسری صورت میں زیادہ عافیت ہے اور یہی آزاد نے کیا ہے۔ قفس کو قفس سمجھنے کا عنصر "جبری" تصور ہے اور "دل" سے یہ ممکن نہیں یہ "دماغ" کا کام ہے۔ "دل" اگر چاہے تو قفس کو آشیاں سمجھ لینے کا "اختیاری" تصور خود پر طاری کرسکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آزاد کے یہاں "رنجِ گلشن" سے زیادہ "حسرتِ تعمیر" ہے اور وہ نئے چمن کی آشیاں بندی ہی کو اپنا مرکزِ تصور بنا چکے ہیں اُن کا ذہنی وادراک زمان ومکاں کا پابند نہ ہوسکا۔ اُن کی انسان دوستی حق پرستی اور اُن کی سادگی اُن کے افکار کو بہت جلد دوسری سمت موڑنے میں کامیاب ہوگئی۔ دیکھئے سے

دل کے ارادے یہ کہتے ہیں بٹ کر بھی ہم ایک رہے
انسانوں کو بانٹنے والو چال تم اپنی ہار گئے

جب سے شمعِ احساس کی یہ لَو تیز ہوئی ہے۔ آزاد کے کلام کا پیامی، افادی اور تعمیری پہلو زیادہ واضح و روشن ہو گیا ہے۔ وطن کی یاد اُن کے سفر میں حائل نہیں ہو جاتی، بلکہ واقعہ اس کے برعکس ہے یعنی وطن کی یاد اُن کے سفر میں ایک رفیقِ سفر کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسی کے سہارے جانبِ منزل بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی آزاد نے نئے وطن کی طرف سے کبھی بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُسے بھی اپنا وطن سمجھ کر اپنا لیا۔ ان کے یہاں تو عام انسان دوستی ہے لیکن وطن یعنی وہ سرزمین جہاں کوئی شخص اپنی طفلی سے لے کر جوانی تک کا زمانہ گزارتا ہے زندگی بھر اس کے تصور سے الگ نہیں ہو سکتا، وہاں کا ذرہ ذرہ دامن کش ہوتا ہے اس کے ہزاروں associations ہوتے ہیں اس سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی خلش غمِ منزل بن کر عمر بھر ساتھ رہتی ہے جس نے وطن کی محبت نہ کی وہ قوم و ملک کا کب ہوا بقول آزاد ؎

آدمی ہو کے بھی دنیا میں وہ انساں نہ ہوا
ننگ ناموسِ وطن کا جو نگہباں نہ ہوا

وطن کا سیاسی تصور کچھ اور ہے انسانی تصور کچھ اور۔ آزاد کے یہاں یادِ وطن زیادہ سے زیادہ ایسی خلش کا نام ہے۔ جو وطن اور وطن والوں کی خیر و عافیت چاہتے رہنے اور جلتے رہنے کی خلش ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام "بیکراں" کے پہلے صفحہ پر یہی خلش ملتی ہے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء نے اُن کو دی ہے اور یہ خلش ماتم و فغاں نہیں گریہ و نالہ نہیں بلکہ آگے بڑھتے ہوئے پیچھے دیکھتے رہنے سے زیادہ کچھ نہیں جمیل مظہری کا ایک شعر ہے ؎

یہ مڑ مڑ کے دیکھ لینا بھی ہے مری شانِ رہبرانہ
قدم میں کس طرح تیز کر دوں کہ میرے پیچھے ہے اک زمانہ

آزاد کے یہ اشعار بھی مڑ مڑ کے پیچھے دیکھ لینے کے ذیل میں آتے ہیں اور ان سے "شانِ رہبرانہ" پر کوئی حرف نہیں آتا ؎

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا — بتا اے پیر میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا — خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
وصال شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے — میں کیا جانوں حضور شمع پروانوں پہ کیا گزری
وہ رنگ و نور سے پھر پور بستانوں پہ کیا بیتی — شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

اسی استفہامیہ خلش کا نام آزاد کے یہاں "یاد وطن" ہے۔ اسی ردیف کے ان اشعار میں بھی ہم کو کرب ہے۔

بس ایک نور جھلکتا ہوا نظر آیا — پھر اس کے بعد نہ جانے چمن پہ کیا گزری
جدا جب اس سے ہوئے اپنی تو خبر نہیں — نہ پوچھو عالم رنگ و چمن پہ کیا گزری

خموش کیوں ہو نسیم و ندیم کچھ تو کہو
ہمارے بعد ہمارے وطن پہ کیا گزری

اس خلش سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کے کلام کا خمیر خاک وطن سے گوندھا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ۱۹۴۷ء کے انقلابات کا اتنا دردمندانہ اور شاعرانہ ردِ عمل اور اس کثرت سے اس کا اظہار شاید ہی کہیں ملے عام طور سے اس انقلاب نے دو قسم کے احساسات ہمیں دیئے ہیں لیکن دونوں احساسات کی نوعیت عام انسانوں کو تو جانے دیجئے۔ شاعروں اور ادیبوں کے یہاں بھی زیادہ تر ایک ہی رہی ہے یعنی سیاسی پندار فتح ہے تو سیاسی اور غم ہزیمت ہے تو سیاسی۔ اس احساس کا انسانی اور وطنی پہلو آزاد کے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ آزاد اس انقلاب سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں انھوں نے اس انقلاب کا جائزہ نہیں لیا بلکہ اسے خود محسوس کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جب کبھی اس سیاسی انقلاب کا ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے تو اس میں کبھی کوئی سیاسی اشارہ کنایہ نہیں ہوتا بلکہ ذاتی غم و حرماں کا ذکر ہوتا ہے اور اس میں بیک وقت اتنی دردمندی اور حق گوئی ہوتی ہے کہ اس سے بہتوں کی "بے بال و پری" کی نمائندگی ہو جاتی ہے اور اسی خلوص نے ان کو اس دور کا ایک مقبول شاعر بنا دیا ہے۔

ہم نے آزاد کو ڈھاکے کے ایک مشاعرے میں پڑھتے اور پڑھتے ہوئے دیکھتے

بھی سنتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے بہت سارے آنکھوں کو نم کر دیا ہے۔ اُن کے لب و لہجہ میں رقت اور فریاد کی سی کیفیت ہو جاتی ہے وہ دوسروں کے غم کو اپنے غم میں سمیٹ لیتے ہیں اور پھر اپنے غم میں ایک دنیا کو شریک کر لیتے ہیں شاعر و قاری کے رشتے کی آخری منزل یہی ہوتی ہے اور یہ منزل آزاد نے پالی ہے۔ آزاد کی شخصیت[1] اور شاعری میں بڑی مطابقت ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے جس گفتار و کردار کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے آزاد فی الحقیقت وہی ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ باوجودیکہ کلام آزاد میں ۱۹۴۷ء کے بعد ایک نمایاں رجحانِ فکر رواں دواں ہے۔ بلکتی ہوئی یادوں اور مٹتے ہوئے چہروں، لٹی ہوئی بہاروں اور اُجڑے ہوئے باغوں کا تذکرہ ہے۔ سہانے خوابوں کی المناک تعبیروں کا رونا ہے۔ حسین آغاز کے دلخراش انجام کا ماتم ہے۔ ان سب کے باوجود آزاد کے یہاں مرثیہ و ماتم کی فضا کہیں نہیں ہے۔ وہ بے اختیار کہیں کبھی نہیں ہوئے لیکن اس لئے دبے رہنے کے انداز کے باوجود اُن کے کلام میں جو اثر آفرینی ہے وہ کہاں سے آئی یہ عطیۂ خلوص ہے۔ آزاد کی شخصیت کا وہ پہلو جو اُن کی طبعی سادگی اور فطری خلوص سے عبارت ہے اُن کے لب و لہجے میں بلند آہنگی پیدا نہیں ہونے دیتا بلکہ تمام ایک قسم کا دھیما پن اور نرمی موجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے تبلیغ، نعرہ بازی یا پروپگنڈا کی راہ نکل آتی ہے اور اگر آزاد چاہتے تو بے تکلف اس راہ پر نکل آ سکتے تھے لیکن شاید آزاد نے اس راز کو پالیا تھا کہ وہ راہ اُن کو راس نہ آئے گی۔ وہ ٹھہرے فن کے ساتھی اور اس راہ میں اگر کچھ ہے تو شش جہات میں حدِ نظر تک بس سرخی ہی سرخی ہے اور کچھ نہیں، یہ سرخی خون ہی کی سرخی ہے آزاد شہیدوں میں خون لگا کر شامل ہونے سے رہ گئے۔ آزاد بلاشبہ ترقی پسند شاعر ہیں (حالانکہ ترقی پسندی سے زیادہ مہمل اصطلاح ادب میں کبھی رائج نہیں ہوئی اور خدا جانے یہ کس احساسِ کمتری کے مارے ہوئے شخص کی ایجاد ہے) اُن کی شاعری کی بنیاد درد و غم پر تو ہے لیکن یہ درد و غم انسانی اور سماجی درد و غم ہے۔ غمِ محبوب کے نقوش آزاد کی شاعری

---

[1] مجھ سے ایک بار دہلی میں آزاد کی ملاقات ہوئی تھی تقریباً آدھ گھنٹہ کی (ارشد)

میں ہیں اور کافی ہیں لیکن اُن کی حیثیت حشکِ برق کی ہے۔ آزاد بحیثیت انسان کے Extrovert قسم کے انسان ہیں۔ اگر وہ Introvert ہوتے تو آزاد اردو شعرا کی اُس فہرست میں ایک اضافہ کرتے جس میں غالب و میر و فانی وغیرہ ہیں۔ اپنی زندگی میں آزاد آنے جانے ملنے ملانے والے انسان ہیں۔ کثرت سے مشاعروں میں جاتے ہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں ہیں۔ اُن کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے ان کی رفاقت اور اُن کے خلوص کے مداحین کی بھی فہرست کافی طویل ہے۔ اس لحاظ سے بھی آزاد کے یہاں ہم کو وہ المناکی، جگر برگشتگی اور غم ناکی و خستگی کی شدید ترین کیفیت جو غمِ محبوب سے وابستہ ہوتی ہے تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ آزاد نے جاناناں اور جہاں کی الگ الگ حیثیتیں رکھی ہیں۔ وہ "جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا" کے قائل نہیں اور اُن کا محبوب جانِ جہاں ہے۔ ایک فارسی شاعر نے محبوب کی ایک خال پر سمرقند و بخارا قربان کر دیا تھا لیکن اگر آزاد کو کبھی کچھ قربان کرنے کا موقع دیا جائے تو وہ ہرگز اس "غلط بخشی" کا ثبوت نہ دیں گے اور اُن کے یہاں وطن زیادہ پیارا ہے اور اُن کے یہاں غم و الم کا سارا سرمایہ وطنی، سماجی، انسانی نوعیت کا ہے میں نے جتنا کچھ کہا ہے اس کی شہادت خود کلامِ آزاد دے گا۔

صدمہ ہجر سے دل جلوہ بداماں نہ ہوا | چوٹ کھا کر بھی یہ پتھر شرر افشاں نہ ہوا

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گزر جا | ہے دور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

اب مجھ کو ناپسند ہے پھولوں کا حسن و رنگ | شاید بلند ذوقِ نظر کر رہا ہوں میں

ان اشعار کو جانے دیجئے مجموعی طور پر کلامِ آزاد کے مطالعہ کا جو تاثر قائم ہوتا ہے اور جو نقش ہمارے ذہن میں بنتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ "حریمِ ناز" ہی کے شاعر نہیں بلکہ اُن کا درد وطنی درد ہے۔ نظم "چاندنی رات" میں شاعر وادیٔ کوہسار میں

میں بیٹھتا ہے اور چاند کی نور پاشیوں میں محو ہے لیکن اس غم زدہ دلکش منظر میں چاندنی کی نہائی ہوئی موجوں کو دیکھ کر شاعر کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ محبوب کا خیال نہیں بلکہ اُسے تاریکیٔ وطن یاد آجاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ۔

گرچہ ہر شے کو حسین اور جواں دیکھتا ہوں　　دل کی گہرائی میں ایک شورِ نہاں دیکھتا ہوں
دلِ غم ناک میں اکثر یہ خیال آتا ہے　　جس سے امید کی دنیا پہ ملال آتا ہے
کیا کبھی ہوگی نہ پُر نور شبِ تارِ وطن　　اور شاداب نہ ہوگا کبھی گلزارِ وطن

الغرض آزادؔ کے یہاں خارجی محرکات زیادہ ہیں لیکن چونکہ اُن کے یہاں غمِ ذات نہیں بلکہ غمِ حیات ہی عمارتِ احساس کی بنیاد ہے اس لئے سارا جوش و خروش اسی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ "جشنِ آزادی"۔ "آزادی کے بعد"۔ "چاندنی رات"۔ "فریبِ نظر" اور اس نوع کی کئی نظموں میں یہ کیفیت ہے۔

آزادؔ ایک تعلیم یافتہ شخص ہے۔ تعلیم یافتہ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ ایم اے ہیں بلکہ یہ کہ اُن کی تعمیرِ ذہن میں بڑے پاکیزہ علم و ادب کارفرما رہے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتیں جن کا اعتراف وہ اکثر کرتے ہیں اُن کی رہنمائی کرتی ہیں۔ نانک، سوامی رام تیرتھ سے لیکر ٹیگور، اقبالؔ اور دیگر اہلِ نظر کے بارے میں آزادؔ نے اپنے تاثرات بیان کئے ہیں اور اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادؔ کے دل میں وہی کرب، وہی درد اور بیچینی وطن اور اہلِ وطن کی طرف سے ہے جو اُن لوگوں کو تھی۔ آزادؔ فارسی شعر و ادب کا بڑا رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں جو اُن کے اردو کلام سے جا بجا نمایاں ہے انھوں نے ہندوستان کے قدیم ادبی اور مذہبی سرمایوں کے علاوہ مختلف فلاسفہ کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اُن کے بیشتر مقالوں سے ظاہر ہے اور کوئی شخص جب تمام مکتبہ ہائے فکر کا مطالعہ کر چکا ہوتا ہے اور مختلف زاویہ ہائے حیات کو دیکھ چکا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ کچھ کہتا ہے تو اس میں ایک خاص وزن اور اعتماد ہوتا ہے آزادؔ کے نظریوں کے پس پردہ ایک مخصوص طرزِ حیات کو اجتماعی اور ملکی طور پر اپنانے کی خواہش چھپی ہوتی ہے اور اُن کی یہی تمنا ان کی شاعری ہے ان کے پیشِ نظر ایک

خاص تمدن اور تہذیب کا خاکہ ہے جس کے نقوش دھندلے ہو چکے ہیں اور اُن کی شاعری تمدن کے چہرے سے اس گرد کو صاف کرنے کی کاوش ہے۔ لیکن۔ ع

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز

اگر وہ انقلاب نہ آیا ہوتا جس نے آزاد کے دل و دماغ کی بنیادیں ہلا دیں اور نہیں بار بار یہ کہنے پر مجبور کیا ہے

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان سے گزر | زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دیدہ ذرا غور سے دیکھ | کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

تمہیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو | سحر کے بعد نسیم سحر پہ کیا گزری
شکستہ شیشہ جو پھر شیشہ گر سے جڑ نہ سکا | خبر نہیں کہ دل شیشہ گر پہ کیا گزری

عندلیب آج بھی گلزار میں ہے محوِ فغاں | درد ہر پھول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے
رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں | ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

تو مجھے یقین ہے آزاد کی شاعری ہزیمت و پسپائی کے اعلان و اعتراف سے قطعی الگ ایک چیز ہوتی جو بڑی حد تک کسی مخصوص فلسفۂ حیات کی بنیاد پر ایک عمارت کھڑی کرتی لیکن جس شاعر "امن و دوستی" "جس" "انسانیت پرستی" اور "جس حب الوطنی" کے پیمانے میکدۂ حیات میں سجا رہا تھا۔ اس میکدے میں ایک طوفانِ بہار آ گیا اور خود بقول آزاد ساغر و مینا ٹکرانے لگے۔ اس دھچکے نے آزاد کی راہِ فکر میں بیک وقت ایک انجماد اور ایک اضطراب پیدا کر دیا۔ انجماد اس طرح کہ اُن کے یہاں ٹکراؤ کہ بہت دخل ہو گیا ہے اور اضطراب یوں کہ اُن کے فن میں اور کبھی چبھن آ گئی۔ آزاد کی راہ شاعری کی ایک مخصوص منزل ہے لیکن یہ منزل کوئی سیاسی یا ہنگامی منزل نہیں۔ نہ انقلاب لانے کی تبلیغ ہے نہ ثواب کمانے کی تحریک

یہ منزل انسانیت پرستی ہے اور بلاشبہ اپنی شاعری سے آزاد ایک ایسے نظام حیات کی ہمارے ذہن میں فضا پیدا کر رہے ہیں جو بہت ہی صحت مند اور جاندار ہے اور وہ "ازم" (Ism) سے متاثر نہیں۔

آزاد کی شاعری کے دیگر پہلوؤں پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی شاعری کا مرکز و محور اور اُس کی ہوا و فضا رہی ہے جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری کے دوسرے رخ کی ایک جھلک دیکھ لی جائے۔ شاعر اپنی زندگی میں مختلف زندگیاں جیتا ہے اس کا دل تو جام جہاں نما ہوتا ہے اور اس جام میں سب سے پہلے جو جلوے بے حجاب ہوتے ہیں وہ عروس فطرت کے جلوے ہوتے ہیں۔ شاعرِ مشرق اقبال کی پہلی حیثیت فطرت کے پجاری ہی کی تھی ——— جب احساس اور شعور میں بالیدگی شروع ہوتی ہے تو شاعر کا حسن پسند دل پہلے شاعر کو کوہسار و سبزہ زار کی طرف لے جاتا ہے اور فطرت کے تمام راز ہائے سربستہ اس پر منکشف کرتا ہے۔ حسنِ فطرت و پاکیزگی فضا کے پے در پے اثرات شاعر کے دل و دماغ پر ثبت ہوتے رہتے ہیں اور پھر وہ حسن و پاکیزگی کی تمام ستھری اور نکھری ہوئی علامتوں کو زندگی میں تلاش کرنے لگتا ہے اور نہیں پاتا ہے تو اس کی حسن پسند طبیعت ایک حسین و پاکیزہ فضا کی تعمیر میں لگ جاتی ہے۔ ہر حساس اور فطری شاعر کے اولین خواب آغوشِ فطرت میں پرورش پاتے ہیں۔ آزاد کے یہاں بھی منظر نگاری کے بڑے دل نواز نمونے ہیں۔ ان میں مشاہدے کے خلوص کے ساتھ ساتھ حسّی بیداری بھی پائی جاتی ہے۔

احساس میں لو دمک رہی ہے گویا　　　پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں　　　شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

اور اب کنایہ زادی دیکھئے:

پھر قصر شام پہ آسودہ ہوا ہے تنہائی　　　سکوتِ شام تھا قدرت کی محفل آرائی

فضا میں تین طرف سے ہجومِ ظلمت کا — اور ایک سمت شفق کا وہ رنگِ زیبائی
کبھی وہ چشمِ زدن میں شفق کی شمعِ حیات — فلک پہ چاروں طرف گھر کے تیرگی چھائی
وہ بزمِ عالمِ بالا میں جلوۂ مہتاب — زمیں کا حسن بڑھانے کو چاندنی آئی

دیکھئے آپ نے ان چار اشعار میں کس بلا کی مصوری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

آزادؔ کی غزلوں میں فکر ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ ہے اس طرح کہ اُن کے یہاں دردِ دل اور آہِ سوزاں کے علاوہ اور بہت کچھ ہے جو فانی زندگی اور اس کی حرماں نصیبیوں سے مختلف ہے اور نہیں اس طرح ہے کہ اُن کے یہاں فکر نے نہ تو فلسفے کا روکھا پن پیدا کیا ہے اور نہ وہاں "شانِ تبلیغ" ہے۔ آزاد غزل کو "غمِ محبوب" نہیں سمجھتے۔ ہر قسم کے جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں لیکن زبان، مزاج اور لب و لہجہ غزل کا ہی ہوتا ہے۔ میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ ہر وہ احساس جو خیال کو چھوتا ہوا گذرے غزل کا سرمایہ ہے چنانچہ ہیروشیما کی سرزمین کی ویرانیاں اور عاشق کے دل کی محرومیاں بھی موضوعِ غزل بن سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ غزل کو بطور غزل برتا جائے

گلستاں کو دیکھ آئی، کہکشاں سے ہو آئی، آسماں کو چھو آئی
اے نگارِ ناپیدا اب تری تمنا میں آرزو کہاں پہنچے

کاوشِ مسلسل کا کیا دیا صلہ مجھ کو تم سے کیا ملا مجھکو
میں تو یہ سمجھتا تھا زیست مسکرا اٹھی تم جہاں جہاں پہنچے

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر — دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں
اک بے وفا کی نذر کروں پھر وقارِ عشق — کیا آرزو ہے جس پہ مٹا جا رہا ہوں میں

غمِ دوراں کی ہوائیں تھیں بہت تیز مگر — تیرا شعلہ غمِ جاناں کبھی مدھم نہ ہوا

کچھ دید کے قابل ہے جہاں میں تو یہی ہے
اے دیدۂ دل بے رخیٔ اہلِ جہاں دیکھ

یہ فریبِ رنگ و بو کچھ دیر رہنا چاہیئے
ورنہ تو ہین مذاقِ دید کا ساماں نہ کر

پھولوں کو دیکھتی ہیں نگاہیں کچھ اس طرح
جیسے میں آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل
اتنی بلندیوں پہ تو انساں نہ تھا کبھی

خواب

خوابیدہ مری روح میں اے نغمۂ خاموش
تو دیکھ کہ میں گوش برآواز ہوں کب سے

تاروں کے دریچوں سے مجھے جھانکنے والے
تھامے ہوئے میں دل میں ترا راز ہوں کب سے

بس اتنی روداد سفر ہے روٹھ کے ملنے والوں کی
آگ بجھے دل سے روٹھے باد یدۂ پُرنم ایک ہوئے

ان آئینوں میں نگارِ حیات کی مختلف ادائیں ہیں جن کو شاعر نے بڑی فنکاری سے الفاظ میں محفوظ کر دیا ہے۔ غزل میں لب و لہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ آزاد کی غزلوں میں خیال اور احساس دونوں کی جلوہ پاشیاں ہیں۔

نگار لکھنؤ
اپریل ۱۹۵۵ء

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
گوہاٹی

جگن ناتھ آزاد کی غزل

غزل کہنا آسان بھی ہے اور فرازِ دار پر چڑھنے کے مترادف بھی ہے۔ غزل کا ایک شعر اگر اچھا ہو تو ایک طول طویل نظم سے زیادہ رقبۂ معنی رکھتا ہے۔ کلیم الدین احمد صاحب کے نزدیک یہ صنف شاعری نیم وحشیانہ ہے۔ غزل کی ریزہ خیالی پر بھی اعتراضات کیے جاتے رہے۔ اس موضوع پر سورگیہ رگھو پتی سہائے فراق نے جو مضمون سپردِ قلم کیا اور جو نگار پاکستان کے شاعری نمبر میں شامل کیا گیا بغایت اہم ہے۔ فراق ایک اچھی غزل کو منتہاؤں کا سلسلہ (Series of Climaxes) بتلاتے تھے۔ اچھا اور بڑا شعر اس فرازو فروغ معنوی سے شروع ہوتا ہے اور اسی فلک و عرش پر منسلط ہوتا ہے جہاں سیاق و سباق از خود اس میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فراق کا یہ شعر ؎

خدا کو اہلِ جہاں جب بنا چکے تو فراق
پکار اٹھے کہ خدا نے ہمیں بنایا ہے

اس شعر میں تاریخِ مذاہب (History of Religions) کی ایسی آئینہ داری ہے جو تحلیلات نفسیات اور سماجیات سے واقف اشخاص کو بہ ہر گوشہ پسند آئے گی۔ بطور جملہ معترضہ یہاں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ فراق کے اشعار کے بیشتر نکتہ چیں سعادت و توفیقِ شعری سے عاری معلوم ہوتے ہیں۔ اردو عروض کو جامد و ساکن سمجھنے والے بھی بہت کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ بہرکیف یہ وہ نکات ہیں جن پر علاحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ میں غزل

کو جانِ شاعری سمجھتا ہوں اس میں نفسیاتی و ترغیباتی یک آہنگی ہوتی ہے۔ خیال میں جذبہ لو دینے لگتا ہے۔ خیال و جذبہ باہم دیگر مربوط ہو جاتے ہیں۔

بہ حیثیت غزل گو آزاد کا بھی اپنا مقام ہے آزاد کی بھی بیشتر غزلیات نظر غائر سے دیکھنے پر ریزہ خیالی سے مسلسل نظر نہیں آتیں۔ مثال کے طور پر یہ غزل دیکھیں۔

کبھی بلندیٔ ذوقِ نظر تک آ پہنچی — کبھی حیات غم بال و پر تک آ پہنچی

فغاں کہ دل کے بھی ہم تم اُسے نہ روک سکے — شب وصال حدودِ سحر تک آ پہنچی

نظر سے بڑھ کے زباں تک کہیں نہ آ جائے — جہانِ دل کی کہانی نظر تک آ پہنچی

ابھی تو دل میں ہے خوابیدہ حسرتِ پرواز — یہی ہوس جو کبھی بال و پر تک آ پہنچی

نظر کی بات تو کچھ اور ہے مگر کیوں کر — تری شبیہ دلِ بے خبر تک آ پہنچی

بھٹک رہی ہے ابھی تک تو آرزو دل میں
اگر کبھی یہ تری رہ گزر تک آ پہنچی

پوری غزل کا کلیدی خیال ذوقِ نظر اور آرزوئے دل ہے یعنی حیات و کائنات پر شاعرانہ نظر۔ تخیل کا رخ ایک ہی جانب ہے معیاری زندگی سے متعلق خیالات و تصورات جذبات سے مستنیر ہو کر "از دل خیزد" سے لے کر "بر دل ریزد" تک زمان و مکاں تک محیط ہو کر کرن کرن نظر آنے لگتے ہیں۔ مطلع میں "ذوقِ نظر" کی آنند کبھی بلندی سے ہمکنار ہوتی ہے اور کبھی "غم بال و پر" سے مجروح ہو اٹھتی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو دل سے نظر تک محیط ہے۔ کبھی یہ حسرتِ پرواز" ہے تو کبھی ہوسِ بال و پر" تک جا پہنچتی ہے۔ ابھی دل ہی میں ہے۔ مگر اس کی تگ و تاز محبوب یعنی مقاصدِ حیات کے حصول کی "رہ گزر" تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ غرض کہ تو ذوق غزل کا ایک ایک شعر جداگانہ حیثیت کا حامل بھی ہے اور صلاحیت انسلاک سے معمور بھی ہے۔ پوری غزل بطورِ نظم بھی پیش کی جا سکتی ہے جس کے متعدد عنوانات ہو سکتے ہیں۔

اب دوسری غزل سے رجوع فرمائیے مطلع ہے ؎

ناکام ہے اور اُس کی پرواز ابھی تک — فریاد کہ ہے راز ترا راز ابھی تک

مقطع ہے ؎

اے کاش کبھی تجھ پہ بھی ظاہر ہو کہ آزاد — ہے کس کے لئے زمزمہ پرداز ابھی تک

آپ اس غزل کو نظم سمجھ کر "ادراکِ راز" عنوان کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں۔

الغرض یہ خصوصیت جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے معمولی صفت نہیں ہے۔ یہی خصوصیت غزلیات اقبال میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صفت منظم خیالات کو تنظیمِ جذبات میں لانے سے حاصل ہوتی ہے اقبال نے مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنا مرشد تسلیم کیا تھا اور اقبال کے شعر و فکر آزاد کے دل و دماغ میں اس طرح سرایت کر گئے ہیں کہ آزاد نے اپنا مرشدِ کامل اقبال کو سمجھ لیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے، قارئین و ناقدین اس سے اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور اتفاق بھی

آزاد کی غزلوں میں ہر قسم کے خیالات ملتے ہیں، فلسفیانہ، سماجیاتی، کائنات دل و دنیا، راز و نیازِ عشق وغیرہ مندرجہ ذیل چند عنوانات کے تحت اپنی پسند کے اشعار پیش کر رہا ہوں۔

فلسفیانہ نکات

تو گرچہ خود اک راز ہے میرے لئے لیکن — دنیا مجھے کہتی ہے ترا راز ابھی تک

مرے تجربے نے پایا اُسے اک فسانۂ خر — وہ جمال جس کو سمجھا میں حقیقتِ زمانہ

یہ فلسفہ خاک ہے کہ ہر خوشی میں الم نہاں ہے — نگاہ پہلو ذرا تو بدلے تو ہر الم میں خوشی ملے گی

پا کے بزمِ رنگ و بو میں وقفِ حیرانی مجھے — دے گیا روحِ الامیں ذوقِ غزلخوانی مجھے

سمجھتا ہوں غزل خوانی کا فن میں بت ۔۔۔ — نہ سنگ تراشی بھی ہے آئینہ گری بھی

یاں جو بھی تفاوت ہے وہ ہے ذوقِ نظر کا
ورنہ نہیں آزادؔ خزاں اور بہار اور

جو

جو تو نے کئے ہم سے سوال اے دلِ پُر فن
مشکل تو نہیں تھے مگر آساں بھی نہیں تھے

شاعر ترے کلام میں فن بھی ہے فکر بھی
لیکن یہ فاصلہ جو ہے فکر اور فن کے بیچ

کار فرما ہے تجلی فکر و فن کے ساتھ ساتھ
نور کا پیکر بھی ہے انبارِ خاکستر بھی ہے

اپنے دل کی بات اے آزادؔ تجھ سے کیا کہوں
یہ عجیب دل ہے جو پیغمبر بھی ہے کافر بھی ہے
قائلِ توحید بھی، جاں دادۂ اصنام بھی
ساجدِ حق بھی بتانِ دیر کا چاکر بھی ہے

نہ بیہوشی کا عالم ہے نہ ہے یہ ہوش کا عالم
یہ عالم اصل میں اک نیم بیہوشی کا عالم ہے

غمِ دل و پیری کے باوجود بلندیٔ ذوقِ نظر تک رسائی حیات و کائنات کا عقدۂ لاینحل، الم و خوشی کے مابین ذوقِ نظر کو کوئی امتیاز معلوم نہ ہونا، آرزو کا کارسازیٔ جہاں میں کردار، قائلِ توحید باوصف اصنام پرستی، ہوش و عدمِ ہوش، درونِ دل ظلمات سے نور، علم و عرفان وغیرہ سب کے سب فلسفیانہ موضوعات ہیں، ملحوظ رہے، بغیر مصطلحات پر گہری نظر رکھے شاعر کا مافی الضمیر بھی سرحدِ ادراک سے باہر معلوم ہوگا۔ مثلاً ظلمات کو لیجئے ویدانت میں اور صوفی نظریات میں بھی ظلمات ان احوال و کوائف دل و دماغ کو کہتے ہیں جو حصولِ عرفان سے پہلے "سادھک" یعنی سالک کو محصور کر لیتے ہیں۔ اس معنوی پس منظر میں یہ شعر دیکھئے ؎

درونِ دل جہاں ظلمات کی دولت عطا کر دی
وہیں ظلمات میں روشن چراغِ طور ہوتا ہے

آزادؔ کے یہاں، نرگن (لاصفات) سگن (باصفات) نور و ظلمات وغیرہ اضافی

وجود رکھتے ہیں۔ آزاد کے یہاں "آرزو" اقبال جیسی جارحانہ آرزو نہیں ہے بلکہ ادائیگیِ فرائض کے مفاہیم سے معمور اصطلاح ہے۔ ذاتِ خداوندی کی فنکارانہ ترسیل تجسیمِ اصنام کو معرضِ وجود بخشتی ہے۔ مورتیاں مورتیاں ہی ہوتی ہیں۔ خدا نہیں ہوتیں۔ متعدد دیوتا، دیویاں وغیرہ انسان کے متخیلات کے فنکارانہ اعتقادات ہی ہوتے ہیں۔ توحید و کثرت بذاتہٖ ہی اضافی اصطلاحیں ہیں۔ فلسفیانہ نکات کے بجائے ان کو مابعد الطبعیاتی تصورات کہنا غالباً زیادہ صحیح ہوتا۔ اقبال کے یہاں بھی مابعد الطبعیاتی نکات ملتے ہیں مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ "توحید" بھی اضافی مفہوم رکھتی ہے۔ آزاد کے یہاں یہ سب مفاہیم کرن کرن نظر آتے ہیں۔

سماجیاتی و سیاسیاتی پس منظر

اپنے گرد و پیش سے، سیاسی صورتِ حالات سے، نیز اقتصادیات سے کوئی شخص بھی علیحدہ نہیں رہ سکتا کسی نہ کسی طور پر اس کی وابستگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ آزاد جیسا فن کار گرد و پیش سے کیوں کر بے نیاز رہ سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار۔

میرا ظاہر گرد سے دھندلا گیا ہے دوستو — تم مرے دل میں تو جھانکو، میں سراپا نور ہوں

نہیں اس سے تعلق آسماں تیرا ہے یا میرا! — فقط یہ پوچھنا ہے خاکداں تیرا ہے یا میرا

دارِ فنا میں کس کو حیاتِ ابد ملی — آزادؔ ہی نہیں فقط، کس کو نہیں مرنے کا شوق تھا

بیٹھا تو ہوں بہتے ہوئے دریا کے کنارے — پوچھو نہ مگر مجھ سے مری پیاس کا عالم

دورِ تکریم ہنر ہے مگر اے دوست نہ پوچھ — کہ ہنرمند ہوئے آج ہراساں کتنے

ہمارے ساتھ جو دنیا منافقانہ چلی — ہم اس کے ساتھ بانداز دوستانہ چلے

تم کہ میری محفل آرائی سے دھوکا کھا گئے   کس طرح تم کو بتاؤں کس قدر تنہا ہوں میں

حالات گردوپیش جو کچھ ہوں اور جس طرح تبدیلی و تغیر اپنے اثرات مرتب کر رہے ہوں روانی آب اور داستانِ حسن و عشق میں کوئی فرق ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ آزاد کے یہاں بھی یہ داستان بغایت سنجیدگی، دل کشی اور زیبائی کے ساتھ زبانِ شعر سے ادا ہوئی ہے مثال کے طور پر درج ذیل اشعار پر توجہ فرمائیں۔

میں جس کو ڈھونڈ رہا ہوں ابھی ملا تو نہیں   مگر ملے گا کسی دن کوئی خدا تو نہیں

عمل کے دیکھنے والو عمل کی دنیا میں   فقط خیال نے جادو جگائے ہیں کیا کیا

جن کے جلوے لوٹ کر واپس نہ آئیں گے کبھی   کیوں لگا ہوں میں وہ بام و در لیے پھرتا ہوں میں

رشتۂ درد سے پائندہ نہیں رشتہ کوئی   میری اس بات کو سینے سے لگائے رکھنا
تم ہوئے دور تو آنکھوں نے یہ فن سیکھ لیا   خشک دریاؤں میں طوفان اٹھائے رکھنا

مری نوا نے شکستہ دلوں کو جوڑ دیا   حدیثِ درد کے طالب مرے کلام کو دیکھ

میں جسے سمجھا تھا دریا وہ بھی نکلا تشنہ لب   اب کسے جا کر سنائیں پیاس کا افسانہ ہم

مثالوں کے انبار لگائے جا سکتے ہیں۔ مخفی مباد کلام آزاد میں رنگِ تغزل نہایت بغایت ہفت رنگی ہے۔ مزید بر آں غزل کے اشعار میں معنی در معنی کی جلوہ گری ملتی ہے۔ اُن کا عشق غمِ دل سے لے کر غمِ دوراں تک محیط ہے۔

روشن بختر کاظمی
شعبہ اردو و فارسی۔ راجستھان یونیورسٹی

جگن ناتھ آزاد کی طویل نظمیں

دورِ حاضر کی طویل نظموں میں بھی جدیدیت کے زیرِ اثر چند منفی اثرات در آئے ہیں لیکن جگن ناتھ آزاد اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ انہوں نے ان اثرات سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا۔ اُن کی نظموں میں کلاسیکل روایتوں کا احترام مکمل طور پر ملتا ہے اور اُن کی نظمیں (مختصر و طویل) شعری تزئین اور فنی نفاست کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ساتھ ہی مقصدیت پر اُن کی گرفت مضبوط رہتی ہے اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر ان کی گرفت رہتی ہے۔ اُن کی طویل نظمیں شعری حسن کے ساتھ ساتھ سوز و گداز، مسرت و انبساط کی فضا سے معمور نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں جو سوز و گداز ہے وہ ادب عالیہ کے لئے شرطِ اوّل ہے اور جس سے انسانی دل کی کثافتیں دور ہو کر مسرت و انبساط کی روحانی کیفیت سے نہاں خانۂ دل روشن و تابناک ہو جاتا ہے

آزاد کے سر سے وہ موجِ خوں گزری ہے جس کا اندازہ سبک سارانِ ساحل کو ہو ہی نہیں سکتا لیکن اس کے بعد اُن کا فن کسی قسم کی افراط و تفریط کا شکار نہ ہو سکا بلکہ اُن کی بصیرت میں اور اضافہ ہوا، ان کی آواز کا سوز اور گہرا ہو گیا اور اُن کا درد ذاتی نہ رہ کر آفاقی بن گیا اور اس ژرف نگاہی نے اُن سے "وطن میں اجنبی" جیسی بلند پایہ نظم لکھوائی جو کہ فکر و فن کا ایک نہ مٹنے والا نمونہ ہے۔

آزاد کی طویل نظمیں بڑی آب و تاب رکھتی ہیں۔ ان سب کے موضوعات اہم مسائل حیات

ہیں جنھیں شاعر نے پوری دیانت داری کے ساتھ نظم کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ "میرا موضوعِ سخن"
"وطن میں اجنبی"، "اردو"، "اجنتا کے غاروں میں"، "ماتمِ نہرو" وغیرہ سب کسی نہ کسی لحاظ سے منفرد اور
وقیع ہیں۔

"میرا موضوعِ سخن" ایک ایسی طویل نظم ہے جس میں آزاد نے تہذیب و تمدن کے ان دعوے داروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جو دراصل انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ جن لوگوں نے آزادیٔ وطن کو ذاتی منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہ نظم تازیانۂ عبرت ہے لیکن شاید اس قسم کے افراد ضمیر فروشی کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہر چیز بے اثر ہو جاتی ہے آزاد ان تلخ حقائق سے آگاہ ہونے کے باوجود انسان کی ازلی نیکی پر یقین رکھتے ہیں اور شکست و ریخت کے اس ماحول میں بھی انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی نظموں کا خاتمہ عام طور پر ایسے ہی انداز میں ہوتا ہے کہ مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ ٹوٹی ہوئی امیدیں پھر سے اپنا رخِ روشن دکھاتی ہیں اور مستقبل پر انسان کا یقین واپس لوٹ آتا ہے۔ یہ نشاطیۂ فکر صرف اقبال سے عقیدت کا اثر نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے رجائی طرزِ فکر کا نتیجہ ہے۔ آزاد کی مندرجہ بالا نظم کے بارے میں تیغ الہ آبادی نے بڑی جچی تلی رائے دی ہے ملاحظہ ہو۔

"آزاد کے ہر شعر پر آزاد کی زندگی کے خلوص کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال "میرا موضوعِ سخن" ہے ...... فیض کی نظم "موضوعِ سخن" کے مقابلے میں یہاں ایک زیادہ بیدار شعور ایک بہتر فلسفۂ عمل ایک پاکیزہ تر نظریہ ہے"[۱]

"وطن میں اجنبی" بھی آزاد کی طویل نظم ہے جس میں آزاد نے نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیات کو بھی نظم کی تکمیل میں استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں وطن پرستی اور انسانیت کے جذبات بہت نمایاں ہیں۔ آزاد جذباتی طور پر آج بھی سرزمینِ پنجاب کو اپنا وطن تسلیم کرتے ہیں حالانکہ سیاسی تقسیم کی بنا پر اب وہ وہاں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں آج بھی سرزمینِ پنجاب کے لئے دریائے محبت موجزن ہے۔ عبدالمجید سالک فرماتے ہیں۔
"اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن ان کی روح ایک مسلسل نظم

میں جاری و ساری ہے اس اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی طویل نظم ہے جس کے مختلف حصے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔

"وطن میں اجنبی" بیشک ایک مربوط و مسلسل طویل نظم ہے۔ مختلف ہیئتوں کے بستنے سے موضوع میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا بلکہ مختلف واقعات کی کڑیاں ملانے کے لئے اور مختلف قسم کے جذباتی اتار چڑھاؤ کی مناسبت سے مختلف ہیئتوں کا استعمال نظم کو یکسانیت اور خشکی سے دور رکھتا ہے اور نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی بھی مقام سے سرسری طور پر گزر جانا ناممکن ہو جاتا ہے اور آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

اردو کی طویل نظموں میں یہ تکنک عام طور پر استعمال نہیں کی گئی ہے لیکن اردو کی یہ ایک ایسی نظم ہے جس کا ہر جز نظم، غزل، قطعہ، رباعی خود اپنی جگہ مکمل ہے اور ساتھ ہی اس طویل نظم کا جز بھی ہے۔

موضوع کے لحاظ سے یہ طویل نظم تقسیم ہند کے دردناک واقعہ کی جذباتی دستاویز ہے جسے ہند و پاک کی آنے والی نسلیں (اگر انہیں ملک و قوم کی بقا سے دلچسپی ہے) ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ "وطن میں اجنبی" صرف آزاد کی جلاوطنی کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس نظم کے ہر شعر میں بیشمار دلوں کی دھڑکنیں پوشیدہ ہیں جنھیں آزاد نے بڑی کامیابی سے الفاظ کا جامہ عطا کیا ہے۔

اس نظم میں جذباتی اتار چڑھاؤ کے مختلف مواقع آئے ہیں۔ پہلی نظم بہ شکل مسدس پنجاب کا مرثیہ ہے جس میں تقسیم کے وقت اہل پنجاب کی بے بسی اور کسمپرسی کو بڑے سوز و گداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ نظم دوسری اس قسم کی منظومات میں بہترین قرار دی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں قتل و غارت کا جو طوفان برپا ہوا تھا اس کی تصویریں بھی لرزہ خیز ہیں۔

اک حشر کا سامان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
اک آگ کا طوفان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
انسان پریشان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
ہر روح میں ہیجان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
پنجاب میں اِک قہرِ الٰہی کا سماں تھا
دونوں طرف انساں کی تباہی کا سماں تھا

ترکِ وطن کی مجبوری کی حسرت ناک کیفیت اس بند میں نمایاں ہے۔

جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے
یا جیسے چلے دُرِّ عدن کانِ عدن سے
آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے
آزادؔ ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے
جس گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم
اُس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

اس مسدس کے بعد افکارِ پریشاں کے عنوان سے آزادؔ کی کچھ غزلیات ہیں جو اس نظم کو ایک رشتۂ مسلسل میں پرونے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کشمکش کا آئینہ ہیں جو نئے ماحول اور نئے وطن میں ایک حساس شاعر کے دل و دماغ میں ہوتی رہتی ہے۔

کب فصلِ بہار آئی تھی یہاں کب برق گری کچھ یاد نہیں
لیکن اب تک ان شعلوں سے ماحولِ گلستاں روشن ہے

بچ نہ سکے نگاہ میں اور کہیں کے باغ و داغ
رُک نہ سکے کہیں قدم چھوڑ کے گھر کے بام و در

جب اُن کا محبت بھرا دل نئے وطن کے مناظر سے دل تسکین پانے کے لئے بھٹکتا ہے تو انہیں پرانے وطن کی اجڑی ہوئی محفلیں یاد آتی ہیں اور وہ بے تاب ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔

دے فریب اور نہ دورِ ستم ایجاد مجھے　　کہ اک اجڑی ہوئی محفل ہے ابھی یاد مجھے

عیشِ زنداں سے تو انکار نہیں ہے لیکن　　چین لینے جو نہ دے فطرتِ آزاد مجھے

"بازگشت" کے عنوان سے نظم کا تیسرا حصّہ شروع ہوتا ہے اور نظم میں ڈرامائی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جب شاعر پاکستان کے قرب وجوار میں پہنچ جاتا ہے تو وطن کی محبت کا دریا پورے جوش وخروش سے موجزن ہو جاتا ہے اور وہ وطن کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے، ساتھ ہی اپنے غریب الدیار ہونے کی کسک اور شدید ہو جاتی ہے۔

جہانِ شوق کا ہر ذرّہ پیچ وتاب میں ہے
یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سُنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشک رواں
ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے
خدا کرے کہ اُسے یاں نہ کوئی پہچانے

لیکن اس شکوے دلی جذبات سے وطن عزیز کی روح بے خبر نہیں تھی اور ارضِ پاکستان اس فریاد پر تڑپ اُٹھی اور یوں گویا ہوئی۔

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ
غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ
اُداس اُداس ہیں پھولوں کے چہرہ ہائے جمیل
تو اے بہارِ چمن پھر چمن کو واپس آ
ترے فراق میں گریاں ہیں چشمِ راوی وسندھ
اسی فضا اسی بزمِ کہن کو واپس آ

آزاد کے اس سادہ سے جذباتی سوال پر کہ۔

نہیں وحشی کہ آوارہ پھروں دشت وبیاباں میں
کسی گوشے میں رہنے دے اگر مجھ کو وطن میرا

پاکستان کا جواب بڑا معنی خیز، وہ فلسفیانہ ہے جس میں تبدیلیٔ زماں کا فلسفہ واضح ہے۔

کبھی خزاں کے بگولے کبھی نسیم بہار
دل و نظر کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں
بہت نہیں فقط اہلِ جنوں کی ایک نظر
یہ بے ثبات زمانے بدلتے رہتے ہیں
اسی بہارِ چمن کا پھر انتظار نہ کر
کہ بجلیوں کے نشانے بدلتے رہتے ہیں

اس جواب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ آزاد جذبات کی شدت کے باوجود حقائق سے کبھی روگردانی نہیں کرتے یہی اُن کے فن کے لازوال ہونے کی دلیل ہے۔

لاہور میں ورود بھی اس نظم میں ایک ایسی منزل ہے جہاں شاعر کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ لاہور کی تاریخی و تہذیبی عظمت کا احساس اور اس شہر سے جذباتی و روحانی تعلق کی شیریں و خوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ حال کے تلخ حقائق اپنے ہی وطن میں پردیسی اور اجنبی ہونے کا خیال دل پر نشتر زنی کرتا ہے۔ اور فریاد کی صورت میں یہ اشعار اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

لاہور میں مزارِ اقبال پر آزاد اور روحِ اقبال کی گفتگو بھی بڑی معنی خیز اور فکر انگیز ہے اور یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ اپنی شاعری اور شخصیت کی تکمیل میں آزاد نے اقبال سے کسب فیض کیا ہے اور زندگی کے اہم موڑوں پر اقبال کے نظریات سے فکری توانائی حاصل کی ہے۔

پاکستان پہنچنے کے بعد آزاد صرف لاہور تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ وہاں سے مختلف مشاعروں میں شرکت کے لئے لائل پور، مشرقی پاکستان اور کراچی بھی گئے سب سے پہلے لائل پور گئے۔ وہاں کے مشاعرے میں آزاد کی غزل یادِ ماضی سے بھرپور رہے۔ نظم جشنِ آزادی "تقسیمِ وطن کے اندوہناک واقعات کی تصویر ہے جب انسانیت کی تمام قدریں سرنگوں تھیں۔

مجھے کیا پھر نوید جشنِ آزادی سناتے ہو
ابھی تک ہیں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا

ادھر صیاد پھرتے تھے ادھر صیاد پھرتے تھے
کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی
ادھر بھی آگ بھڑکی تھی ادھر بھی آگ بھڑکی تھی
زمینِ باغ پر یوں رحمتِ پروردگار آئی

اشارہ غیر کا تھا ہمت اپنی تھی ہوس اپنی
دکھائے واہ کیا تیور وطن کے نوجوانوں نے
جہالت کی سیاہی چہرۂ تہذیب پر مل دی
نئی تاریخ یوں لکھی وطن میں لکھنے والوں نے

نوائے پریشاں کے عنوان سے جو حصّہ ہے اس میں آزاد کو "راولپنڈی" اور مری کا سے دعوتیں ملتی ہیں لیکن سیاسی مجبوریوں کے سبب آزاد وہاں پہنچ نہیں سکتے

اور اپنی مجبوریوں کی کہانی اپنے دوستوں کو بزبانِ شعر سناتے ہیں

تجھ پہ اے دورِ سیاست آفریں صد آفریں
اک مسافر آج اپنے گھر میں جا سکتا نہیں
جس سے ملنے کے لئے ہے ایک دنیا بے قرار
آج وہ اپنا قدم آگے بڑھا سکتا نہیں

مشرقی پاکستان جاتے ہوئے اثنائے راہ میں بھی آزاد نے کئی خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔ چاٹگانگ کے ذرات شاعر کو حیات آفریں پیغام دیتے ہیں۔ یہیں آزاد کی ملاقات حفیظ جالندھری سے ہوتی ہے جو آزاد کے الفاظ میں

کیا کہوں کیا تھی ملاقاتِ حفیظ
غم کی دنیا تھی ملاقاتِ حفیظ

اسی سلسلہ میں حفیظ کی ایک غزل اور تلوک چند محروم کی تضمین بھی شامل کی گئی ہے جس سے نظم کے تسلسل روانی اور درد انگیزی میں اضافہ ہوتا ہے اور ایک خاص ڈرامائی انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں تو یہ پوری نظم ہی ایک ڈرامائی نظم ہے جس میں شاعر خود مرکزی کردار ہے۔ مشرقی پاکستان کے لئے شاعر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار بصد خلوصِ قلب کرتا ہے اور بصد حسرت یہ کہتا ہوا واپس ہوتا ہے۔

ترے چمن میں بھی مجھ کو قیام مل نہ سکا
کہیں بھی غنچۂ مری آرزو کا کھل نہ سکا

اس طویل ڈرامائی نظم میں چند واقعات کی تکرار ہے۔ مثلاً لاہور میں شاعر کا دوبار ورود ہونا اور مزارِ اقبال پر دوبار حاضر ہوتا ہے لیکن واقعات کا جو تسلسل ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان سے شاعر کے لئے لاہور واپس آنا ضروری تھا۔ لاہور میں دوبار آنے کے بعد شاعر کی ملاقات سر عبدالقادر سے ہوتی ہے اور فن کی باریکیوں پر گفتگو ہوتی ہے۔ آرزو اور روحِ اقبال کے درمیان جو مکالمہ ہوتا ہے وہ زندگی کے فلسفیانہ رموز و نکات کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ مزارِ مجدد پر چند لمحے کے خیال

سے جو نظم ہے اس میں روحِ تاجور اپنے شاگرد کو بصیرت افروز اور بیش بہا نصیحتیں کرتی ہے۔ قیامِ لاہور کے دوران ہی فانوسِ خیال میں وہ دل سوز لمحہ گردش کرتا ہے جب انھوں نے اپنی ایک محبوب ہستی کو سپردِ خاک آتش کیا تھا، پھر عالمِ خیال میں ہی سجاد ظہیر، فیض احمد ندیم، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے ملاقاتیں ہوتی ہیں جو کہ زندانی تھے اور رسمِ فغاں سے ناواقف ——

ممکن ہے اُن کو رسمِ فغاں کی خبر نہ ہو
ہیں کچھ اسیر داخلِ زنداں نئے نئے

سب سے آخری سفر کراچی کا تھا، اس سلسلہ میں عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں ——

"آخر میں کراچی کا سفر در پیش آتا ہے، یہاں وہ غزلیں درج کی گئی ہیں جنھوں نے کراچی کے ہر حلقہ سے خراجِ اشک و آہ وصول کیا تھا۔"

واقعی یہ غزلیں نہیں ہیں، آزاد کے دل و جگر کے ٹکڑے ہیں جو شاعر نے انسانیت کے نام پر نذر کئے ہیں۔

جو دل کا راز ہے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے
تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو تو اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری
فضا میں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں ان کی
جنونِ سرفروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

ان غزلیات کے بعد "تحفے بہ پاکستان" کے عنوان سے ایک دل کش نظم ہے
جو آزاد کے خلوص و محبت کی ایک مہر ہے جو انھوں نے اپنے وطن کی پیشانی پر ثبت
کی ہے۔ وہی وطن جس میں وہ اجنبی کی طرح داخل ہونے پر مجبور ہوئے تھے اور اب
جو پرایا دیس بن چکا ہے۔

بیشک یہ نظم ہند و پاک کے انسانوں کو ایک محبت بھرے رشتہ میں باندھنے
کی ایک ایسی کوشش ہے جس کی تعریف چند الفاظ میں ناکافی ہے بقول خواجہ غلام السیدین
"اس مجموعے کی تمام نظموں میں ایک خاص کیفیت اور جذبہ جاری و ساری ہے
...... ایک حساس شاعر جس کے قدم تقسیم ہند کے المیوں کے باوجود محبت اور شرافت
کے راستے سے نہیں بھٹکے، کئی سال بعد اپنے قدیم وطن پاکستان میں ایک اجنبی کی طرح
آتا ہے اور دل میں جذبات کا ایک طوفان لے کر آتا ہے جو اس کے شعروں میں خلوص
اور محبت کے موتی بن کر چمکتے ہیں اور اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی شبنم میں ڈھل
جاتے ہیں۔ وہ اس کے ظل میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور دوستی کے
ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے ایک شیرازۂ محبت میں سمیٹ لیتے ہیں......
...... کس قدر مختلف ہے یہ اندازِ فکر، یہ جذبہ، ہند اور پاکستان
کے ان یک چشم ادیبوں، شاعروں، اخبار نویسوں اور سیاست دانوں سے جو نہ تہذیب
کی وحدت کے قائل ہیں نہ انسانیت کے مشترک رشتوں کا پاس کرتے ہیں جو سستی
ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یا ذاتی مفاد کی خاطر لوگوں میں تعصب کی آگ
بھڑکاتے ہیں"

بیشک اس پر آشوب دور میں یہ نظم چراغِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے جو بھولے
بھٹکے مسافروں کو صحیح راہ دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مقصدیت کے ساتھ ساتھ

شعری خصوصیات اور فنکاری کے تمام تقاضوں کو بخوبی پورا کرنا ایک دشوار منزل تھی جس سے آزاد بحیر و خوبی گزر گئے ہیں۔

"اردو" اردو زبان کی پیدائش و ارتقا پر ایک خوبصورت نظم ہے لیکن اس میں کوئی فکری گہرائی نہیں ہے۔ "ماتم نہرو" میں درد و اثر کی فراوانی، زبان کی تراش خراش کے سبب۔ اکثر مقامات پر مراثی انیس کی جھلک نظر آتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر جتنی نظمیں لکھی گئیں، یہ نظم درد و اثر کے لحاظ سے ان سب سے بہتر ہے۔ نہرو کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ان کی مختلف حیثیتیں تھیں، ہر دلعزیز قومی لیڈر، سیاست داں، مقرر، ادیب وغیرہ لیکن ان سب سے بلند ان کی حیثیت بطور ایک انسان تھی۔ جس کے دل میں انسانیت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ انہیں انسانوں کی نیکی پر جو یقین تھا اس نے بعض اوقات انہیں نقصان بھی پہنچایا (خاص طور سے عمر کے آخری حصہ میں) لیکن سیاست داں نہرو کا انسانیت کے آگے سپر انداختہ ہوتا رہا۔ آزاد کی نظر میں اُن کی شخصیت کا یہی پہلو سب سے بہتر و برتر ہے۔ آزاد کی نظر میں ایسے انسان فنا نہیں ہوتے کیونکہ اُن کے افکار اور طرزِ عمل ہمیشہ مشعلِ ہدایت ثابت ہوتے رہتے ہیں ؎

وہ ایک مشتِ خاک نہیں برقِ طور ہے
وہ آدمی اجل کی رسائی سے دور ہے

آزاد کی نظموں میں کسی مخصوص سیاسی نظریے کی بازگشت نہیں ملتی۔ انہیں زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں سے پیار ہے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید۔ اگرچہ آزاد نے پسماندہ طبقوں کی مخصوص طریقہ سے عکاسی نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں ہر انسان سے محبت ہے اور وہ جمہوری مساوات کے حامی بھی ہیں۔ اُن کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے وہ ماضی کی عظمتوں کا احساس رکھتے ہیں لیکن حال کی طرف سے بھی انہوں نے کبھی غفلت نہیں برتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کی شاعری عصری ہم آہنگی کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر آلِ احمد سرور کا اظہار خیال حقیقت پر مبنی ہے۔ "اُن کے یہاں نئے اور بدلے ہوئے حالات کا مطالعہ اور انسانیت کے

ہندو میں اضافہ کا عزم ملتا ہے۔ ان کے یہاں نئے رجحانات کے ساتھ مشرقی کلاسیکی
ادب کی روح اور زندگی کے جمالیاتی پہلو کا احساس بھی ہے۔ اُن کی شاعری مقصدی
ہے اور اس میں مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت کا سامان بھی ملتا ہے۔ اُن کے یہاں
فنکار کی ایک خلش، بےچینی اور غم بھی ہے۔ یہ دراصل اس ولولہ کا نام ہے جو ہمیشہ
خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتا ہے اور جس کے مرحلہ ہائے شوق کبھی طے نہیں ہوتے
میں اُسے شاعر کے لئے ایک نیک فال سمجھتا ہوں۔ اس میں ترقی کا راز مضمر ہے[1]۔

آزاد کے اس مرحلۂ شوق کی ایک منزل اُن کی زیرِ تصنیف طویل نظم "جمہور نامہ"
ہے جو مثنوی کی حیثیت میں تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس مثنوی کا موضوع بقول
ڈاکٹر گیان چند جین تخلیق کائنات اور ارتقائے بنی آدم ہے[2]۔ یہ نظم تین ہزار اشعار تک
پہنچ چکی ہے اور ابھی نا تمام ہے۔ اس نظم کا موضوع جوش کی نا تمام نظم "حرفِ آخر" کا ایک
ہی ہے۔ آزاد نے سائنسی نقطۂ نظر سے ارتقائے انسانی کو پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔
یہ موضوع عظمت کے ساتھ ہی طوالت کا بھی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین ۔

دنیا کی اکثر بڑی رزمیہ نظمیں ایک قوم کے کسی ایک دور سے متعلق ہیں۔ آزاد نے
بنی نوع انسان کے پورے ارتقاء بلکہ قبل ارتقاء کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔۔۔۔ "جمہور نامہ"
کا سرمایۂ فخر اس کے متعدد شاعرانہ بیانات ہیں۔ بشر کی توصیف، مٹی کی عظمت، انسان
پہ سلام، قلوپطرہ کا خیرہ کن حسن، وید اور گیتا کی عظمت اور اس قبیل کے دوسرے بیانات
نے اس مثنوی کو محض بیانیہ نہیں رہنے دیا بلکہ سراپا شعر بنا ڈالا ہے[3]۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے ان بیانات کی تصدیق "جمہور نامہ" کے ان حصوں سے
ہوتی ہے جو نقوش، نگار، چنگاری، [illegible] وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور ہم امید کر سکتے ہیں
کہ یقیناً یہ نظم اردو کی طویل نظموں میں ایک تاریخی مقام حاصل کرے گی اور آزاد کی طویل
نظموں میں بھی سرِ فہرست جگہ پائے گی۔ لیکن تکمیل شرطِ اوّل ہے۔

۱۔ اردو ادب [illegible] ۔ ۲۔ تجزیے ص ۲۸۰۔ ۳۔ پروفیسر گیان چند
جین تجزیے ص ۲۸۵۔

آزاد کے کلام میں روشنیٔ طبع کے ساتھ جو طمانیت ہے اس کا سبب محض اُن کا شعور نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں ان کے لاشعور میں پوشیدہ ہیں۔ انھوں نے بچپن میں جو شفقت اور محبت کی انمول دولت اور ذہنی آسودگی پائی ہے اس نے اُن کی فکر کو ابتدا سے آج تک متوازن رکھا ہے، اور بڑے سے بڑا خارجی طوفان بھی اُن کے اندازِ فکر کو منفی نہ بنا سکا۔ یہ خصوصیت آزاد کی نسل کے اکثر شاعروں میں بھی نہیں تھی۔ اور نئی پود میں تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔

آزاد کی فکر کی طرح اُن کا لب و لہجہ بھی متوازن ہے۔ تلخ سے تلخ موضوعات بھی اُسے کرخت نہیں بنا سکے ساتھ ہی انفعالیت کی کیفیت بھی کہیں پیدا نہیں ہوتی ہے۔ مایوسی اور ناامیدی کے ماحول میں بھی وہ آنے والے کل سے مایوس نہیں ہوئے بقول خواجہ غلام السیدین :-

"اُن کے کلام میں ایک صبح نو کے طلوع کی آرزو اس طرح جھانکتی ہے جس طرح صبح سویرے برسات کے اندھیرے بادلوں میں کبھی کبھی سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے۔"

آزاد کے لب و لہجے اور شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں فراق گورکھپوری رقمطراز ہیں :-

"آزاد کی آواز بیک وقت نرم متوازن اور مردانہ وار ہے۔ لہجہ بیک وقت سنجیدہ و حساس ہے۔ خیالات، جذبات، طلب و نظر کی اس تربیت تہذیب کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر کی جائے، کم ہے۔ الفاظ و بیان میں کامل قدر شستگی ہے ان کے ہر شعر کے آئینہ میں اُن کا کردار جھلک رہا ہے اور اُن کا سچا دل و دماغ بھی۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اُن کا کلام برابر ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سطحیت تو اُن کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جارہی ہیں۔ ایک بلندی جو نئی منزلیں تلاش کرتی رہی ہے۔ ایسی تنقیدِ حیات جو سادہ پرکار ہے ایک ایسا اندازِ بیان جو تہ کر بے تکلف ہے اس لئے بے حد دل کش ہے۔ زندگی

ے پیش لفظ طبع دوم "وطن میں اجنبی" ۱۹۶۷ء

سے انسانیت سے کائنات سے فطری اور پرخلوص لگاؤ، ایک چوٹ کھایا ہوا دل جس نے اپنی چوٹ کو قبول کر لیا ہے یہ ہیں وہ خصوصیات جو آزاد کی شاعری کو امتیازی رنگ عطا کرتی ہیں"۔ [1]

پچھلے چند سالوں سے آزاد شاعری سے زیادہ نثر کی طرف متوجہ ہیں۔ خصوصیت سے اقبالیات پر اُن کی تصانیف بہت اہم ہیں۔ بیشک وہ بہت اہم کام کررہے ہیں۔ اُردو میں اچھے نثر نگاروں کی کمی ہے لیکن ساتھ ہی اچھے بلند پایہ شاعروں کی بھی کون سی زیادتی ہے؟۔

ابر نیساں یہ تنک بخشیٔ شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

---

[1] جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری۔ ص ۳۴ ــ ۳۵

اقبال اکیڈمی میں حضرت جگن ناتھ آزاد کی تقریر

حیدرآباد۔ ۱۴ر دسمبر (راست) اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام اقبالیات کے مشہور اسکالر جناب جگن ناتھ آزاد کی توسیعی تقریر ۱۹ر دسمبر کو ۸ بجے شب "مدینہ منشن" نارائن گوڑہ حیدرآباد میں منعقد ہوگی۔ اس موقع پر جناب نواب سید محمود علی ثاقب، اقبال کی شاہکار نظم "مسجد قرطبہ" کے منتخب اشعار کا انگریزی منظوم ترجمہ پیش کریں گے۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر اقبال اکیڈمی صدارت کریں گے۔ شرکت کی عام اجازت ہے۔ خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہے۔

سیاست حیدرآباد
۱۵ر دسمبر ۱۹۷۴ء

غلام محمد وفائیؔ
سری نگر

بچوں کی نظمیں

"بچوں کی نظمیں" جگن ناتھ آزاد کی تصنیف ہے جس کو ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم اور سماجی بہبود "حکومت ہند" نے شائع کیا ہے۔ اس میں سولہ نظمیں ہیں۔ آزاد موصوف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ نثر و نظم دونوں میں مکمل دسترس رکھتے ہیں آپ کا مخصوص فکری و لسانی رجحان ہے۔ نثر ہو یا نظم دونوں میں اردو کے عام فہم الفاظ کا بلیغ و بے ساختہ استعمال کرتے ہیں۔ آزاد چونکہ فطرتاً حریت پسند اور تقلید دشمن واقع ہیں۔ اس لئے درماندہ انسانیت کو سہارا دینے کے لئے آپ نے جو بھی صور پھونکا وہ اپنے آہنگ میں گرجدار اور ہر طرح نیا ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے جو بھی زبان اختیار کی وہ اُن کے مافی الضمیر کا ساتھ نبھنے والی ہے۔ آپ نے اپنے پیرایۂ بیان میں نت نئی راہیں پیدا کیں۔ آپ کا ایک عام ادبی رجحان بدل اس جوہر قابل کے تمام ادبی تجربوں اور اسلوب اظہار کی قدیم پابندیوں سے گریز ہی کا ایک دوسرا نام ہے۔ یہاں کے نوجوان ادیبوں کو اس سے ایک جھنجھوڑ ملی ہے۔ کتاب کی نظموں میں مصرعے کے مصرعے ایسے ملتے ہیں جن میں عام فہم اردو کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "تماشے والا" اس کے الفاظ اس کی روشن مثال ہیں۔

آؤ بچو! دو دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کر و!

نظارے دکھلانے والا
جگ کی سیر کرانے والا
ڈبہ اپنے سر پہ اُٹھائے
گلی گلی میں جانے والا
آج تمہارے گھر کے باہر رنگ جمانے آیا
دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا
آؤ بچو! دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو
اُس نے ڈبہ لا کر رکھا
تم نے ایک شیشے میں جھانکا
تصویروں پر تصویریں ہیں
بلّی، کتّا، مینا، طوطا
کھیل تماشے والا اک سنسار بسانے آیا
دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا

بچوں کے لئے ایک اور نظم "کلکتہ میل" ہے۔ اس میں بھی یہی رُخ ہے۔

کلکتے سے میرے بھیّا لائے ہیں اک ریل
ریل بہت ہی اچھی ہے یہ اس کو نہ سمجھو کھیل
چابی ہے اس ریل کا کوئلہ چابی اس کا تیل
کلکتے سے آئی ہے یہ ہے کلکتہ میل

ننھا سا ہے انجن اس کا ننھا سا ہے گارڈ
ننھی سی ہے پٹری اس کی ننھا سا ہے یارڈ
اس پٹری پر چل نکلی ہے ننھی سی یہ ریل
ننھی سی یہ ریل ہے لیکن ہے کلکتہ میل

اس نظم کے صرف تین بند ہیں ۔ پہلے دو بندوں میں شاعر نے الفاظ میں خوب مصوری کی ہے اور عام فہم الفاظ میں ریل کی تصویر بنائی ہے

آزاد کی جو نظمیں میری نظروں سے گزری ہیں اُن میں رسائی بہت بلند اور اظہار بڑا جرائت مندانہ ہے۔ آپ نے گیتوں میں شعریت کے ساتھ نغمگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ نثر کے مکالموں کو بھی آپ نے جدید تکنیک سے آشنا کیا۔ وہ ایک محقق بھی ہیں اور منکشف بھی۔ اقبال پر آپ نے جو تحقیقی کام کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے اور جب آپ تنقید کے فن کو ہاتھ لگاتے ہیں تو بے لاگ تنقید کرتے نظر آتے ہیں اخلاقی قدروں کی حفاظت کرتے ہوئے آپ آزادانہ تنقید کرنے میں بڑے جری ہیں اس طرح سے آپ کی تخلیقات نے ادبیاتِ عالیہ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے آپ کی تخلیقات سے ہمیں ان کے ادبی سفر اور اُس کی تدریجی و انقلابی رجحان کی نشاندہی ہو سکتی ہے اور جب ہم "بچوں کی نظمیں" کی مختصر کتاب میں بچوں کے لئے اُن کی نظمیں پڑھتے ہیں تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ آپ نے یہاں تخیلی اور تصوری موضوعات سے عمداً گریز کیا ہے۔ کیونکہ شاعر کو احساس ہے کہ وہ نوعمر بچوں کے لئے نظمیں کہہ رہے ہیں۔ ایک ذہن ہے جو پورے عروج پر ہے لیکن جب بچوں سے ملتا ہے تو بچوں کی زبان میں باتیں کرتا ہے اور یہی ایک بڑے شاعر اور ادیب کا کمال ہے ایک نظم ہے "سُن لو ایک کہانی بچو"! غور کیجئے کہ ایک بڑا شاعر بچوں کو کس خلوص محبت اور صاف ستھرے الفاظ میں کس طرح کہانی سناتا ہے۔

سُن لو ایک کہانی

بچو

سُن لو ایک کہانی

تین برس کی ایک بچی ہے نام ہے جس کا پونم
لیکن سب بچوں نے اس کا نام رکھا ہے رانی
سُن لو ایک کہانی بچو! سُن لو ایک کہانی

اُس کے سر کی ٹوپی لال ہے بوٹ ہیں اس کے کالے
کوٹ ہے اس کا رنگ برنگا کرتا اُس کا دھانی
سُن لو ایک کہانی بچو! سُن لو ایک کہانی

چھیڑتی ہے وہ ہر اک شئے کو سامنے جو بھی آئے
ریڈیو ہو یا ہیٹر ہو یا ہو وہ چینی دانی!!
سُن لو ایک کہانی بچو! سُن لو ایک کہانی

بسکٹ کے دھوکے میں رانی کھا جاتی ہے روٹی
دودھ کے دھوکے میں اکثر پی جاتی ہے پانی
سن لو ایک کہانی بچو! سن لو ایک کہانی

یہ نظم ذرا طویل ہے اس میں کم عمر بچوں کی نفسیات کا تجزیہ ہے۔

باہمی محبت، قربانی کا جذبہ اور ذوقِ طلب کا اظہار آزاد صاحب کسانوں کی زبان میں کر رہے ہیں۔ کسان ہی ہمارے ملک کے معیشتی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے آج بھی نوعِ انسان کے سامنے جو بڑے بڑے معاشرتی اور سماجی مسائل ہیں اُن میں بھوک سب سے اہم ہے۔ آج کی مہذب دنیا میں جبکہ انسان علم و ادب سے عظیم لائبریری بھر چکا ہے اُس کی آرٹ گیلریوں میں بہترین فن کے مجسمے ہیں اس کے تخیل پر عظیم منصوبے جنم لے رہے ہیں۔ اس کی انگلیاں برق و باد پر حکمرانی کر رہی ہیں لیکن قوم کے بچے اور بچیاں [illegible] ہیں اس کا واحد علاج یہ ہے کہ ذرائع پیداوار میں بہت جلد اضافہ کیا جائے اگر کسانوں کو زندگی کی سہولیات بہم کی جائیں اور کسان خود منظم ہو کر سخت سے سخت محنت کریں تو بھوک اور افلاس کا خاتمہ ہو سکتا ہے ان سچائیوں کا اظہار شاعر نے "کسان کا گیت" کی نظم میں کیا ہے۔ اس نظم میں ایک ایک لفظ کی صداقت ابھر کر آ رہی ہے اس نظم میں شاعر [illegible]

کی طرف آؤ اور زندگی کے سانچے کو عمل کی آنچ سے پختہ کرو۔ کسان گاتے ہیں۔

قدم اپنا آگے بڑھاتے چلیں گے
زمانے کی بگڑی بناتے چلیں گے
زمینوں پہ جب ہل چلاتے چلیں گے
تو مٹی سے سونا اگاتے چلیں گے
نشاں بھوک کا ہم مٹاتے چلیں گے

کہیں چاولوں سے سجائیں گے دنیا
کہیں باجرے سے لبائیں گے دنیا
جو ہے کال اس کو مٹائیں گے دنیا
نشاں بھوک کا ہم مٹاتے چلیں گے
زمانے کی بگڑی بناتے چلیں گے

کتاب میں اور بھی کئی نظمیں ہیں۔ عید، دسہرہ، دیوالی، دیس ہوا آزاد، اس قسم کی نظموں میں انسانی اخوت اور عالم گیر برادری کا پرچار ہے اور ذات فرقہ اور رنگ و نسل کا امتیاز مٹانے کی تلقین ہے۔ شاعر چاہتا ہے کہ بچوں کے دل کی سادہ تختیوں پر ابھی سے اس قسم کے نقوش مرتسم ہو جائیں تاکہ حب الوطنی کی بنیاد مستحکم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نفرت کا جذبہ مٹتا جائے اور انسانیت داغدار نہ ہو۔ ان خصوصیات مطالب و معانی سے ان کو ایک ایسا کمال فن عطا ہوا ہے جس سے آپ دنیائے ادب میں ایک منفرد مقام پر فائز ہوں گے۔

روزنامہ سیاست۔ حیدرآباد
[illegible]ر دسمبر [illegible]ء

اقبال شاعر اور سیاستداں
جگن ناتھ آزاد کا لیکچر

حیدرآباد۔ ۱۵ر دسمبر۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اقبال اسٹڈیز اور ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک جلسہ جناب حامد علی عباسی کی صدارت میں دوشنبہ ۱۴ر دسمبر کو ۷ بجے آزاد انسٹی ٹیوٹ ادارہ [illegible] میں منعقد ہوا۔ جناب جگن ناتھ آزاد نے اقبال شاعر اور سیاستداں کے موضوع پر [illegible]

شیخ نجم الہدیٰ شمس الضحیٰ
ریسرچ اسکالر، انجمن اسلام اردو
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

جگن ناتھ آزاد کی نظم نگاری اور دردِ وطن

۱۸۵۷ء نے جہاں ملک کے سیاسی حالات میں انقلاب کی چنگاری بھڑکائی اور عام ہندوستانی، برطانوی استبداد کے خلاف اور آزادیٔ وطن کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علمائے اردو نے حکمت عملی کے تحت اردو شعر و ادب میں بھی انقلاب آفریں موڑ کے لئے راہیں ہموار کیں۔ اس انقلاب آفریں موڑ میں مولانا محمد حسین آزاد کے ہمرکاب مولانا الطاف حسین حالی بھی تھے۔

اردو نظم کے اس انقلاب آفریں موڑ کو جب ہم وسیع پس منظر میں دیکھیں تو بہت سارے نام جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، تلوک چند محروم، اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، فراق گورکھپوری، وامق جونپوری، احمد ندیم قاسمی، اختر شیرانی، احسان دانش، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، شمیم کرہانی، اعجاز صدیقی، سلام مچھلی شہری، سلیمان اریب، اختر انصاری، معین الدین جذبی، مجاز لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، پریم دھون، نیاز حیدر، خلیل الرحمان اعظمی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، مظہر امام، ن م راشد وغیرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

تاہم ہم ان تمام شعراء کی نظم نگاری کا موازنہ پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ جگن ناتھ

آزاد کی نظم نگاری پر اظہارِ خیال پیشِ نظر ہے۔ لیکن نہ جانے ۱۹۴۷ء کے کشت و خون اور اُس کے بعد پیدا ہونے والے واقعات میں کیا بات پنہاں تھی کہ یہ ایک بجلی کی طرح میرے ذہن پر گرے اور اپنا اثر ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ جذبات و خیالات کے بند چشمے تھے کہ اشارہ پاتے ہی پھوٹ پڑے ہیں۔

ایک بحر زار تھا جو مہر نیم روز کی حدت کا محتاج تھا اور جب اس کی ابھرتی کرنوں سے دوچار ہوا تو ایک سیلاب بن کر بہہ نکلا :

(ستاروں سے ذروں تک ص۱۱) مکتبہ شاہراہ دہلی

(جگن ناتھ آزاد)

ورڈسورتھ نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی کہ شاعری انسانی رشتوں کے اظہار کی بات ہے اور اُس نے یہ بات بھی کہی تھی کہ شاعری علی حدود سے خواہ وہ حدودِ زبان کے ہوں معاشرت کے ہوں نکل کر سارے عالم اور ساری انسانیت کی شاعری بن جاتی ہے"

جگن ناتھ آزاد کے یہاں ذاتی درد، ذاتی رنج و غم کے ساتھ ساتھ غم دوراں اور غم انسانیت کی پرچھائیاں اُبھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے یہاں یہ دونوں غم آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اگر وہ جدید نگ و آہنگ سے واسطہ رکھتے ہیں تو وہیں مشرق کا کلاسیکی ادب اور اس کی عظمت بھی اُن کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ اُن کا لب و لہجہ ایسا ہے جو طلوں میں بیعت ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ آزاد کسی ایک نظریے کے پابند نہیں ہیں اور نہ ہی اُن پر کوئی نظریہ لادا جا سکتا ہے۔

آزاد کے شعری نگارخانہ میں انسانی رشتوں کی پاکیزگی اور اُن کا حسن، اس کی لطافت کی ایک کائنات ہے۔ آزاد کی اس کائنات میں زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ تلخ نوائی کی گرم روی بھی ہے جس سے شدتِ جذبات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

آزاد اپنی نظموں میں اظہارِ حق سے خیالات و واقعات کی ترجمانی کرتے ہیں مگر مصلحت کوشی کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ بے باکانہ اظہار کے ساتھ حق و انصاف کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے

ہیں۔ وہ اپنے احساسات و جذبات کو قتل نہیں کرتے۔

اسے آزاد کی وارفتگیٔ ذوق کا ثمر ہی کہا جائے گا کہ سرکاری ذمہ داریوں میں گھرے رہنے کے باوجود بھی شاعرانہ محویت اور فنی ریاضت و مطالعہ کی آنچ کبھی مدھم نہیں ہوتی اور اس سے بڑھ کر حساس فنکار کی ثقافت اور کیا ہو سکتی ہے۔

بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۱۹۴۷ء کے کشت و خون کے حالات و واقعات کے سبب ہی وہ فکر و سخن کی طرف متوجہ ہوئے اور جب ہم فکر و شعور کی روشنی میں آزاد کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ثقافت کے اس پیکر میں آزاد کی زندگی کے تجربات، حادثات اور مشاہدات کا گہوارہ نظر آتا ہے۔ کلام میں فن کی پختگی اور معنویت، زبان کی شگفتگی، بیان کی سنجیدگی اور خیال کی طہارت دکھائی پڑتی ہے۔ وہ آزاد کی ریاضت، ذہنی تربیت وسعت مطالعہ کے علاوہ شب و روز کے تجربے کا ماحصل ہے۔ اور جب تقسیم وطن کے کشت و خون کے واقعات و حالات پیدا ہوئے تو یہی اُن کی تخلیقی قوت کی اظہار کا وسیلہ بنے ان حالات و واقعات نے تخلیقی فکر میں وہ رنگ بھرا جو کم عرصہ ہی میں کئی شعری مجموعوں کے سیکڑوں صفحات پر بکھر گیا۔ جن میں ماضی کا جلال و جمال، حال کی تڑپ اور کسک کے ساتھ مستقبل کا اُجالا پھیلا ہوا ہے۔ درد اور تڑپ کے ساتھ ساتھ حوصلہ مندی کے جذبات و احساسات کی روشنی نظموں میں بکھری ہوئی ہے وہ کدورت اور پُرآشوب دور میں بھی جینے کی آنچ کو مدھم نہیں ہونے دیتے۔ وطن کی بدحالی پر تڑپ اُٹھتے ہیں۔ وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زندگی جہدِ مسلسل کا دوسرا نام ہے۔ نظم "طوفان کے بعد" میں یہی احساس زندہ ہے

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے — زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دید ذرا غور سے دیکھ — کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

اور یہ پیغام آخر کہ

باوجود اس کے ارادوں کا تقاضہ ہے یہی — لڑکھڑاتی ہوئی دنیا کو سنبھالے بڑھ کر
تیز طوفان فضاؤں میں چلتے ہی رہیں — میری بجھتی ہوئی قندیل کو جلنے بڑھ کر

محمد حسین آزاد نے اردو نظم کو نیا مزاج عطا کیا تاہم وہ شعر کو الہامی چیز سمجھتے

ہیں۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں بھی اس کا اظہار کیا تھا کہ۔

"فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضانِ الٰہی کا ہے کہ اہلِ دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے"۔

(دیکھئے نظم اور کلام موزوں کے باب میں حیات نو)

محمد حسین آزاد نظم آزاد صہ

اور یہی روایت اردو شاعری میں جاری رہی کہ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"

آج کے تغیر پذیر دور میں اس روایت پر کتنے شعراء ادبا کا ادبی ایمان ہے اس کا اظہار ممکن نہیں تاہم آج سے پینتیس برس قبل جگن ناتھ آزاد نے اسی روایت کو دہراتے ہوئے اس کا اظہار کیا۔ یوں بھی اردو فارسی ادب میں ہمیشہ سے شاعری کو جزو پیغمبری اور شاعر کو عام سطح سے بلند انسان تصور کیا گیا تھا۔

لیکن پروفیسر آزاد کے یہاں شعوری احساس بیدار ہے اور اسی بیداری کے نتیجے میں انھوں نے اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

"........ لیکن اب داخلی اور خارجی واردات نے میرے اس نظریے کو ختم کر دیا ہے اب شعر کہنے کے لئے میں اس آسمانی برکت کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اب تو جو کچھ دیکھتا ہوں سنتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں"۔

(ستاروں سے ذروں تک" پیش لفظ۔ جگن ناتھ آزاد

مکتبہ شاہراہ دہلی ۱۹۵۸ء پہلی اشاعت)

شہنشاہِ تغزل جگر مرادآبادی نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جب تکلیف دہ حالات سے دوچار ہوئے تب گھبرا کر انھوں نے کہا۔

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن ؎ لاکھ بلائیں ایک نشیمن

کامل رہبر قاتل رہزن ؎ دل سا دوست نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن ؎ لیکن اپنا اپنا دامن

معین احسن جذبی نے ۱۹۳۶ء میں غزل اس رنگ میں ڈوب کر کہی ہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب دنیا دنیا کون کرے

دو صدیوں سے زیادہ کی کشمکش اور جد و جہد کی پُر خطر وادیوں سے گزرنے کے بعد یہی توقع تھی کہ طلوع صبح آزادی کے بعد جور و ظلم نا انصافیوں ظلم و ستم اور جبر و استبداد استحصال کے اندھیرے چھٹ جائیں گے اور اس وسیع و عریض ملک کے باشندے آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے آزادی کی نعمتوں اور برکتوں سے بہرہ ور ہوں گے لیکن وقت کا یہ انقلاب اپنے دامن میں انسان دشمنی، آتش زنی اور عصمت دری کے ایسے بیملانہ طوفان لایا کہ انسانیت چیخ پڑی، دین دھرم کے جذباتی نعروں میں صدیوں پرانی مشترکہ جد و جہد آزادی کی میراث لٹ گئی۔ ہزاروں بے گناہ موت کے اندھیرے میں جا پڑے اور سیکڑوں ہزاروں ہجرت کے صبر آزما اور کٹھن دور سے گزرے۔

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اس لئے بھی زیادہ متعبر ہے کہ اس انقلاب نے انہیں وطن سے بے وطن کیا جس فضا میں زندگی کی اولین سانسیں لی تھیں اس سے انہیں منہ موڑنا پڑا اور یہ سب سیاست کی اس سفاکی کے سبب ہوا جو ملک کی تہذیب، ثقافت اور حسن اخلاق کی دشمن تھی۔

انہیں ترکِ وطن کا احساس اتنا شدید رہا کہ وہ آزاد کے غم کے روپ میں اُن کے وجود میں سما گیا۔

اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر
اپنی نظر کا کیا علاج اپنی نظر کو کیا کروں

ہر پھول کے دامن میں شرارے نظر آئے
ہر شاخ چمن زار میں کانٹے نظر آئے
خوشبو کے عوض موج صبا میں شرر آئے
بکھرے ہوئے انوارِ طلوعِ سحر آئے

[illegible]

ہندو نے لیا وید کی عظمت کا سہارا　　قرآں کے تقدس کو مسلماں نے پکارا
سکھ دھرم سے جو دور کہاں اس کو گوارا　　یوں لے کے زمانے میں مذاہب کا اجارا
فردوس تھا ان سب نے جہنم کو بسایا　　پنجاب میں سامانِ قیامت نظر آیا

برطانوی استبداد کے ملک کی سیاسی تقسیم کی اور اس کے نتائج کس قدر دردناک اور عبرت ناک ظاہر ہوئے اس کا احساس آزاد کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر بکھر گیا ہے۔ ہمیں اس وقت کی بربریت اور ظلم و ستم کے سنگین حالات و واقعات کی دردناک تصویر پیش کرتے ہیں اس تصویر میں انسان کا روپ ہے اور انسانیت کا ماتم ہے۔ اخلاص و محبت شرافت و صداقت کا قتلِ عام ہے۔

نظم پنجاب کے چند بند ایسی ہی سنگین اور دردناک المیہ کی ترجمانی کرتے ہیں ۔

ملک ہوئی تقسیم محبت ہوئی رخصت　　اخلاص گیا مہر و محبت ہوئی رخصت
پنجاب سے ہر سی دل سے صداقت ہوئی رخصت　　پنجاب کی دیرینہ شرافت ہوئی رخصت
قسمت سے جو دن بزمِ الم ناک کے بدلے　　تقسیم کی حد دل پہ کھنچی خاک کے بدلے

بوڑھے تھے کہ بچے تھے نہ تھا ان میں کوئی فرق　　انسانیت اک خون کے سیلاب میں تھی غرق
تھا ایک جہنم کا نمونہ چمن شرق　　یوں برگ و گل و بار پہ تھی شعلہ فشاں برق
چاہوں بھی تو لفظوں میں بیاں کر نہ سکوں میں　　تصویر میں یہ رنگ کبھی بھر نہ سکوں میں

انسان کا دل اور اتنا ستم ایجاد　　انسان ہی مقتول ہوا انسان ہی جلاد
انسان ہی خود صید ہو انسان ہی صیاد　　فریاد ہے فریاد ہے فریاد ہے فریاد
انسان کی یہ وسعتِ دامانِ تمنا　　ملعون ہے ملعون ہے یہ پایانِ تمنا

وطنیت کا تصور بہت گہرا ہوتا ہے۔ ایک ملک، ایک وطن، ایک ریاست جہاں ہم پیدا ہوئے اور مشترکہ تہذیب و تمدن کو ہم نے اپنے سینے سے لگایا جس کی خاک کا ہر ذرہ قابلِ احترام ہے اور آزاد اپنے وطن سے بے وطن ہوئے ہم دور حاضر کو ہم کس طرح تصور میں لائیں اس شکست سیاست نے آزادی کو

وطن سے بے وطن کیا۔ اس سے بڑھ کر درد میں ڈوبی ہوئی ترجمانی کہاں ہو سکے گی۔

بزم ہوئی آنے سے ترے محفل یاراں ۔۔۔ بے بابِ سیاست کی نسیم طرب افشاں
تازیست رہ رکھیں گے ترے یاد یہ احساں ۔۔۔ جن سے تری آمد نے چھڑایا چمنستاں!
دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے ۔۔۔ جانے وہی بلبل جو بچھڑ جاتی ہے چمن سے
جس طرح چلے لعل یمن ملکِ یمن سے ۔۔۔ یا جیسے چلے ذرِ معدن کانِ عدن سے
آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے ۔۔۔ آزاد ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے
جس گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم ۔۔۔ اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

اور یہی احساس آزاد کا تیسرا غم ہے یہ قول انہی کا ہے "۔۔۔۔۔۔ ایک بات اور اور وہ اس غم کے متعلق ہے جسے نہ غم جاناں کہہ سکتے ہیں نہ غم دوراں' یہ ایک تیسرا غم ہے نہ جانے کس کا غم ہے اور کیوں پیدا ہوا' لیکن جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنی سرشت میں پایا اس غم کا مداوا کیا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ غم ایک عجیب قسم کی بے بسی کا خلاق ہے اور اس بے بسی میں ایک ایسی کیفیت پنہاں ہے جس کی بدولت یہ غم مجھے غم جاناں یا غم دوراں سے کم محبوب نہیں ہے"

(ستاروں سے ذروں تک صـ۲۲)

اور یہ احساس غم آزاد کے فکر و شعور میں مختلف خانوں میں منقسم ہوتے ہوئے بھی انسانیت اور صرف انسانیت کا ہی طلب گار اور خواہش مند ہے۔ ایک ایسی آرزو کے روپ میں جو انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے خواہش و حصول کے لئے جذبہ و جد و جہد کی شمعیں روشن کرتا ہے اور آزاد کی نظموں میں یہی جذبہ و جد و جہد ایک روشنی کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ آزاد کا یہ تیسرا غم انہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور جو غم' غم جاناں اور غم دوراں سے کم محبوب نہ ہو اس سے نجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اسی غم نے ان کے فکر و شعور میں حق و صداقت کا نور پھیلایا اور شاعری میں درد تڑپ اور سوز پیدا کیا۔ آزاد کی نظموں میں درد اور تڑپ کی شدت کا اظہار ہم یوں دیکھتے ہیں۔

وہ سے فریب اور ستم دوستم احباب دے مجھے ۔۔۔ کہ ایک اُجڑی ہوئی محفل ہے یاد آتی ہے مجھے

جو سماں عمر رواں کے ساتھ لئے بیت گئی ۔۔۔ وہ اب نہ چشم تصور نہ دلا یاد مجھے
میرے نغمے کا سبب مفہوم بہت ان سے بلند ۔۔۔ اور مشکل ہے کہ آتی نہیں تو سر یاد مجھے

اپنے تیسرے غم کی نشاندہی ان اشعار میں دیکھئے

تو امانت دارِ ماضی ہے مرا ۔۔۔ محرم اسرارِ ماضی ہے مرا

دشتِ غربت میں وطن سے دور ہوں ۔۔۔ پھول ہوں اپنے چمن سے دور ہوں

تو مجھے میری امانت سونپ دے ۔۔۔ پھر مجھے اپنی محبت سونپ دے

لاہور آزاد کے فکر و سخن کا دروازہ ہے۔ اس تاریخی شہر کے گلی کوچوں سے والہانہ محبت کے جذبات چھلکے پڑتے ہیں۔ عقیدت و محبت کا یہ چراغ کس قدر روشن ہے ذیل کے اشعار کہہ اُٹھتے ہیں۔

خطۂ لاہور منزل گاہِ تہذیب وادب ۔۔۔ علم کے انوار سے روشن ہے جس کے روز و شب
جس کو بخشی ہے تمدن کی نرالی زندگی ۔۔۔ جس کے بام و در پہ ہے تہذیب کی تابندگی
جس کا ہر ذرہ مرے جذبات کی تصویر ہے ۔۔۔ جس کے ہر ذرے پہ میرے نام کی تحریر ہے

اور آزاد جب لاہور پہنچ گئے تب دل و نظر کے سامنے محفلِ یاراں کی اَن مٹ یادوں کے نقوش اُبھر گئے وہ پھر کھو سے گئے اور اس تیسرے غم نے صفحۂ قرطاس پر یہ شعر بکھیر دیئے

تری بزم سخن میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں ۔۔۔ چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
تری محفل سے جو ارمان و حسرت لیکے نکلا تھا ۔۔۔ وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لیکے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر اندازِ تو دیکھو ۔۔۔ کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

سوا اس کے اب اے آزاد میرا بس کہاں تک ہے
اندھیری رات میں ذکرِ چراغاں لے کے آیا ہوں

اور آزاد نے بھی اسی سفاک سیاست کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔

ظلمتوں کی ہے کار فرمائی — جلوہ آرا کہیں بھی نور نہیں
چاند تاروں کا ذکر ہی کیا ہے — ایک جگنو کا بھی ظہور نہیں

آزاد ایک حساس شاعر ہیں اُن کے پاس احساس کی دولت فراواں ہے: وہ ایسے اپنے احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ احساس کی پوری پوری نمائندگی کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ زبان و تہذیب اور انسانی زندگی کے مخلصانہ اور دردمندانہ رشتے سیاست سے کبھی کسی دور میں بھی نہیں کٹ سکے ہیں اور اس کا اظہار اس آخری شعر میں یوں کیا ہے۔

پھر بھی مجھ کو گماں یہ ہوتا ہے — تو مری دسترس سے دور نہیں

آزاد کی شاعری میں تلخیٔ حالات اور غم و اندوہ کا بھرپور اظہار ملتا ہے لیکن وہ کسی رومانی شاعر و ادیب کی طرح یاسیت، اداسی اور کرب کے اسیر نہیں ہوتے جو خیالی فردوس میں کھو کر حقیقت سے اپنا واسطہ توڑ لیتے ہیں اور نہ ہی آزاد کا غم فانی کی طرح ان کی زندگی بنتا ہے اور نہ ہی احساسِ غم اُنہیں رونے بسورنے پر مجبور کرتا ہے بلکہ آزاد اپنے دل میں دکھ درد اور رنج و غم کے سیلاب میں زندگی کی صلیب سے گزر گئے اور ایک جیتے انسان کی طرح زندگی کے اُن غم و آلام کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے اور اُن ہی سے حوصلہ اور آہنگ حاصل کرتے ہوئے زندگی کا اُسے بھی ایک رخ سمجھتے ہوئے عملی زندگی کے شب و روز میں ڈھال لیا اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ لمحۂ جدائی نے اُن میں محبت اور انسانیت کے ایک وسیع تر تصور کو جنم دیا اُنہیں دنیا اور اس کے انسانوں سے محبت ہے اس لئے انھوں نے عظمتِ آدم کے گیت گائے ہیں۔

نظم "پیش کش" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں بے دردیوں سے ربط ہے دردوں سے نفرت ہے — وہاں بھولا ہوا، دردِ انساں لے کے آیا ہوں
جہاں گفتار کی جرأت پہ فردِ جرم لگتی ہے — وہاں گلبانگِ شرحِ دردِ پنہاں لے کے آیا ہوں
مرا منہ تک رہی ہیں ظلمتیں اربابِ عالم کی — دہ مرمریں قندیلِ فروزاں لے کے آیا ہوں

اے او ظلمت پرچوں میں سرپھوڑنے والے ادھر آ میں شعاعِ مہرِ تاباں لے کے آیا ہوں
جہاں ظلمت کا مرکز آندھیوں کا آشیانہ ہے وہاں آزادؔ پیغامِ چراغاں لے کے آیا ہوں

انسان اپنے دکھ درد، محرومیوں، ناکامیوں، آرزوؤں اور خواہشوں کو ایک وسیع تر دائرے میں ایک اور بلند تر افق دیکھنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ آزادؔ کی زندگی اور شاعری میں حسن، خلوص، گہرائی اور عالی ظرفی کے واضح نشانات ملتے ہیں۔

نظم کشورِ ہندوستان کے چند بند ملاحظہ کیجئے ؎

اے کشورِ ہندوستاں اے خطۂ جنت نشاں
اے سجدہ گاہِ قدسیاں
اے منبعِ انوارِ حق !!! اے کعبۂ روحانیاں
اے کشورِ ہندوستاں

صبحِ بنارس کے بیاں شامِ اودھ کی داستاں
اے نور پاروں کے جہاں
دنیا کی تاریکی میں ہے تو روشنی کا کارواں !!
اے منزلِ نورانیاں اونچا ہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

اے خطۂ گنگ و جمن اے عالمِ شعر و سخن
کیا شئے ہے تیرا بانکپن
تو فلسفے کا دین ہے تو شاعری کا ہے وطن
شعر و ادب کے آسماں اونچا ہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

ویدِ مقدس کی زمیں تقدیسِ عالم کی زمیں
روشن دل و تاباں جبیں
بہتے ہوئے ساحل پر تلسی کے نغماتِ حسیں

تقدیس کے اے راز داں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں
صابر یہیں عنبر چکاں کاکیؒ یہیں گوہر فشاں
جن سے زمیں ہے آسماں
گورِ نظام الدینؒ کے ہیں ذرّے حریفِ کہکشاں
روحانیت کے راز داں اونچا رہے تیرا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں

آزاد نے اپنی شاعری کے اس واضح وصف کو نظموں میں اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے علیحدہ نظر آتا ہے اور نہ شاعر کی انفرادیت اس کا نرم شیریں لہجہ ان سے جدا ہوتا ہے اس کے رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے ان کے خیالات و احساسات میں ان سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کے دل روشن ہیں کیونکہ ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں اور سیاسی حالات و واقعات کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔ ایک شاعر ان حالات و واقعات سے متاثر ضرور ہوتا ہے مگر اس کا فن سرحدوں کی تقسیم سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کا فن ہمہ گیر اور آفاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی شاعری بھی ان ہی اوصاف کی حامل ہے۔

اقبال ایوارڈ

اقبال اکادمی حیدرآباد نے اپنا سالانہ اقبال ایوارڈ اس سال پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ جس کی ابتدا ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی پہلے سال پروفیسر غلام دستگیر رشید کو اور دوسرے سال ڈاکٹر عالم خوندمیری کو (پس از مرگ) دیا گیا تھا

غلام رسول نازکی
سری نگر

ستاروں سے ذرّوں تک

نام بڑا دل فریب ہے اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ کتاب کو اسم بامسمّیٰ ثابت کرے۔ "ستاروں سے ذرّوں تک" کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ ستاروں سے ذروں تک جاتے جاتے جو چیز بھی سامنے آتی ہے وہ شاعر کی نظر سے اوجھل نہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ کیونکہ اس کی تیز بین نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یا اس نام کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے شاعر اس وقت تک ستاروں کی کہانیاں بہت کہہ گئے ہیں اور اب ستاروں کی اس خیالی دنیا سے ذروں کی اس حقیقی دنیا میں آجائیں جسے آج تک شاعروں نے اپنی توجہ کا مرکز بنانے کے شایاں نہ سمجھا۔ کتاب کی فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے نام کی یہ دوسری توجیہہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ ان ذروں میں جگن ناتھ آزاد کو سمندِ فکر پر ایڑ لگانے کے مختلف موقعے ملتے ہیں اور وہ ان ذروں میں اپنی قوم اور اپنے سماج کی صحیح تصویر تلاش کرتا ہے وہ اپنے پڑھنے والے کو سب سے پہلے تذبذب کی دنیا سے اقبال کے دو شعر سنا کر نکالتا ہے۔

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ظاہر ہے کہ جگن ناتھ آزاد ستاروں سے ذروں تک سفر کرتے وقت اس

خیال کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ ایک ایسا قطرہ ہے جس سے دلِ دریا متلاطم ہو جاتا ہے۔ وہ بادِ سحر کا ایسا جھونکا نہیں جو چمن کو افسردہ کرے۔ وہ اپنی نوا سے حریمِ ذات میں بھی شور ڈالنا چاہتا ہے اور بتکدۂ صفات سے بھی غلغلہ ہائے الاماں بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ میرا مسوِ خصوصیتِ سخن کے عنوان سے رہے سہے شکوک و شبہات دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دوست مجھ پر تنقید کرتے ہیں انہیں شکایت ہے کہ۔

میرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ ابر کے کیف سے مہتاب کے نظاروں سے

آزاد کو اس کا اعتراف ہے اور وہ کہتا ہے۔

یہ بجا ہے کہ مرے فکرِ سخن کی زد میں اب نہ رنگینیٔ مغرب ہے نہ ہے بادِ شمال

کیونکہ۔

ظلمتیں نور سے جب دست و گریباں ہو جائیں پھر کہاں حسن و تجلی کی لطافت کا سوال

آزاد اپنے نکتہ چین کو تسلی بخش جواب دینے کے لئے اپنے ماحول کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں رنگینیٔ مغرب اور بادِ شمال کا ذکر کیسے کروں جب مجھے ہر چار طرف سے بے اطمینانی کا ایک کریہہ منظر نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اور کاش تو بھی اسے دیکھ سکے کہ آدم آدم کا شکار بنا ہے۔ ہر وہ شخص نفرت کا پجاری ہے جس کی زبان پر اخلاص کے دعوے ہیں۔ ہر وہ انسان شیطان کا حواری ہے جو دنیا والوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ یزداں کا پرستار ہے۔ ایک طرف سے آدمی لعل و زر میں تلتا ہے اور دوسری طرف سے ہزاروں مائیں اور لاکھوں بچے جسم اور جان کا واسطہ قائم رکھنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب صورت ایسی ہو تو شاعر نغمۂ شادمانی گا نہیں سکتا۔ مگر وہ پھر کیا کرے گا؟ کیا وہ روئے گا کیا وہ مایوس ہو کر ماتم کرے گا نہیں وہ روتا نہیں، ماتم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ میرا فکر ایک عالمِ نو کی تعمیر میں مصروف ہے۔

میں کہ فنکار ہوں تسلیم بھی ہے کام مرا مجھ کو اس بات کے اظہار سے کچھ عار نہیں

اُسے چرخ پر ایک تجلی نظر آتی ہے جس کی ضیا زمین پر چاروں طرف پھیلتی جاتی ہے۔ اس تجلی سے نور کے چشمے پھوٹے پڑتے ہیں۔ وہ قیدِ حدود و قصور سے آزاد ہے اس نے اذان و ناقوس کی آواز سُنی بھی نہیں۔ یہ نور ایک ابدی نور ہے جس میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اس نور کی کرنوں سے ایک جہانِ نو کی تعمیر ہو گی۔ یہ جہانِ نو نویدِ مسرت بن کر دہر کو پیرہنِ انصاف پہنائے گا۔ ہر طرف خوش بختی و فارغ البالی کا دور دورہ ہو گا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اسی دور کا منّاد ہوں۔ اسی دور کا مبلغ ہوں۔ جب وہ دور آئے گا تو پھر مجھ سے اس شعر کی تمنا کر جہاں میرا فکر کہیں کہکشاں سے اُلجھے گا اور کبھی تاروں سے اور کبھی اس کی رفتار اتنی تیز ہو گی کہ وہ سرحدِ افلاک سے بھی گزر جائے گا۔

کہکشاں سے کبھی اُلجھے گا کبھی تاروں سے ـــــ کبھی افلاک کی سرحد سے گزر جائے گا
یہ کرے گا کبھی میخوار گھٹاؤں کا طواف ـــ کبھی بدمست بہاروں میں سکوں پائے گا
کبھی مہتاب جمالوں میں ملے گا تجھ کو ـــ اور کبھی زہرہ جبینوں میں نظر آئے گا

پھر گلہ تجھ کو نہ ہو گا کہ مرا فکرِ جمیل ـــ بھاگ نکلا ہے تخیل کے سمن زاروں سے
میں نے ڈھونڈی ہے زمانے کے اندھیروں میں پناہ ـــ دور گردوں کے دمکتے ہوئے سیاروں سے
میرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ ـــ ابر کے کیف سے مہتاب کے نظاروں سے

نظم بہت طویل ہے اور اندازِ بیان اتنا دلچسپ کہ ایک بار شروع کیجئے تو ختم ہونے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹے گی۔ ساری کتاب میں یہی تصور غالب ہے۔ کتاب میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزلوں میں بھی اسی درد کی شدت کا احساس نمایاں ہے ذیل میں لکھی گئی ایک دلچسپ غزل ملاحظہ فرمائیے۔ آزاد کہتا ہے۔

ہمت نہ ہارو ہمت نہ ہارو ـــ میرے چمن کی زخمی بہارو
طوفاں کی موجیں للکارتی ہیں ـــ قائم رہو گے کب تک کنارو
ذروں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں ـــ اے چاند تارو! اے چاند تارو
کچھ تنگ سے ہو گئے میرے وطن میں ـــ بے کیف رنگو! خونی نظارو

اے آنے والے اردو کے تاباں | میرے قلم پہ سجدے گزارو
بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل | آزاد اٹھو ان کو سنوارو

معلوم ہوتا ہے کہ مجروح ماحول اور زخمی سماج کو دیکھ دیکھ کر شاعر کے ذہن پر متضاد کیفیتیں وارد ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے چمن کی زخمی پہلوؤں کو دلاسا دیتا ہے کہ وہ ہمت نہ ہاریں۔ جہاں وہ پُرامید ہے کہ کنارے زیادہ دیر تک للکارتی موجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جہاں اُسے نظر آتا ہے کہ ذروں کے تیور اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ چاند تارے یہ سرگوشی کرتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے۔

آزاد مغربی پاکستان سے ہجرت کر کے دلی آیا ہے وہ لاہور میں پیدا ہوا۔ وہیں تعلیم پائی اور اُس نے وہیں کی ادبی محفلوں میں اپنے ذوقِ ادب کو پروان چڑھایا۔ تقسیم ملک نے آزاد کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کیا اس کے کلام سے ہر جگہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُسے اپنے وطن کی یاد بُری طرح ستا رہی ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے بعد وہ غالباً ایک بار طیارے میں لاہور گیا۔ اس سفر کے تاثرات اس نے سیرِ پاکستان کے عنوان سے چند رُباعیوں میں ظاہر کئے ہیں۔ طیارے سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

گردوں پہ ہوئے مدو کو تُلنے والے | بچھڑی ہوئی دنیا سے ملانے والے
اللہ تجھے اور بلند اقبال کرے | اے مجھ کو وطن میں لے جانے والے

جب وہ اپنے وطن پہنچا تو اس کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے۔

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا | مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن انجمن میں اعلان کرو | شیدائے چمن چمن میں واپس آیا

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے احباب نے آزاد کو سر آنکھوں پر بٹھایا جب وہ واپس آیا تو اس قسم کے تاثرات لے کر آیا۔

گزرے ہوئے دن یاد دلانے والو | ہشیار کو دیوانہ بنانے والو
آزاد کو گفتگو کا یارا ہی نہیں | آزاد کو آنکھوں پہ بٹھانے والو
مانا کہ تمہیں عہد سے آزاد کیا | تسلیم کہ ناشاد کو دل شاد کیا

آزادؔ کو رکھا نہ کہیں کا تم نے　　یوں لطف و کرم سے اُسے برباد کیا

آزادؔ ان ادیبوں میں سے ہیں جو اُردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کی ملی جلی تہذیب کی یادگار سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ دشمنی کرنے والوں کو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے دشمن قرار دیتے ہیں۔ دو ایک رُباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سرشارؔ کا حسنِ داستاں ہے اُردو　　محرومؔ و فراقؔ کا بیاں ہے اُردو
اُردو کو ملیچھ کیوں سمجھتے ہو تم　　چکبستؔ و سرورؔ کی زباں ہے اُردو

اے اہلِ وطن یہ داستاں اپنی ہے　　اپنی ہے یہ رودادِ فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو اے دیوانو　　غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

اردو ہے فقط زبانِ کہسار نہیں　　اِک موجِ شمیم ہے یہ تلوار نہیں
مشکل نہیں اردو کا مٹانا لیکن　　کیا اپنے تمدن سے تمہیں پیار نہیں

ریڈیو کشمیر سری نگر

اپریل ۱۹۵۱ء

نقوش۔ لاہور

برادرم!

یہ خط دیکھتے ہی تلوک چند صاحب محرومؔ اور اپنی چھ چھ غزلیں (اپنے اپنے کلام سے) انتخاب کرکے روانہ فرمادیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام خود کروں گا لیکن کام اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب پیچھے ہٹنے کی بھی سکت نہیں۔ خط ملا ہوگا جس میں میں نے عرض کیا تھا۔ شرح جاوید نامہ ابتک نہیں چھپی۔ جوشؔ صاحب کی تصویر تمہیں ملی۔

محمد طفیل

۷ / اپریل ۱۹۵۴ء

رام پرکاش راہی

جگن ناتھ آزاد غزل کے آئینے میں

جگن ناتھ آزاد کے ادبی قد و قامت کو کچھ ایسے زاویوں سے دیکھا گیا ہے جو اُن کی زندگی نے کسی نہ کسی گوشے پر مرکوز رہے ہیں اور انہیں زاویوں کی گرد مدھم روشنی میں اُن کے شعری کردار پر نقد و نظر کے آڑے ترچھے تانے بانے استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اقبال آغاز سے ہی اُن کے شعری وجدان کا سرچشمہ تھے۔ اقبال پر اُن کا مطالعہ وسیع اور عمیق رہا۔ اپنی تحقیقی کاوشوں سے اُنہوں نے اقبال پر متعدد تصنیفات تحریر کیں اور ماہرِ اقبال ہو کر بین الاقوامی شہرت کے مستحق ہوئے۔ آزاد کی زندگی کے ان گوشوں پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے اربابِ نقد و نظر نے ان آئینوں میں اُن کی اپنی ادبی ماہیت کا عکس تلاش کرنے کی کم کوشش کی ہے۔ انھوں نے موصوف کے شعری کردار، خاص کر غزل کے میدان میں اُن کے کسبِ فن اور تحقیقی معیار کو اگر بالکل نظر انداز نہیں کیا تو کم از کم اُس سے بے توجہی ضرور ہوئی ہے۔

وہ ایک ایسے دور کی پیداوار ہیں جس میں بیشتر اچھے شعراء کو نظم سے زیادہ وابستگی رہی لیکن غزل سے لگاؤ برابر رہا۔ یہ ایک ایسا دور تھا اور اب بھی قریباً وہی دور چل رہا ہے جس میں شعراء کی شعری شخصیت نظم اور غزل دونوں کے امتزاج کی بدولت ہی مکمل تصور کی جاتی ہے گویا نظم میں فنی اجتہاد اور فکری گہرائی کے ساتھ غزل سے فطری وابستگی اور پنجاب کی رومانی فضا میں آنکھ کھولنے والا شاعر آزاد بھلا غزل سے اپنا دامن کیسے بچا سکتا تھا۔ ۱۹۴۹ء سے لیکر آج تک مشاعرہ

پڑھنے والے ان کے شعری مجموعے یعنی "بیکراں" "ستاروں سے ذروں تک"، "وطن میں اجنبی" اور "نوائے پریشاں" کے اوراق میں منظومات کے ساتھ ساتھ غزل کے فن پارے بھی بدستور ملتے ہیں۔ مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نظموں کے انبوہ میں کاہے گاہے غزلوں کا وجود بھی ایک دم دار ستارے کی طرح لپک سا جاتا ہے جس کی دور تک جاتی ہوئی روشنی اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے باقاعدہ غزل کہی ہے اور اس میدان میں بھی ان کی تخلیقی جولانیاں خوب سے خوب تر کی طرف مائل پرواز رہی ہیں۔ ذیل کے چند اشعار سے ان کے اس رویے کا صاف صاف انکشاف ہوتا ہے۔

یہ گلشن نوائے گلشن نوائے فکر کہن کے دیکھنو ۔۔۔ بیمار نظر آخر اس گلشن میں غزل خواں کیا ہوگا

آزاد چلیں کوئی نئی دنیا تلاش کر ۔۔۔ جلوے یہاں بقدر مذاق نظر کہاں!

گم ہو چکی ہے کاہکشاں گرد راہ میں ۔۔۔ اب دیکھئے ہو ختم ہمارا سفر کہاں؟

اور اسی کیفیت میں ایک سچے فنکار کی طرح ان کا انکسار اور تخلیقی کسر نفسی بھی اس شعر میں قابل ملاحظہ ہے۔

ہمارا ارتقاء آزاد فن شعر میں یہ ہے
بہت آساں سمجھتے تھے بہت مشکل سمجھتے ہیں

آزاد صاحب اپنی اوائل کی غزلوں یعنی بے کراں، وطن میں اجنبی اور ستاروں سے ذروں تک" کی غزلوں میں ایک طرح کی فکری بوقلمونی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں رومانی سپردگی کہیں عجز شوق کی نیازمندی کہیں تمکین انا اور کہیں عشق کی خود اعتمادی اُن کے اشعار میں بڑے طمطراق کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے اور وہ اس دور کی معنوی تہہ داری اور مقبولیت کے جوہر اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں جس دور کی سربراہی [illegible] غالب اور اقبال کے سر جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار اس صورت حال کے نمائندہ شعر ہیں

جن میں احساس کا بنیادی خمیر جذبے کے آہنگ کے ساتھ فکریات سے بھی انصاف کرتا ہوا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

گلشن بھی ترے اور بہاریں بھی تری ہیں — آزاد کا حصہ ہے فقط زخمِ نظارہ

زبانوں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے — جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

سانسوں کے ساتھ ساتھ اُڑا جا رہا ہوں میں — لحظہ بہ لحظہ تیرے قریب آ رہا ہوں میں

کچھ جیت کا احساس ہے کچھ ہار کا احساس — معلوم نہیں اصل میں ہارا ہوں کہ جیتا

کوئی احساس کو آواز تو دیتا ہے مگر — کون ہے اور کہاں ہے مجھے معلوم نہیں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ میں — نزدیک آ سکوں نہ کہیں دور جا سکوں

کیا جانئے آزاد مرا عشق جنوں خیز — جینے کا سہارا ہے کہ مرنے کا بہانہ

وحشت میں آ کے اب یہ عالم ہے — اپنا گھر ہے مقامِ دور دراز

تری جستجو میں مری آرزو نے — بہت رنگ بدلے بہت روپ دھارے

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر — دھوکہ دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

ہیں زلفِ محبت قدر پہچانی ہے کچھ تیری — تجھے طوفاں، تجھے کشتی، تجھے ساحل سمجھتے ہیں

عشق کی رزم گاہ میں کتنا سرور و کیف ہے　　　عقل کی بزم گاہ سے دامنِ دل بچا کے دیکھ

علم ہے کیفِ بے ثبات عشق ہے گرمئ حیات　　　زیست کی یہ حقیقتیں دل کے قریب آ کے دیکھ

آزاد صاحب کا تخلیقی ارتقاء اُن کے ذہنی فروغ کا ہمرکاب رہا ہے۔ لہذا اُن کا شاعرانہ تشخص جہاں نظم سے بالیدگی پذیر رہا ہے وہاں اس صورت حال میں اُن کی غزل کا رنگ بھی نکھرتا گیا ہے۔ نوائے پریشاں کی غزلیات اور بعد کی بہت سی غیر مطبوعہ غزلیات میں جن خوبیوں کا منظرنامہ بتدریج کھلتا، سنورتا اور نکھرتا گیا ہے اُن کا تذکرہ اتی نکھار بھی یہاں دوراز کار نہیں ہوگا۔ بنیادی طور پر آزاد غزل میں روایت کے پرستار ہیں لیکن اس رویے کو اُنہوں نے اپنی پختہ کاری کا پیمانہ اور تحرک تصور کر کے ہی آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے ان کے اس رویے کا بالواسطہ اعتراف ان اشعار میں ملاحظہ ہو۔

شعر کا انداز اے آزاد اپنا ہے مرا　　　ہوں میں عاشق لہجہ غالب کا طرز میر کا

پرانے دور کا دامن نہ ہاتھ سے نکلے　　　نقوش ابھی نہیں واضح نئے زمانے کے

رومی و اقبال خود ہوتے ہیں مجھ سے ہم کلام　　　کیوں نہ ہو محبوب مجھ کو میری تنہائی بہت

چنانچہ روایت کی پختہ بنیادوں پر اُن کے تخلیقی وجدان کے تانے بانے کئی صورتوں میں عیاں ہوئے ہیں۔ ہر اچھے شاعر کی طرح اُنہوں نے اپنے شعری اظہار میں طنز و تعریض یا مزاح سے بھی کام لیا ہے کیونکہ شاعری اگر زندگی کی تنقید ہے تو معاشرے کے کم و کاشت، ظاہرداری، ذہنی تحفظات نیز تعصبات پر ناقدانہ نظر کا فریضہ شاعر پر خود بخود عاید ہو جاتا ہے جسے ادا کرنے میں آزاد صاحب کی تخلیقی اور فنی روش انفرادی طور پر بروئے کار آئی ہے۔ یہ اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

آغازِ بہاراں دیکھ لیا، انجامِ بہاراں روشن ہے
تدبیرِ گلستاں کے صدقے تقدیرِ گلستاں روشن ہے

خدا جانے گریں گی کب من و تو کی یہ دیواریں
یہ اِس کا جام ہے ساقی، یہ اُس کا جام ہے ساقی

داخل ہوئی ہے ایک نئے دور میں حیات
اب ہم ہیں اور خوابِ پریشاں نئے نئے

نظر اُن کی، زباں اُن کی، میں کس کو معتبر سمجھوں
نظر کچھ اور کہتی ہے زباں کچھ اور کہتی ہے

اُس دور میں حیات بسر کر رہا ہوں میں
آزاد جس کو آنکھ ملی ہے نظر نہیں

زندگی بھر ہم فریبِ دوستی کھاتے رہے
زندگی بھر ہم وفاؤں کا صلہ پاتے رہے

فنونِ علم کا گرداب وہ گرداب ہے جس میں
کبھی کشتی نہیں ملتی کبھی ساحل نہیں ملتا

بٹھایا ہے امارت نے اُنہیں مسند پہ آج
صدر صاحب سٹیج میں آ ہیں بیک فرمائیں تو کیا

شعر میں نعرے لگا کر تو نے بازی جیت لی
اور میں لہجے کی نرمی آزماتا رہ گیا

بجا کہ شعر ترا تجربے پہ مبنی ہے
مگر یہ تجربہ تیرا ہے یا کتاب کا ہے

شاعر ترے کلام میں فن بھی ہے فکر بھی
لیکن فاصلہ جو ہے فکر اور فن کے بیچ

تمہارے شہر کا اب کے سفر عجیب لگا
جو گھر کو لوٹ کے آئے تو گھر عجیب لگا

جو سنگ باریِ احباب ہو، قبول کرو — زباں درازیِ یاراں سے دل لگائے ہوئے

غزل کا شاعر اپنے خمیر سے ہی حسن و عشق کا شاعر ہوتا ہے اور حسن و عشق کا معاملہ لازمی طور پر شاعر کے جمالیاتی شعور سے وابستہ رہتا ہے۔ آزاد صاحب جنھیں مشاہدات کی ایک وسیع دنیا سے واسطہ رہا ہے اپنے جمالیاتی شعور کو بڑی اچھوتی مرصع کاری سے راہ دیتے ہیں کہ کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایئے۔

غنچہ غنچہ وہ نہیں رہتا ہے گل بننے کے بعد — لعل ہیں مانا لب، ہیں تبسم میں گل بن جائے ہے

ٹھہر گئی ہے جہاں بس وہاں ٹھہر ہی گئی — نگاہ کر ہی نہ پائی ترے بدن کا طواف

جس کی طرف آنکھ اٹھانا بھی ہے آزاد محال — بات کیا ہے کہ اسی سمت برابر دیکھوں

تجھ کو میں ایک زمانے سے چھپ کر دیکھوں — یوں ترے حسنِ دل آویز کا منظر دیکھوں

اہلِ کشتیِ طلب و نظر خدا جانے — یہ موجِ نکہتِ گل ہے خرامِ رنگِ چمن

منزل کی راہ میں یہ ہجوم نشاط و کیف — ڈرتا ہوں روک لے نہ کوئی مرحلہ مجھے

رومی، اقبال اور فارسی کے متعدد شعرا کی دولتِ سخن سے متاثر ہونے والے آزاد نے جہاں ان حضرات کی فکریاتی صلاحیت کو اپنے لئے مشعلِ راہ تسلیم کیا ہے وہاں اپنے منفرد لہجے اور برجستہ اسلوب نیز قادر الکلامی سے انھوں نے فکریات کے اچھے خاصے تیور اجاگر کئے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں معنویت کی تہہ داری، ذات و صفات کے گلشنِ رنگ و رموز کی خوشہ چینی، عقل و عشق کی آویزش، دل و دماغ کی سپردگی نیز تصوف کی دور اندیشیاں غور سے دیکھنے کا تقاضا کرتی ہیں۔

کل ہر اک پردے پہ جلوے کا گماں تھا آزاد — آج آزاد ہر اک جلوہ ہے پردے کا گماں

خزانہ مسرت کا دل میں ہے پنہاں، یہ دولت نہ ڈھونڈے مسرت کے جویا
کہستاں کہستاں، بیاباں بیاباں، گلستاں گلستاں، سمندر سمندر

مرے جذبِ دل بس یہاں تک نہ پائے — زمیں کے نوادر ہاتھوں سے چھوٹیں

میں نے پوچھا کہ زندگی کیا ہے — ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

دی اجازت جو کسی کو یہ مکتب نے — جو پہاڑوں سے چشموں تک پہنچے
عقل نے عشق کو یہ کہہ کے اجازت دے دی — اب ترا ذوقِ تگ و تاز جہاں تک پہنچے

حیات بس اک لمحہ نگاہوں پہ محیط — نہ ابد ہے نہ ازل ہے یارو

ہو سکے تو جائزہ اک بار لے ضمیر کا — رونے والے اس طرح ماتم نہ کر تقدیر کا

کس لئے حیران ہے اے دل دیکھ کر پیکر کا بت — یہ نہیں بت کی یہ دستِ باہنر کی بات ہے

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعوے علم کا — انتہا یہ ہے کہ اس دعوے پہ شرمایا بہت

سرکتے لمحوں کی شمشیرِ بے نیام کو دیکھ — ملی ہے آنکھ تو یلغارِ صبح و شام کو دیکھ

نگاہ ایک نئی شے ہے چمن کا اپنا منظر ہے رنگ — فقط منظر کو دیکھو آزاد اپنا منظر نہ دیکھ

دارِ فنا میں کس کو حیاتِ ابد ملی   آزاد انہیں فقط جنھیں مرنے کا شوق تھا

آزاد اپنی آفاقی رشتے کے تحت زندگی کی نفسیاتی حقیقتوں کے شاعر ہیں۔ اور ان حقیقتوں کی ترجمانی انھوں نے بڑے ہی برجستہ شعری منطق کے ساتھ کی ہے جس میں شعریت اور تغزل کا جادو گویا اُن کے فن پاروں کے سر چڑھ کے بولتا ہے اس نوعیت کے چند مرغوب و مانوس اشعار ذیل میں درج ہیں۔

کیا کہوں چاندنی راتوں کی خموشی کا فسوں   لمحے لمحے میں اک آوازِ نہاں ہوتی ہے

جانے کیا شے ہے کہ بنتی ہے کبھی دل میں لہو   بن کے پانی کبھی آنکھوں سے رواں ہوتی ہے

کام ہے نالہ و فریاد ہوس کاروں کا   عشق والوں کی فغاں ضبطِ فغاں ہوتی ہے

ذرا میری پریشانی کا تو مجھ سے بیاں سن لے   پھر اس کے بعد کوئی بھی پریشانی نہیں ہوگی

وہ اک تڑپ کہ جس سے عبارت ہے زندگی   کچھ سنگِ در میں کچھ مرے سودائے سر میں ہے

کبھی نغمہ، کبھی نالہ، کبھی خاموشیٔ پیہم   تری یادوں کے صدقے دل کا اک عالم نہیں ہوتا

آج خوشبوئے گلستاں جو گلستاں سے چلی   وہ جو تھا اک دلِ برباد بہت یاد آیا

میں گرمِ سفر تھا مجھے کچھ بھی نہ رہا یاد   نقشِ کفِ پا یاد نہ منزل کا پتا یاد
اللہ رے بے خودیٔ شوق کا عالم   کوچے میں ترے آکے ترا گھر نہ رہا یاد

بیکراں رات کے سناٹے میں   تو مجھے یاد بہت یاد آیا

میں عمر بھر غمِ دوراں سے ایک بار ملا　　پھر اس کے بعد کبھی تجھ کو منہ دکھا نہ سکا

ساقیٔ میخانہ تجھ سے تشنگی کی کیا کہوں　　زندگی صحرا رفیق و شوقِ دریا آشنا

اپنی آنکھوں میں عجب اک گھر لئے پھرتا ہوں میں　　ہاتھ میں بنیاد کا پتھر لئے پھرتا ہوں میں
تبصرہ کیا پوچھتے ہو آج کے حالات پر　　آج سر اپنا ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہوں میں
جس طرح ایک اعترافِ جرم کی تصویر ہو　　اس طرح خاموش تیرے روبرو بیٹھا ہوں میں

آوارہ نہ پھرا سے دل صحرا و بیاباں میں　　آباد ہے اِک دنیا دامن سے گریباں تک

آزاد نے اپنی زندگی حتی الوسع کامیابی کے ساتھ گزاری ہے اور یہ صورتِ حال خدا کے فضل سے ابھی تک برقرار ہے۔ ہر کامیاب زندگی کی تہہ میں جہاں شخصی کردار کی خوبیاں، خداداد صلاحیتیں، محنت و مشقت کے وسیلے اور خود زندگی کے تئیں نظریاتی رویے کام کرتے ہیں وہ زندگی کی مجموعی تصویر کی تکمیل کے لئے طرح طرح کی کمزوریاں تجرباتی ردِعمل ناسٹلجیا ذہنی تعصبات و تحفظات بھی در آتے ہیں اور شاعر چونکہ غیر معمولی احساس اور جذبات کا مجسمہ ہوتا ہے اپنی آزاد خیالی کو کشادہ روی سے نہیں روک سکتا اور صنفِ غزل جس کی نیم وحشی نوعیت ہر شعر میں الگ الگ موضوع و مرض کو مکمل طور پر نظم کر دینے کی اجازت دیتی ہے۔ آزاد صاحب کے لئے بھی حسبِ منشا معرضِ اظہار رہی ہے۔ لہٰذا جب وہ زندگی کے تئیں اپنے رجائی رویے کو راہ دیتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

اے مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنے والے　　دن تو کیا ہجر میں راتیں بھی مری بیت گئیں

مری تقدیر گلشن چن رہی ہے　　بہارِ بوستاں ہے اور میں ہوں

میری منزل ہے جادۂ منزل — میری منزل مری حیات نہ پوچھ

قید کسی پھول میں رہے پھول کی خوشبو — کانٹوں میں رہے ہم اور پریشاں نہ رہے ہم

جسم بھی تھک چکا، روح بھی تھک چکی، راستہ کی خبر کتنا تاریک ہو
اپنی یادوں کے بجھتے دیوں سے کبھو ٹمٹماتے رہیں جھلملاتے رہیں
کیا خبر کیا حقیقت ہے کیا خواب ہے میں تو یہ راز سمجھا ہوں بس اس قدر
خواب کی طرح سے آپ آتے رہے خواب کی طرح سے آپ آتے رہے

جگن ناتھ آزاد سماجی تعلقات، مراسم و روابط کا ذکر کرتے ہیں تو بڑے پُراسرار انداز میں بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں ـــــ تجربات و مشاہدات کی فراوانی ان اشعار کی تہہ میں کار فرما ہے۔

شوق بے باک زمانے میں بڑی شے ہے مگر — وقت کچھ اور ہی بے باک ہے خاموش رہو

سکونِ دل جہانِ بیش و کم میں ڈھونڈنے والے — یہاں ہر چیز ملتی ہے سکونِ دل نہیں ملتا
نگاہوں سے نگاہیں بارہا آزاد ملتی ہیں — مگر یہ دل ہے ایسا کہ دل سے دل نہیں ملتا

خبر کیا کہ وہ بات پہنچے کہاں تک — جو دل سے چلے اور آئے زباں تک

[illegible] بتکدہ — شمعِ حرم کا نور بھی میری نظر میں ہے

بس اتنی یاد ہی سیرِ دو عالم کی باقی ہے — جنوں مہمان تھا، ہر بخشِ خرد کی میزبانی تھی

اپنے آبائی وطن پاکستان کا جب انہیں خیال آتا ہے اور جب وہ اس وطن میں اجنبی کی طرح تشریف لے جاتے ہیں تو سیاست کی تنگ دامانیوں سے ماورا محبت کی فضاے بے لوث ان کا خیر مقدم کرتی ہے چنانچہ گھر آتے ہی ناسٹلجیا کا ایک احساس ناگزیر ان کے دل کے سوتوں سے گویا پھوٹ پڑتا ہے۔

وطن نے تجھ کو بھلایا تو کیا ہوا آزاد　　دیارِ غیر میں تو اپنے احترام کو دیکھ

کیا خبر کیا بات اس کے کفر میں پوشیدہ تھی　　ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

اپنی خاطر خواہ زندگی اور اپنی ہر کامیابی کی تہہ میں صلاحیتوں کی کارفرمائی نیز اپنی عمر کی جد و جہد کے برگ ثمر پر جب ان کی نظر پڑتی ہے تو اپنی انا، احساسِ خودداری، نرگسیت کے اظہار سے بھی نہیں رکتے کیوں نہ ہو یہ اُن کی متاعِ استحقاق ہے جو اجتہاد کی کوکھ سے براہِ راست ودیعت ہے۔

ہونٹ تر کرنے میں اپنی آبرو کا تھا خیال　　یوں تو آنے کو مرے رستے میں دریا آ گیا

غزل سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے　　فقط رنگینیِ حسنِ بیاں سے کچھ نہیں ہوتا
سخن کے باغ کی تو خونِ دل سے آبیاری کر　　جو یہ کرے تو پھر یادِ خزاں سے کچھ نہیں ہوتا

ہمیں پر ختم ہے شعر و داں تیری غزل خوانی　　یہاں جب ہم نہیں ہوں گے غزل خوانی نہیں ہوگی

دنیا ترے تغزل اس پہ کیا چھوڑ کے گئے ہم　　اک حسنِ بیاں حسنِ ادا چھوڑ کے گئے ہم
احول کی ظلمات میں جس راہ سے گزرے　　قندیلِ محبت کی ضیا چھوڑ کے گئے ہم

چلتی ہوا سب کو لگتی ہے۔ ادب کی فضاؤں میں بھی نئے رجحانات تحریکوں اور تغیر کی ہوائیں چلیں، جیسے روایت پسندی اور میانی وضع قطع کے ادیبوں کو چھونے سے باز نہیں آتیں یا یوں کہیے کہ ایک طرح کی صحت مند ابن الوقتی بھی ایک پختہ کار

ادیب کے عصری وقار اور فنی تازگی کی ضامن بن کر اس کے تخلیقی جوہر کے لئے تازیانہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ آزاد کے یہاں بھی اُن کی جواں فکری بدلتے ہوئے میلانات کی ڈور تھام کر عصری حیثیت سے ہمکنار ہوئی رموز و علائم اور ایمائیت کے آلات کا سے جدیدیت کے شعری پیکر اجاگر کرنے کی مرتکب رہی ہے۔ یہ اشعار اس صورت حال کا اشاریہ فراہم کرتے ہیں:

ذکرِ عصرِ جدید سُن مجھ سے — مجھ سے عصرِ کہن کی بات نہ پوچھ

ہر جہت مسائل کے جو کانٹے ہوں تو اُن سے — کس طرح میں دامانِ تغزل کو بچا لوں

خود ہے کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں — کچھ اس طرح وجودِ بشر کا بکھر گیا

ہر قدم پر طے شدہ رستے کو مُڑ مُڑ کر نہ دیکھ — صبحِ فردا کے مسافر میل کا پتھر نہ دیکھ

یہ بات حیرت میں اتنا تپاک کا عالم — کبھی کبھی تو بڑا خوف سا لگے ہے مجھے

کیا گلہ غیروں کا خود ہی سے الجھ کر چلے — پتھروں کے شہر میں ہم آئینہ لے کر چلے

لبِ زمانہ پہ مہرِ سکوت کیا کہنا — مرے تمام سوالوں نے خودکشی کر لی
یہ دیکھ کر کہ نہیں کوئی چاہنے والا — نہ جانے کتنے خیالوں نے خودکشی کر لی

نہ جانے کتنی رسوائی مری بازار میں ہوتی — خدا کا شکر ہے بے چہرگی نے آبرو رکھ لی

زندگی کی چھٹی دہائی کے اواخر میں بھی آزاد صاحب اپنے عملی ادبی

سفر میں رواں دواں ہیں۔ اُن کی متعدد تصنیفات و تالیفات، ملک کے علمی اور ادبی اجتماعوں میں اُن کی شرکت ناگزیر، بین الاقوامی سطح پر ان کی سیر و سیاحت ہر بڑے مشاعرے میں ان کی باوقار شمولیت، ان کے شعری مقام اور شعر و شاعری سے اُن کے پیدائشی رشتے کے آئینہ دار ہیں۔ یہ سلسلہ اُن کے سنِ معمرِ عروج تک آ پہنچا ہے اور بدستور جاری و ساری ہے گویا نگارِ شعر سے اُن کی شبِ وصال ابھی حدودِ سحر سے ماورا ہے۔ فکری تنوع اور عصری رویوں کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں ہے۔ ایسے میں اُن کے رخشِ تخلیق و فن کی جولانیاں کہاں کہاں انہیں لے جائیں گی یہ وقت ہی بتائے گا۔

خوش قسمتی سے ملک کے مشہور اور ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد بھی ۱۱ بجے کے قریب مشاعرے میں تشریف لے آئے۔ آپ کے آنے سے سامعین میں جوش و مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر ایک مرثیہ سُنایا جس کے ہر ہر شعر پر موصوف کو بے پناہ داد ملی۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس جے پور
کی رُوداد

"ہماری زبان" علی گڑھ
کانفرنس نمبر ۸-۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
(گوہاٹی)

جگن ناتھ آزاد ـــــ بچوں کی نظمیں

دلربائیِ اوصاف وصفات کے حامل جگن ناتھ آزاد اچھے شاعر، قابلِ قدر نثرنگار، اچھے نقاد و محقق، مخلص دوست اور بے لوث مددگار وغیرہ سب کچھ ہیں۔ ہند و پاک کے چوٹی کے ادیبوں نے ان کی تصنیفات و ادبی خدمات کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور اتنا لکھا ہے کہ کوئی موضوعِ صرفِ نظر نہیں ہوا ہے مگر ایک حقیقت بایں ہمہ پردۂ اخفا میں رہا ہے۔ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون بعنوان ـــ Jagan Nath Azad's contribution to Iqbalean Studies جو پاکستان اقبال اکادمی کے جریدے Iqbal Review کو دیا گیا ہے اور عنقریب نکلنے والا ہے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ آزاد کو ماہرِ اقبالیات سمجھا جاتا ہے اور درست سمجھا جاتا ہے ان کو "حافظِ اقبال" بھی کہا گیا ہے کیونکہ کلامِ اقبال نے اُن کے حافظے کو لوحِ محفوظ بنا رکھا ہے۔ یہیں ایک بات چھوٹ جاتی ہے حافظ کے معنی حفاظت کرنے والے یا محافظ بھی ہوتے ہیں۔ آزاد نے تقسیمِ وطن سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اقبال پر انگریزی اور ہندی میں بھی لکھنا شروع کیا۔ شاہین بچے تو سرحد پار جا چکے تھے اور ہندوستان کے مسلمان حواس باختہ ہو کر رہ گئے تھے یہ آزاد ہی کا دم خم تھا کہ اُنہیں ناسازگار اور غیر مساعد حالات میں اقبال پر بولنا اور لکھنا شروع کیا لہٰذا آزاد نے ہندوستان میں مطالعۂ

اقبالیات ہی کو بحال نہیں کیا بلکہ اردو زبان و ادب کو جس کو یہاں صرف پاکستانی زبان سمجھا جانے لگا تھا مقام و وقار بخشا اس خدمت کو نہ جانے کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے آزاد حافظ اقبال بھی ہیں اور حافظ اردو بھی۔

آزاد کی ہمہ جہتی صلاحیتوں پر خاصا کچھ لکھا جاچکا ہے مگر اردو تنقید چوں کہ ہنوز کم دائرہ نیز کوتاہ رتبہ ہے بچوں کے ادب سے غفلت برتی گئی ہے بچوں کے لئے کتابیں تو تیار کی گئیں مگر اُن پر نگاہ انتقاد نہیں ڈالی گئی۔ بچوں کے لئے کیا لکھا جائے، وہ کیسی شاعری پسند کرتے ہیں اور کیوں پسند کرتے ہیں نیز اُن کے نفسیاتی تقاضات و التزامات کیا ہوتے ہیں۔ ایسے امور سے ہم اردو والے ہنوز مخاطب نہیں ہوئے ہیں۔ ہندی ادبیات اس نقطۂ نظر سے خاصی منزل طے کرچکا ہے۔

آزاد بچوں سے مخاطب ہوئے ہیں ان کی تصنیفات بچوں کی نظمیں جس کو ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ ۴۴ صفحات پر محیط ہے اور اس میں ۱۷ نظمیں شامل ہیں۔ نظموں کی جانب رجوع کرنے سے پیشتر ان ضروری نکات پر جو بچوں کی نفسیات سے عبارت ہیں اور وہ مختصات جن پر ماہرینِ تعلیم نے روشنی ڈالی ہے توجہ صرف کرنا چاہیئے۔

انگریزی زبان میں تعلیم کو دکان پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس موضوع پر ہر پہلو و زاویے سے بغایت ژرف بینی سے بحث کی گئی ہے۔ موٹے طور پر بچوں سے متعلق ادبی تخلیقات دو طرح کی ہوتی ہیں۔ نوع اول، وہ نظمیں کہانے وغیرہ جو بطور پند و نصیحت سپردِ قلم کئے جاتے ہیں۔ نوع دوم وہ منظومات وغیرہ جن میں بچوں کو اپنے مشاہدات و تجربات ملتے ہیں ان کو اصطلاحاً Shared experience کہا جاتا ہے۔ مزید برآں بچوں کے ادب کو Age Group یعنی عمر کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ۷۔ ۵ سال، ۹۔ ۷ سال، ۱۲۔ ۹ سال اور ۱۴۔ ۱۲ سال کے بچوں پر مشتمل گروپ کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ہر گروپ کے بچوں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی پر ماہرینِ تعلیم نے مشاہدات و تجربات پر مبنی نتائج اخذ کئے ہیں۔ مغربی

ممالک میں Child study Associations یعنی تعلیم کو دوکان کی جاعتیں تشکیل دی گئی ہیں۔ ایشیا کے ممالک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں۔ ژوسٹ فرینک (Joustte Franks) نے درج ذیل نکات پیش کئے ہیں۔

(۱) بچوں کا ادب ہلکی پھلکی زبان میں اُن کے اپنے ذوق و شوق کے مطابق ہونے چاہئیے۔

(۲) Tiresome chore تھکانے والا بے مزہ کام نہ ہو۔

(۳) بچوں کی لڑکھڑاتی کاوشوں (Fumbling efforts) کو سہارا دینے والا ادب ہونا چاہیئے نہ کہ بچوں کی کوششوں کو دھکا دینے والا Pushing efforts

(۴) بچے لڑکیوں کے مذاق اور جستجو کی لو کو تیز کرنے والا ہونا چاہیئے ہیلن پلوٹز (Helen Plotz) نے اپنی تصنیف Children and Poetry میں درج ذیل مقاصد پر روشنی ڈالی ہے

(۱) بچوں کے لئے تخلیق ہوئی شاعری کو ذریعۂ تفریح ہونا چاہیئے۔ اس میں استعجاب کشش ہر روز نئی دنیا کے متعلقات لازمی ہیں

(۲) کھیل کا وقت، سونے کا وقت، بازار کرنے کا وقت، غسل کرنے کا وقت وغیرہ جیسی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۳) ہنسی مذاق کی باتیں، روز مرہ زندگی کے مقتضے بھوت پریت کی کہانیاں، ریل ہوائی جہاز وغیرہ کا ذکر ہونا چاہیئے۔

(۴) لوک کہانیاں، جانوروں اور پرندوں سے متعلق کہانیاں۔

(۵) دیس بدیس کے قصے، دور دراز بحری و بری سفر وغیرہ

(۶) کھیل کود کی باتیں

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ مغربی ممالک میں اسکول کا سب سے اہم اور گھر پر ماں باپ کو بچوں کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیئے جیسے موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں مثلاً

۱) Teeching T. Good Growing with Nursery art

Kindergarten children.

(۲) Dorothy K. Whyte: Teaching your child Right From wing

(۳) H Harry Giles · The integrated class room.

(۴) Gordon W. Allpot: The Nature of Prez.

(۵) E.M. Duvall: Facts of life and Love for Teen-Agers.

اس موضوع پر قریب ۱۵۰ کتابیں میرے زیر مطالعہ آئیں ہندی ادیبوں نے متعدد کتابوں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے اور بچوں کے ادبیات کو شائع کرنے والے ناشروں نے قصے کہانیوں پر مشتمل با تصویر کتابیں بھی شائع کی ہیں اگر تصاویر نہ ہوں تو نظمیں ایسی ہوں جن سے صوری پس منظر بچے کے ذہن میں ابھرے اس کا جی لینے لگے کہ وہ پڑھے یا سنے

آزاد نے اپنی تخلیق بچوں کی نظمیں میں دیباچہ شامل نہیں کیا ہے اگر اُن کی جانب سے بھی "حرفے چند" شامل ہوتا تو بچوں کے لئے کہی جانے والی نظموں کے مختصر مترنمات واشگاف طور پر قارئین کو معلوم ہوجاتے۔ بہرکیف نظموں کے مطالعے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ آزاد صاحب ذہنی و جذباتی طور پر نفسیات کو دکان سے بہ حسن و خوبی واقف ہیں

اُن کی تخلیق کی پہلی سات نظمیں SHARED EXPERIENCE یعنی لیے تجربات و مشاہدات سے بھرپور ہیں۔ بچوں کو یہ نظمیں اپنی ہی تخلیق کردہ معلوم ہوا ہوں گی یہ ایسی نظمیں ہیں جو بچے بہ ذوق و شوق گا نا پسند کریں گے اور جو بغیر طوطارٹ اُن کے ذہن نشین ہوجائیں گی۔ (محوظ رہے میں طوطا کو توتا لکھنا غلط سمجھتا ہوں)

پہلی نظم ہے: "تماشے والا"

آؤ بچو! دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو۔

نظارے دکھلانے والا
جگ کی سیر کرانے والا
ڈبہ اپنے سر پہ اُٹھائے
گلی گلی میں جانے والا
آج تمہارے گھر کے باہر رنگ جمانے آیا
دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا
گاڑی لایا انجن لایا
پیرس لایا لندن لایا
گٹھری اپنے سر پہ اُٹھائے
بارہ من کی دھوبن لایا

اس نظم کو گاتے گنگناتے تصویر سامنے آتی ہے۔ بچوں کی صوتی سطح سے صوری سطح پہ لے جانے والی نظم ہے۔ یہی خوبی "کلکتہ میل"، "گرمیاں آگئیں"، "سن لو ایک کہانی بچو"، "ہم بادل کہلاتے ہیں"، "کسانوں کا گیت"، "جادو والا"، "میں کرن کرن"، "نفس نفس پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مجولہ نظموں کے کچھ حصے پیش ہیں

کلکتے سے میرے بھیا لائے ہیں اِک ریل
....
چھک چھک کرتی بھک بھک کرتی شور مچاتی جائے
جس رستے سے بھی گزرے طوفان اُٹھاتی جائے
....
ننھی سی یہ ریل ہے لیکن ہے کلکتہ میل (کلکتہ میل)

میز بھی گرم ہے کھاٹ بھی گرم ہے
فرش بھی گرم ہے ٹاٹ بھی گرم ہے

گرمیاں آگئیں

گرمیاں آگئیں (گرمیاں آگئیں)

سُن لو ایک کہانی

بچو

سُن لو ایک کہانی

تین برس کی اِک بچی ہے نام ہے جس کا پونم

لیکن سب بچوں نے اس کا نام رکھا ہے رانی

سُن لو ایک کہانی

بچو

سُن لو ایک کہانی (سُن لو ایک کہانی)

ہم بادل کہلاتے ہیں

زوروں کی جب گرمی پڑتی ہے ہم بارش لے آتے ہیں

ہند مہاساگر سے اُٹھ کر بھارت پہ چھا جاتے ہیں

(ہم بادل کہلاتے ہیں)

قدم اپنا آگے بڑھاتے چلیں گے

زمانے کی بگڑی بناتے چلیں گے (کسانوں کا گیت)

میں ہوں جادو والا

بچو

میں ہوں جادو والا

بھوندو میرا نام ہے بچو بھوندو میرا نام

جادو میرا کام ہے بچو جادو میرا کام

(جادو والا)

ہلکی پھلکی بحریں بالخصوص فعلن، کے رکن پر استوار درج ذیل نظموں میں بچوں کا دل موہ لینے والی صفات ملتی ہیں۔ حسن و تکرار، جملہ زیبائی، تمسخر، رعنائی و تنوع ایسی صفات لئے نظم کہنا آسان کام نہیں ہے اور آزاد صاحب بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اسی نوعیت کی اور نظمیں بھی مجموعہ میں شامل ہیں۔ مثلاً

ہر گھر میں عید آئی　　خوشیاں ہزار لائی
....　　عیش و نشاط لائی

یعنی ہر اک بشر نے
دل کی مراد پائی　　(عید)

مفعول فاعلاتن، مفعول فاعلاتن پر استوار ہے اس کی غنایت بچوں کو نغمگی و سرگوشی میں فسرا بور کرتی رہے گی۔

بزم وطن میں آیا دسہرہ
رنگینیاں ساتھ لایا دسہرہ

.....

اک سمت راون چالاک و مکار
اک سمت ہے رام حق کا طرفدار　　(دسہرہ)

بھارت ورش میں چاروں جانب　　چھایا جب اندھیارا
....　　چمکا ایک ستارا
بھارت ورش کے اس تارے کو　　کہتے ہیں سب گاندھی
اس بگڑے سنسار میں لایا　　پریم کی چلتی آندھی

(ایک ستارا)

دیس ہوا آزاد ہمارا دیس ہوا آزاد
دل کا سہارا آنکھ کا تارا دیس ہوا آزاد
سندر سندر پیارا پیارا دیس ہوا آزاد
گونج اٹھا ہر سمت یہ نعرہ دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد ہمارا دیس ہوا آزاد

(دیس ہوا آزاد)

اس نظم کو بچوں کے لئے قومی ترانہ کہا جا سکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اگر ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کو اسی کو گائیں تو ان پر زیادہ اثر مرتب ہو سکتا ہے۔ آسان لفظیات، حسن و تکرار، غنائیت وغیرہ خصوصیات سے لبریز اس نظم کو شامل نصابات ضرور کیا جانا چاہیئے۔

دیوالی (ایک غنائی فیچر) کو اسکولی تقریبات میں سٹیج کیا جا سکتا ہے۔ کورس میں شامل بچوں کے گانے کے ساتھ ساتھ دوسرے بچے بھی گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر غنائیہ میں شامل ہو جائیں گے۔ گرد و پیش کی زندگی، ہندو مسلم تقریبات، غیر مذہبی قصے کہانیاں جیسے معراج النبیؐ، وکرم سال، وشنو اور بالی، کھیل تماشے، آتش بازی وغیرہ پر محیط پس منظر اس غنائیہ کو وہ اخلاقی سطح اور کردار سازی کی منہاج دیتا ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے خاصی اہم خصوصیت ہے۔

ایک نصیحت جو شیخ سعدیؒ کے چند فارسی اشعار کا اردو ترجمے پر محیط نظم ہے واقعاتی نظم ہے جس میں ایک واقعہ کو نظم کر کے خاموشی کی تلقین کی گئی ہے۔ نظم میں صرف ایک لفظ "خردمند" ایسا ہے جس سے بالعموم بچے واقف نہ ہوں گے مگر آزاد نے لفظ ہذا کو اس طرح نظم کیا ہے کہ بچے خود بخود اس کے معنی سمجھ سکتے ہیں۔

اس مجموعہ "بچوں کی نظمیں" میں مشمولہ نظموں کے علاوہ بھی آزاد صاحب نے بچوں کی طرف توجہ فرمائی ہوگی اور نظمیں کہی ہوں گی۔ اگر کہی ہوں تو ان نظموں کو بھی زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جانا چاہئے۔ آزاد بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں

اور اس سے مختص لفظیات سے بھی آشنا ہیں۔ آزاد حافظ اقبال اور حافظ اردو اور بہانت کبھی ہیں۔ زاویہ ہائے فکر و نظر کے حامل نقاد بھی ہیں اور مکمل شاعر بھی ہیں لفظ مکمل پر غور فرمائیے جو آزاد کی دائرہ در دائرہ سطح بہ سطح جہات و اطراف فکر و جذباتی شاعری کا آئینہ دار لفظ ہے۔ آزاد نے بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے

ہزار نکتہ دریں کار و بار دل داریست

آزاد کی دلداری سے مملو شاعری میں ہزار نکات ہیں ؎

ستارۂ ز خورشید و ماہ کامل شد

ڈاکٹر سید عابد حسین۔

جگن ناتھ آزاد دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ نوجوان شعراء میں اُن کی منفرد حیثیت ہے۔ حسنِ زبان اور پختگیٔ فن کے ساتھ اُن کے کلام میں گہرا احساس اور خلوص ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سلیقے سے کہتے ہیں اور بقول فراقؔ اُن معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنھیں واقعی شعر کہنا آتا ہے۔

بیکراں آزاد کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے غزلوں میں تغزل کے ساتھ ہلکی پھلکی غنائیت ہوتی ہے جیسے کوئی مدھم سُروں میں ستار بجا رہا ہے۔ نظموں میں انھوں نے زندگی کے اہم مسائل جن میں درماں بھی شامل ہے۔ شاعری کے خوبصورت سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ آزاد کی نظر گہری مطالعہ وسیع اور دل دردمند ہے۔ اور یہی اچھی شاعری کے لوازمات ہیں (نئی روشنی دہلی۔ ۲۰ جولائی ۱۹۶۳ء)

شیخ محمد نجم الہدیٰ شمس الضحیٰ
ریسرچ اسکالر
اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ انجمن اسلام بمبئی

اردو کے شخصی مرثیے اور جگن ناتھ آزاد

واقعۂ کربلا میں امام عالی مقام امام حسینؓ کی شخصیت کا ہر پہلو دنیا و آخرت کے لئے مینارۂ روشنی ہے گو کہ حضرت امام حسین علیہ السلام معصوم ہیں لیکن کسی معجزے یا کرامت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ بھوک اور پیاس کی شدت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ رفقاء، انصار، اعوان اور اقرباء کی لاشیں میدانِ قتال سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ اعدائے شام سے تمام حجت کے لئے تقریریں بھی کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے ششماہے پسر کی قبر بھی کھودتے ہیں اور پھر ہنگام خالق میں سر بھی کٹا دیتے ہیں۔

واقعۂ کربلا کے مختلف کرداروں کی عکاسی ہمارے شعراء نے مختلف انداز میں کے تحت کی ہے اور اُن کے احساسات قلبی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے ایسا اظہار جو عقیدت و محبت کے ساتھ غیر متعصب بھی ہوتا ہے۔ شعرائے کرام کی فہرست میں تلوک چند محروم جیسے غیر متعصب اور عقیدتمند شاعر کا نام نمایاں اور منفرد دکھائی دیتا ہے۔

محروم نے شہادت حسینؓ پر جو مرثیہ لکھا ہے اس کا ہر شعر صاف و شفاف دل کا مظہر ہے۔

عہد فانی تھی فنا پیماں فنا ہو کر رہی وہ بھی ہیں مر کر جنہیں حاصل بقا ہو کر رہی

سب سے اونچا ان میں ہے نام شہید کربلا — جن شہیدوں پر ستم کی انتہا ہو کر رہی
وائے مجبوری کہ اک صحرائے ہیبت ناک میں — شام غربت سایۂ تیغ جفا ہو کر رہی
بند جب غربت زدوں پر نہر کا پانی ہوا — نہر خود سیلاب اشک بے نوا ہو کر رہی
کیفر کردار سے بچ کر کہاں جاتا یزید — دائمی لعنت شقاوت کی سزا ہو کر رہی
بے گناہوں کے لہو نے اس کو بخشا یہ شرف — غربت اکسیر خاک کربلا ہو کر رہی

آج بھی طلعت فشاں ہے کوکب عزم حسین
حق پرستوں کی شہادت حق نما ہو کر رہی[1]

تلوک چند محروم ایک ایسے شاعر ایک ایسے انسان تھے جن کے سینے میں اپنوں اور غیروں کے صدمات کی تہیں جمی ہوئی تھیں پھر بھی اُن کے سینے میں جو دل دھڑک رہا تھا اس میں انسانیت کے لئے ہمدردی تھی اور یہیں اُن کے ہر شعر میں جذبۂ انسانیت کا اظہار محسوس ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسانی جذبات و پاکیزہ خیالات کی آئینہ داری و ترجمانی میں اُن کا شاعرانہ کمال بدرجۂ اتم دکھائی پڑتا ہے۔

اولاد کی محبت کے لطیف اور شدید جذبات واحساسات سے ہر انسان کا دل دھڑکتا ہے لیکن یہ جذبۂ محبت اس وقت اور شدید ہو جاتا ہے جب زندگی کے مختلف موڑ پر حادثات زمانہ سے بھی دو چار ہونا پڑے اور پھر اولاد کا غم کوہ غم سے کم نہیں ہوتا

شکنتلا دو برس کی معصوم بچی کے انتقال پر ایک حساس باپ کے دل پر جو گہری چوٹ پڑتی ہے اس کا اظہار تین صبحوں کی "صبح امید" سے ظاہر ہوتا ہے۔

پہلی صبح

کیوں ہم سے روٹھ کر تو نکل آئی ہے یہاں — اٹھ چل مرے ساتھ مری پیاری شکنتلا
سنسان فضا مقام ہے جنگل ہے ہولناک — یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا[2]

---

[1] شہادت حسین تلوک چند محروم۔ نیرنگ معانی ص۔۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی جون اشاعت ۱۹۶۲ء
[2] کم سن بچی کے مدفن پر تلوک چند محروم ص۱۰۳ ایضاً۔

خوابِ گراں میں تو ہے ابھی زیرِ خاکِ سرد
بیدار کائنات ہے ساری شگفتہ

خوش ہو کے پھول پھل کے گلشن بھی ساتھ ہے
آنکھوں سے اس کی اشک ہے جاری شگفتہ

آنکھوں میں آ گیا ہے دلِ صد چاک کا لہو
چلّا رہا ہوں تجھ پہ دیکھ کے جاری شگفتہ

ویرانہ ہو گیا ہے ہمارا گھر ترے بغیر
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شگفتہ[۱]

دوسری صبح

مایوس ہو کے کل گئے پھر آج آ گئے
اے کاش زیرِ خاک سے ہو آشکار تو

ہم دودھ لے کے آئے تھے گھر سے ترے لئے
دو دن کی بھوکی پیاسی ہے اے شیرخوار تو

گھر میں رات کاٹی تھی تو نے تڑپ تڑپ
آسودہ ہو گئی تہِ خاکِ مزار تو

افسوس عمر بھر نہیں تڑپا سکے گی وہ رات
جب ہو رہی تھی بہرِ سفر بیقرار تو

روتا ہے پھوٹ پھوٹ کے بالیں پہ تیری آج
وہ باپ جس سے کرتی تھی ہنس ہنس کے پیار تو

جتنی مسرتیں ترے دم سے ہوئیں نصیب
اتنا ہی کر گئی ہے ہمیں دل فگار تو

تیرے لئے وہ عشرتِ دل تھی نصیب کی
ہو بہرہ یابِ رحمتِ پروردگار تو[۲]

تیسری صبح

ملتا نہیں ہے کچھ مری فریاد کا جواب
کس نے شگفتہ تجھے یوں کر دیا خموش

مطلب یہ تھا کہ تو مرے نالوں سے جاگ اٹھے
فطرت میں وہ نہیں ہے دلِ درد آشنا خموش

مجھ بدنصیب کے لئے تیری خموشیاں
ایمائے خامشی ہے تو ہو جاؤں گا خموش

طاری ہے آہ! شہرِ خموشاں کا یہ سکوت
خاموش اس سرزمیں کی ہے ساری فضا خموش

سرِ منزلِ دیارِ عدم ہے یہی مقام
ڈیرے لگے ہوئے ہیں مگر ہے صدا خموش

وادی یہ وہ ہے جس میں مسافر اترتے ہیں
سینے میں سانس روک کے جوں نقشِ پا خموش

دم مارنے کی تاب کسی کو یہاں نہیں
پیر و جواں خموش ہیں شاہ و گدا خموش

نغمے خوشی کے ہیں نہ کہیں نالہ ہائے غم
یکسر ہیں ساکنانِ دیارِ فنا خموش

۱؎ نظم بن بیاہی کے مدفن پر۔ منشی تلوک چند محروم نیرنگِ معانی ص۱۳۲-۱۳۳ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔

۲؎ ایضاً ایضاً ص۱۳۴

۳؎ ایضاً

صدمہ نہ تھا کہ ہو تری معصوم روح کو ہوتا ہے ساز اب مری فریاد کا خموش[۱]

محروم نے اپنی شریکِ حیات کی موت پر جس دردانگیز لہجہ میں اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے ہر حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمہاری وہ طرزِ غمخواری کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی
کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے ابھی سے ہو گئے تیار کیوں سفر کے لئے
گزرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی
ہے یاد مجھ کو وہ برسوں کی زیرِ لب فریاد تمہاری آہ! جگر سوز پر تعب فریاد
دل و جگر پہ مرے ڈھا گئی غضب فریاد کہ کرنے والے نہ تھے تم تو بے سبب فریاد
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف
خیال میرے دلِ دردمند کا کرتے شریکِ شادی و غم تھے تو پھر وفا کرتے
کسی سے کرتے نہیں کوئی بات واأسفا نہ تھے تم ایسے تغافل صفات واأسفا
دھرے ہی رہ گئے نبضوں پہ ہاتھ واأسفا کٹے گی کس سے یہ ماتم کی رات واأسفا
لو اٹھ کے بیٹھو کہ ودیا سرہانے آئی ہے تمہارے منہ سے وہ دامن اٹھانے آئی ہے
اٹھا بھی لو کہ بہت بے قرار ہے ودیا نہ چھوڑ جاؤ اسے شیرخوار ہے ودیا
پکارتی ہے تمہیں آج کس قرینے سے ابل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے
ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے
مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے مجھ سخت جاں پہ یارب یہ کیا گزر رہی ہے[۲]

ودیا جو شیرخواری کی سن میں ماں کے دودھ کے لئے ترستی رہی تڑپتی رہی۔ ماں کا دودھ بچے کی معصوم زندگی کا اثاثہ ہوا کرتا ہے مگر وہ بدنصیب رہی اور یہ بدنصیبی

۱؎ نیرنگ سکندر فن پر تلوک چند محروم نیرنگ معانی ص ۱۳۲ ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔
۲؎ اشکِ حسرت تلوک چند محروم گنج معانی۔

تھے تین بچوں کی ماں، ہونے تک پیچھا کرتی رہی اور وہ جل مری۔

محروم کی زندگی میں غم و اندوہ اور حزن و ملال کا ایک دریا ہے۔ زندگی کی ذہنی تلخیوں نے محروم کے فکر و فن میں تاثرات و احساسات کے مختلف و دل پذیر پہلو اس طرح یکجا کر دیئے ہیں کہ کلام میں درد، روانی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

جون ۱۹۳۵ء میں شیر خوار بچی شکنتلا داغِ مفارقت دے گئی اور ستمبر ۱۹۳۶ء میں اپنا دوسری بیٹی نے سسرال میں خودکشی کر لی جو تین بچوں کی ماں تھی۔ "آتش کدۂ غم"[1] میں محروم نے بڑے ہی دلدوز پیرائے میں اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔

پہلے ہی غم خانہ تھی وہ میری نظر میں
افسوس کہ اب اور بھی برہم ہوئی دنیا

اے لختِ جگر آہ! کہ جل مرنے سے تیرے
میرے لئے آتش کدۂ غم ہوئی دنیا

بجھ نہیں سکتی جو دل میں آگ ہے بھڑکی ہوئی
عالمِ فانی میں اب راحت کہاں میرے لئے

سچ تو یہ ہے تیرے جل مرنے سے اے لختِ جگر
ہو گئے دوزخ زمین و آسماں میرے لئے

کر دیا ہوتا مجھے آگاہ اپنے حال سے
تھی جو ایسی ہی کوئی تکلیف اے دُردیا تجھے

دل ہی دل میں عزم مر جانے کا تو نے کر لیا
ظالموں نے آہ! اتنا تو جلایا تھا تجھے

تاب اک لوکے کی لا سکتی نہیں جانِ بشر
ایک چنگاری سے ہو جاتا ہے انساں بیقرار

ہائے کن مجبوریوں سے تو نے اے لختِ جگر
کر لیا ملبوس تن کو اپنے تن پر شعلہ زار

دلِ بیتاب جلتا ہی رہے گا اس کی حدت سے
زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی دریا

جگر بھنتا ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجہ میں
تصور میں نظر آتی ہے جب جلتی ہوئی دریا

انگریزی کے شہرۂ آفاق شاعر شیلے کا نظریہ ہے کہ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو انتہائی جذبۂ غم بیان کرتے ہیں"۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ محروم کی شاعری کا ہر زور نغمہ اُن کا بیانِ غم رہا ہے۔ شاعر انسان کے احساسات اور جذبات کا ترجمان ہے اس کا درجہ اتنا ہی بلند اور رفیع ہوتا ہے جتنا کہ وہ انسانی دل کی گہرائیوں اور پوشیدہ جذبات اور احساسات کے آشکارا کرانے میں ہمارا ممد و معاون ہوتا ہے۔ غم و الم کے

---

[1] آتش کدۂ غم نیرنگِ معانی ص ۱۳۷ مکتبہ جامعہ نئی دہلی طبع دوم ۱۹۶۶ء تلوک چند محروم۔

جذبات کی ترجمانی میں محروم کو بڑی دسترس حاصل رہی۔ جس کے سبب اُن کے کلام میں تاثیر کے ساتھ سوز و گداز کی فراوانی بھی ہے۔ محروم نے شعرائے ہم عصر اور مشاہیرِ وطن کے ماتم میں بھی نوکِ قلم سے خونِ جگر ٹپکایا ہے۔ سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی، پریم چند، اوما کانت مولانا گرامی، آغا حشر، برق دہلوی، علامہ اقبال، طالب بنارسی، سحر ہنگامی، منشی دیا نرائن نگم رابندر ناتھ ٹیگور جیسے شعراء و ادباء کے علاوہ مشاہیرِ قوم میں خصوصاً لالہ لاجپت رائے گوپال کرشن گوکھلے، لوکمانیہ تلک، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر پُر درد مرثیے کہے ہیں۔

"چار آنسو" گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر

سوگ میں آج اس کے ہے بزمِ اخوّتِ تمامِ ہند ۔۔۔ ہائے لیا تھا غیب سے جس کی بقا تمامِ ہند

شانِ مدبّری تیری ۔ استقلال و ہ تیرا ۔۔۔ لائینگے اب کہاں سے ہم نیک صفات گوکھلے

ہم کو بھی راستہ کوئی تجھ کو دکھا کے جانا تھا ۔۔۔ قطعِ رہِ عدم تو تھی بات کی بات گوکھلے

ہوگا وطن پہ آہ! اب تری طرح نثار کون؟

تو ہی نہیں تو ہند کا بیڑا کرے گا پار کون؟ [1]

"یادِ تلک"

کارواں کو چھوڑ کر تو چل دیا ۔۔۔ دشت میں اے کارواں سالارِ ہند

اے تلک اے یوسفِ مصرِ وطن ۔۔۔ باعثِ صد گرمیٔ بازارِ ہند

منتظر جس دن کے تھے وہ ہے قریب ۔۔۔ کوئی دن میں رو رہے آزادِ ہند [2]

"اشکِ خوں" لالہ لاجپت رائے

بھینٹ آزادی کے کیسے کیسے رہبر ہوگئے ۔۔۔ بار ہا جاگے نصیبے اپنے پھر اور سو گئے

مٹ گئی آخر تلک اور گوکھلے کی یادگار ۔۔۔ ہوگیا اہلِ وطن کی آرزوؤں کا فشار

ناؤ منجدھار میں اور ناخدا کوئی نہیں ۔۔۔ اب خدا کا آسرا ہے جو لگا دے اس کو پار

---

[1] چار آنسو نذرِ ہند گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر، تلوک چند محروم - کاروانِ وطن صفحہ ؟ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۰ء

[2] اشکِ خوں۔ کاروانِ وطن۔ تلوک چند محروم صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۴ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۰ء

اے کہ تیری ذات تھی صبح تمنائے وطن — کچھ تسلی دے انہیں بیکل ہیں ابنائے وطن[1]

محروم نے "ہری کشن کے پھول" کے زیرِ عنوان بھی موثر مرثیہ کہا ہے جس نے ۱۹۳۰ء میں گورنر پنجاب پر گولی چلائی تھی اور گرفتار کئے جانے کے بعد اُسے پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ لاش جب نذرِ آتش کی گئی تب سرکاری ملازمین کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

سپردِ تست آہ! دمِ سحر یہ اکیلی جلتی ہوئی چتا
نہ تو الوداع کہی گئی، نہ برائے زیبِ کفن کھلا

انہیں پائمال نہ کر صبا کہ ہری کشن کے یہ پھول ہیں
جو وطن کی آن پہ مر مٹا اسی بے وطن کے یہ پھول ہیں[1]

آہ! موتی لال نہرو

ہمنوا ہے تیرا جہاں سارا — فخرِ شہر و دیار موتی لعل
وہ جو ہے تیری یادگار عزیز — اس کے حق میں ہے یہ دعائے وطن
کہ سلامت رہے جواہر لال
تا قیامت رہے جواہر لال[2]

"منشی پریم چند کی وفات پر"

پائی تھی ادب کی جو سعادت تو نے — کی اس سے وطن کی خوب خدمت تو نے
کیا ہم سے ہو پریم چند تیری توصیف — افسانے کو کر دیا حقیقت تو نے[3]

"مہاتما تیم آزادنہ"

گاندھی کے بعد ہند میں مینارِ روشنی — تھی تیری ایک ذات جو طلعت فشاں رہی
ہاتھوں میں تھا ترے علمِ اتحادِ ملک — سائے میں جس کے قوم بہ امن و اماں رہی

---

[1] ہری کشن کے پھول۔ تلوک چند محروم ص ۱۹۶-۱۹۷۔ مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی سن ۱۹۶۰ء

[2] آہ موتی لال نہرو۔ " " ص ۲۲۲-۲۲۳

[3] منشی پریم چند کی وفات پر پنڈت برج نرائن چکبست کی موت پر گنج معانی۔ تلوک چند محروم

آزاد ہو کے یکانہ ہستئ غم سے ہم رہا
اپنے لئے وہی روشِ آسماں رہی [1]

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی جواں مرگی پر مرحوم نے اپنے دلی احساس و غم کی ترجمانی کی ہے۔

سخن طرازوں میں چکبست بے مثال رہا — شہید جلوۂ معنی و خوشس خصال رہا
متاعِ سوزِ قسدیمی سے مالا مال رہا — کہ شمعِ انجمن دانش و کمال رہا
مٹا دیا اُسے سفاکئ اجل نے مگر نہ تھا
کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانہ تھا [2]

اردو ادب میں جگن ناتھ آزاد ایک ممتاز و منفرد ادبی شخصیت کی حیثیت سے روشناس ہیں۔ ایسی شخصیت جس کا سارا حسن اور نکھار محبت خلوص جذبات لگن اور عجز و انکسار سے جنم لیتی ہے۔ آزاد قادر الکلام شاعر ہیں۔ حسنِ بیان اور وضاحتِ زبان کے گل بوٹے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شعری فکر کے ساتھ اس فن کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے اپنی متاعِ زندگی نچھاور کر دی لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ آزاد فکری اعتبار سے اقبال سے بہت زیادہ قریب و متاثر ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ آزاد نے جہاں نثر نگاری میں لطافتِ حسن و بیان کے گل بوٹے مہکائے ہیں وہیں شعر و سخن کی بزم میں اُن کی فکر و شعور کا چراغ جل رہا ہے۔ جس کی روشنی میں غمِ ذات کے لطیف احساس و خیال کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔ نازک جذبات و حالات کی وہ داستانیں پڑھنے کو ملتی ہیں جن سے آزاد کی زندگی کا گہرا اور اٹوٹ رشتہ رہا ہے اور جب جذبات اور احساسات پر چوٹ پڑتی ہے، جب دل کے تار چوٹ کھا کر جھنجھنا اُٹھتے ہیں قلب و ذہن میں

---

[1] ماتم آزاد کاروانِ وطن تلوک چند محروم صہ۱۵۷ سنِ اشاعت ۱۹۶۰ء مکتبہ جامعہ

ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے تو مرثیہ پھوٹ کر نکلتا ہے۔

آزاد کے شخصی مرثیوں میں "شگفتہ"، "ایک آرزو"، "ٹیگور"، "گاندھی"، "ماتم نہرو"، "ماتم سالک"، "ماتم ابوالکلام آزاد"، "رفیع صاحب کے مزار پر"، "امام حسین" خاص طور سے مشہور ہیں اور ادبی نقطۂ نگاہ سے ان کی قدر و قیمت بھی ہے۔ ان مرثیوں میں ہم آہنگی، رنگا رنگی، رعنائیِ فکر و ادبی رکھ رکھاؤ، گریز کی لطافت، سراپا کی شگفتگی، ضبط و استقلال کے گوشے نمایاں نظر آتے ہیں۔

پروفیسر آزاد، سالک (مرحوم) سے زمانۂ طالب علمی سے عقیدت و احترام سے مخلصانہ جذبات رکھتے تھے۔ اُن کی بزرگانہ شفقتوں اور محبتوں نے آزاد کے ادبی و شعری مزاج میں وسعت بخشی ہے۔ سالک (مرحوم) نے ادب و صحافت میں اپنے رشحاتِ قلم سے گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ خصوصاً "فن برائے فن" اور "فن برائے زندگی" کے مباحثے کی مجلس بڑی فکر انگیز قرار دی جاسکتی ہے۔ جس میں آپ نے پُرمغز تقریر کی تھی۔ آپ نے کہا تھا۔

"فن برائے زندگی" اور "فن برائے فن" کے موضوع پر یہ نکتہ ذہن نشین کیا جانا چاہیئے کہ فن ہمیشہ زندگی کے لئے ہوتا ہے۔ "فن برائے فن" پر بھی جب ہم غور کرتے ہیں تو انجام کار اس کا مقصد بھی یہی سمجھ آتا ہے کہ وہ زندگی کے لئے ہی ہے۔ علوم ہوں یا فنون، یہ سب زندگی کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ میں حیران ہوں آپ "فن برائے فن" ایسی مہمل بات کیوں لئے بیٹھے ہیں۔ آج تک کبھی ہم نے یہ نہیں سنا کہ "سائنس برائے سائنس"، "تاریخ برائے تاریخ" یا "جغرافیہ برائے جغرافیہ" بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آخر "فن برائے فن" ہی کیوں ہو۔ "فن برائے فن" تو ایک ایسا نعرہ تھا جو فرانس میں خالص سیاسی ضرورتوں کے تحت بلند کیا گیا تھا اور اس وقت ایسے ہی نعرے کی ضرورت تھی۔" [1]

سالک (مرحوم) فکر و معانی کے علم و ادب کے فنِ گفتگو کے ایک تجربہ کار نمائندہ تھے جنھوں نے اردو ادب کی ایک نسل کی فکری و ذہنی تربیت کی ہے۔

---

[1] مولانا سالک مرحوم کی تقریر آنکھیں ترستیاں ہیں ص ۹۵ جگن ناتھ آزاد۔

آزاد نے "ماتم سالک" میں ان ہی سارے گوشوں کو عقیدت و محبت کی روشنی سے اُجاگر کیا ہے۔

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہ فیض سے ناخوب ہوئے خوب کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
اے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ اخلاص و محبت کا مودت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروت کا خزینہ مٹی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لٹا گردشِ ایام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر بٹی شام کے ہاتھوں

اے خاکِ وطن منزلِ مقصودِ محبت قرباں ترے ذروں پہ مرے اشکِ ارادت
ماناکہ نہ چیں سہت میری عقیدت پہلے بھی کچھ آسان نہ تھی تیری زیارت

اس راہ میں اب ایک رکاوٹ سی پڑی اور
اک ٹوٹ گئی رشتۂ الفت کی کڑی اور [۱]

ہم نے سابقہ صفحات میں کہا ہے کہ گاندھی جی کا خون ایک قوم، ایک عہد ایک تاریخ کا خون ہے اس خونِ ناحق پر آزاد نے جو مرثیہ کہا ہے اس کی تاثیر و گہرائی سب سے منفرد ہے۔

ہاتھ جب تیرے لئے بہرِ دعا اٹھتے ہیں دل مرا جرم کے احساس سے ڈوب جاتا ہے
کہ دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں مجھے محسنِ دہر! ترا خون نظر آتا ہے مجھے

پروفیسر آزاد فکری اعتبار سے اقبال سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ انہوں نے اقبال کے فکر و فن سے روشنی بھی حاصل کی ہے۔ اقبال کی موت پر آزاد نے جس

---

[۱] ماتم سالک۔ جگن ناتھ آزاد ص ۳۵ مکتبہ جامعہ ۱۹۶۶ء ماڈرن پبلک ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۔ اشاعت فروری ۱۹۸۱ء۔

فکر و جذبات میں ڈوب کر مرثیہ لکھا ہے دوسروں کے یہاں ہم یہ گوشے نہیں دیکھ پاتے۔

مٹی کو تجھ پہ فخر، تخیل کو تجھ پہ ناز ۔ نازاں تھا تجھ پہ مشرق و مغرب کا ہر دیار
تو نے سخن کو زندۂ جاوید کر دیا ۔ تیرے نفس نے دی چمنِ شعر کو بہار
رنگیں تھا جس کے حسنِ تخیل سے برگِ گل ۔ جس کی گرج سے موجۂ طوفاں میں تھا خروش
سینوں میں جس نے قوتِ گفتار سے بھرا ۔ صہبائے بیخودی کا سرور دغل کا جوش
تھا جس کے سانس سانس میں پیغامِ حیات ۔ تربت ہے اس کی سایۂ مسجد میں سبز پوش

ہے خاک میں وہ عرشِ معانی ہزار حیف
اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف

ملک کی سیاست سے آزاد کا عملی رابطہ نہ سہی تاہم ایک حساس اور درد مند شاعر کی حیثیت سے آپ نے سیاست دانوں کی ان فکری و عملی کاوشوں اور جدوجہد کے کارہائے نمایاں کو قالبِ شعر میں ڈھالتے ہوئے خراجِ عقیدت و تحسین کے چراغ روشن کئے ہیں کہ جن سے ملک کی ساکھ قائم و برقرار رہی اور عوام کی زندگیوں میں اجالے کی کرن پھیلی۔

اس صف میں گاندھی جی، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم ملک کی سیاست میں اپنا منفرد درجہ رکھتے تھے جن کی مدبرانہ صلاحیتوں کا ہر کوئی معترف رہا۔ ملک کی غذائی صورت حال پر جس حسنِ تدبر سے قابو پایا اس کی مثال کم کم دکھائی دے گی۔

آزاد نے "رفیع کے مزار پر" ایسے ہی دردمندانہ لہجے میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے جسے ہر ہندوستانی کے دل کی دھڑکن کہا جا سکتا ہے۔

ہند سے قحط مٹا جس کی فراست کے طفیل ۔ ہاں وہی صاحبِ اعجاز اسی خاک میں ہے
کیوں نہ ہوں درد سے لبریز یہاں دل آکر ۔ دل کے ہر ذرہ کا ہمراز اسی خاک میں ہے
عقل بیتاب اسی خاک میں ہے جو سکوں ۔ عشق کا جذبِ تگ و تاز اسی خاک میں ہے
اس پہ ہندو و مسلمان کے دل کیوں نہ جھکیں ۔ مجمع سبحہ و زنار اسی خاک میں ہے

وہ خردمند کہ دیوانہ رہا تیرے لئے

ہاں وہی دیوانہ ہشیار اسی خاک میں ہے

پروفیسر آزاد نے اپنی کتاب "نشانِ منزل" میں پنڈت نہرو کی سیاسی زندگی کے علاوہ ہمیں اس پنڈت نہرو سے بھی روشناس کیا جس نے سات کتابیں "سوانح حیات" "دریافتِ ہند" "ہندوستان میں اٹھارہ مہینے" "نئے مضامین اور تحریریں" "ہم کہاں ہیں" "چین سپین اور جنگ" اور "تاریخ عالم کی جھلکیاں" لکھی ہیں۔ جبکہ سارے عالم میں پنڈت نہرو ایک مدبر سیاست داں اور سوشلزم طرز کے سماج کے داعی کی حیثیت سے جانے پہچانے گئے اور جاتے ہیں ہم میں سے ایسے کتنے ہوں گے جو پنڈت نہرو کی اس حیثیت و شخصیت سے بھی آشنا ہوں گے؟ کہ وہ سیاست داں ہی نہیں بلکہ ادیب و صحافی بھی تھے۔ جن کی تحریر کے پیچھے جوش عمل و کردار کی قوت بھی موجود ہے۔

اور دنیا کے عوام اور طبقۂ دانشوراں اس روشن حقیقت سے آشنا رہا۔ کہ پنڈت نہرو نے آزادیٔ وطن کے بعد جب زمامِ حکومت سنبھالی تب سے دمِ آخر تک اُن کی یہی خواہش و تمنا رہی کہ ملک کو آزادی کے بعد وہ تمام برکتیں حاصل ہونا چاہیئے جن پر افراد کی "مسرتِ زندگی کا دارومدار ہے۔

اس عظیم شخصیت کے اُٹھ جانے کے بعد ہر دل تڑپ اُٹھا سارے عالم پر اندھیرا سا چھا گیا اردو کے بے شمار شاعروں نے نہرو کی موت پر اپنے جذبات کا مرثیہ کی صورت میں اظہار کیا ہے۔ لیکن آزاد کے "ماتمِ نہرو" میں تاثیر اور زبان و بیان کا جو انداز ملتا ہے وہ ایسا نالۂ ماتم ہے جو ہر دل کی دھڑکن و آواز معلوم ہوتا ہے۔

آزاد کے "ماتمِ نہرو" پر غلام ربانی تاباں نے یوں اظہارِ خیال فرمایا۔

"مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ پنڈت نہرو پر جتنے بھی مرثیے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں آزاد کا زیرِ نظر مرثیہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ نظم شروع سے آخر تک آورد نہیں ہے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر صرف شعر کہنے کے لئے کہا گیا ہے اس میں تاثیر ہے

رومانی ہے اور بڑی حد تک حقیقت پسندی۔" [1]

یہ کون آج بزمِ سخن سے گزر گیا — مرنا یہ کس کا زیست سے بیزار کر گیا
کیا پھول تھا کہ خاکِ چمن پہ بکھر گیا — اک دردِ جاوداں تھا کہ دل میں اتر گیا
انساں کا فکر گو بہ پرواز ہی رہا
اے موت تیرا راز مگر راز ہی رہا

اے تو کہ تیری ذات سے قائم تھی شانِ قوم — ماتم سرا ہے آج لبِ نغمہ خوانِ قوم !
تیرے طفیل اے نفسِ ملک و جانِ قوم — رتبے میں آسمان رہا آستانِ قوم
یوں تیرے دم قدم سے سرافراز ہو گئے
ہم لوگ شرق و غرب میں ممتاز ہو گئے

حق نے دیا تھا تجھ کو ادب میں بڑا مقام — دنیا کے اہلِ فن ترا کرتے تھے احترام
اس بات میں نہیں ہے کسی کو ذرا کلام — بیٹی کے نام خط ہوں کہ عالم کے صبح و شام
تیرا ہے بات کرنے کا انداز ہی کچھ اور
شورِ جہاں میں ہے تری آواز ہی کچھ اور [2]

مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملکی سیاست میں ایک خاموش اور باعمل شخصیت کے مالک ہیں۔ بحیثیت صحافی اُن کا کردار تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے اس عالم سے شرف ملاقات حاصل کیا اور اُن کی عالمانہ شخصیت سے متاثر بھی رہے ہیں۔ مولانا آزاد کی وفات پر آزاد نے دردمندانہ لہجے میں اپنے حزن و ملال کا اظہار کیا ہے جیسا کہ مولانا حالی نے لکھا تھا کہ قوم میں قومیت کی روح پھونکنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ قوم کے افراد مثل ایک خاندان کے ممبر کے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کریں اُن کی مساعی جمیلہ کی قدر کریں اُن کی نیکیوں کو جتائیں اُن کے کمالات کو شہرت دیں اور اُن پر مرثیہ لکھیں۔

---

[1] حرفِ اوّل ماتم نہرو ۱۹۶۵ء مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔ غلام ربانی تاباں

[2] ماتم نہرو جگن ناتھ آزاد صفحہ ۱ مکتبہ جامعہ ۱۹۶۵ء

آزاد کے مرثیہ کے ان دو بندوں میں ہمیں وہ تاثر برابر دکھائی دیتا ہے۔

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی
وہ خبر آئی کہ بزم زندگی تھرا گئی
روشنی جس کی حریم روح کو چمکا گئی
ظلمت مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے منور تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا حکمت کا دانش کا چراغ

اے غلاموں کا لہو گرمانے والے الوداع
آگ سی الفاظ میں برسانے والے الوداع
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے الوداع
اے جگا کر ملک کو سو جانے والے الوداع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے [1]

اُردو شعر و ادب کا دامن کسی دور میں بھی مرثیہ سے خالی نہیں رہا۔ اردو شعراء کی لامتناہی فہرست ہے جس میں شعراء نے واقعہ کربلا پر اپنے عقیدتمندانہ احساس و خیال کا اظہار کیا ہے یوں تو واقعۂ کربلا کا کوئی کردار اور اس کا کوئی گوشہ ایسا ہے ہی نہیں جس سے روشنی نہ پھوٹ رہی ہو۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے واقعہ کربلا کی دسویں محرم کے ہنگام عصر کو اپنے مرثیہ کا موضوع قرار دیتے ہوئے واقعہ کربلا کے درد انگیز مناظر و کیفیات کو شدت جذبات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے اشعار میں حسن صداقت حکمت اور اخلاق کے بلند پایہ معیار کے ساتھ ساتھ ہمارے فکر و شعور میں حس و حرکت پیش کرتے ہیں۔

اس حقیقت سے ادب کا طالب علم واقف ہے کہ اچھی شاعری سے ایک اچھی نظم ہو سکتی ہے لیکن اسے اعلیٰ بنانے کے لئے ایک عظیم واقعہ ہونا چاہیئے جو انسانی احساس کو جھنجھوڑ سکے اور جس کی مدد سے جذبات کے رشتوں میں بہتر تنظیم پیدا کی جا سکے اور واقعہ کربلا اس کی روشن مثال ہے۔

اور آزاد نے "نمازِ عصر" کے زیرِ عنوان جن عقیدتمندانہ احساسات و خیالات کی

---

[1] جگن ناتھ آزاد ۔ ایک مطالعہ" محمد ایوب واقف ۱۹۳۳ ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اعظم گڑھ مکتبہ جامعہ ۱۹۸۱ء۔

روشنی بکھیری ہے۔ اس میں ہمیں نمازِ عصر کی ادائیگی سید الشہداء نے کس طرح ادا کی۔ اور احول کی کیفیت اور اُس کے مزاج کے تئیں فرض کی ادائیگی میں سید الشہداء نے جو مثال قائم کی ہے وہ مثال اوّل اور آخر ہی ہے کا پیکر دکھائی دیتی ہے۔

امام حسینؑ جو ارفع و اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل ہیں ایک ایسا کردار ہیں جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔

اور آزاد نے اپنے اس شعر میں بھرپور ترجمانی کرتے ہوئے نمازِ عصر کا نقشہ کچھ ایسے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ان الفاظ میں تمام حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے دل کانپ کانپ جاتا ہے اور سانسیں رُکی ہوئی معلوم ہوتی ہیں

"نمازِ عصر"

میری نوا میں سوزِ کہن رونما ہے آج
دنیائے دل میں ایک قیامت بپا ہے آج
چھیڑا ہے آج دل نے شہادت کا تذکرہ
گردوں سے بھی بلند تر اے کربلا کی خاک
کیسے کہوں کہ ذکر نہایت ہے دردناک

درپیش نغمگی کو عجب معرکہ ہے آج
میری زباں پہ تذکرۂ کربلا ہے آج
بے مثل وبے عدیل عبادت کا تذکرہ
میری نگاہ میں تو حرم کی طرح ہے پاک
دامن میں تیرے پھول کا سینہ ہے چاک چاک

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتول

لو چل رہی ہے نام کو سایہ کہیں نہیں
آنکھیں اُٹھا کے دیکھ ذرا اے دلِ حزیں

حدت وہ ہے کہ وقت کی سانسیں ہیں آتشیں
گردوں تنور ہے کرۂ نار ہے زمیں

اِک شعلہ زار ہے کہ ہے میدانِ کربلا
اِک آگ ہے کہ ریگِ بیابانِ کربلا

طوفاں بپا ہے گرم ہے میدانِ کارزار
طینت اُدھر، اِدھر انساں کا وقار

ہے قاتلوں سے محوِ وغا ایک شہ سوار
تنہا حسینؑ اور یزیدی کئی ہزار

اے گردشِ زمانہ ٹھہر جا ذرا یہیں
ایسی مثال پھر نہ ملے گی تجھے کہیں

وہ سامنے غنیم کی فوجیں ہیں وجلہ پار ہیں اس طرف اکیلے حسینؑ اسپ پر سوار
دامن ہے غبار گریباں ہے تار تار کانٹوں میں جیسے پھول ہو یوں ہے وہ نامدار
آزاد نوکِ خار کی زد پہ ہے پھول دیکھ
ہاں دیکھ انقلابِ جہاں کا اصول دیکھ

اُوپر تلے تپے ہوئے ذرّوں کا انتشار ہتھیار جس قدر ہیں بدن پر ہیں شعلہ زار
اور اس کے ساتھ ساتھ ہیں چاروں طرف سے وار سر تیغ سے شکستہ جگر تیر سے فگار
تین دن ہوئے ہیں پینے کو پانی ملا نہیں
لیکن نمازِ عصر یہاں بھی قضا نہیں

اب ہیں نمازِ عصر کی ساعات بھی قریب دن ڈھل چکا ہیں شام کے لمحات بھی قریب
اے دوپہر کی دھوپ ہے اب رات بھی قریب جس بات کا ہے ذکر وہ ہے بات بھی قریب
گھوڑے سے گر چکے ہیں شہِ مشرقین اب
سجدے میں سر جھکائے ہوئے ہیں حسین اب

دیکھ اے نگاہ دیکھ یہ منظر جگر خراش تابِ نظر کہاں کہ کلیجہ ہے پاش پاش
فریاد سے فضاؤں میں پیدا ہے ارتعاش کیا اے فلک تجھے بھی اسی وقت کی تلاش
دستِ قضا کو صبر ذرا بھی نہ ہو سکے
اور عصر کا فریضہ ادا بھی نہ ہو سکے

وہ ہاتھ اُٹھا لعین کا شمشیر تول کر بھرپور وار جسم اِدھر اور سر اُدھر
اے بے سواد رازِ حقیقت سے بے خبر سجدہ یہی ہے سجدۂ معبود کم نظر
بے مثل ہے عدیلِ شہادت یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت یہی تو ہے[1]

اُردو میں شخصی مرثیوں کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعرا نے اپنے عصر کی قومی، سماجی و سیاسی شخصیات پر اُن کی خدمات اور ملک و قوم کے

---

[1] رثائی ادب میں ہندوؤں کا حصہ صفحہ ۱۸۷/۱۸۸ - مرتبہ جعفر حسین خاں جونپوری ۱۹۸۳ء - اردو پبلشر لکھنؤ۔

وسیع تر مفادات کے حصول کی عملی جد و جہد کو اشعار کے روپ میں پیش کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ شخصی مرثیوں میں چند ایسے ہی مرثیے ہیں جن کا تعلق بڑی حد تک ذات سے ملتا ہے۔ جیسے مرزا غالب نے اپنے بھانجے عارف کی جواں مرگی اور مومن خاں مومن نے اپنے محبوب "پردہ نشین" کے گزر جانے پر اور تلوک چند محروم نے اپنی رفیقۂ حیات اور اپنی لختِ جگر پر، علامہ اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار مرثیہ کے روپ میں کیا ہے۔

اور جگن ناتھ آزاد نے جہاں آزادیٔ وطن کے مجاہدین اور قافلہ سالاروں ایسے ادیب و صحافی جن کے قلم سے اردو کی ایک نسل متاثر ہوئی کی دائمی جدائی کو ایک خلاء محسوس کرتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات، کیفیتِ دل کے بیان کو اشعار وسیلہ بنایا ہے نیز ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ آزادی کے ان آزاد کے ان سے ذاتی مراسم بھی رہے ہیں لہٰذا ان اشعار میں سوز و گداز، درد و غم اور زورِ بیان جھلکتا ہے وہیں ہم آزاد کا مغموم اور رنجیدہ دل دھڑکتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ آزاد نے اردو کے شخصی مرثیوں میں اپنی انفرادیت کے جوہر چمکائے ہیں۔ "شکنتلا" جو اُن کی شریکِ حیات رہی اور داغِ مفارقت دے گئی۔ اس کو وہ غم کو آزاد نے کس طرح جھیلا۔ واقعی ہمیں "شکنتلا" کے مرثیہ میں ہر ہر شعر سے ملتا ہے۔

"شکنتلا"

میں تُجھے لیکر خدا جانے کہاں پھرتا رہا	پتھروں پر ڈگمگاتا جیسا بجا گرتا رہا
چاند تارو! وہ سماں کتنا الم آثار تھا	میری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا
لے گرفتارِ تپِ کہنہ قرارِ چشم دل	ایک مدت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل
شکر ہے آخر حرارت کا یہ بادل چھٹ گیا	شکر ہے آخر ترا دورِ مصائب کٹ گیا
سامنے میری دعاؤں کا مرے انجام ہے	اب ترے ہر درد، ہر تکلیف کو آرام ہے
اب نہ دیکھے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر	اور اس معصوم کی خاطر ترسے گی نظر

جو ترے دامن میں آیا مسکراتا چل بسا — جن کو یہ انداز دنیا کا نہ بھایا چل بسا
اب نہ ہم کو دے دوا دارو پلائیں گے تجھے — اب نہ بیماروں کے بستر پر سلائیں گے تجھے
عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے — میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے
ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایام نے — تو نہیں ہے اور ہیں ترے پھول میرے سامنے
چن کے تیری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں — گوہرِ اشکِ رواں دے کر انہیں لایا ہوں میں

بزمِ فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں [1]

آزاد کی زندگی اپنے شریکِ غم و خوشی کے وجود کے تحفظ کے لئے کن کن صبر آزما دور سے گزرتی ہے اس کا مشاہدہ و تجربہ اُن کے احساس و خیال کو زندگی کی آزاد کا یہ مرثیہ غمِ جاناں کی محض شعری روایت کا ترجمان نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ان نازک اور لطیف احساسات کی آئینہ داری ہے جس میں اٹوٹ وابستگی کے سچے اور حقیقی جذبات موجود ہیں۔

آزاد کا احساسِ غم ہر ہر شعر سے محسوس کیا جا سکتا ہے جس میں زندگی کے اُجالوں کی تمنا کا کرب بھی ہے اور دل نشیں یادوں کے چراغ بھی روشن ہیں۔

---

[1] شکنتلا، بیکراں جگن ناتھ آزاد ص ۱۲۲ دہلی کتاب گھر تیسری بار ۱۹۵۶ء

کتاب (تلوک چند محروم) ابھی جستہ جستہ دیکھی ہے بہت اچھا مجموعہ ہے جس سے ایک نامور شاعر اور ایک اچھے انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ابھی سب کتاب پڑھی نہیں ہے۔ اسکے پہلے آپ کے مضمون "میرے والد" پر پڑی۔ اسے پورا پڑھ لیا۔ اور پڑھنے میں آنکھیں کئی بار نم ہو گئیں۔ اسے پڑھ کر ایسا لگا کہ محروم صاحب کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور صرف اُن کے کلام ہی کے توسط سے واقفیت نہیں ہے۔

ایک خط کا اقتباس

راج بھون، رانچی۔ ۴ر اگست ۱۹۵۹ء

اسحق شبلی

اُردو ایک ہندو شاعر کی نگاہ میں

اُردو زبان کو مسلمانوں کی زبان اور اس کے وجود کو "سرکاری زبان" ہندی کی ترقی میں سدِ راہ سمجھ کر اس کے مٹانے کی جو سرگرم اور باقاعدہ سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں اس وقت جاری ہیں قدرتاً اس کا زور سب سے زیادہ اس صوبہ یوپی میں ہے جو اُردو زبان کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ حال میں اردو کے حامیوں نے اُردو کے بقاو تحفظ کے لئے جو جدوجہد شروع کی ہے اگرچہ وہ بالکل آئینی اور ایک جائز حق کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لئے ہے اس کے خلاف زبردست شوروشر مچا ہوا ہے اور اس جدوجہد کو مسلمانوں کی فرقہ پرستی تقسیم ہند والی ذہنیت اور دو قومی نظریہ کی ترجمان ذہنیت سے تعبیر کرکے اسے باغیانہ قرار دیا جا رہا ہے اور ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو کے حق میں جدوجہد کرنے والوں میں تفرقہ پڑ جائے نشۂ تعصب میں غرق اور لسانی سامراج کے علمبردار یہ کہتے اور لکھتے ذرا نہیں شرماتے اور جھجکتے کہ اُردو زبان کو مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں زبردستی ہندو رعایا کے سر منڈھا تھا اور اب آزادیٔ وطن کے ساتھ پہلی بار ہندو جنتا اردو کی غلامی سے بھی آزاد ہوئی ہے۔ کسی کسی حلقہ سے اردو کی فردِ جرم یہ بتا کر اسے گردن زدنی ٹھہرایا جاتا ہے کہ یہ محض مسلم تہذیب کی علمبردار ہے۔ ہندو تہذیب و تمدن کی اس میں کوئی جھلک نہیں یہ زبان

اسلام اور صرف اسلام کی مبلغ رہی ہے اور ہند کے سارے مذہبی و تمدنی اختلافات بلکہ سیاسی اختلافات کی ذمہ داری اس پر عائد ہوئی ہے پروپیگنڈے کی یہ سحر کاری عرصے سے جاری ہے اور بڑی حد تک یہ پروپیگنڈہ اکثریت کے پڑھے لکھے اور برسر حکومت افراد کو متاثر بھی کر چکا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب بھی انصاف پسند ہستیاں موجود ہیں اور خود ہندوؤں میں موجود ہیں جو اردو دشمنی کے اس طوفان و ہیجان میں سیدھی راہ پہ اب تک قائم ہیں اور سچ بات بلا کسی خوف و خطر کے کہہ رہی ہیں انہیں مستثنیٰ ہستیوں میں ایک تاریخی ذکر ہستی جناب جگن ناتھ صاحب آزاد (رسالہ آجکل دہلی) کی ہے اگرچہ تقسیم ہند کے نتیجہ میں انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا اور طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑے لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی اردو کے زبردست حامی ہیں۔ اور نظم و نثر دونوں کے ذریعہ اردو کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔ تھوڑے دن ہوئے ان کی ایک نظم "اردو" کے عنوان سے دہلی کتاب گھر دہلی سے شائع ہوئی۔ وہ اس قابل ہے کہ اردو کی حامی انجمنیں اپنے اُسے شائع کرکے ملک بھر میں پھیلائیں اس میں نہ صرف اُردو کے محاسن دکھائے ہیں بلکہ فرقہ پرستوں کی جو وحدتِ تہذیب اور وحدتِ لسان کے نام پر اقلیتوں کو کچلنا ان کی تہذیب کو ختم کرنا اور ان کی زبان کو مٹانا چاہتے ہیں پوری تردید حقائق کے ذریعہ کی گئی ہے آج کل کے فرقہ پرست اور افسوس کہ ایسے حضرات کانگریس کی سی مدعی قوم پرستی جماعت میں بھی کوئی کم نہیں ہند کے مسلم عہدِ حکومت کو بدترین دور اور ہندوؤں کی غلامی کے دور سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ہمارا حق گو شاعر آزاد اپنی اس نظم میں حقیقت کا اظہار یوں کرتا ہے

سنا ہے ہند پر یوں حکمراں تھی آلِ تیموری — کہ ملک اک جسم تھا اور اس میں جاں تھی آلِ تیموری
یہ تھا دور آدمیت کا شرافت کا مروت کا — وطن میں یہ زمانہ تھا زمانہ امن و راحت کا
ہوئیں شیر و شکر اس طرح دو اقوام آپس میں — کہ پھیلیں ہر طرف ہندوستاں میں پیار کی رسمیں
اکٹھے ہندو مسلم شریکِ حکمرانی تھے — وطن کے پاسباں مل جل کے گویا پاسبانی تھے
ادھر بھی اک تمدن تھا ادھر بھی اک تمدن تھا — نظر آیا وطن کی سرزمیں پر ایک حسین نقشہ

نہ کیوں اس گلستاں میں ارتقا کے پھول پیدا ہوں جہاں پہلو بہ پہلو دو تمدن کارفرما ہوں

آگے چل کر یہ بتانے کے بعد کہ ان دونوں قوموں اور دونوں تمدنوں میں مزید ربط و اتحاد پیدا کرنے کے لئے خلوصِ قلب سے جو مشترک کوشش کی گئی اس کے نتیجہ میں نئی زبان اردو پیدا ہوئی جو دونوں قوموں کی اصل زبانوں سے کہیں زیادہ حسین اور دلنشیں نکلی۔

کیا اردو بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا مروت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا
یہ عقدہ حل کیا جس نے وہ زریں شاہجہانی تھا یہ زریں شاہجہانی تھا کہ لطف آسمانی تھا

آگے چل کر صحیح معنی میں قوم پرور شاعر اور ہندو مسلم اتحاد کا سچا علمبردار شاعر زمانہ کی تبدیل شدہ روش پر نفاق انگیز روش پر جس کی بدولت ؎

حقیقت ہو گئی پنہاں فسانے ہو گئے پیدا لڑائی اور جھگڑے کے بہانے ہو گئے پیدا
نگاہوں میں محبت کی جگہ نفرت نظر آئی تجلی گم ہوئی چاروں طرف ظلمت نظر آئی

اور رفتہ رفتہ آجکل وہ تاریک اور اتحاد شکن زمانہ آ گیا کہ ؎

نہ اب وہ پیار کی باتیں نہ وہ اخلاص باقی ہے نہ اب وہ پینے والے ہیں نہ وہ مے ہے نہ ساقی ہے

لیکن شاعر اب بھی ناامید نہیں وہ کہتا ہے کہ اب بھی ایک چیز ایسی باقی ہے جو ؎

مگر اک چیز بچھڑوں کو ملا سکتی ہے جو اب بھی ہمارے ملک کی بگڑی بنا سکتی ہے جو اب بھی

وہ چیز کیا ہے؟ وہ زبان اردو ہے جس کی بنا دورِ شاہجہانی میں رکھی گئی تھی۔

بنا رکھی گئی تھی جس کی دورِ شاہجہانی میں مگر افسوس اب یہ روش ہے جس پر بدگمانی میں
یہ وہ شے ہے جو لائے ایک مرکز پر حریفوں کو سے کہتا ہے ایک مرکز پر حریفوں کو
غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلم' پیار کی بولی

آگے چل کر شاعر نے نام لے کر نامور ہندو شعراء اور نثاروں کے نام گنائے ہیں جن پر اردو زبان کو بجا طور پر ناز ہے اور آگے چل کر اردو کی کتنی صحیح تعریف کی ہے

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بدگمانی سے کہ دھل کر آئی ہے زمزم و گنگا کے پانی سے
بیاضِ ہند میں اردو وہ اک خوش رنگ پودا ہے جسے خونِ جگر سے ہندو و مسلم نے سینچا ہے

اور آخر میں اہلِ وطن سے بلا امتیاز مذہب وملت اپیل کی ہے۔

مرے اہلِ وطن یہ آدمیت کا تقاضہ ہے
محبت کا، حمیت کا، شرافت کا تقاضہ ہے
کہ ہم پامالِ جورِ آسماں ہونے دیں اس کو
خزاں کے دور میں وقفِ خزاں ہونے نہ دیں اس کو

سیاست کانپور ۔ ۸ رجنوری ۱۹۵۴ء

جگن ناتھ آزاد کی جوہر شناسی ۔ جموں (کشمیر) میں مولانا محمد علی جوہر کی صدی تقریب کے افتتاحی اجلاس میں

جگن ناتھ آزاد صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ صحیح جوہر شناسی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ انہوں نے مولانا کی سیاسی وملّی خدمات کے ذکر کے ساتھ ان کی شاعری کی بھی جو سخن شناسانہ تحسین کی ہے اُس کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

ابھی تک محمد علی کی شاعری پر کسی نے جم کر کام نہیں کیا ہے اور شاید اسی وجہ سے اُردو کے ممتاز شعراء میں بالعموم اُن کا نام نہیں لیا جاتا لیکن اگر محمد علی جوہر کے کلام کا انتخاب کیا جائے تو ایسے اشعار جو ہماری اردو غزل کے لئے باعثِ افتخار سمجھے جاتے ہیں خاصی تعداد میں نکلیں گے ہماری اردو غزل کی تاریخ میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شعراء ایسے گزرے ہونگے جن کا ایک شعر بھی آج کسی کو یاد نہیں ہوگا لیکن ہندوستان سے اُردو سے دلچسپی رکھنے والے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے یہ شعر نہ سنا ہو۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

خطبہ کا خاتمہ آزاد صاحب نے اس استفساری فقرہ پر کیا ہے "موجودہ صدی تقریب کے دوران میں ہمارے لئے غور وفکر یہ ہے کہ محمد علی نے ہندوستان کے لئے اپنی جان دیدی۔ ہندوستان نے محمد علی کے لئے کیا کیا۔

پیغام سیادت وار صدقِ جدید لکھنؤ ۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء

محمد ایوب واقف
بمبئی

جگن ناتھ آزاد بحیثیت نظم گو شاعر

"مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے اس پار ایک چھوٹا سا شہر ہے عیسیٰ خیل۔ میں نے اس شہر میں ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کی صبح کو آنکھ کھولی۔ چار پانچ سال کی عمر میں یہ شہر مجھ سے چھوٹ گیا لیکن اس وقت کے نقوش یادوں کے شبستاں میں اس طرح جگمگا رہے ہیں گویا ابھی کل کی بات ہے۔"

(میرے گزشتہ روز و شب)

آزاد کے والدِ محترم جناب تلوک چند محروم اُن دنوں عیسیٰ خیل میں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے لیکن اُنھوں نے آزاد کو ابتدائی سبق خود ہی گھر پہ پڑھائے۔ پانچ سال بعد جب محروم صاحب کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ ہوا تو آزاد صاحب کو باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لئے وہاں داخل کرادیا گیا آزاد نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو اس وقت اُن کی عمر کوئی بارہ سال کی تھی۔ اس وقت تک اُن کی شاعری صرف اتنی تھی کہ کبھی کبھار ایک آدھ مصرع یا شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ دسویں جماعت کا امتحان اُنھوں نے میانوالی

سے پاس کیا۔ اب اُنہوں نے ڈی۔ اے۔ وی کالج راولپنڈی میں داخلہ لیا وہاں سے اُنھوں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور گارڈن کالج سے بی۔ اے کا یہیں سے اُن کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور اُن کی نظمیں اور غزلیں ملک کے معیاری رسالوں اور اخباروں میں چھپنا شروع ہو گئیں اور وہ اہلِ ذوق کے حلقوں میں روشناس ہوئے۔ عبدالحمید عدم، عبدالعزیز فطرت، اظہر امرتسری، آغا محمد صدیق ضیاء وغیرہ محروم صاحب کے قابل دوستوں میں تھے۔ اس لئے ان سب کا دستِ شفقت آزاد کے سر پر رہا۔ اسی اثنا میں آزاد صاحب نے "اقبال اور اُس کی منظر نگاری" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو وہاں کے ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا۔ یہ مقالہ یوم اقبال راولپنڈی (۱۹۳۸ء) کی تقریب میں شیخ سر عبدالقادر مرحوم کی زیرِ صدارت پڑھا گیا۔ اُنہیں یہ اس قدر پسند آیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ راولپنڈی سے لاہور لے گئے اور وہاں اُسے "ہمایوں" میں شائع کرایا۔ "ہمایوں" سے یہ مقالہ "ادبی دنیا" میں نقل ہوا۔ بی۔ اے کا امتحان اُنہوں نے گارڈن کالج سے پاس کیا۔

اب وہ راولپنڈی سے لاہور آ گئے یہاں اُن کی ملاقات مولانا تاجور نجیب آبادی سے ہوئی جن کے فیضِ صحبت اور مشوروں سے آزاد نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُنہوں نے ایم۔ اے میں داخلہ بھی لیا اور ساتھ ہی ساتھ ٹریبیون اخبار (انگریزی) اور ملاپ اخبار (اردو) میں پارٹ ٹائم نوکری بھی کر لی۔ "ملاپ" سے اُنہیں تیس روپے ماہوار ملتے تھے۔ اخبار کے مالک نے اُنہیں دس روپے ماہانہ مزید دینا قبول کیا تھا تاکہ وہ اُسے رُباعیاتِ عمر خیام پڑھائیں۔ ٹریبیون سے اُنہیں پچیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ ایم۔ اے میں وہ پڑھ رہے تھے تو ڈاکٹر محمد اقبال (وائس پرنسپل اورینٹل کالج) سید عابد علی عابدؔ، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ ایسے باکمالوں سے اُنہیں استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ اُنہیں دنوں میں سر سکندر حیات مرحوم نے "تحریکِ رفاقت"

کے نام سے ایک تحریک چلائی۔ آزاد بھی اس میں شامل ہو گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ ایک کانگریسی اخبار "جے ہند" سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد ملک میں کچھ ایسے حالات واقع ہوئے جو اُن کے لئے قیامت سے کم نہ تھے۔ یہ ۱۹۴۷ء کا بھیانک سال تھا جس میں ملک کے سیاسی رہنماؤں نے ملک کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا منظور کر لیا۔ یہ تقسیم صرف زمین کی تقسیم نہ تھی بلکہ صدیوں کی ملی جلی تقسیم کا بٹوارہ تھا۔ اس تقسیم نے لاکھوں افراد کو بے خانماں کر دیا۔ آزاد بھی اس بھیانک طوفان کا شکار ہوئے۔ سیاست کی بادِ سموم نے اُنہیں اُن کی جان سے بھی زیادہ عزیز لاہور سے اُٹھا کر دہلی لا پھینکا۔ ترکِ وطن کے اس احساس نے اُن سے زندہ دلی و شگفتگی ہمیشہ کے لئے چھین لی۔ اب اُن کے پاس اُن کی کوئی عزیز چیز باقی نہیں ہے صرف ایک غیر فانی غم ہے جسے اُنہوں نے اپنا رفیق بنا لیا ہے۔ یہ غم اُنہیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا ہے ممکن نہیں کہ اُنہیں اس غم سے نجات حاصل ہو لیکن اس غم نے اُن کے ساتھ بہت بڑا احسان بھی کیا ہے اسی کی وجہ سے اُن کی شاعری میں درد، تڑپ اور سوز پیدا ہوا ہے اسی نے اُنہیں ایک ہر دلعزیز شاعر بنا دیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر آزاد فراقِ وطن میں مبتلا نہ ہوتے تو اتنے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ہوتے بھی یا نہیں۔ بقول سیّد احتشام حسین۔

> "لاہور نے اُنہیں شعر کہنے اور شعری فضا میں رہنے کے لئے مجبور کیا تھا لاہور کے فراق نے اُن کے کلام میں گداز اور غنائیت کے عناصر پیدا کر دیئے۔ انہیں عناصر کے فنکارانہ اظہار میں اُن کی ہر دلعزیزی اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔"

آزاد ذہین وطبّاع ہیں۔ اُنہوں نے حافظہ بھی قوی پایا ہے۔ وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے تو اُنہیں حفیظ جالندھری کی کتاب "ہندوستاں ہمارا" کی ساری نظمیں یاد تھیں۔ جب امتحان میں بیٹھے تو تاریخ کے ہر سوال کا جواب انھوں نے اسی کتاب "ہندوستاں ہمارا" سے نظم میں دیا۔ اس کا چرچا سارے راولپنڈی ڈویژن

میں ہوا۔ اس سلسلے میں اُن کا ذکر اخباروں تک میں آیا۔ بہت بعد کی بات ہے آزاد ایک مشاعرے میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں تاجور نجیب آبادی نے اُن کا تعارف حافظ کلام اقبال کہہ کر کرایا۔ مشاعرے کے دوسرے روز جب سارے شعراء کھانے پر جمع ہوئے تو ایک صاحب نے آزاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ کیوں صاحب رات تاجور صاحب نے آپ کا تعارف حافظِ کلام اقبال کہہ کر کرایا تھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مثنوی "اسرارِ خودی" کس شعر سے شروع ہوتی ہے۔ آزاد نے کہا جناب آپ نے واقعی ایک مشکل سوال کیا ہے اصل میں مثنوی "اسرار خودی" کے پہلے صفحہ پر مولانا روم کے یہ اشعار درج ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور مثنوی کے پہلے باب کی ابتدا نظیری کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم !!!

اس کے بعد مثنوی شروع ہوتی ہے۔

راہِ شب چوں مہرِ عالم تاب زد گریۂ گل بر رخ من آب زد

وہ مثنوی کے اشعار سناتے چلا گئے اور سننے والے متحیر ہو کر رہ گئے۔

آزاد ایک نوجوان شاعر ہیں لیکن اسی عمر میں اُنہوں نے اردو شاعری میں وہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو اردو شعراء کو اواخر عمر میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے کئی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "بیکراں" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا "ستاروں سے ذروں تک" تیسرا "نوائے پریشاں" اس کے علاوہ "وطن میں اجنبی" اور کچھ طویل نظمیں کتابچوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں مثلاً "ماتم نہرو"، "نوحہ ابوالکلام آزاد" وغیرہ۔ آزاد نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ایک نظم گو کی حیثیت سے اُنہیں اہمیت حاصل ہے۔ اُن کی نظموں

کو اگر موضوع کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو اُن کی تقسیم اس طرح ہوگی، سیاسی نظمیں، رومانی نظمیں، وطن دوستی اور انسان دوستی کے جذبات پر مبنی نظمیں۔ آزادی کی نظموں میں سیاست کی عکاسی نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے وہ بے باکانہ طور پر سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور اُن پر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ اُن کی نظم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

سیاست کی تباہ کاریوں کی اچھی عکاسی کرتی ہے۔ "پس پردہ" میں اُنھوں نے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں کہا ہے۔

خبر نہ تھی وہ کہ سحر نظر کو جس کا شوق ہے
ہر ایک رہرو کو رہگزر کو جس کا شوق ہے
جب آئے گی تو ظلمتوں کی سیل ساتھ لائے گی
قریب تر دور تک مہیب رات بن کے چھائے گی

اُنھوں نے اپنی نظم "آزادی کے بعد" میں بے باکانہ طور پر حالات کا جائزہ لیا ہے اور دو ٹوک فیصلہ دیا ہے۔

آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا
گوشِ سرمایہ پہ یہ شورِ گراں آج بھی ہے

"زرد قطرو" میں وہ انسان کو اپنے آپ کو پہچاننے کا پیغام دیتے ہیں۔ دنیا کے لئے امن اور شانتی کی جو جنگ لڑی جا رہی ہے اس میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں

زرد قطرو
ایک نئے مضمون کی اب تمہید ہو
زرد قطرو
ایک نئی محفل کا اب سامان ہو
بے سود و کمزور نہ جانو

اپنی ہستی کو پہچانو
ذرّو!
اپنے سوزِ دروں سے چمکو اور خورشید بنو
قطرو!
اپنے عزمِ جواں سے پھیلو اور طوفان بنو

"دو کلا سے پیرس تک" میں انہوں نے اس تحریک کی اہمیت اور اس کے عالمی اثرات کا نہایت زوردار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "مرتی ہوئی سچائی" میں انہوں نے موجودہ فرسودہ نظام کے اکھڑتے ہوئے اور نئے نظام کو آتے ہوئے صاف دیکھ لیا ہے

ایک مرتی ہوئی حقیقت ہے
ایک ابھرتی ہوئی حقیقت ہے

"اے میر کارواں" میں ہمارے سیاسی رہنماؤں کو مشورہ دیا ہے۔

مغربی اُفق پہ تابہ کے نظر
اک نگاہ سوئے خاوراں بھی دیکھ

آزاد کی قومی و سیاسی نظموں میں "امید موہوم"، "سبھاش چندر بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر"، "آزاد ہند فوج" اور "بھارت کے مسلمان" خاص طور پر اہم اور قابلِ قدر ہیں اُن کی نظم "بھارت کے مسلمان" سے بڑے خلوص اور محبت اور ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے ہندی مسلمانوں کو اُن کی پرانی شان و شوکت یاد دلائی ہے اور اس کی پست ہمتی اور جمود کو دور کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ نظم ایک پُرخلوص اور دردمند دل کی پکار ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیے۔

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں　　　کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
دانش کدۂ دہر کی اے شمعِ فروزاں　　　اے مطلعِ تہذیب کے خورشیدِ درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں
بھارت کے مسلماں!

پھر کہتے ہیں۔

حافظ کے ترنم کو بسا قلب و نظر میں   رومی کے تفکر کو سجا قلب و نظر میں
سعدی کے تکلم کو بٹھا قلب و نظر میں   لے نغمۂ خیام کو جا قلب و نظر میں
یہ لحن ہو تو پھر ہند کی دنیا میں پُر افشاں
بھارت کے مسلماں

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کا مسلمان عہدِ سلف کی شان کھو چکا ہے اس کی خودداری کا آبگینہ چور چور ہو چکا ہے اس میں ذوقِ عظمت اور جوشِ شجاعت نام کو بھی باقی نہیں رہا۔ وہ علم و تجربہ سے ناواقف، نکاتِ معارف اور حیاتِ ابدی سے بے بہرہ ہو چکا ہے۔ بقول علامہ اقبال

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

آزاد بھارت کے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تم یادگارِ پاستاں ہو عدالت، شجاعت اور صداقت کے مردِ میداں ہو تم کو ذرا بھی پاسِ شرف ہے تو اپنا مقام پہچانو۔

تو دردِ محبت کا طلب گار ازل سے   تو مہر و مروت کا پرستار ازل سے
تو محرمِ ہر لذتِ اسرار ازل سے   ورثہ ترا رعنائی افکار ازل سے
رعنائیِ افکار کو کر پھر سے غزلخواں
بھارت کے مسلماں

وہ مسلمانوں کو اُن کے ہراس، کمزوری اور زوال کا سبب بھی بتلاتے ہیں اور بعد ازاں طور پر انہیں ہمت بھی دلاتے ہیں۔

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو   نا محرمِ ہر جراتِ رندانہ ہوا تو
آبادیِ ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو   تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو
ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے ساماں

مسلمانوں کو اگر صحیح معنوں میں زندہ و پائندہ رہنا ہے تو انہیں اسلام کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا ہوگا۔ قرآن کی تعلیم اور اس کے احکام پر عمل کرنا ہوگا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

آزاد بھی اس بات پر زور دیتے ہیں اور مسلمانوں کو قرآن پاک اور اس کی تعلیمات کو اپنا سچا رہنما بننے کی دعوت دیتے ہیں۔

قرآن کی تعلیم سے پھر درس بقا لے — پھر روح میں پیغام محبت کو بسا لے
گزری ہوئی عظمت کے زمانے کو بلا لے — روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے
ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انساں
بھارت کے مسلماں!

آزاد نے جس پر خلوص اور دردمندانہ طریقے سے بھارت کے مسلمانوں کو اپنی اخلاقی و معاشرتی اصلاح کی تلقین کی ہے وہ صرف بھارت ہی کے مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے قابل صد احترام ہے۔ آج کل ہندوستان میں متعصب طبقہ زور پکڑتا جا رہا ہے اور انہی کے غلط اقدام کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں امن واتحاد اور صلح و آشتی کے لئے انسان تڑپ رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اب مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں رہا ہے۔ آزاد ان متعصب اور تنگ ذہنیت کے لوگوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

میرا ہی نہیں ہے یہ گلستاں ہے ترا بھی — ہر سرو گل ولالہ و ریحاں ہے ترا بھی
اس خاک کا ہر ذرۂ تاباں ہے ترا بھی — اس بحر کا ہر گوہر رخشاں ہے ترا بھی
دامن میں اٹھا لے یہ سبھی گوہرِ رخشاں
بھارت کے مسلماں

اور پھر

گزری ہوئی عظمت کا زمانہ ہے ترا بھی　　　تمسی کا دل آویز ترانہ ہے ترا بھی
جو کرشن نے چھیڑا تھا فسانہ ہے ترا بھی　　　میرا ہی نہیں ہے یہ خزانہ ہے ترا بھی
چھوڑ اب مرے پیارے یہ گلۂ تنگیٔ داماں

بھارت کے مسلماں

آزاد نے مسلمانوں کے متعلق جتنی بھی نظمیں لکھی ہیں اُن کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب سے کتنے مانوس ہیں اور اسلام کا اُنہوں نے کتنا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہے ان کی ایک نظم "مسجدِ قرطبہ سے ویلنشیا تک" ہے۔ یہ اس وقت کی یادگار ہے جب وہ یورپ کے سفر پر گئے تھے وہاں اُنہوں نے اسلامی تہذیب کے قدیم تاریخی و مذہبی آثار کا موجودہ حالات کی روشنی میں معائنہ کیا اور جو کچھ اُنہوں نے دیکھا اور محسوس کیا اُسے مندرجہ بالا عنوان کے تحت نظم کیا۔ اس کا ایک بند حسب ذیل ہے۔

رفتارِ وقت دیکھ رہا ہوں ترا طلسم　　　طوفاں سمٹ کے آج نقطہ رہ گیا ہے جو
ڈھونڈے سے بھی نہ اس کا مجھے مل سکا سُراغ　　　تہذیب وہ کہ جو تھی زمانے کی آبرو
میخانۂ حیات کا عالم کہوں تو کیا
رند آج کم طلب ہیں تو ساقی تہی کدو

وہ قصرِ سلاطین کے بام و در کو خاموش پاتے ہیں۔ علم و ادب کی شمع فروزاں یعنی شیخ محی الدین ابنِ عربی کے مولد مرسیہ کو تاریک فضاؤں میں گم دیکھتے ہیں۔ تو اس طرح فریاد کرتے ہیں۔

کیوں ہیں خموش قصرِ سلاطیں کے بام و در　　　اے دل کہاں یہ سے کے مجھے آگیا ہے تو
اِک شمع ادب کا یہاں کیا پتا چلے　　　آساں نہیں یہاں تو خود اپنی ہی جستجو
سنسان میکدوں میں مری تشنگی کی خیر
اب وہ شراب ہے نہ وہ ساقی نہ وہ سُبو

اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" نے آزاد کے دل میں آرزوؤں کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس مسجد کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کیں لیکن علامہ اقبال نے جو تاثرات اپنی نظم میں پیش کئے ہیں آزاد کے خیالات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ اقبال نے اپنی نظم میں کہا ہے۔

قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کچھ ــــ ہے تہہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں ــــ جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلس
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں ــــ آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
زادِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں ــــ روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

لیکن آزاد کے خیالات کچھ اس طرح کے ہیں۔

مانا کہ سرد ہو ہی گئی شمعِ آرزو ــــ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات دیکھ کر
جیسے کہ جم گیا ہو رگوں میں مری لہو ــــ تیرے جہاں میں آکے مگر اے ولنشیا

رقصاں بشر کی روح جہاں تھی وہاں ہے آج
رقصاں فقط برہنگیٔ جسم چار سو

اس طرح آزاد نے پیغمبرِ اسلام کی بارگاہ میں جو سلامِ عقیدت پیش کیا ہے اس سے اُن کی فراخدلی اور وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس چھوٹی سی نظم میں اُنہوں نے آنحضرت کے تقدس اور عظمت کا اظہار نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل پڑھیئے۔

سلام اس پر کہ جس کے نور سے پُر نور ہے دنیا
سلام اس پر کہ جس کے نطق سے مسحور ہے دنیا
سلام اس پر جلائی شمعِ عرفاں جس نے سینوں میں
کیا حق کے لئے بیتاب سجدوں کو جبینوں میں
سلام اس پر فقیری میں نہاں تھی جس کی سلطانی
رہا زیرِ قدم جس کے شکوہ و فرِّ خاقانی

اسی طرح اُنہوں نے "دہلی کی جامع مسجد" پر جو نظم لکھی ہے اس سے بھی اُن کی مسلم دوستی اور اسلامی تہذیب سے شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے۔

اُن کی ایک اور اہم نظم "اردو" ہے جس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اردو ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ تہذیب کا نتیجہ ہے۔ اس کو تباہ کرنا رواداری اور انصاف کے خلاف ہے بلکہ خود اپنی تہذیب کو مٹانے کے برابر ہے۔ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو اردو کو ہندوستان کی زبان ماننے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی زبان بن چکی ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی بڑی افسوسناک بات ہے کہ ہندوستان کی جمہوری حکومت بھی اس زبان کے ساتھ بے اعتنائی برت رہی ہے۔ حامیانِ اردو کی طرف سے متعدد بار تحریکیں اُٹھیں۔ اور یہ کوشش کی گئی کہ اردو کے ساتھ حکومت اور عوام کا جو غلط رویہ ہے وہ تبدیل کیا جائے لیکن ابھی وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں آزاد ان لوگوں کو جو اُردو زبان کو پرائی زبان سمجھ کر اس سے نفرت کرتے ہیں اور اُسے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، مخاطب کر کے خفگی اور درد بھرے لہجے میں کہتے ہیں

اے اہلِ وطن یہ داستاں اپنی ہے　　اپنی ہے یہ رودادِ فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹاتے ہو دیوانو! 　　غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

آزاد کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندوستان اور اس کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے بہت بڑا کام انجام دیا ہے اُن کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے لوگ اس زبان کو حقیر نظر سے دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی تہذیب سے عداوت رکھتے ہیں ایسے لوگوں سے مخاطب ہو کر وہ کہتے ہیں۔

اردو سے یہ فقدانِ محبت کیوں ہے　　اپنی تہذیب سے عداوت کیوں ہے
تھے ہند کے فخر غالب و داغ و انیس　　پھر اُن کی زبان سے یہ نفرت کیوں ہے

وہ فرقہ پرست جماعتوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں جو اردو کو غیر کی زبان سمجھتے ہیں۔

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی　　یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلم پیار کی بولی

صداقت و اصلیت کے عناصر سے پُر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ پوری نظم میں تسلسل روانی اور اثر ہے۔ اُن کی دوسری طویل نظم "پنجاب" ہے جس میں انھوں نے پنجاب کی تباہی و بربادی کا بہت المناک اور موثر نقشہ کھینچا ہے ملک کی تقسیم کا پنجاب پر جو اثر پڑا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

مٹی ہوئی تقسیم، محبت ہوئی رخصت　　اخلاص گیا، مہر و مروت ہوئی رخصت
چہروں سے ہنسی دل سے صداقت ہوئی رخصت　　پنجاب کی دیرینہ شرافت ہوئی رخصت

قیمت سے جو دن بزم المناک کے بدلے
تقسیم کی حد دل پہ کھنچی خاک کے بدلے

اور یہ واقعہ اپنے ہی سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس پر آزاد نے یوں افسوس کا اظہار کیا ہے۔

خود باغ کے مالی جو ہوئے باغ کے دشمن　　اس خاک پہ ہر ذرہ ہوا شعلہ بدامن
اپنا ہی چمن زار تھا اپنا ہی نشیمن　　شاداں ہوا جلتا ہوا دیکھا جو یہ گلشن

اس باغ کا تھا دھرم بھی ایماں بھی محافظ
ہندو بھی محافظ تھا مسلماں بھی محافظ

اور ہندوستان کی تاریخ میں یہی وہ زمانہ ہے جس میں انسان نے حیوان کا لباس پہن کر نسوانیتِ زن پہ تلوار کھینچی تھی اس کا ماتم آزاد یوں کرتے ہیں۔

اس طرح ہوا گرم عمل عالم پیکار　　نسوانیتِ زن پہ اُٹھی مرد کی تلوار
مُردے کئے پڑے سڑکوں پہ انبار در انبار　　معصوم کی لاشوں سے بھرے کوچہ و بازار

اے دیدۂ افلاک کبھی یوں بھی ہوا ہے
اے آدم بیباک کبھی یوں بھی ہوا ہے

آزاد کی اس نظم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اس میں خلوص ہے درد ہے محبت ہے۔ یہ نظم حقیقتاً ہر شریف ہندوستانی کے دل کی ترجمان ہے۔

آزاد نے چند رومانی نظمیں بھی کہی ہیں۔ "ایک منظر" میں کتنے حسین انداز میں منظر نگاری کی ہے۔

وہ صبح کے دامن میں چھلکتے ہوئے انوار — وہ شام کے ماتھے پہ چمکتا ہوا تارا

لوگوں سے جو سنتے ہیں کہ جنت بھی ہے کوئی — ممکن ہے کسی نے ہو یہی عکس اتارا

سرمست ہوا ہے کہ ہے چلتا ہوا جادو

بدمست گھٹا ہے کہ جنوں کو ہے اشارا

وہ قدرتی مناظر کو اتنے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہم پر ایک افسوں سا طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کی ایک مشہور نظم "کنارِ راوی" کے چند اشعار نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں۔

ہر چیز چاندنی سے زرپوش ہو رہی تھی — گردوں سے ماہِ تاباں سونا لٹا رہا تھا

دو موسموں میں باہم تھا اتصال گویا — اک وقت آ رہا تھا اک وقت جا رہا تھا

راوی کے پل کے نیچے تھیں نغمہ بار لہریں — لہروں کا راگ دل کو بیخود بنا رہا تھا

موجوں سے ہلکے ہلکے گرداب پڑ رہے تھے

منظر یہ میرے دل میں طوفاں اٹھا رہا تھا

اسی طرح انہوں نے "دل کے کنارے" اور "ایک صبح" میں بھی بڑی اچھی طرح منظر نگاری کی ہے۔ دورۂ دکن کے سلسلے میں "عثمان ساگر" اور "مدراس کے ساحل پر" اُن کی نہایت عمدہ نظمیں ہیں۔ جن سے اُن کی شاعرانہ قدرت اور دلکش اندازِ بیان کا پتہ چلتا ہے۔ اپنی بیوی کی وفات کے سلسلے میں "شکنتلا" نامی نظم کہی ہے اس نظم میں اُن کا اندازِ بیان بہت رومانی اور موثر ہے۔ "ایک آرزو" میں تو اُن کی شاعری فن کے کمال تک پہنچ گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جن سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

تو کہاں ہے اے مرے گلزارِ ہستی کی بہار
قسمت بیدار ہر دردِ نہاں کی چارہ کار

کیا صبا بن کر کسی گلشن میں آوارہ ہے تو
یا بسیرا کر لیا پھولوں کے دل میں مثلِ بو

یا فلک پر ہے کسی تارے کی تابانی میں گم
یا مرے افکارِ روشن کی درخشانی میں گم

منزلِ آرام تو میرے قلب کے ایواں میں ہے
یا کہیں آسودہ میرے خاطرِ ویراں میں ہے

تیرے دل کو بھا گئی ہے کوئی خوابوں کی زمیں
یا پسند آئی ہے آوارہ سحابوں کی زمیں

ہو گئی تو آبشاروں کے ترنم میں کہیں
یا ٹھکانہ کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں

اور آخیر میں رفیقۂ حیات سے دلی محبت اور دردمندی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند
اے کہ اک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

ہو سکے تو میری خلوت گاہ میں پھر آ کبھی
خاطرِ اندوہ گیں کو شادماں فرما کبھی!

مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ "ایک زمیں کے نام"، "خونِ ادب"، "فن کار"، "جسم اور روح"، "سیر محبت"، "زندگی"، "عزائم"، "منزل ہے کہاں تیری" وغیرہ آزاد کی دوسری اچھی نظمیں ہیں اور توجہ سے پڑھی جانے کی متقاضی ہیں۔ آزاد کی نظموں کا سب سے نمایاں وصف اُن کی انسان دوستی ہے۔ اُن کو فرقہ پرستی کا تلخ تجربہ ہے ان کو جشنِ آزادی کا ہنگامہ بھی یاد ہے جب انسانیت حیوانیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا۔ سہاگن کو بیوہ بنایا جا رہا تھا۔ کیونکہ آزاد خود اس حیوانیت کا شکار ہوئے۔ اس لئے اس بھیانک طوفان کے بعد اُن کے دل میں انسانیت کا درد اور بڑھ گیا۔ لیکن وہ وحشی انسانوں سے متنفر نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُن سے اور زیادہ محبت کرنے لگے ہیں۔ اُن کا مجموعۂ کلام "وطن میں اجنبی" اس جذبہ کا ترجمان ہے۔ اُن کی نظم "سیر پاکستان" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے اب بھی کتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ کیسے پُر درد انداز میں اپنے بچھڑے ہوئے وطن کا ذکر کرتے ہیں۔

اے وطن اے مخزنِ اقطاعِ جہاں
خاک تیری سجدہ گاہِ قدسیاں

حق پرستوں کے تہذیب والوں کے وطن
دہر کے روشن ضمیروں کے وطن

فکر [illegible] کا مسکن ہے تو
قلبِ حق آگاہ کا مسکن ہے تو

تو ہے نانک کی نظر سے فیضیاب
قطبِ دوراں کے اثر سے فیضیاب

آزاد کو اپنا عزیز وطن مجبوراً چھوڑنا پڑا اور اس کا غم انہیں آج تک ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعر غور طلب ہے۔

اس غم میں مری روح پریشاں ہے ابھی تک ۔۔۔ اک درد سا احساس میں غلطاں ہے ابھی تک

اور جب انہیں پھر وطن جانے کا موقع ملتا ہے تو "واہگہ کی سرحد پر" ان کے تاثرات کچھ اس طرح شعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ہیں آج رقص میں عہدِ طرب کے میخانے ۔۔۔ چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
جہانِ شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے ۔۔۔ یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشک رواں ۔۔۔ ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے !!

وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

لیکن ان کو غلط فہمی تھی ان کا وطن ان کی فریاد پر تڑپ اٹھا اور اس نے ان کو وطن واپس لوٹ آنے کی دعوت دی۔

وطن کو چھوڑنے والے وطن کو واپس آ ۔۔۔ غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ
اداس آج بھی ہیں پھول بن کے چہرہ ہائے حسیں ۔۔۔ تو اے بہارِ چمن پھر چمن کو واپس آ
(شکوہ پاکستان)

اور وہ جب لاہور پہنچتے ہیں تو یہ اشعار ان کی زبا

اور وہ جب لاہور پہنچتے ہیں تو یہ اشعار ان کی زبان پر آتے ہیں۔

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں ۔۔۔ چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا ۔۔۔ وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

آزاد نے اپنے وطن پنجاب میں ایک عجیب و غریب حسن دیکھا ہے جس کی مثال نہیں

اور کہیں نہیں ملتی۔ پنجاب کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

فردوس کا عالم مرے پنجاب کی دنیا
تسکین کے آرام کے اسباب کی دنیا
سیلابِ محبت کے وہ گرداب کی دنیا
دردو تپش و سوز و تب و تاب کی دنیا

اُن کا وطن اولیاء فقراء کی سجدہ گاہ رہا ہے حق پر سر کٹا دینے والے مجاہدوں کی آرام گاہ ہے اس کی خاک میں نور کا جوہر ہے یہاں کے لوگوں میں عقل و فہم کا دریا رواں ہے۔ وہ شجاعوں اور بہادروں کا گلشن دلنشیں ہے۔ سوہنی اور مہینوال کی بزم حسیں ہے ہیر اور رانجھے کی زمین ہے جب وہ اپنے اس پیارے وطن سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئے ہیں تو اُن کے تاثرات یہ ہوتے ہیں۔

رُک نہ سکے کہیں قدم چھوڑ کے گھر کے بام و در | جچ نہ سکے نگاہ میں اور کہیں کے باغ و زاغ
اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر | اپنی نظر کا علاج اپنی نظر کو کیا کہوں

وطن کو خیرباد کہہ کر جب اُن کے قدم ایک پرائی جگہ کی طرف اُٹھتے ہیں تو اس طرح فریاد کرتے ہیں۔

یا جیسے چلے دُرِ عدن کانِ عدن سے | جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے
آزاد ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے | آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے

جس گھر کی فضاؤں میں بڑھے اور پلے ہم
اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

"مزارِ اقبال پر"، "جشنِ آزادی"، "نوائے پریشاں"، "مجبوری" وغیرہ ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ "مجبوری" میں شاعر نے نہ صرف اپنی مجبوری کا اظہار کیا ہے بلکہ عہدِ حاضر کی سیاست پر لطیف طنز بھی کیا ہے۔

اک مسافر آج اپنے گھر میں آسکتا نہیں | تجھ پہ اے دورِ سیاست آفریں صد آفریں
اس چمن میں جاکے اب وہ گیت گا سکتا نہیں | جس چمن میں اس نے سیکھا بات کرنے کا طریق

آزاد نے کچھ عظیم شخصیات کی وفات پر مرثیے بھی لکھے ہیں جن میں ماتمِ نہرو و
نوحۂ ابوالکلام آزاد خصوصاً قابلِ تحسین ہیں۔ ماتمِ نہرو میں انہوں نے جواہر لال نہرو کے
متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کے بلند کردار اور اعلیٰ قدر و منزلت
کا اندازہ ہوتا ہے وہ انسانیت و اخوت کے ایک بڑے محسن، لامذہبی میں دولتِ
ایمان سے سرفراز۔ قوم و ملک کے پرخلوص اور سچے خادم، میدانِ سیاست کے
مردِ کامل، صلح و آشتی کے پیغامبر علم و ادب کے آفتاب تھے۔ ان کی وفات نے
کسی ایک قبیلہ یا طبقے کو مغموم نہیں کیا بلکہ وہ پوری دنیا کے لئے رنج و غم کا باعث
بنی جس کا اظہار آزاد یوں کرتے ہیں۔

ہندو کے دل سے اور نہ مسلماں کے دل سے پوچھ — اپنا الم نہ کفر نہ ایماں کے دل سے پوچھ
حالِ تباہ تباہ بس انساں کے دل سے پوچھ — گنگا کے دل سے پوچھ نہ ایراں کے دل سے پوچھ

ہندو کی موت ہے نہ مسلماں کی موت ہے
تیری جو موت ہے وہ اک انساں کی موت ہے

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد جب جہانِ فانی سے رحلت فرماتے ہیں تو آزاد
عقیدت اور محبت کے آنسو بہاتے ہیں۔ مرحوم ہندوستان کے ان مایۂ صد ناز اور صد فخر
فرزندوں میں سے تھے جن کی کوششوں اور کاوشوں سے نہ صرف ملک کو بلند مقام
حاصل ہوا بلکہ ہندوستانی ادب اور کلچر کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ انہوں نے جنگ
آزادی میں ایک سچے محبِ وطن کی حیثیت سے جو حصّہ لیا اور جو قربانیاں دیں۔
انہیں ہندوستان کے لوگ کبھی فراموش نہیں کر سکتے ان کے قلم کی جولانیوں
نے زبان و ادب کو وہ جلا بخشی جس کی مثال صدیوں تک ڈھونڈنے سے بھی نہ مل
سکے گی۔ انہوں نے کلام اللہ کے باریک نکات سے لوگوں کو روشناس کرایا اسلام
کی وحدانیت اور اس کے زندۂ جاوید کارناموں کے گن گائے۔ ان کی وفات ایک
عظیم سانحہ تھی جس کا اعتراف آزاد یوں کرتے ہیں۔

اے وطن تیرا امیرِ کارواں جاتا رہا — ناز تھا جس پر وہ گنجِ شائگاں جاتا رہا

داستاں کیسی کہ زیب داستاں بنتا رہا | اے کلامِ اللہ تیرا ترجماں جاتا رہا
جس کی تحریروں سے روشن تھی شبِ افکارِ شرق
آج ٹھنڈا ہے وہ سوزِ سینۂ احرارِ شرق

ہندوستان اور پاکستان کی مسلح آویزش سے متعلق بھی آزاد نے چند نظمیں کہی ہیں جن میں اُنہوں نے کسی طرح کی جانب داری سے کام نہیں لیا بلکہ دونوں کو اپنے آپسی نازعات ختم کرنے اور صحیح راستے پر گامزن ہونے کی دعوت دی ہے۔ وہ ایک سچے ہندوستانی کی حیثیت سے پاکستان سے خطاب کرتے ہیں۔ اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو پاکستانی عوام سے کوئی عناد نہیں ہے اور نہ ہم اُن سے کسی طرح کی عداوت رکھتے ہیں ہم تو امن کے خواہاں ہیں اور ہمارے پیشِ نظر جنگ وجدل یا کسی طرح کا فساد نہیں ہے بلکہ ہم اخوت اور محبت کا رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں جس پر ہم ہمیشہ اور ہر حالت میں کاربند رہے ہیں اور آج بھی ہم اپنے نصب العین سے ذرہ برابر بڑھے نہیں ہیں "دیارِ پاک کے اہلِ قلم سے" میں اُنہوں نے تمام پاکستانی ادیبوں اور شاعروں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہر بات کو صحیح اور معقول زاویۂ نگاہ سے دیکھیں اور وہ اس بات کے بھی متمنی ہیں کہ پاکستان کے اہلِ قلم اپنی پچھلی تاریخ پر غور کریں کہ وہ ہمیشہ سے جمہوریت کے ہمنوا رہے ہیں اور آج اگر پاکستان ترقی کی راہ پر چلنا چاہتا ہے تو اُسے جمہوریت کا بہر حال استقبال کرنا ہوگا وہ اس سے کنارہ کش ہوکر اپنا بھلا نہیں کرسکتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ نظم کہنے کے لئے وہ خاص کر انہیں موضوعات کو چنتے ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح سماج اور انسان سے تعلق ہوتا ہے۔ اُن کی نظمیں اس اعتبار سے قابلِ اعتبار ہوتی ہیں کہ پہلے وہ موضوع کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر غور وخوض کے بعد ان پر اشعار کہتے ہیں۔ موجودہ نظم گو شعراء میں وہ امتیازی درجہ رکھتے ہیں ان کی نظمیں اس لحاظ سے اور مقبول ہیں کہ وہ زبان وبیان کی غلطیوں سے اکثر وبیشتر پاک ہوتی ہیں۔ اُن کے یہاں کلام

کی پختگی کے ساتھ خوبصورت اسلوب، زبان کی صحت، خیال کی پاکیزگی، طرزِ ادا کی برجستگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے خلوص اور اُن کی آفاقی محبت نے اُن کی شاعری کو جاندار بنا دیا ہے وہ حیوانیت کو انسانیت میں، خلفشار کو تنظیم میں تبدیل کرنے کا محکم عزم رکھتے ہیں، اور وہ جب تک سماجی خلفشار کو تنظیم میں تبدیل نہ کریں گے اپنی شاعری کے موضوع میں کسی طرح کی تبدیلی نہ پیدا ہونے دیں گے۔

جب تک اے دوست یہی ہے مری دنیا کا نظام
میرا موضوع کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا

زمانے کو انسانیت و محبت کا پیغام سنانا اُن کا سب سے بڑا شیوہ ہے اور اس کے بدلے انہیں تاج اور تخت ہی کیوں نہ ملتے ہوں لیکن وہ خاطر میں نہ لائیں گے بلکہ وہ دُھن میں صدق دل سے لگے رہیں گے۔

اپنا پیغام زمانے کو سنانے کے عوض
تاج اور تخت بھی ملتے ہوں تو انکار کریں

وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ دنیا کا انسان اپنی عظمت کو سمجھے۔ اپنے دل کو ہر طرح کی کدورت سے پاک رکھے۔ صدق و صفا، رحم و کرم، مہر و مروت سے اپنا معاملہ رکھے۔ اگرچہ آج کی دنیا میں یہ چیزیں مشکلات اور ناممکنات میں گنی جانے لگی ہیں۔ لیکن آزاد دنیا کے انسانوں سے نا امید نہیں ہیں انہیں یقین ہے کہ انسان کے اندر کتنی بھی خامیاں ہوں پھر بھی وہ انسان ہیں۔ اللہ نے اس کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ودیعت کی ہے کل اس کا ضمیر اُسے صحیح راستے پر لیجائے گا اور جس روز انسان کو یہ کامیابی نصیب ہو جائے گی، آزاد کی روح کو ابدی سکون حاصل ہو جائے گا

۱۹۷۷ء

غلام رسول زبیرز
سری نگر

بچوں کی نظمیں

اُردو زبان کے نامور شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کی نظموں کا یہ مجموعہ ترقی اُردو بورڈ وزارت تعلیم سماجی بہبود مرکزی سرکار نے شائع کیا ہے۔ یہ بورڈ ابتک بہت سی نصابی کتابیں علمی، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنہیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب "بچوں کی نظمیں" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد کی سولہ نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ جو سب کی سب بچوں کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھ کر کہی گئی ہیں اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ بچوں میں ان کو وہ مقبولیت حاصل ہوگی جس کی یہ ہر لحاظ سے مستحق ہیں۔

بچوں کے لئے اس سے پہلے بھی برگزیدہ شعراء نے نظمیں کہی ہیں ان میں علامہ اقبال جناب تلوک چند محروم اور اندر جیت شرما کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے بچوں کی زبان میں بچوں کے لئے نظمیں کہی ہیں۔ جن شعراء نے بڑوں کی زبان کے بدلے بچوں کی زبان استعمال کی ہے ان میں اسمٰعیل میرٹھی اور حفیظ جالندھری شامل ہیں۔ جناب جگن ناتھ آزاد کی نظموں کے اس مجموعے میں بھی ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جو بہت آسان ہے اور جس کو سمجھنے میں بچوں کو کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی۔

آزاد صاحب نے ان نظموں کے لئے موضوعات منتخب کرنے میں بچوں کی نفسیات

اور دلچسپی کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "تماشے والا" جو میلوں اور تہواروں پر بچوں کی دل چسپی کا مرکز بنتا ہے۔ "جادو والا" ایک اور نظم ہے۔ "ایک نصیحت" شیخ سعدی کے چند فارسی اشعار کا ترجمہ ہے اور یہ کام آزاد صاحب نے جس سلیقے سے انجام دیا ہے اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اسی طرح "عید" "دسہرہ" اور "دیوالی" کے تہواروں پر بڑی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے تہواروں سے بچوں کو بڑی دل چسپی ہوتی ہے۔ "چمکا ایک ستارا" میں گاندھی جی کی ایک سیاسی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے اور بچوں کے ذہن کو مدِ نظر رکھ کر آزاد صاحب نے اُن کے فلسفۂ حیات اور تعلیمات کو جس خوبی سے واضح کیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔

(روزانہ خدمت سری نگر)

محمد امین بچھ

سری نگر

ملک کے نامور صاحبِ علم شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کی سولہ نظموں کی ایک خوشنما کتاب بعنوان "بچوں کی نظمیں" حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم کے ترقی اردو بورڈ نے شائع کر کے اردو میں بچوں کے ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے جس پر بورڈ کے لئے۔ جبانہ آفرین کے الفاظ بے ساختہ زبان پر آتے ہیں۔ ریاستی محکمۂ تعلیم کو چاہیئے کہ وہ اس دیدہ زیب کتاب کو ہزاروں کی تعداد میں پرائمری اسکولوں میں تقسیم کر دے۔

السنہ اورپا میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بالخصوص اور السنہ میں جاپانی زبان میں بچوں کے ادب پر ہزاروں کتابیں بڑے سربرآوردہ دانشوروں اور شعراء نے لکھی ہیں جس سے بچوں کا ادب ان ملکوں میں مالا مال ہے۔ اردو کا دامن ابھی تہی ہے۔ اردو کے دانشوروں کا ادب کے اس اہم شعبہ کی طرف متوجہ ہونا وقت کی پکار ہے۔ آزاد صاحب نے اردو کی اس تہی دامنی کو ملحوظ رکھ کر اپنے سحر کار قلم سے اُسے موتیوں سے بھرنا شروع کر دیا ہے۔ اقبال کی کہانی کے ساتھ بچوں کی نظمیں منصۂ شہود

پرا گئی ہیں

آزاد صاحب جہاں اونچے علمی مسائل پر بڑی کامیابی کے ساتھ قلم اُٹھانے کی اہلیت کے مالک ہیں وہاں وہ بچوں کی زبان میں نظمیں لکھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں "تماشے والا" "جادو والا" "چمکا ایک ستارا" "چاندنی اُتری پھلواری میں" ایسی نظمیں ہیں جنھیں بچے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ گرمیاں آگئیں، ہم بادل کہلاتے ہیں، کسانوں کا گیت، عید اور دسہرہ جیسی نظموں سے بچے کچھ سیکھتے ہیں دیوالی جیسی گمنامی فیچر سے ایک طرف سیکولرازم کی جوت بچوں کے دلوں میں جلتی ہے تو دوسری طرف اُن کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب علمی اور تاریخی باتیں دل خوش کن نظم میں بچوں کو سمجھائی جائیں تو بڑی آسانی سے وہ اُنہیں سمجھ لیتے ہیں۔ دیس ہوا آزاد جیسی نظموں سے بچوں میں حب الوطنی اور حب قومی کا جذبہ اُجاگر ہوتا ہے الغرض ان سولہ نظموں میں ہلکے پھلکے انداز بیان سے بچوں کو نصیحت آمیز باتیں بتائی گئی ہیں ان کے اندازِ تخیل کو ملحوظ رکھ کر جس پر ہمیں آزاد صاحب کے فنکارانہ قلم کی داد دینا پڑتی ہے اور ہم صدق دل سے دعا گو ہیں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(روزانہ خدمت سری نگر)

خواجہ ثناءاللہ بٹ

جگن ناتھ آزاد نے حال ہی میں اپنی "بچوں کی نظمیں" کا ایک مجموعہ شائع کرایا ہے شائع کرنے والا ادارہ ہے۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔۔۔ نام رکھا ہے۔ بچوں کی نظمیں آزاد صاحب پچھلے دس برس سے خیابانِ جنتِ کشمیر میں مقیم ہیں اور شاعر ہونے کے ناطے کشمیر میں ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان و پاکستان میں جانے پہچانے جاتے ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کشمیر میں مقیم ہونے سے اُن کی شاعری میں ایک تازگی سی پیدا ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال کی پیروی میں آزاد صاحب نے بھی بچوں کی نظمیں لکھی ہیں اُن کی "بچوں کی نظمیں" میرے سامنے ہے۔ اس کتابچے کا ٹائیٹل بڑا خوبصورت ہے کتابت

بڑی لاجواب ہے اور نظمیں بڑی پُر لطف ہیں یقیناً بچے خوب چٹخارے لے لے کر انہیں پڑھیں گے۔ خود مجھے بھی اس عمر میں انہیں پڑھ کر لطف سا آیا۔ اُن کے اس چھوٹے سے کتابچے میں کُل سوّلہ نظمیں ہیں — "تماشے والا" سے لے کر "دیس ہوا آزاد" تک ان میں عید بھی ہے دسہرہ بھی اور دیوالی بھی پہیلیاں بھی اور نصیحت بھی۔ قیمت صرف دوّ روپے رکھی گئی ہے اور آزاد صاحب نے اس میں جو نظمیں شامل کی ہیں وہ نہایت سلیس اُردو میں ہیں۔ پہلی نظم "تماشے والا" ہے جسے میں اپنے قارئین کی لئے یہاں پیش کرتا ہوں۔

آؤ بچو! دوّ پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو

نظّارے دکھلانے والا — جگ کی سیر کرانے والا

ڈبہ اپنے سر پر اُٹھائے — گلی گلی میں جانے والا

آج تمہارے گھر کے باہر رنگ جمانے آیا

دوّ پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا

آؤ بچو! دوّ پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو

اُس نے ڈبہ لا کر رکھا — ہم نے اک شیشے میں جھانکا

تصویروں پر تصویریں ہیں — بلّی، کُتّا، طوطا، مینا

کھیل تماشے والا اک سنسار بسانے آیا

دوّ پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا

("آفتاب" سری نگر)

غلام محمد جیلانی

مدیر "سری نگر ٹائمز" — سری نگر

ترقی اُردو بورڈ بالغوں کے لئے تو اردو کتابیں چھاپ ہی رہا ہے اس نے اب

بچوں کے لئے بھی کتابیں چھاپنے کا کام ہاتھ میں لے کے اردو دنیا کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس وقت اس ادارے کی چھپی ہوئی ایک نئی کتاب ہمارے سامنے ہے جو اردو کے نامور شاعر جگن ناتھ آزاد کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی نظموں پر مشتمل ہے ہم اس وقت تک جگن ناتھ آزاد کو ایک مستند شاعر، نقاد اور ماہر اقبالیات تو سمجھتے ہی تھے لیکن اُن کی شاعری کا یہ پہلو ہماری نظر سے پوشیدہ تھا کہ وہ بچوں کے لئے آسان موضوعات پر آسان انداز بیان میں نظمیں کہنے پر بھی قادر ہیں۔ یہ کتاب "بچوں کی نظمیں" جو آزاد کی سولہ دلکش نظموں پر مشتمل ہے، بچوں ہی کی زبان میں ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے موضوعات ہیں "تماشے والا" اور "کلکتہ میل" سے لے کر عید، دسہرہ اور دیوالی تک سب شامل ہیں۔ ہمارے یہاں بچوں کے لئے نصیحت آمیز نظموں کی تو کمی نہیں لیکن اُن نظموں کی یقیناً کمی ہے جو بچوں کی اپنی زبان میں ہوں۔ رواں دواں بحروں میں ہوں اور جن کے لئے بچوں کو لغت کا سہارا نہ لینا پڑے۔ جگن ناتھ آزاد کی یہ چھوٹی سی کتاب انہی خوبیوں سے ملا ہے۔ کتابت اور طباعت دونوں معیاری ہیں کاغذ عمدہ اور ڈسٹ کور نہایت دیدہ زیب ہے ہم اپنی حکومت کے محکمہ تعلیم سے سفارش کرتے ہیں کہ اس کتاب کو اسکولوں کے چوتھے اور پانچویں درجہ میں نصاب کے طور پر شامل کرے تاکہ ریاست کے بچے کم عمری میں سلیس اور معیاری اُردو سے آشنا ہو سکیں۔

(سری نگر ٹائمز۔ سری نگر)

رضوان احمد

بچوں کے لئے سب سے پہلے خوبصورت ادبی و تفریحی کتابیں "مکتبہ جامعہ" نے چھاپنی شروع کی تھیں یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب بچوں کے لئے کورس کی کتابوں کے علاوہ اُن کے مذاق اور ان کی دلچسپی کے لئے کسی بھی اشاعت گھر سے کوئی کتاب نہیں چھاپی جاتی تھی یا اگر کچھ لوگ پری اور دیو کی کہانی کی کتابیں یا کتابچے چھاپتے بھی تھے تو وہ اس معیار اور اس پایے کے نہیں ہوتے تھے کہ اُن کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ بات بہت اہم اور شکریہ کے لائق ہے کہ ترقی اُردو بورڈ نے بھی بچوں کی کتابوں کی اشاعت

میں پیش دستی کی ہے۔ اور بہترین آرائش و زیبائش کے ساتھ انہیں پیش کرنے کا کام شروع کیا ہے۔

"بچوں کی نظمیں" جناب جگن ناتھ آزاد کی سو نظموں کی مجموعہ ہے اس میں تماشے والا، ہم باولی کہلاتے ہیں، کسانوں کا گیت، چکا ایک ستارا، دلیس ہوا آزاد مواد و ہیئت کے اعتبار سے بہت کامیاب نظمیں ہیں

امید ہے کہ بچے انھیں کافی ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔ زیبائش اور تو "ترقی اردو بورڈ" کا طرۂ امتیاز ہے۔

(عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ)

طفرمعراج

پچھلے چند برسوں کے دوران اُردو کے فروغ کے سلسلے میں سرکاری سطح پر جو قابلِ قدر اقدامات کئے گئے ہیں اُن میں مرکزی وزارتِ تعلیم کے تحت ترقی اردو بورڈ کا قیام خاص طور سے قابلِ ستائش ہے۔ اس ادارے کی جانب سے ابتک کئی مطبوعات شائع ہوئی ہیں۔ جن میں سائنس، فلسفہ، تاریخ اور دیگر موضوعات پر دوسری زبانوں کی اہم تصانیف کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتابچہ بورڈ کے اس سلسلۂ مطبوعات کی تازہ ترین کڑی ہے۔ جو بچوں کے ادب میں واقعی ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے جس ملک کے دانشور اور شاعر اپنی نگارشات سے بچوں کے ادب کو مالا مال کریں۔ اسی ملک کا ادب ہمہ جہت ترقی یافتہ ادب کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ مغربی اقوام کے دانشوروں اور شاعروں نے اس کی طرف پوری توجہ دی ہے۔ اسی لئے اُن کے بچوں کے ذہن پختہ اور دل و دماغ صالح ہوتے ہیں اور وہ ذہنی اور علمی ترقی کے مدارج بڑی آسانی سے طے کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد کے برسوں میں قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادبی شعبوں میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے۔ گزشتہ تین برسوں میں ملک کے ادب نے ہر پہلو ابھتی دقتوں کو سر کرنے کی تگ و دو میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

مگر ہمارے بچوں کا ادب ابھی تہی دامن ہے جو ملک کے دانش وروں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ ملک کے نامور دانش ور اور صاحبِ فکر شاعر جناب جگن ناتھ آزاد نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے بچوں کی نظمیں لکھی ہیں۔ بچوں کی زبان میں اور انہی کے موضوعات پر۔ جنھیں ترقی اردو بورڈ نے ایک دیدہ زیب کتابچے کی صورت میں شائع کیا ہے ہماری ریاست کے محکمہ تعلیم کا یہ فرضِ اولین ہے کہ وہ اس خوشنما کتابچہ کو ریاست کے سارے اسکولوں میں تقسیم کرائے تاکہ ریاست کے بچے اس سے مستفید و محفوظ ہوں۔

آزاد صاحب اور اُن کے پبلشر حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کو ہر وہ شخص مبارکباد کہے گا جو اس خوشنما کتابچہ کو دیکھے گا۔ آزاد صاحب کو فکری کاوشوں کے لئے اور ترقی اردو بورڈ کو اس کی دیدہ زیب طباعت کے لئے۔

(روزنامہ "آئینہ" سری نگر)

ترقی اردو بورڈ ہمارے ملک کا ایک ایسا ادارہ ہے جسے معیاری اور خوبصورت کتابیں چھاپنے میں کمال حاصل ہے۔ زیرِ نظر کتاب "بچوں کی نظمیں" جو اُردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کی نظموں کا مجموعہ ہے اسی ادارے نے نہایت دیدہ زیبی کے ساتھ شائع کی ہے چار رنگوں میں چھپے ہوئے ڈسٹ کور کا ڈزائن نالنا کسی کشمیری قالین سے لیا گیا ہے۔

سولہ نظموں کا یہ مجموعہ بچوں کے شعری ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے دراصل جہاں تک بچوں کے شعری ادب کا تعلق ہے اقبال محمد اسماعیل میرٹھی اور تلوک چند محروم کے بعد ایک طرح کا سناٹا چھا گیا تھا۔ حفیظ جالندھری بھی جہاں تک اس صنعت شعر کا تعلق ہے ایک زمانے سے خاموش ہیں۔ اول اول اس سناٹے کو پروفیسر شفیع الدین نیّر نے توڑا۔ مقامِ مسرت ہے کہ جگن ناتھ آزاد بھی بچوں کے لئے اپنے قلم کو جنبش میں لائے ہیں ورنہ ہمارے ملک میں بڑے شاعروں اور ادیبوں کو تو بڑا ادب پیدا کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔

حالانکہ سامنے کی بات ہے کہ جب بچے ہی ادب سے ناآشنا ہوں گے تو وہ بچے بڑے ہوکر ادب سے کیا لگاؤ پیدا کر سکیں گے۔ آسان اور دلکش زبان میں اس مجموعے کی اشاعت پر ہم جگن ناتھ آزاد اور ترقی اردو بورڈ دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔
ہماری حکومت کے محکمۂ تعلیم کو چاہیے کہ "بچوں کی نظمیں" لائبریریوں کے لئے اس کتابچہ کو بھاری تعداد میں منگوائے تاکہ ریاست کا ہر بچہ ان نظموں سے محظوظ بھی ہو اور مستفید بھی۔

(روزانہ "ہمدرد" سری نگر)

جگن ناتھ آزاد اردو کے ایک عظیم شاعر، نقاد اور ماہرِ اقبالیات کے طور پر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مشہور ہیں۔ "بچوں کی نظمیں" ان کی نئی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو ملک کے معیاری اشاعتی ادارے ترقی اردو بورڈ ویسٹ بلاک ۸ رام کرشنا پورم نئی دہلی نے نہایت خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔
چوبیس صفحات پر مشتمل دلکش اور آسان زبان میں نظموں کا یہ مجموعہ بچوں کے ادب میں گراں بہا اضافہ ہے۔ زبان اتنی عمدہ اور سلیس ہے کہ ایک دو بار پڑھنے سے ہی یہ نظمیں بچوں کو زبانی یاد ہو سکتی ہیں۔ ایک نظم دیوالی کا ایک بند دیکھئے۔

یوں تو ہر تہوار کی اپنی بات ہے اپنی شان
یوں تو اپنا ہر تہوار ہے سندر اور مہان
دو تہوار مگر ہیں اپنے نورانی تہوار۔
اک معراج نبی ہے ان میں اور ہے اک دیوالی
یہ تہوار ہے دیس کے باغ میں نور کی جیسی ڈالی
نور کی جیسی ڈالی
اک معراجِ نبی ہے ان میں اور ہے اک دیوالی

باقی نظموں کے عنوان ہیں "تماشے والا"، "کلکتہ میل"، "گرمیاں آگئیں"، "سن لو ایک کہانی"، "ہم بادل کہلاتے ہیں"، "کسانوں کا گیت"، "جادو والا"، "ایک نصیحت"، "پہیلیاں"، "وقت کی پابندی"

چاندنی اُتری پھلواری میں، عید، دسہرہ، چمکا ایک ستارہ، دیس ہوا آزاد، اور یہ تمام نظمیں اس دل آویز اندازِ بیان کی دلیل ہیں جس کی مثال اوپر دی گئی ہے۔

ترقی اردو بورڈ کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کی کتابت طباعت بھی بہت عمدہ ہے کاغذ چکنا اور دبیز استعمال کیا گیا ہے۔ قیمت ۲؍ روپے ہے۔ بچوں کی نظمیں کی ان تمام خوبیوں کے پیشِ نظر ہم ریاست کشمیر کے تاجرانِ کتب سے اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ وہ ناشرین سے جن کا پتہ اوپر درج ہے خاصی تعداد میں یہ کتاب منگائیں تاکہ جموں وکشمیر میں اردو پڑھنے والے بچے اس ننھی منی کتاب سے فائدہ اُٹھائیں۔

(روزنامہ "ولر" سری نگر)

SEEP ASOCIO CULTURAL · AND LITERARY QUARTERLY

POST BOX NO 3224 KARACHI 28

PHONE : (RES) 673267

EDITOR, NASEEM DURRANI

محترمی آزاد صاحب آداب

شکایت ہے کہ آپ کراچی آتے ہیں لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوتی کیوں؟ وجہ آپ بتائیں۔

"سیپ" کا پچاس واں خاص نمبر ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کی غزلوں کے لئے بیحد ممنون ہوں جو اس شمارے کی زینت ہیں۔ پرچہ آپ کو یقیناً پسند آئے گا۔

دیگر کیا احوال ہیں۔

آپکی اس عرصے میں کوئی نئی کتاب شائع ہوئی۔؟ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

مخلص نسیم درّانی 1/9/84

بھارت کے مسلمان

ایک نظم ــــ ایک کہانی

(۱)

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

مکرمی تسلیم

آپ کی نظم "بھارت کے مسلمان" الجمعیت میں پڑھی۔ سیاسی وعظ و پند تو آئے دن سننے میں آتے رہتے ہیں لیکن ان میں اخلاص و صداقت نہیں ہوتی اس لئے اُن کا کوئی اثر بھی نہیں پڑتا اور آپ کی نظم "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کی مصداق ہے۔ اس کو پڑھ کر دل متاثر ہوا کئی مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ نیا لطف آیا۔ آپ نے جس اخلاص اور اسلوب جذبات سے یہ نظم لکھی ہے اس سے زیادہ ایک مسلمان سے بھی ممکن نہیں ہے یہ اس کا ثبوت ہے کہ انسانیت کی شمع تیرہ و تار دور میں بھی بجھ نہیں جاتی اس سے مسلمانوں کے پنپنے کی بھی امید بندھتی ہے یہ نظم تو اس لائق ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کی جائے۔ "معارف" میں کوئی مطبوعہ نظم یا مضمون نقل نہیں کیا جاتا لیکن فروری کے پرچہ میں آپ کی نظم انشاء اللہ نقل ہوگی۔

معین الدین احمد ندوی

۳۰ر جنوری [illegible]

(۲)

ہفتہ وار "صدق" لکھنؤ

۸ر فروری ۱۹۵۲ء

اندھیرے میں اُجالا ایک ملی نظم کے صرف تین بند:۔

حیرت و مسرت کے کانوں سے اس حقیقت کو سُن لیجئے کہ نظم کسی مسلمان کی نہیں۔ دلّی کے مشہور غیر مسلم شاعر جناب جگن ناتھ آزادؔ کے قلم سے ہے۔ اس سرزمین پر جب تک اس طرح کے تھوڑے سے بھی فراخ دل، بے تعصب و سلیم الطبع ہمسایوں کا وجود ہے مسلمانوں کو ہرگز اس کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور "بخت کا تارا" اگر واقعی کبھی "چمکا" تو اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ ملّتِ اسلامی ایسے شریف ہمسایوں کے حقوق ہرگز نہ بھولے گی۔

(۳)

حویلی دیوان صاحب درگاہ اجمیر

۱۱ر فروری ۱۹۵۲ء

آپ کی نظم "بھارت کے مسلمان" بڑی ولولہ انگیز ثابت ہوئی۔ آپ اس بلند اندازِ فکر کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں اور ہند کے موجودہ دور میں جبکہ مسلمان کے حق میں کچھ تعصب اور تنگ دلی کے بادل چھائے ہوئے ہیں آپ نے نظم کے ذریعے پیار اور اخلاق کا مظاہرہ کر کے ان بادلوں میں سے اپنی فکر روشن کا آفتاب چمکایا ہے۔ ہند کا سچا ہندو وہی ہے جو اس ملک میں اپنے ہمسایہ اور وطنی بھائی کی قدر کو سراہے۔ اخلاق کی بنیاد اقدار پر ہی ہے اور مطلق اقدار لازوال ہیں مطلق اور آزاد اقدار کا تصور ہی انسان کو بلند اور لازوال بناتا ہے۔ اردو دنیا میں آپ کی یہ نظم آپ کی محبت کو لازوال بنا گئی ہے۔

اجمیر میں حافظ نور احمد صاحب واعظ نے شاہجہانی مسجد درگاہ میں جمعہ کی نماز کے بعد اس نظم کو پڑھ کر تمام مسلمانوں کو سنایا۔ یہ قبولیت کی ایک عجیب مثال

ہے۔ خواجہ صاحب کے معتقدوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جس شاعر کا کلام دربارِ خواجہ میں پڑھا جاتا ہے وہ مقبول اور بامُراد ہو جاتا ہے۔ اُستاد داغؔ کی مشہور غزل "سلطان الہند غریب نواز" جس کی ردیف ہے اس مثال کا تاریخی شاہکار ہے۔ اجمیر کے دربار میں اس غزل کے پڑھنے کے بعد ہی دکن میں داغؔ کو ملازمت ملی اور نوازے گئے۔ حافظ نور احمد شاعر نہیں ہیں۔ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں مُلّا ئے خشک ہیں۔ میں حیرت سے جمعہ کے بعد دیکھتا رہا اور سُنتا رہا کہ وہ آپ کی نظم کو مسجد کے بلند اندازہ کے در میں کھڑے ہوئے مجمع عام کو از خود بغیر کسی تحریک کے سُنا رہے ہیں۔

مہربانی کر کے شکوہ اقبالؔ کے طور پر چھوٹے سائز پر اس کو کتابی صورت میں چھپوائیے۔ اور عوام کے ہاتھوں تک پہنچائیے۔

نیاز مشرب

محمد حبیب فضائی

(۴)

روزنامہ "پاسبان" بنگلور

مسٹر جگن ناتھ آزاد اردو کے دورِ جدید کے شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں عقلی روحانیت آپ کے کلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی پس منظر میں آپ ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ آپ کا شمار اُن محبانِ وطن اور شیدائے زبان اردو میں ہوتا ہے جنھوں نے تقسیم ہند کی تمام قہرمانیوں اور تباہ کاریوں کا شکار ہونے کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ آپ کو اور آپ کے خاندان کو اپنے وطن عزیز راولپنڈی کو چھوڑ آنا پڑا۔ اپنی زندگی کو ہندو مسلم اتحاد اور اردو کی حفاظت و بقا کے لئے وقف کر دیا ہے آپ ان حق پرست اور حق گویوں میں سے ہیں جو "اسلام" کو "مہر و محبت کا بیان" اور ایک "زندہ و پائندہ حقیقت" سمجھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل طویل نظم میں آپ نے بھارت کے مسلمان کو اس کی پریشانی و ہراسانی سے جھنجھوڑتے ہوئے اس کو اس کے حقیقی مقام سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادارہ

(۵)

روزانہ "پرتاپ" نئی دہلی

۲۰ر فروری ۱۹۵۷ء

جگن ناتھ آزاد نے پچھلے دنوں بھارت کے مسلمان کو خطاب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی تھی جس کا آخری بند تھا

ماحول کی ہو تازہ ہوا تجھ کو گوارا — کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا
چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارا — ہو جائے گی تاریخ ماحول گریزاں
بھارت کے مسلمان

پاکستان کے اخبار" نوائے پاکستان" نے اس نظم پر ذیل کے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے

"بھارت کی سرزمین میں جب تک اس طرح کے تھوڑے سے بھی فراخ دل بے تعصب اور سلیم الطبع ہمسایوں کا وجود موجود ہے مسلمان کو ہرگز اس طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں اور بخت کا تارا اگر واقعی کبھی چمکا تو امید ہی نہیں یقین ہے کہ ملت اسلامی ایسے شریف ہمسایوں کی حقوق ہرگز نہیں بھولے گی۔"

یہ ہے خلوص اور محبت کا جواب بہرحال جگن ناتھ آزاد کو مطمئن ہو جانا چاہیئے کہ اگر مسلمان کے بخت کا تارا چمکا اور وہ ہندوستان پر قابض ہو گیا تو ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا۔ اور انہیں شاید دار پر کھچوا دیا جائے گا۔ اندازہ لگایئے کہ پاکستانی دوستوں کے دماغ کا گھوڑا کس رستے پر دوڑ رہا ہے۔

(نیپالی)

(۶)

روزانہ "پرتاپ" نئی دہلی

۲۴ر فروری ۱۹۵۷ء

چند روز ہوئے ہم نے ان کالموں میں جناب جگن ناتھ آزاد کی نظم کا ایک بند "نوائے پاکستان" کے تبصرے کے ساتھ نقل کیا تھا۔ شری ودیا پرکاش سرد ایڈیٹر تشلین

دہلی نے ہمیں اس سلسلے میں ایک چٹھی بھیجی ہے۔ لکھتے ہیں پرتاپ میں آپ کے کالم میں
فقرہ جگن ناتھ آزاد کے ایک بند پر تبصرہ دیکھا۔ آپ نے اخبار نوائے پاکستان" کے
جس ریمارک کا حوالہ دیا ہے وہ دراصل" نوائے پاکستان کا اپنا نہیں بلکہ صدق" لکھنؤ
سے نقل کیا گیا ہے اور" نوائے پاکستان" نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان
بھی مسلمانوں کے بخت کا تارہ چمکنے کے انتظار میں ہیں۔ آپ پاکستانی دوستوں کے
دماغ کے گھوڑے کی راہ دیکھ رہے ہیں مگر یہاں تو آوا ہی بگڑا ہوا ہے پاکستانی
دوست جو چاہیں کہیں ہندی مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان میں رہ کر ایسے ریمارکس
صرف ہماری سیکولر گورنمنٹ ہی برداشت کر سکتی ہے۔

یہاں جگن ناتھ کی زیرِ بحث نظم کے چند بند پیش کر دینے مناسب معلوم ہوتے
ہیں۔ سنیئے۔

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں

ابتدائی ــــــ

دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں اے مطلعِ تہذیب کے خورشید درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہے ترساں
بھارت کے مسلماں

درمیانی ــــــ

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو نا محرمِ ہر جرأت بیباکانہ ہوا تو
آبادیٔ ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو
ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے سامان
بھارت کے مسلماں

آخری ــــــ

ماحول کی ہر تازہ ہوا تجھکو گوارا وہ کاسۂ تہذیب کو بھاتا ہے سہارا

کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارا
ہو جائے گی تاریکیٔ ماحول گریزاں
بھارت کے مسلماں

مندرجہ بالا نظم میں شری جگن ناتھ آزاد نے بھارت کے مسلمان کو دانش کدۂ دہر کی شمع فروزاں، مطلع تہذیب کا خورشید اور بہت کچھ کہا ہے دل کھول کر داد دی ہے۔ اور اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان کے بخت کا ستارا ایک بار پھر چمکے گا نہ معلوم بخت کا تارہ چمکنے سے جگن ناتھ آزاد کی کیا مراد ہے۔ لیکن لکھنؤ کے اخبار "صدق" نے اس کا کوئی مطلب لیا ہے تو یہ کہ ہندوستان کے کفرستان میں ایک بار پھر مسلمانوں کے گھوڑے دوڑیں گے۔ خلیج بنگال کی لہریں ایک بار پھر ان گھوڑوں کے سُم چومنے کے لئے مچل کر آگے بڑھیں گی اور لال قلعے پر ایک بار پھر اسلامی پرچم سر دھنتا ہوا نظر آئے گا۔ ہم "صدق" لکھنؤ کی مندرجہ ذیل سطور کا اس کے سوا کوئی مطلب اخذ نہیں کر سکے۔ "صدق" نے لکھا ہے "حیرت اور مسرت کے کانوں سے اس حقیقت کو سُن لیجئے کہ یہ نظم کسی مسلمان کی نہیں۔ دلّی کے مشہور غیر مسلم شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کے قلم سے ہے۔ اس سرزمین پر جب تک اس طرح کے تھوڑے سے بھی فراخ دل، بے تعصب اور سلیم الطبع ہمسایوں کا وجود ہے مسلمانوں کو ہرگز اس کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور "بخت کا تارا" اگر واقعی کبھی چمکا تو اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ ملّتِ اسلامیہ ایسے شریف ہمسایوں کے حقوق ہرگز نہیں بھولے گی۔" ان الفاظ کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہ کہ اگر ہندوستان میں کبھی مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو وہ جگن ناتھ آزاد جیسے سلیم الطبع ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھیں گے یا یوں کہہ لیجئے کہ مستقبل کی اسلامی حکومت میں نہ صرف جگن ناتھ آزاد کی جان بخشی ہی کی گئی ہے بلکہ اُن کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد واقعی خوش قسمت ہیں اُنہیں یہ تماشا بطور سند سنبھال کر

رکھنا چاہیئے کیونکہ بروقت ضرورت کام آسکتا ہے اور وہ اس کی بنا پر آنے والے اسلامی دور میں کوئی تین ہزاری یا پنج ہزاری منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں تو درباری شاعر ضرور ہو جائیں گے۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے نئے پاکستان کے نام سے علیحدہ نیشنل ہوم حاصل کر لیا۔ ہندوستان کے ایک حصے پر قابض ہونے کے بعد بھی ہندوستان میں اُسے مساوی مقام حاصل ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوؤں نے حالیہ انتخابات میں اپنے ووٹوں سے مسلمانوں کو کامیاب کر دیا ہے اُن کے بخت کا تارہ چمک رہا ہے لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں اور اُن کی جسارت کا یہ عالم ہے کہ وہ وعدے کر رہے ہیں کہ بخت کا تارہ چمکنے پر آزاد صاحب جیسے شریف الطبع انسانوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے گا گویا انہوں نے ابھی سے اس ملک کے ہندوؤں کی "وائٹ لسٹ" اور "بلیک لسٹ" تیار کرنی شروع کر دی ہے۔

(۷)

روزنامہ "نوائے وقت"

۲۵ فروری ۱۹۵۲ء

شفیق زاد لطفکم . . . . تسلیم

آج روزانہ اخبار میں آپ کی ایک نظم "بھارت کے مسلمان" شائع کی ہے اللہ اکبر آپ نے کیا خوب نظم کہی ہے۔ یہ توفیق ہندوستان کے کسی مسلمان شاعر کو نصیب نہ ہوئی۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ خدا کرے دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کیونکہ دونوں کی بہتری اسی میں ہے۔

مخلص

حمید نظامی

(۸)

معارف اعظم گڑھ

فروری ۱۹۵۲ء

مذکورہ بالا نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہوگئی ہے۔ اس نظم کی قدر و قیمت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا لکھنے والا گزشتہ انقلاب کا ستایا ہوا مغربی پنجاب کا ایک پرخانماں ہندو ہے۔ یہ نظم اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہ ہو لیے سے گزرے اسی لئے اس کو اخبار "الجمعیتہ" سے نقل کیا جاتا ہے ہم کو امید ہے کہ انسانی اخوت و محبت کی اس آواز کا جواب پاکستان سے بھی دیا جائیگا

(۹)

روزانہ "پرتاپ" نئی دہلی

۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء

چند روز ہوئے ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضمون پر اپنے انداز میں کچھ تنقید کی تھی۔ سہارنپور سے انور اقبال صاحب نے ہمیں اس سلسلے میں ایک چٹھی لکھی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"چند دن ہوئے آپ نے "پرتاپ" کے فکاہی کالم میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے ایک مضمون کو مشق ستم بنایا ہے۔ عدم واقفیت اور کچھ دانستہ طور پر بھی آپ نے اس میں کچھ غلط بیانیاں کی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی پاکستان کے اخبار "نوائے پاکستان" یا کسی اور اخبار میں مضمون نہیں لکھتے۔ اُن کا ذاتی اخبار "صدق جدید" ہے جو لکھنؤ سے نکلتا ہے اور ہند اور پاکستان کے اکثر جرائد اُن کے اخبار سے اُن کے مضامین نقل کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے مسلّم اور مشہور اہل قلم ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے صدر نشین

ہیں۔ اور ہندوستان میں اُن سے بہتر نقاد اور حق گو مشکل سے ہی ملے گا۔ اگر اُنھوں نے صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم پر فلمی بیسواؤں کا اعزاز بڑھانے کے سلسلے میں تنقید کی ہے تو پاکستانیوں کی فردگذاشت اور اُن کی غلطیوں پر بھی اُنہیں زیادہ دکھ پہنچتا ہے اور وہ بہت زیادہ زوردار الفاظ میں اُن پر تنقید کرتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے مضمون زیر بحث میں اگر کچھ لکھا تھا تو یہ کہ مولانا عبدالمجید صاحب ہندوستان میں مضمون لکھتے ہیں اور پاکستان میں پہنچتے ہیں۔ مانا کہ وہ مضامین اپنے اخبار میں لکھتے ہیں لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ پاکستان کے اخبارات اُنہیں نقل کرتے ہیں اور اس میں سے ہندوستان کی تضحیک کا پہلو نکالتے ہیں ابھی پچھلے دنوں جگن ناتھ آزاد نے "بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کا شاندار ماضی اور شاندار مستقبل دکھانے کی کوشش کی تھی اور اُن کی اس نظم پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھا تھا۔ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس سرزمین پر ابھی تک جگن ناتھ آزاد جیسے غیر متعصب اور مسلم نواز حضرات موجود ہیں اور جب مسلمان ہندوستان میں پھر سے برسر اقتدار آئے گا وہ اُن لوگوں کا خیال رکھے گا۔ مولانا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے دماغ کا گھوڑا کس طرف دوڑ رہا ہے جہاں تک مولانا کی قابلیت کا تعلق ہے ہم نے اُس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اُن کا اسلوبِ بیان واقعی قابلِ داد ہے۔

مولانا کا ذکر چل نکلا ہے تو آج اُن کی اور سچی باتیں سُن لیجئے۔ "نوائے وقت" میں اُن کے نام سے "تازہ سچی باتیں" شائع ہوئی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مسلمانوں نے الیکشن میں اگرچہ کانگرسی اُمیدواروں کو کامیاب کرانے میں پوری مدد دی تاہم خود مسلمانوں کی نمائندگی ہلکی رہی ہے چنانچہ ہاؤس آف پیپل (پارلیمنٹ) میں جس کی کُل نشستیں ۴۹۷ ہیں مسلمان شاید کل ۱۵ کی تعداد میں پہنچے ہیں۔ حالانکہ

مسلمانوں کی آبادی ملک میں اب بھی ۱۳ فیصدی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں جو نیابت جُداگانہ کا طریقہ مسلمانوں کے لئے رائج تھا اُس سے مسلمان نمائندے بھی تعداد آبادی کے تناسب سے منتخب ہوتے تھے۔ ۴۹۷ میں ۱۵ گویا ۱۰۰ میں تین اور یہ تین فیصد بھی شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے اپنے اثر سے ـــ لیکن یہ ناشکرے مسلمان۔ اسے غنیمت نہیں سمجھتے اگر ایک فیصدی بھی نہ رہ جاتے تو کرہی کیا سکتے تھے۔ اقلیتیں ملک میں اور بھی ہیں لیکن ہر تنظیم سے معریٰ ـــ اس لئے اتنی کس مپرسی میں مبتلا اور ہر ناانصافی کی ہدف بجز مسلمان اقلیت کے اور کون ہے۔

مولانا کو شکایت ہے کہ مسلمان پارلیمنٹ میں اپنے تناسب کے مطابق نہیں آ سکتے لیکن اُنہوں نے صرف تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ وہ دیکھنا نہیں چاہتے یا دانستہ طور پر اُسے نظرانداز کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ نظام میں آبادی کے تناسب کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر مولانا صاحب پانچ سال پہلے کی پُرانی روایات کی یاد کو فراموش نہیں کر سکے تو اُنہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کر لینا چاہیئے دہلی میں مسلمانوں کی آبادی کُل آبادی کا کم و بیش آٹھواں حصہ ہے لیکن اُنہیں وزارت میں ایک تہائی نمائندگی دی گئی ہے۔ پنجاب میں سوائے گورگاؤں کے کہیں کوئی مسلمان آباد نہیں لیکن انبالہ سے وحدہ لاشریک مسلمان ووٹر ہندو ووٹوں سے کامیاب ہو چکے ہیں تین مسلمان اسمبلی کی رکنیت حاصل کر چکے ہیں اور اُن میں سے ایک منسٹر یا ڈپٹی منسٹر کی صورت میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والا ہے۔ صرف یہی نہیں جمعیت العلماء کو بھارت کی سُپر حکومت کے اختیارات حاصل ہیں اور جب ہم ہندوستان کا پاکستان کے حالات سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں اب بھی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہندو موجود ہیں لیکن اُنہیں نہ سینٹرل کینٹ میں نمائندگی کے قابل سمجھا گیا ہے اور نہ کینٹ میں۔ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوؤں

کو ذمہ داری کے عہدے مل سکتے تھے لیکن اورنگ زیب ثانی یعنی خواجہ ناظم الدین کے عہد میں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔

(۱۰)

۹۶۸ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

۲۸ر اپریل ۱۹۵۲ء

مکرمی تسلیم

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے فروری کے "معارف" میں آپ کی نظم نقل کرکے پاکستان کے شعراء سے درخواست کی تھی کہ وہ انسانی محبت اخوت کی اس آواز کا جواب دیں چنانچہ رسالہ "دعوت الحق" کراچی بابت اپریل میں اسے ملتانی نے اس اعتراف کے ساتھ کہ نظم لاجواب ہے اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا البتہ منظوم اعتراف پیش کر سکتا ہوں۔ ہندو مسلمان کے نام سے ایک نظم لکھی ہے اس کو بھی اگر گنجائش ہوئی تو مئی کے معارف میں ورنہ جون کے پرچہ میں نقل کرنے کا ارادہ ہے۔ درحقیقت آپ کی نظم اس پایہ کی ہے کہ پاکستان میں اس کا جواب صرف مولانا ظفر علیخاں لکھ سکتے ہیں۔ میں اپنے نوٹ میں ان کو بھی توجہ دلاؤں گا۔

معین الدین احمد ندوی۔

(۱۱)

نظام المشائخ کراچی

مئی ۱۹۵۲ء

اپریل کے "نظام المشائخ" میں جناب جگن ناتھ آزاد کی نظم "بھارت کے مسلمان" کے صرف تین بند شائع کئے گئے تھے۔ اب پوری نظم شائع کی جاتی ہے۔

جگن ناتھ صاحب آزاد نے ہندو ہو کر مسلمانوں سے وہ مخلصانہ اور دردمندانہ خطاب فرمایا ہے جو مسلمانوں میں بھی شاید بس حضرت اقبال کا حصہ تھا۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے تو آج مسلمانوں کو یوں ہی جھنجھوڑتے۔

مسلمان تو خیر جاگیں گے یا نہ جاگیں گے لیکن جگن ناتھ صاحب آزاد نے ثابت کر دکھایا کہ ہندوؤں میں اتنے اچھے لوگ موجود ہیں۔ جگن ناتھ صاحب آزاد نے اپنی قوم کا سر اونچا کر دیا۔ جس طرح ایک مچھلی سارا جل گندا کر ڈالتی ہے اس طرح تھوڑا سا عطر میلے کپڑوں پر بھی مل لیا جائے تو انہیں معطر کر دیتا ہے اچھے اور برے ہر قوم میں ہیں۔ برے قوم کا سر نیچا کرتے رہتے ہیں اور اچھے قوم کا سر اونچا کرتے ہیں یہ دور بروں کا دور ہے کبھی اچھوں کا دور آئے گا تو ہندو قوم جگن ناتھ صاحب آزاد کی قدر کرے گی اور ان کی وسعت قلب اور توازن دماغ کو سراہے گی۔

جگن ناتھ صاحب آزاد کی نظم کے بعد جناب اسد ملتانی کی نظم ہے۔ اسد صاحب نے جگن ناتھ صاحب آزاد کی آواز کو لبیک کہا ہے۔ اسد صاحب کا اعتراف ایک معنی سے تمام صالح جو مسلمانوں کا اعتراف ہے۔

ایسی تحریریں اور تقریریں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنائیں گی۔ اللہ تعالیٰ تعلقات سنوارنے والوں کو قوت عطا کرے۔

(محمد واحد تیا)

ہمدرد مسلمان

جناب اسد ملتانی

تیرا ہیں جگن ناتھ ہوں شرمندۂ احساں — سوجھا ہے تجھے خوب مرے درد کا درماں
روشن ترے دل پر ہوا میرا غم پنہاں — صاف اس سے خلوص اور محبت ہے نمایاں
اے پیکر غم خواری و دل سوزی انساں
ہمدرد مسلماں

ہر نکتہ ترا نشترِ فصاد سے بھی تیز — ہر حرف ترا فکر و نظر کے لئے مہمیز
ہر نغمہ ترا ولولہ انگیز و جنوں خیز — ہر شعر ترا جذبۂ اخلاص سے لبریز
ہے آتش تبریز ترے دل میں فروزاں
ہمدرد مسلماں

تو خوش رہے اے حضرتِ مخدوم کے فرزند اخلاص و محبت سے سنا سب تری پند
سُن کر تری باتیں مری ہمت ہوئی دوچند تو نے دلِ مجبور کے سب کھول دیئے بند
دل سے ترا ممنون ہوں اور بندۂ احساں
ہمدردِ مسلماں

جس دور میں نازاں ہوں تہِ تیغ زن و مرد جس دور میں ہر راہ سے نفرت کی اُٹھے گرد
جس دور میں دل مہر و محبت سے ہوئے سرد اس دور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہمدرد
ہوں دیر میں یہ رنگِ حرم دیکھ کے حیراں
ہمدردِ مسلماں

کیا خوب طبیعت کی بلندی میں بڑھا تو اقبال کے پاکیزہ دبستاں میں پڑھا تو
سائے میں بزرگوں کے پلا اور بڑھا تو اسلام کے ماحول میں پروان چڑھا تو
ملتان تری گرمیٔ گفتار پہ نازاں
ہمدردِ مسلماں

اسلام کی تعریف بہرحال بجا ہے گر ہے یہ نہیں مصداق تو میری ہی خطا ہے
اس وقت مرا دل جو گرفتارِ بلا ہے ایسا نظر آتا ہے کہ غفلت کی سزا ہے
اوروں سے تو میں اپنی سزا سے ہوا ہراساں
ہمدردِ مسلماں

میں تھا اثرِ گردشِ ایّام سے غافل بدلے ہوئے رنگِ سحر و شام سے غافل
ماضی میں رہا مست اور انجام سے غافل ہر بات سے بے فکر ہر اک کام سے غافل
آخر یہی غفلت تھی کیا جس نے پشیماں
ہمدردِ مسلماں

افسردگیٔ شوق پہ ہے مجھ کو ندامت کوئی نہ رہی زندگیٔ دل کی علامت
واقع ہوئی جب موت تو دیکھی یہ قیامت اب آئی مرے سامنے اعمال کی شامت
خود شامتِ اعمال ہی آتش بہ گریباں
ہمدردِ مسلماں

میں علم کی دولت کا خریدار نہیں ہوں — گنجینۂ قاسم کا طلبگار نہیں ہوں
سید کے خزانے کا سزاوار نہیں ہوں — اسلاف کی میراث کا حقدار نہیں ہوں
ہوتا تو نہ رہتا کبھی یوں بے سروساماں
ہمدردِ مسلماں

ہیں کلیر و اجمیر کی باتیں تو پرانی — بھولا میں قلندر کی مجدّد کی کہانی
گم کر گئی واعظ کی مجھے سحر بیانی — میں نے تو اس اقبال کی بھی بات نہ مانی
ہے جس کا اثر تیری طبیعت میں نمایاں
ہمدردِ مسلماں

گو آج کا ماحول مجھے راس نہیں ہے — کچھ اس کا مداوا بھی مرے پاس نہیں ہے
پھر بھی کسی اندیشے کا احساس نہیں ہے — مستقبلِ روشن سے مجھے یاس نہیں ہے
امید کی ہے شمع مرے دل میں فروزاں
ہمدردِ مسلماں

اب بھی کسی قاتل کسی رہزن کا نہیں خوف — بربادیِ و تخریبِ نشیمن کا نہیں خوف
افسوں گریِ شیخ و برہمن کا نہیں خوف — اب بھی کسی اندر کے دشمن کا نہیں خوف
سچ یہ ہے کہ ہوں اپنے ہی سائے سے گریزاں
ہمدردِ مسلماں

کیوں مجھ کو شکایت ہو کسی اور سے جھوٹی — خود اپنی ہی تقصیر سے قسمت مری پھوٹی
اللہ کی رسّی تو نہ ٹوٹے گی نہ ٹوٹی — افسوس یہی ہے کہ مرے ہاتھ سے چھوٹی
شیرازۂ ملّت ہوا اس درجہ پریشاں
ہمدردِ مسلماں

میں بحر ہوں جنبش مجھے طوفاں سے ملے گی — بیتاب طبیعت غمِ پنہاں سے ملے گی
توفیقِ عمل قوتِ ایماں سے ملے گی — ایمان کی دولت مجھے قرآں سے ملے گی
رخ تو نے مرا پھیر دیا جانبِ قرآں!
ہمدردِ مسلماں — (ریڈیو پاکستان کراچی)

(۱۲)

گنج سلے بتیا

۱۵ر مئی ۱۹۵۲ء

صابر نواز ــ سلام و نیاز

"نقاد" کراچی میں آپ کی ایک نظم "بھارت کے مسلمان" نظر سے گزری۔ کم از کم ابھی تک پچیس یا تیس بار پڑھ چکا ہوں اور ابھی نہ جانے کتنی بار اور پڑھونگا۔ نظم خوب ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ نظم لکھ کر آپ نے ہندوستانی مسلمانوں پر احسان کیا ہے تو شاید مبالغہ نہ سمجھا جائے گا۔ سوچتا ہوں اس اہندوستان میں کیسے کیسے لوگ ابھی باحیات ہیں۔ ایک طرف بابو راؤ پٹیل اور دوسری طرف آزاد۔ خدانخواستہ آپ یہ نہ سمجھ بیٹھتے گا کہ میں آپ کا اس سے مقابلہ کر رہا ہوں۔ توبہ ہے مری بھلا ایسا کون ہوسکتا ہے مجھے کہنا یہ مقصود ہے کہ ایک طرف انسان نما شیطان ہیں تو دوسری طرف آدمی کے بھیس میں شاید فرشتے۔ خدا آپ کو زندہ و باآل خیر رکھے۔

(۱۳)

معارف ۔ اعظم گڑھ

جون ۱۹۵۷ء

ہمدردِ مسلماں ــ جناب اسد صاحب ملتانی

جگن ناتھ آزاد کی نظم "بھارت کے مسلمان" ہم نے فروری کے "معارف" میں نقل کرکے پاکستان کے شعراء سے اس کا جواب لکھنے کی درخواست کی تھی پنجاب کے مشہور شاعر جناب اسد ملتانی نے اس کے جواب میں "ہمدردِ مسلماں" کے عنوان سے ایک اعتراف لکھا ہے۔ جس کو رسالہ دعوت الحق کراچی نے شائع کیا ہے۔ ہم اس نظم کو رسالہ مرکوز کے ساتھ نقل کرتے ہیں

(۲)

رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کے فروری ۱۹۵۲ء کے پرچے میں جناب جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم "بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے نظم نہایت ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات سے معمور ہے اور اس قدر پسندیدہ کہ ہم کو ہندوستان سے بعض بزرگوں کی طرف سے خطوط موصول ہوئے کہ ممکن ہو تو جناب اسد ملتانی سے اس کا جواب لکھوایا جائے اور دونوں نظموں کو دعوت الحق میں شائع کیا جائے۔

جب جناب اسد کو دعوت دی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ نظم لاجواب ہے اس کا جواب تو نہیں دیا جاسکتا ہے البتہ منظوم اعتراف پیش کرسکتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی جوابی نظم "ہمدردِ مسلماں" کے عنوان سے لکھ کر ہماری دعوت کا حق ادا کر دیا ہے۔

دراصل جناب آزاد کی نظم کے مخاطب بھارت کے مسلمان ہیں لیکن اسلام کی عالمگیر اخوت میں وطنی و ملکی حد بندیاں حائل نہیں ہوسکتیں۔ بنابریں پاکستانی شاعر نے گویا مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی طرف سے جگن ناتھ صاحب کا منظوم شکریہ ادا کیا ہے

ہم جناب آزاد کی نظم "معارف" کے تمہیدی نوٹ کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد جناب اسد ملتانی کی جوابی نظم "دعوت الحق" کے ذریعے جناب آزاد اور ان کے ہم خیال احباب تک پہنچاتے ہیں۔

(مدیر)

(۱۴)

شاہ پور (یو۔پی)

۱۹ر جون ۱۹۵۲ء

مکرمی آزاد صاحب۔ تسلیم۔

کل "معارف" کا تازہ شمارہ ملا۔ اس میں جناب اسد ملتانی کی ایک نظم "ہمدرد مسلماں" نظر سے گزری۔ نوٹ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نظم دراصل آپ کی کسی نظم "بھارت کے مسلمان" کے سلسلے میں بطور اظہارِ تشکر کے ہے۔ چنانچہ نیا شمارہ تو وہ پھینکا اور "معارف" کی گڈی میں سے فوراً فروری کا شمارہ نکال کر بغیر کھائے پئے بیٹھ گیا۔ یقین مانئے علی گڑھ کی اصطلاح میں اسے "کبوتر بازی" نہ سمجھئے گا۔ طبیعت پر بےحد اثر ہوا اور نہ جانے ایک عجیب طرح کا احساس بیدار ہو گیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس ملک میں آزاد صاحب جیسے "روشن خیال" زندہ ہوں وہاں مایوسی اور جمود گناہ ہے میں تو اس وقت سے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جیسے ہندوستان ابھی منقسم نہیں ہوا۔ اور میں تو اس کا قائل ہوں کہ جن دو ملکوں کے ادیب اور صحافی آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے ہوں۔ وہ کبھی ایک دوسرے سے جنگ نہیں کر سکتے خواہ وہاں کے سیاسی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ اخباروں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ اُن کی حالت ایک ڈو کو چھوڑتے ہوئے آزاد خیالی کے اعتبار سے انتہائی گری ہوئی ہے۔ مگر یہ جو کچھ بھی پُر امن ماحول سا کچھ نظر آتا ہے وہ سب ادیبوں کی بدولت ہے۔

میری طرف سے ایسی کامیاب نظم پر ایک طالبعلمانہ شکریہ اور مبارکباد قبول فرمائیے جو حسنِ اتفاق سے نظر سے گزر گئی۔ ورنہ تعلیمی مصروفیتیں اکثر ایسے ادبی شہ پاروں سے لطف اندوز ہونے سے قاصر رکھتی ہیں۔ چونکہ آپ مجھ سے واقف نہیں ہیں اس جرأت کی معذرت چاہتا ہوں۔

نیاز کیش

اختر۔ ایم۔ ایس۔ سی (علیگ)

○

سب رنگ۔ حیدرآباد۔ دکن

جون ۱۹۵۲ء

اے پیارے جگن ناتھ

محمد عبدالرحمٰن خاں ضمیر

"جگن ناتھ آزاد صاحب کی "بھارت کے مسلمان" کے عنوان سے جو نظم شائع ہوئی تھی اس کا جواب اسعد ملتانی صاحب نے پاکستان میں دیا تھا جو "ہمدرد مسلماں" کے عنوان سے ماہنامہ "دعوت الحق" کراچی بابت ماہ اپریل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان دونوں نظموں کے مطالعہ کے بعد حیدرآباد کے مشہور عالم اور ادیب مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب اے۔ آر۔ سی۔ ایس۔ بی۔ ایس۔ سی (لندن) سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ و صدر حیدرآباد اکیڈمی نے حسب ذیل نظم لکھی ہے۔

کیا نظم کہی تو نے مرے پیارے جگن ناتھ بھارت کے مسلماں کا برے وقت دیا ساتھ
ہمدرد مسلمان ہے پُر اخلاص تری ذات جادو کا اثر رکھتی ہے ہر ایک تری بات

اللہ کے تجھ پہ ہوں شب و روز عنایات
اے پیارے جگن ناتھ

ایسا بھی تھا اک وقت کہ بھارت کا مسلماں حاکم تھا مگر مہر و مروت کا تھا انساں
سب اہلِ وطن کا تھا دل و جاں سے نگہباں غدار کو بھی عفو سے کرتا تھا پشیماں

بھارت کے ہر اک شخص سے تھے اس کے مراعات
اے پیارے جگن ناتھ

مانا کہ وہ ہندو نہ تھا ہندی تھا یقیناً اس ملک کے باہر نہ بنایا کبھی مسکن
کرتا تھا فدا ہند ہی پر اپنا وہ تن من ہندو کو نہ سمجھا کسی حالت میں کبھی دشمن

دونوں میں محبت ہی کے جاری تھے روایات
اے پیارے جگن ناتھ

جب ہند کو اک بار وطن اس نے بنایا اس ملک کی ہر چیز سے دل اپنا لگایا
ہر فرقِ تمدن کو بتدریج مٹایا رسم اور رواج اس کا خود اپنے کو سکھایا

مذہب میں اگر فرق تھا اک چھوٹی سی تھی بات
اے پیارے جگن ناتھ

ہر وعدہ و پیماں پہ وہ قائم تھا ہمیشہ　　اخلاص و صداقت کو سمجھتا تھا فریضہ
مسجد ہو کہ مندر ہو کہ دیول ہو کلیسہ　　قسمت کا نوشتہ تھا اٹل اس کا وثیقہ
ہر امر میں مسلک تھا مدام اس کا مساوات
اے پیارے جگن ناتھ

مظلوم کا ہمدرد تھا بیکس کا مددگار　　ہر کام میں تھا اس کے عیاں جذبۂ ایثار
تھا اپنے رفیقوں کا سدا یار وفادار　　بر وقت ضرورت تھا وہ جاں دینے کو تیار
دنیا کو تمنا تھی مسلماں کے لگے ہاتھ
اے پیارے جگن ناتھ

پھر اس کی طبیعت ہوئی مائل بہ تنزل　　پیدا ہوا کچھ اس میں تفاخر کا تخیل
خود اس کو نہ محسوس ہوا اس کا تبدل　　کھو ڈالا بالآخر وہ تمام اپنا تجمل
تب اس پہ مصائب کی برسنے لگی برسات
اے پیارے جگن ناتھ

غفلت ہی میں سرزد ہوئے سب اس کے برے کام　　سمجھا نہیں زنہار کہ کیا ہوئے گا انجام
بدکاروں کی صحبت میں ہوا آپ بھی بدنام　　آخر کو تباہی کے ملے اس کو کل انعام
یہ دور ہے صرف اس کی ہی غفلت کی مکافات
اے پیارے جگن ناتھ

دشمن کو سمجھتا ہے کہ اس کا ہے بہی خواہ　　محسن سے اسے بغض رہا کرتا ہے للہ
اسلاف کے علم اور ہنر سے نہیں آگاہ　　ایماں کے رستے سے بھٹک کر ہوا گمراہ
ہے لہو و لعب ہی میں گرفتار وہ دن رات
اے پیارے جگن ناتھ

مذہب کو سمجھتا ہے گیا اس کا زمانہ　　سنتا ہے یہی ان دنوں دنیا میں فسانہ
ہے گو بج رہا گرچہ تعصب کا ترانہ　　نازاں ہے کہ ہے طرز مرا فلسفیانہ
ایسے کے پنپنے کی کچھ امید ہے ہیہات
اے پیارے جگن ناتھ

دولت نہیں، صنعت نہیں حرفت نہیں کچھ پاس
ثروت نہیں ہمت نہیں گر ہے تو ہے افلاس
نکبت میں گرفتار ہے پر کچھ نہیں احساس
جاتی رہی اُمید عوض اس کے ہے یاس پاس
دل مُردہ ہیں ایمان کی پونجی نہیں کچھ سات
اے پیارے جگن ناتھ

تجھ جیسے اگر اور رہیں اس ملک میں انساں
ظلم اور تعصب کا لرز جائے گا طوفاں
شاید کہ دلوں میں بھی کچھ آجائے گا ایماں
سکھ پائے گا اس وقت ہی بھارت کا مسلماں
اس وقت پریشاں ہیں بہت اس کے خیالات
اے پیارے جگن ناتھ

اب بھی اگر افعال پہ ہو اپنے وہ نادم
کر توبہ وہ ہو جائے حقیقت ہی میں مسلم
بن جائے محمد کا دل و جان سے خادم
ہو جائیں گے حاصل اسے پہلے کے مکارم
مل جائیں گے سب کھوئے ہوئے اس کے کمالات
اے پیارے جگن ناتھ

خود ہو کے مسلماں وہ جگائے گا جہاں کو
پلٹائے گا نیکی کی طرف دورِ زماں کو
بتلائے گا تحقیق سے ہر سود و زیاں کو
پھیلائے گا دنیا میں پھر ایمان واماں کو
ہر ملک کا ہو جائے گا دستورِ موالات
اے پیارے جگن ناتھ

دار المصنفین۔ اعظم گڑھ

نمبر ۱۶۷۴
۱۶ر اگست ۵۲

مکرمی۔ تسلیم

آپ کی نظم "بھارت کے مسلمان" کا جواب ہندوستان کے مسلمان کی طرف سے ملنا چاہیئے کیونکہ نظم میں مخاطب وہی ہیں۔ میں نے نظم "اعتراف و تشکر" میں اس

فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم "معارف" میں اسعد ملتانی کی نظم کے ساتھ ہی شائع ہونے والی تھی۔ لیکن قلتِ گنجائش کی وجہ سے اب شائع ہو رہی ہے جس کی ایک کاپی آپ کے ملاحظہ کے لئے ارسال ہے۔

اپنی نظم میں آپ نے جن شریفانہ جذبات کا اظہار فرمایا ہے درحقیقت ہندوستان کے مسلمان اُن کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے بھی اس نظم میں آپ کے تشکر کا کما حقہٗ حق ادا نہیں ہو سکا ہے۔ پھر بھی اسے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے آپ اس حقیر کو قبول فرمائینگے

یحییٰ اعظمی

(۱۷)

معارف اعظم گڑھ

اگست۔ ۱۹۵۲ء

اعتراف و تشکر

(جگن ناتھ آزاد کی نظم "بھارت کے مسلمان" کے جواب میں)

جناب یحییٰ اعظمی

یہ نغمۂ دلکش ترا یہ نالۂ دل دوز یہ تیری فغانِ اثر انگیز و جگر سوز
یہ پند محبت یہ پیام ادب آموز اے مادرِ قومی کے جوان نظر افروز

بھارت کے مسلمان پہ ہے یہ ترا احساں
ممنون ترا کیوں نہ ہو بھارت کا مسلماں

تو نے اسے مدہوشئ غفلت سے جگایا بھولا ہوا پیغام اسے یاد دلایا
ماضی کی روایات کا افسانہ سنایا پھر عظمتِ پارینہ کا راز اس کو بتلایا

دی تو نے اسے سچے مسلمان کی تعلیم
اسلام کی، قرآن کی، ایمان کی تعلیم

بھارت کے مسلماں کے لئے یہ ترا پیغام دراصل ہے اک ولولۂ تازہ کا انعام

تو نے اسے بتلائے ہیں قرآں کے احکام لب پر ہے ترے ولولۂ تازہ عظمت اسلام
سنتا تھا جسے حاملِ قرآں کی زباں سے
وہ درس ملا اس کو ترے سوز و فغاں سے

اس راز سے واقف ہیں زمانے کے مہ و سال گردش میں رہا کرتے ہیں اقوام کے احوال
ہوتا ہے تغیر بھی مگر ثمرۂ اعمال ہے پستیٔ ہمت کا اثر پستیٔ اقبال
جاری ہے ہمیشہ سے یہ قانونِ الٰہی
اعمال بگڑتے ہیں تو آتی ہے تباہی

یہ نکتہ بھی تھی نہیں اقوام و ملل سے اعمال بگڑتے ہیں عقیدوں کے خلل سے
اعصاب سے ہے ربط جوارح کا ازل سے ہمت ہے اگر پست تو اعضا بھی ہیں شل سے
چھاتی ہے کسی قوم پہ جب پستیٔ اخلاق
نادان سمجھ لیتی ہے خود زہر کو تریاق

رہتی تھی جو خود جوش کے عالم میں بھی باہوش وہ قوم جو افسوس غلط کار و غلط کوش
ہو جاتے سراسر ہے غفلت سے جو مدہوش پھر کیوں نہ ہوا اسلام کی تعلیم فراموش
خوف اور ہزیمت ہو مسلماں کا شعار آہ
مومن کی حیات اور ہو سرگرم فرار آہ

اس دیس میں سب چھوڑ کے سرمایۂ اسلاف اس شان سے آمادۂ ہجرت ہوئے اخلاف
ہیں نوحہ کناں منبر و محراب کے اطراف ہیں مرثیہ خواں آج مساجد ہوں کہ اوقاف
کیا اب بھی سزاوار ہیں یہ مجد و شرف کے
حقدار ہیں کیا اب بھی یہ میراثِ سلف کے

یہ جامع دہلی یہ منارِ قطب و تاج تعمیر کی تقدیس کی تہذیب کی معراج
کل تک تھے زمانے میں سرافراز مگر آج کیوں دیدۂ بینا کو نظر آتے ہیں تاراج
بے وجہ نہیں آج یہ احساسِ غم ان کا
ہے کس کی بدولت سرِ پُر فخر خم ان کا

فیضِ کہن و نو کے وہ سرچشمۂ جاری
خوں بن کے جو ملّت کی رگ و پے میں تھے ساری

صدیوں کی متاعِ ہنر و علم ہماری
وابستہ روایاتِ کہن جن سے تھیں ساری

وہ قاسم و سیّد کے خزانے ہیں تلف آج
اور اُن کے نگہباں ہیں حوادث کے ہدف آج

حق یہ ہے کہ یہ عظمت و اقبال کے آثار
ہیں دیر سے ملّت کے غمِ ہجر میں خونبار

خواجہ کا ہو دربار کہ محبوب کی سرکار
دلی ہو کہ اجمیر ہو سب ہم سے ہیں بیزار

رخصت ہوئے غربت میں اُنہیں چھوڑ کے افسوس
صدیوں کا جو رشتہ تھا اُسے توڑ کے افسوس

وہ سیل بھی کیا پھیل کے جو آپ سمٹ جائے
وہ فوج بھی کیا فوج جو میدان سے ہٹ جائے

کس کام کا وہ ابر ہواؤں سے جو پھٹ جائے
ناداں وہ مسافر ہے جو منزل سے پلٹ جائے

خود کھو دے جو اسلاف کی ہمت کا خزانہ
دنیا میں وہ پھر کیوں نہ ہو پامالِ زمانہ

ہم کو ہے عبث گردشِ ایّام کا شکوہ
بے سود ہے بے مہریٔ اقوام کا شکوہ

شکوہ ہے تو اپنے دلِ خودکام کا شکوہ
ہم کو ہے خود اپنے غلط اقدام کا شکوہ

کیا کہئے اسے آہ بجز شامتِ اعمال
اک ملّتِ زندہ ہو جو اس طرح سے پامال

ہم دل سے تری پندِ محبت کے ہیں شکور
پیغام ترا جذبۂ عالی سے ہے معمور

تڑپا جو ہمارے لئے ترا دلِ رنجور
شرحِ غمِ دل کے لئے تو ہو گیا مجبور

حیرت ہے یہ آوازِ حق اس دورِ فتن میں
ہے شکر کہ ایسے ہیں جواں اب بھی وطن میں

ماضی کی روایات کا جو زمزمہ خواں ہے
غیروں کے کمالات کا جو مرتبہ داں ہے

جس گلشنِ ملّت کا تو اک سروِ رواں ہے
جس مادرِ قومی کا تو فرزندِ جواں ہے

لاریب زمانے میں ہے وہ لائقِ تبریک

ہے قابلِ توصیف وہ انصاف کے نزدیک

اے تابشِ بزمِ وطن و نازشِ دوراں
ظلمت کدۂ ہند کی اے شمعِ فروزاں

ہے دل سے دعاگو ترا ہر قلبِ مسلماں
ہر بچہ ہے اس کا ترا گرویدۂ احساں

صد شکر کہ سرگرمِ عمل تیری نوا ہے
اس قافلۂ حق کے لئے بانگِ درا ہے

(۱۰۹)

اکیڈمی اعظم گڑھ

۱۴ ستمبر ۱۹۵۷ء

محترمی۔ تسلیم و نیاز

میرا اعتراف و تشکر تکلف کی باتیں نہیں بلکہ ایک شریف اور احسان شناس قوم کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے یہ نظم لکھ کر نہ صرف مسلمان بلکہ ہر شریف انسان کے دل میں گھر کر لیا ہے اور ہمیں اس پوری قوم کا گرویدۂ احسان بنا لیا ہے جس نے آپ جیسا بلند نظر اور شریف انسان پیدا کیا۔ وہ قوم لائقِ تضحیک نہیں قابلِ تبریک ہے۔ جس نے گاندھی، نہرو، سندرلال، کشن پرشاد اور جگن ناتھ آزاد پیدا کئے۔ برخلاف اس کے اس قوم کو دیکھئے جس کا ماضی اس قدر شاندار ہے اور جو دنیا کو اخلاق اور انسانیت کا درس دینے آئی تھی لیکن اس نے گاندھی، نہرو تو کجا ایک کشن اور جگن ناتھ تک نہ پیدا کیا اس احساس سے میری شرم کی گردن جھک جاتی ہے

یہ نظم لکھ کر یقیناً آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جیسا کہ ہمیشہ حق و صداقت کی راہ میں ہوتا آیا ہے لیکن یہ مشکلات صاحبِ عزیمت کو راہِ صداقت سے ہٹا نہیں سکتیں۔ گاندھی جی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ الحمدللہ آپ کا پائے ثبات بھی ان سے متاثر نہیں۔ آپ حضرات کی ان مخلصانہ کوششوں سے یقیناً لوگوں کا نقطۂ نظر بدل رہا ہے اور حالات سازگار ہو رہے ہیں۔ لیکن

ذاتی طور پر مجھے مسلمان قوم کی ذہنیت سے ابھی بڑی مایوسی ہے کہ اس کے ذہن و دماغ پر ابھی گزشتہ دس سال کی تحریک کا کافی اثر ہے۔

میں آپ کی شاعرانہ عظمت سے واقف نہ تھا۔ اس نظم کے ذریعہ پہلی بار دل میں آپ کی عزت و عقیدت پیدا ہوئی ہے اور اس وقت سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا ہے۔ اب آپ کہاں اس طرف تشریف لاتے ہیں دیکھیے میں ہی دلی آکر آپ دونوں حضرات کی زیارت کا شرف حاصل کروں گا۔

نیاز کیش

یحییٰ اعظمی

(۱۹)

میں نے اپنے عزیز دوست جگن ناتھ آزاد کی دل آویز و دل پسند نظم "بھارت کے مسلمان" خود اُن کی زبان فیض ترجمان سے دو بار سُنی اور خود کئی بار پڑھا۔ ہر بار ایک نیا لطف آیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ نظم بھارت کے مسلمانوں کے افسردہ اور مایوس دلوں میں از سرِ نو تازگی اور امید پیدا کرے گی۔ مجھ سے پاکستان کے ایک مشہور و معروف بزرگ نے حال ہی میں یہ کہا کہ مسلمانوں کو زندہ کرنے میں جگن ناتھ آزاد بڑا حصہ لے رہا ہے اس سے زیادہ اس نظم کی اور خود جگن ناتھ آزاد کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

خاکسار

سیّد محمود

(۲۰)

پیارے عزیز جگن ناتھ۔ سلام و دُعا

میں کل شام کو یہاں پہنچا اور آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ کا ذکر سر ظفر اللہ کراچی میں کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام جگن ناتھ آزاد سب سے زیادہ کر رہا ہے میں نے اُن سے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے۔ پھر آپ کی نظم کا ذکر آیا۔ میں یہاں غالباً ۷ اریا ۸ ار جون تک ٹھہروں گا اگر یہ خط وقت پر مل جائے

تو پرسوں ملنے کی کوشش ممکن ہے کہ میں پرسوں ہی آٹھ بجے کی گاڑی سے چلا جاؤں
پنڈت جی تو یہاں تشریف نہیں رکھتے چند سطریں میں لکھے دیتا ہوں۔ سر ظفر اللہ کا نام تو
بغیر اُن کی اجازت کے نہیں لکھ سکتا ورنہ بڑا اچھا ہوتا اگر کہیئے تو ان کو لکھوں گو وہ یورپ
چلے گئے ہیں۔ امید ہے جلد آجائیں گے۔

خاکسار
سید محمود

معین احسن جذبی
۶۔ امیر نشاں
سول لائن علی گڑھ

برادرم!
تمہارا خط ملا۔ دہلی کے مشاعرے میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ روپیہ
بہت بڑی چیز سہی لیکن ضمیر اس سے بڑی چیز ہے۔ ضمیر کی موت
آرٹسٹ کی موت ہے۔
"ماحول" کے مالک اگر پچیس (۲۵) روپیہ دے سکیں تو میں غزل بذریعہ
وی۔ پی بھیجنے کو تیار ہوں۔ تم انھیں معاوضہ دینے پر کیوں نہیں آمادہ کرتے۔
جوش صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہونچا دینا۔ عرش صاحب، اختر صاحب
بلونت سنگھ سے بھی سلام کہنا۔ اپنا مجموعہ اڈیٹر علی گڑھ میگزین اردو
سکشن کے نام بھیجدو۔ اگلی اشاعت میں تبصرہ ہو جائیگا

تمہارا
جذبی

13.1.50

بھارت کے مسلمان

جگن ناتھ آزاد

مذکورہ بالا نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہوگئی ہے اس نظم کی قدر و قیمت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کا لکھنے والا گزشتہ انقلاب کا ستایا ہوا مغربی پنجاب کا ایک بے خاناں ہندو ہے یہ نظم اس لائق ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نگاہوں سے گزرے اس لئے اس کو پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

(نیاز احمد صدیقی پرنسپل محمد حسین انٹر کالج ...)

...ں دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں — کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
...لش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں — اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں

حیرت ہے گھٹاؤں سے نور ہو ترساں

بھارت کے مسلماں

...ردِ محبت کا طلبگار ازل سے — تو مہر و مروت کا پرستار ازل سے
...محرم ہر لذتِ اسرار ازل سے — ورثہ ترا رعنائیٔ افکار ازل سے

رعنائیٔ افکار کو کر پھر سے غزلخواں

بھارت کے مسلماں

...لرز نہ بھلا میر کا غالب کا ترانہ — بن جائے کہیں تیری حقیقت نہ فسانہ
...زاقِ فنا کو تو ہے درکار بہانہ — تاراج نہ ہو قاسم و رشید کا خزانہ

اے قاسم و رشید کے خزانے کے نگہباں

بھارت کے مسلماں!

حافظؒ کے ترنم کو بسا قلب و نظر میں ۔ رومیؒ کے تفکر کو سجا قلب و نظر میں
سعدیؒ کے تکلم کو بٹھا قلب و نظر میں ۔ دے نغمۂ خیامؒ کو جا قلب و نظر میں
یہ لحن ہو پھر ہند کی دنیا میں پُر افشاں
بھارت کے مسلماں!

طوفان میں تو ڈھونڈ رہا ہے جو کنارا ۔ امواج کا کر دیدۂ باطن سے نظارا
ممکن ہے کہ ہر موج نظر کو ہو گوارا ۔ ممکن ہے کہ یہ موج بنے تیرا سہارا
ممکن ہے کہ ساحل ہو پس پردۂ طوفاں
بھارت کے مسلماں!

مانندِ صبا خیز و زیدن دگر آموز ۔ اندر دلک غنچہ خزیدن دگر آموز
در انجمنِ شوق طپیدن دگر آموز ۔ نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز
اے تو کہ ترے دل میں ہے فریاد نیستاں
بھارت کے مسلماں!

ظاہر کی محبت سے مروت سے گزر جا ۔ باطن کی عداوت سے کدورت سے گزر جا
بیکار و دل آزار قیادت سے گزر جا ۔ اس دور کی بوسیدہ سیاست سے گزر جا
اور عزم سے پھر تھام ذرا دامنِ ایماں
بھارت کے مسلماں!

اسلام کی تعلیم سے بیگانہ ہوا تو ۔ نا محرمِ ہر جرأتِ رندانہ ہوا تو
آبادیٔ ہر بزم تھا ویرانہ ہوا تو ۔ تو ایک حقیقت تھا اب افسانہ ہوا تو
ممکن ہو تو پھر ڈھونڈ گنوائے ہوئے ساماں
بھارت کے مسلماں!

اجمیرؒ کی درگاہِ معلی تری جاگیر ۔ محبوبِ الٰہیؒ کی زمیں پر تری تنویر
قدرت سے ہیں کلیرؒ کے فروزاں تری تصویر ۔ ہانسیؒ کی فضاؤں میں ترے کیف کی تاثیر
سرہندؒ کی مٹی ہے ترے دم سے فروزاں
بھارت کے مسلماں!

ہر ذرّہ دہلی ہے تری ضو سے منور　　پنجاب کی مستی اثرِ جذبِ قلندرؒ
گنگوہؒ کی تقدیس ہے قدوس سراسر　　پٹنے کی زمیں نکہتِ خواجہؒ سے معطّر
مدراس کی مٹی میں نہاں تاجِ شہیداںؒ

بھارت کے مسلماں!

بسطامیؒ و بصریؒ و مصریؒ و غزالیؒ　　جس علم کی جس فقر کی دنیا کے تھے والی
حیرت ہے تو اب ہے اسی دنیا میں سوالی　　ہے گوشۂ پستی میں تری ہمتِ عالی
افسوس صد افسوس تری تنگیِٔ داماں

بھارت کے مسلماں!

مذہب جسے کہتے ہیں وہ کچھ اور ہے پیارے　　نفرت سے پرے اس کا ہر اک طور ہے پیارے
مذہب پہ تعصب تو بڑا جور ہے پیارے　　عقل و خرد و علم کا یہ دور ہے پیارے
اس دور میں مذہب کی صداقت ہو نمایاں

بھارت کے مسلماں!

اسلام تو مہر اور مروّت کا بیاں ہے　　اخلاص کی روداد مروّت کا بیاں ہے
ہر شعبۂ ہستی میں صداقت کا بیاں ہے　　اِک زندہ و پائندہ حقیقت کا بیاں ہے
کیوں دل میں ترے ہو نہ حقیقت یہ فروزاں

بھارت کے مسلماں!

اِسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں　　انساں کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں
افراد کی تنظیم فراموش ہوئی کیوں　　اخلاص کی تسلیم فراموش ہوئی کیوں
حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالم نسیاں

بھارت کے مسلماں!

ماحول کی ہو تازہ ہوا تجھ کو گوارا　　درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا
کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا　　چمکے گا پھر اک بار ترے بخت کا تارا

ہو جائے گی تاریکیٔ احوال گریزاں
بھارت کے مسلماں!

۱؎ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند ۲؎ سرسید احمد خاں ۳؎ مشہور شاعر حافظ شیرازی ۴؎ مولانا جلال الدین رومی ۵؎ شیخ سعدی شیرازی ۶؎ مشہور فلسفی شاعر عمر خیام ۷؎ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ۸؎ حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی ۹؎ کلیر میں حضرت علاء الدین احمد صابر کا مزار مبارک ہے۔ ۱۰؎ ہانسی میں حضرت جمال ہانسوی اور دوسرے بہت سے بزرگوں کے مزارات ہیں ۱۱؎ سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی کا مزار مبارک ہے ۱۲؎ پانی پت میں حضرت بو علی شاہ قلندر کا مزار ہے ۱۳؎ حضرت عبدالقدوس گنگوہی جن کا مزار مبارک گنگوہ میں ہے ۱۴؎ پٹنہ میں حضرت خواجہ اسحاق کا مزار ہے ۱۵؎ تاج شہیداں سے مراد ٹیپو سلطان شہید ہے ۱۶؎ بسطامی سے مراد حضرت بایزید بسطامی ہیں، بصرہ میں بہت سے بزرگ گزرے ہیں، معرّی سے مراد مشہور فلسفی ابوالعلا معرّی اور غزالی سے حضرت امام غزالی ہیں۔

معین حسن جذبی
۶۔ امیر نشاں
سول۔ لائنس۔ علی گڑھ۔

تمہارا خط ملا۔ دہلی کے مشاعرے میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ روپیہ بہت بڑی چیز سہی لیکن ضمیر اس بڑی چیز ہے۔ ضمیر کی موت آرٹسٹ کی موت ہے۔

"ماحول" کے مالک اگر پچیس روپے دے سکیں تو میں غزل بذریعہ وی۔ پی بھیجنے کو تیار ہوں۔ تم انہیں معاوضہ دینے پر کیوں نہیں تیار کرتے

جوش صاحب کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دینا۔ عرش صاحب، اختر صاحب، بلونت سنگھ سے بھی سلام کہنا۔ اپنا مجموعہ اڈیٹر علی گڑھ میگزین اردو سیکشن کے نام بھیج دو۔ اگلی اشاعت میں تبصرہ ہو جائے گا۔

تمہارا ــــ جذبی ـ ۱۳ جنوری ۵۶ء

نثریات

1. آنسوؤں اور قہقہوں کی کتاب ——— خواجہ احمد عباسی
2. جگن ناتھ آزاد اور شخصیت نگاری ——— ڈاکٹر سلیم اختر
3. آنکھیں ترستیاں ہیں ——— پروفیسر عبد المغنی
4. کے دیس میں ——— مظہر امام
5. کافر ہندی مسجدِ قرطبہ میں ——— مولانا عبد الماجد دریابادی
6. آنکھیں ترستیاں ہیں ——— حکیم عبد القوی
7. آنکھیں ترستیاں ہیں ——— حکیم محمد حسین خاں شفا
8. آنکھیں ترستیاں ہیں ——— رزاق ارشد
9. نشانِ منزل ——— ڈاکٹر محمد حسین
10. اقبال اور مغربی مفکرین ——— عبد السمیع بویرے
11. آنکھیں ترستیاں ہیں ——— ادیب حیدرآبادی
12. جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ ——— ڈاکٹر حامد اللہ ندوی
13. اقبال اور آپ کا عہد ——— ضیا تیرو ہما
14. دو ریڈیو فیچر ——— قومی آواز لکھنؤ

خواجہ احمد عباس

آنسوؤں اور قہقہوں کی کتاب

میں نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" (موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی قیمت ۲۳ روپے) ایک ہندو اردو داں دوست کو پڑھنے کے لئے دی انھوں نے میرے سامنے ہی اسے پڑھنا شروع کر دیا۔
میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کبھی تو میں نے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری دیکھے اور کبھی ہنسی سے لوٹ پوٹ پایا

اس کتاب میں کیا جادو کی پڑیا ہے؟

موت کا کرشمہ:۔ وہ جادو کی پڑیا انسانی کردار، انسانی جذبات، اور انسانی احساسات کی ادبی (یعنی جادو بھری) نقاشی ہے۔ دنیا میں ادب ہی سب سے بڑا جادو ہے۔
یہ اس سے پہلے بھی میرا خیال تھا مگر اس کتاب کو پڑھنے کے بعد خیال مستحکم ہو گیا۔
اردو ادب کے جتنے صاحبِ قلم پنجاب میں ہوئے ہیں اتنے شاید ہی کسی علاقے میں نہیں ہوئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ کوئی مصنف کا شاعری میں استاد تھا۔ کوئی ان کا دوست تھا کسی سے روپیہ قرض لے کر وہ تقسیم کے بعد دہلی آئے تھے کوئی ان کے بزرگ تھے۔ کوئی ان کے ہم عمر دوست تھے مگر ایک بات ان سب میں مشترک ہے وہ ہے موت! جو کرشن کو مولانا آزاد کے برابر کھڑا کر دیتی ہے۔ جو ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کو مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر "ادبی دنیا" کے برابر کر دیتی ہے

حالانکہ یہ مختلف نسلوں کے ادیب تھے مگر موت کے ظالم ہاتھوں نے سب کو برابر کر دیا مگر مگر ان سب میں ایک اور مشترک قدر تھی وہ تھی ان کی انسانیت اور ادبی پوزیشن جو کہ ممتاز تھی۔

اگرچہ پرانی نسل کے پنجابی ادیبوں کا پلّہ بھاری ہے۔ اس کتاب میں جو کہ پروفیسر آزاد نے اپنی آہوں اور آنسوؤں کو پی کر اور اپنے انسان دوستی کے جوہر کو کام میں لاکر لکھی ہے مگر غیر پنجابی ممتاز ہستیاں بھی اس میں شامل ہے۔۔

پنجابیوں میں تاجور نجیب آبادی صلاح الدین احمد، عبدالمجید سالک، شیخ سر عبدالقادر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، محمد دین تاثیر عرش ملسیانی، تلوک چند محروم (مصنف کے والد) مہندر ناتھ اور کرشن چندر (چھوٹا بھائی موت میں بڑے بھائی سے سبقت لے گیا) غیر پنجابی ہستیوں میں سروجنی نائیڈو، مولانا آزاد، مولوی عبدالحق، سلیمان ادیب، ابنِ بھائی، درگا پرشاد دھر، حسرت موہانی اور رشید صدیقی ہیں۔

دو غیر پنجابی ادبی ہستیاں اس فہرست میں رہ گئی ہیں۔ نہ جانے کیوں! کیونکہ دونوں جگن ناتھ کے قریب تھے ایک تو خواجہ غلام السیدین اور دوسرے ڈاکٹر عابد حسین

بائیس قلمی چہرے:۔ اور پنجابی ادیبوں میں پنجاب کا سب سے بڑا اور آزاد کا چہیتا شاعر محمد اقبال۔ مانا کہ اقبال پر کئی کتابیں آزاد صاحب لکھ چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس سونی محفل سے ان کی غیر حاضری کس قدر کھلتی ہے۔ "ان بائیس قلمی چہروں" میں سب ہی درخشندہ ہیں۔ ان میں تمیز کرنا مشکل ہے بقول ڈاکٹر سلیم اختر کے مقدمے کے یہ "وہ آئینے ہیں، جن میں آزاد نے اپنی فطرت اور ادبی قابلیت۔ ح۔ ا ع۔! کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کے محبت بھرے مرقعے سجاتے ہیں پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ تاجور نجیب آبادی (جو آزاد کے شاعری میں استاد تھے) کا مضمون سب سے جامع ہے (دریا کو کوزے میں بند کیا ہے) جو اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔۔۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

جذبات کا مرقع: صلاح الدین احمد کے بارے میں جو مضمون ہے وہ سب سے زیادہ جذباتی ہے۔ بار بار پڑھنے والے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ پہلا فقرہ ہی حاصلِ مضمون ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کی موت ایک فرد کی موت نہیں ہے ایک ادارے کی موت ہے ایک عہد کی موت ہے۔

دراصل آزاد (اور بہت سے ہندوؤں کے ساتھ) کا ارادہ مستقل پاکستان میں رہنے کا تھا۔ یہ بات قابلِ یقین ہے مگر سچ ہے کہ ۱۴ اگست کی آدھی رات کو پہلا "ترانۂ پاکستان" ریڈیو پاکستان سے بجا وہ نہ اقبال کا لکھا ہوا تھا نہ فیض احمد فیض کا نہ شاعرِ پاکستان حفیظ جالندھری کا بلکہ ایک "ہندو کافر" جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا تھا۔ تو جس دکھ کا احساس اس وقت ہوا جب یہی "ترانۂ پاکستان" والا جگن ناتھ حالات سے مجبور ہو کر رفیوجی کیمپ سے ایک لاری میں سوار ہو کر امرتسر چلا۔

یہ بس میونسپل کارپوریشن کے قریب جاکر تھوڑی دیر کیلئے رُکی میں نے باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا سڑک کے کنارے نقش بہ دیوار بنے کھڑے ہیں اور لاہور سے جانے والے مہاجرین سے بھرے ٹرکوں اور بسوں کو حسرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ لپک کر بس کے نزدیک آگئے۔ مجھ سے انھوں نے کچھ کہنا چاہا ان کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی میں نے بھی کچھ نہیں کہا بس چل پڑی اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے

سب سے زیادہ مؤدبانہ قلمی چہرہ مولانا آزاد کا ہے

مولانا نے قریب ہی رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے مولانا کے حضور مجھے ان کے قدموں میں فرش پر بیٹھنا چاہئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

مولانا ادب نواز اور ادیب ستائش تھے محروم صاحب (والدِ آزاد) کی پنشن کا وقت آیا تو مولانا نے بیک قلم توسیع کرادی۔

آزاد سے ایک ملاقات جس کے لئے پانچ منٹ مقرر تھے جب تیس منٹ پھیل چکی ...... چنانچہ یہ کہہ کر کہ آج آپ بہت مصروف ہیں ۔ ہم رخصت طلب ہوئے باہر آئے تو صدر کانگریس شری ڈھیبر بھائی موجود تھے ان سے معذرت کی کہ ہماری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی وہ بولے نہیں اس دربار میں شاعروں اور ادیبوں کو سیاست دانوں پر ہمیشہ فوقیت دی جاتی ہے ۔

سروجنی نائیڈو مکمل ترین سوانح حیات ہے جس میں ایک شاعر نے نہ صرف ایک عظیم شاعرہ کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے بلکہ ان کی پوری زندگی کے ادبی اور سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔

کرشن چندر کا مضمون "دوست تشنہ رہ گیا ہے" دراصل یہ ایک دوسری تصنیف سے ادھار لیا گیا ہے ۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب اپنا ثانی نہیں رکھتی ۔ علاوہ اور خوبیوں کے ہر قدم پر اردو کی عظمت اور خوبصورتی اور ہمہ گیری کا احساس دلاتی ہے ۔ ہر اردو داں کو نہ صرف یہ کتاب پڑھنا چاہئے بلکہ پروفیسر آزاد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے

انسٹی ٹیوٹ آف اقبال اسٹڈیز کا جلسہ

جگن ناتھ آزاد مخاطب کریں گے ۔ حیدرآباد ۱۴ دسمبر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اقبال اسٹڈیز اور ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک جلسہ دوشنبہ ۱۷ دسمبر ۶ بجے شام آزاد انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں منعقد ہوگا ۔ ماہر اقبالیات جناب جگن ناتھ آزاد مخاطب کریں گے ڈاکٹر غلام عمر خاں اور جناب خواجہ محمد احمد نے دونوں اداروں کے اراکین اور اقبال سے دلچسپی رکھنے والے طلبا اور طالبات سے شرکت کی اپیل کی ہے ۔

سیاست ، حیدرآباد

۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر سلیمہ اختر

جگن ناتھ آزاد اور شخصیت نگاری

شخصیت نگاری کا جائزہ لینے پر اندازِ نظر اور تدبیر کاری کے لحاظ سے اب واضح طور پر دو دھاروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف وضع داری پر مبنی انداز جس کی اساس مشرقی رواداری پر استوار ہے۔ اس میں قلم کو رواداری کی روشنائی میں ڈبو کر اور آنکھوں پر عقیدت و احترام کی عینک لگا کر شخصیت کا خوش منظر روپ دکھایا جاتا ہے۔ ہماری سوانح عمریاں اور شخصیت نگاری کی بیش تر مثالیں اس شریفانہ انداز کی مظہر قرار دی جاسکتی ہیں اور اسی اندازِ شخصیت نگاری کے خلاف سعادت حسن منٹو نے ان الفاظ میں احتجاج کیا تھا کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا شخصیت کو لانڈری سے دھلا لیا گیا ہو چنانچہ منٹو اور عصمت چغتائی جیسے باغی ادیبوں کی تحریروں سے اس انداز کی داغ بیل پڑی جس میں شخصیت پر لانڈری میں کلف چڑھانے کے بجائے اس کے داغ داغ دامن اور تار تار گریباں کے ذریعے منفی سے مثبت کا اثر ابھارا جاتا ہے ویسے یہ انداز بے حد خطرناک کہ نفسیاتی عدم آگہی اور کردار کے لاشعوری محرکات سے عدم واقفیت کے باعث اس نوع کی شخصیت نگاری سنسنی خیزی کے باوجود گمراہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ شاید

اس لئے اب بھی بیش تر سکھنے والے اولین رجحان کے ترجمان نظر آتے ہیں۔

شخصیت نگاری کے تجزیاتی مطالعہ سے بیش تر شخصیت نگار کی جانچ بھی بہت ضروری ہے۔ یہ اس لئے کہ شخصیت نگار کی اپنی نفسیات اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مخصوص رجحانات و میلانات ذاتی پسند ناپسند اور پالتو تعصبات اس کی آنکھوں پر جو غیر مرئی عینک چڑھا دیتے ہیں اس کے باعث وہ ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہی کے مطابق افراد اور وقوعات کی پرکھ کرتا ہے اس لئے اگر "حیاتِ جاوید" حالی کے برعکس یا اکبر الہ آبادی نے لکھی ہوتی تو کیا وہ "مدلل مداحی" ہو سکتی تھی؟ اسی طرح اگر مولوی عبدالحق کے برعکس کسی اور نے "چند ہم عصر" لکھی ہوتی تو اس میں نیچ ذات کے نام دیو مالی اور ایک گمنام سپاہی نورخاں پر مضامین کبھی نہ ملتے۔

اگرچہ بیش تر شخصیت نگاروں نے اپنے معیارِ شخصیت کی بطورِ خاص تشریح نہ کی لیکن موضوع بننے والی شخصیات اور پھر ان کی تصویر کشی میں روا رکھے گئے انداز سے ان کے اپنے مخصوص تصورِ شخصیت نگاری کا استخراج کوئی ایسا مشکل کام نہیں اور اس انداز پر اگر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت نگاری کا جائزہ لیں تو "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں شامل یا ہستیہ شخصیات پر قلم بند کئے گئے مضامین سے ان کے مخصوص تصورِ شخصیت نگاری کا باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں اور یہاں شاید یہ امر بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ یہ دونوں نامور باپ بیٹے دنیائے ادب میں اتنے ہی ممتاز اور منفرد ہیں جتنا کہ اپنے غیر متعصبانہ رویے شریف النفسی اور وسیع ظرفی کیلئے مشہور ہیں شاید اسی لئے انھوں نے فسادات کی آگ میں مسلمان دوستوں اور مسلمان محلوں میں پناہ لینے کو ترجیح دی۔

ان ایام کی داستان بزبانِ آزاد ہ

۱۹۴۷ء کے ذکر سے یاد آیا میرا لاہور چھوڑنے کا پروگرام بہت جلدی میں بنا تھا اس قدر جلد لاہور چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں تھا بلکہ ارادہ تو وہیں مستقل قیام کا تھا۔ لیکن ہوا یوں میں شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا وہ سارا ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ یہ کرشن نگر سے ملحقہ رام نگر کا علاقہ تھا فسادات کے دنوں میں یہ علاقہ خالی ہونا شروع ہو گیا۔ ہم چند لوگوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے ہم اپنا گھر بار اور اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ لیکن ہر نئی صبح اس آبادی کی ایک خاصی تعداد کے ارادے کے متزلزل ہونے کی خبر لاتی تھی اپنے اپنے گھر میں جمے رہنے کا مستقل ارادہ کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی گئی اور ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اس ساٹھ ہزار کی آبادی میں میرے سوا کوئی ہندو باقی نہیں رہ گیا تھا سب جا چکے تھے۔ اسی عالم میں تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی رات کو میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانہ پاکستان سنا۔

اے سرزمین پاک!

روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ پہلا ترانہ پاکستان تھا جو پاکستان کے نقشۂ عالم پر نمودار ہونے کے ساتھ یعنی ۱۴ اگست کو رات کے بارہ بجے سننے والوں تک پہونچا (اس ترانے کو صلاح الدین احمد) اور جب بارہ نمبر گھر یاد چھوڑا تو یہ عالم تھا کہ،، عین اس دن جب سالک صاحب کے خیال کے مطابق مجھے کسی خالص ہندو آبادی میں محفوظ ہونا چاہیے تھا۔ میں ملتان روڈ پر ابوالمعز بازش رسوی کے مکان پر مقیم تھا اور وہاں کی خالص مسلمان آبادی کے مہمان عزیز کی طرح نزوکش تھا (عبدالمجید سالک) اور جب بچ بچا کر دہلی پہنچ گئے تو لاہور کی انہیں یاد ستاتی کہ پھر واپس آ گئے۔ آزاد تو پاکستان ہی میں رہنے کے خواہش مند تھے مگر بعض بہی خواہوں کے مشورے پر واپس وو شرنارتھی،، بن کر جانے پر مجبور ہو گئے اور پھر جب پاکستان آئے تو یوں!

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو کہ اپنے آپکو مانند مہمان لے کے آیا ہوں

اور کیوں نہ ہوتا کہ یہ محروم کے فرزند ہیں جو خود اسلام کا شیدائی ہیں ورنہ ایسے اشعار نہ لکھتا۔

اے ملّتِ اسلام! تیرے ذوقِ سخن سے
فردوسِ نظر عالمِ معنیٰ کا ہے گلزار

تبریزی ورومی کی نواؤں سے ہے پیہم
وہ حسن کی بارش ہے کہ جاذب مطلع انوار

ہے روحِ بشر اس کے تجسس میں ازل سے
جس حُسن کے ہیں پردہ کُشا جامی و عطار

محروم نے کس حد تک اسلامی شعار اپنا رکھے تھے اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کی دو سالہ بیٹی کا انتقال ہوا تو بقول آزاد: اس بچی کی موت کے بعد ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلایا نہیں گیا بلکہ دفنا گیا تھا۔ والد اور میں مسلسل تین روز اس کی قبر پر جاتے رہے (محترم میرے والد)

میرا مقصد جگن ناتھ آزاد کو اسلام شاہ آزاد ثابت کرنا نہیں صرف اس امر کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ آزاد اور ان کے والد محترم کس قدر غیر متعصب انسان تھے یہ اس لئے ضروری ہے کہ "آنکھیں ترستیاں ہیں"۔ انھوں نے جن ہستیوں کو عقیدت و محبت اور خلوص سے یاد کیا ہے ان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے مگر کیسے کیسے مسلمان کہ ایک شاعری میں ان کا استاد ہے (تاجور نجیب آبادی) تو دوسرا فارسی کا پروفیسر (صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم) جبکہ ایک اردو دنیائے ادب میں ان کی رہبری کرتا ہے (مولانا صلاح الدین احمد) اس طرح زندگی کے دیگر مواقع میں بھی جن جن حضرات نے کسی نہ کسی طرح ان کی دست گیری کی ان سب کا بصد احترام اعتراف کیا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر آزاد کی شخصیت کی جو مرتب ہوتی ہے اس میں محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی انکساری کا رنگ ملتا ہے بلکہ آزاد کی شخصیت کا یہ پہلو اتنا نمایاں ہے کہ پہلی ملاقات ہی میں اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح

بزرگوں اور بالخصوص اساتذہ کے احترام کا بھی احساس ہوتا ہے مثلاً وہ مشاعروں میں ہمیشہ اپنے استاد تاجور نجیب آبادی کے پیچھے بیٹھے تھے (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم) اس مضمون میں وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں اقبال عالمی کانگریس کے موقع پر سیالکوٹ میں مندوبین کا جو جلوس نکلا اس کی قیادت کا اعزاز انھیں سونپا گیا مگر انھوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ جلوس میں ان کے دو اساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی تھے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی قیادت کریں۔ آخر جب خود صوفی صاحب نے زور دے کر کہا تو وہ مانے اس طرح جب سیالکوٹ ہی میں مشاعرے کی صدارت کیلئے بھی انھیں کا نام تجویز ہوا تو انھوں نے پھر اساتذہ کے احترام میں صدارت سے جان چھڑانی چاہی اس پر بھی صوفی صاحب نے ڈانٹا یوں کہ بقول آزاد وہ مجھے ان کا چالیس برس پہلے والا لہجہ یاد آیا جب انھوں نے کلاس روم میں مجھ سے کہا تھا۔

AZAD GET OUT OF THE CLASSROOM

ان مضامین سے آزاد سے علامہ اقبال سے محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ آج جگن ناتھ آزاد نے اقبال سکالر کے لحاظ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے ہمارے ہاں وہ عدیم المثال مقبولیت رکھتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کو اقبال شناسی بھی اپنے نامور والد سے ورثے میں ملی ہے چنانچہ اپنے والد پر لکھے گئے مضمون میں وہ بتلاتے ہیں کہ علامہ اقبال کے انتقال پر کیسے ان کے والد نے فی البدیہہ نظم کہی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا۔

اس مضمون میں یہ اہم انکشاف بھی ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے سبقاً سبقاً عروض پڑھی تھی ان مضامین میں کئی ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے علامہ اقبال سے عقیدت کی شدت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کبھی وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ

"آج میری بیاض اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہے جو اقبال کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں"، (عبدالمجید سالک) تو کبھی اپنی کم مائیگی کے احساس کی ترجمانی کے لئے اقبال کا شعر نقل کرتے ہیں (ابوالکلام آزاد) یہی نہیں بلکہ اقبال کے خلاف بات تک سننے کے روادار نہیں ہیں (سلیمان اریب) اور جب کوئی ان کی توقع کے برعکس اقبال کا شیدائی نہ نکلے تو چہرہ پر انقباض کی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے (کرشن چندر) شاید اسی لئے جگن ناتھ آزاد نے اپنی زندگی علامہ اقبال کی تعلیمات کے فروغ کیلئے وقف کر رکھی ہے۔ جب میں اپنی مرتبہ کتاب (اقبالیات کے نقوش) کیلئے علامہ اقبال کی زندگی میں ان پر لکھے گئے مقالات کی تلاش میں پرانے جرائد کی خاک چھان رہا تھا تو مئی ۱۹۳۵ء کے "ہمایوں" میں جگن ناتھ آزاد کا ایک مقالہ بعنوان "اقبال کی منظر نگاری" میرے ہاتھ لگا میں کیونکہ اب تک آزاد سے نہ ملا تھا اس لئے سوچا یہ بھی یقیناً کوئی معمر اقبال شناس ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کے زمانۂ طالب علمی کی کوشش تھی اس وقت سے لے کر اب تک آزاد نے خود کو علامہ اقبال کیلئے وقف کئے رکھا ہے اس لحاظ سے تو یہ حضرت واقعی یک رخے ذہن TRACK OF MIND کے حامل ہیں اور یہ "ٹریک" ہے اقبال۔۔

جگن ناتھ آزاد کی علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت کے نتیجے میں مختلف شخصیات کے مطالعات میں علامہ اقبال کے بارے میں بعض نئی اور کام کی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شیخ عبدالقادر کا یہ انکشاف کہ ان کے "بانگ درا" کے دیباچے کے بارے میں بعض احباب نے اقبال کو یہ رائے دی تھی کہ یہ دیباچہ "بانگ درا" میں شامل نہ کیا جائے کیونکہ یہ "بانگ درا" کے معیار کا نہیں ہے لیکن اقبال نے یہ دیباچہ "بانگ درا" میں شامل کیا اور اس سے میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ انھوں نے اسے پسند کیا ہوگا۔ شیخ صاحب نے کہا۔ "یہ بات خود اقبال نے مجھے بتائی تھی۔ اگرچہ ان لوگوں میں سے کسی کا نام نہیں بتایا جنھوں نے دیباچے کے بارے میں مخالفانہ رائے دی تھی۔۔۔

اقبال کے بعض ایسے غیر مطبوعہ اشعار بھی لکھے گئے ہیں جو مدت بعد کہیں جا کر مدون ہوئے تین اشعار پیش ہیں۔

شبِ فرقت تصور تھا ترا اعجاز تھا گیا تھا — تیری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے — پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

دلم بسوخت تنم بسوخت استخواں ہم سوخت — تمام سوختم و ذوقِ سوختن باقیست

شیخ عبدالقادر والے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی نظموں کے پہلے مجموعے کا نام "نذرِ اقبال" تھا اور اس میں تمام نظمیں اقبال ہی کے بارے میں تھیں بعض نظموں میں اقبال کے مصرعوں یا اشعار کی تضمین تھی۔ یہ مسودہ تو ۱۹۴۷ء میں تلف ہو گیا لیکن شیخ عبدالقادر نے اس پر جو دیباچہ لکھا وہ محفوظ رہ گیا اور اب حمیدہ سلطان کی مرتبہ کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اُن کی شاعری" میں شامل ہے۔[۲]

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال شناسی جگن ناتھ آزاد کی تخلیقی شخصیت میں اساسی کردار ادا کرتی نظر آتی ہے چنانچہ جب میں نے اپنی کتاب "فکرِ اقبال کا تعارف" کا انتساب جگن ناتھ آزاد کے نام کیا تو میں اس سے بہتر لکھنے کو اور کچھ نہ سوچ سکا۔

"اقبال کے غیر متعصب سکالر اور مداح جگن ناتھ آزاد کے نام"

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازاں بآں قسمت کہ پیشِ یار می رقصم

---

[۱] غالباً اپنے فارسی کے استاد مولوی میر حسن کی طرف اشارہ ہے

[۲] یہ دیباچہ ایک مضمون کے طور پر اسی نام کی کتاب یعنی "نذرِ اقبال" (مرتبہ محمد حنیف شاہد) میں بھی شریکِ اشاعت ہے (قدیر)

"آنکھیں ترستیاں ہیں" کے باقی سوانحی مضامین دراصل وہ آئینے ہیں جن میں آزاد نے اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کی یادوں کے محبت بھرے مرقعے سجائے ہیں یوں دیکھیں تو یہ تمام مضامین مل کر "موزیک" کی صورت اختیار کر کے خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کے رنگ دکھاتے ہیں۔ وہ شخصیت جس کا سارا حسن اور رنگینی، محبت، خلوصِ جذبات، لگن اور عجز و انکسار سے جنم لیتا ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے؛

علامہ نیاز فتحپوری۔ ۔۔۔۔۔۔ اس وقت ہمارے اردو شعراء میں صرف جگن ناتھ آزاد ہی ایک ایسا شاعر ہے جو پہلے دل خون کرتا ہے اور پھر اس خون سے شعر لکھتا ہے۔ وہ ایک بڑا وسیع النظر انسان ہے جس کی دنیا میں محبت و خلوص کے سوا کسی اور جذبہ کی گنجائش نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا اپنے دل کے ٹکڑے نظم کرتا ہے جن کی دھڑکن ہم کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

"نگار" کراچی

پروفیسر عبد المغنی (پٹنہ)

آنکھیں ترستیاں ہیں

جناب جگن ناتھ آزاد عصر حاضر میں اردو کے ان ادیبوں اور شاعروں میں ایک ہیں جن کی تحریر و تقریر نے اردو زبان و ادب کے تحفظ و ترقی کا سامان کیا ہے تقسیم ہند کے بعد جن چند شاعروں نے آزاد ہندوستان میں اردو کی عوامی مقبولیت برقرار رکھنے میں نمایاں ترین خدمات انجام دیں ان میں ایک جگن ناتھ آزاد بھی ہیں اس کے علاوہ اردو کے سب سے بڑے شاعر اقبال کے کلام کی تشریح و ترجمانی کے لئے بھی آزاد صاحب نے اردو دنیا میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔ اقبال صدی کی تقریبات میں جگن ناتھ آزاد کی مرتب کی ہوئی اقبال نمائش اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب جناب جگن ناتھ آزاد کے ان مختصر سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف مواقع پر اردو کے معروف ادبا و شعرا کے متعلق تحریر کئے۔ علم و ادب کی ان ممتاز شخصیتوں سے آزاد صاحب کے تعلقات رہے ہیں۔ یا ان کی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اس طرح مشاہیر کے چند بہت دلچسپ خاکے مرتب ہوتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد ڈاکٹر عبدالحق، سر عبدالقادر، تاجور نجیب آبادی، عبدالمجید سالک، صلاح الدین احمد سروجنی نائیڈو، کرشن چندر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، عبدالقادر سروری، رشید احمد صدیقی اور حسرت موہانی کی شخصیتوں کے دل آویز مرقعے ان خاکوں میں ابھرتے ہیں جب اردو کے مشہور شاعر اور اپنے والد، جناب تلوک چند محروم کا جو خاکہ جگن ناتھ آزاد

نے پیش کیا ہے وہ خاص کر بہت عمدہ ہے اور اس سے ایک باوقار شائستہ ادیب کی پر اثر تصویر ابھرتی ہے۔ اس آرزوؤں کی اور محرومیوں کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ اس کے دوستوں اور عزیزوں کے چہرے نمایاں ہوتے ہیں نامساعد حالات میں اس کے پختہ ارادوں اور وقیع خدمات کی روداد مرتب ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دورِ تہذیب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

یہ خاکے بہت سیدھے سادے لفظوں میں، انشا پردازی کی کسی کوشش کے بغیر بڑی بے تکلفی سے، گویا قلم برداشتہ مرتب کئے گئے ہیں۔ یہی ان کی خوبی اور کامیابی ہے انھیں پڑھتے ہوتے قاری کا ذہن خاکہ نگار کے قلم کی شوخیوں میں اٹکنے کی بجائے براہِ راست موضوعِ خاکہ کی شخصیت کی رعنائیوں میں محو ہو جاتا ہے ان خاکوں کی عمارت قیاسات اور تصورات پر نہیں، تجربات و تاثرات پر مبنی ہیں اس لئے ان میں حقیقت کی جھلک ہے اور انھیں پڑھتے ہوتے ہم زندہ انسانوں سے ملتے ہیں، مل کر خوش ہوتے ہیں، زندگی کا حوصلہ پاتے ہیں اور کچھ سیکھتے ہیں یقیناً پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے لکھے ہوئے یہ خاکے اردو خاکہ نگاری میں اضافہ کرتے ہیں اور خود مصنف کی ادبی شخصیت کا ایک نیا گوشہ پیش کرتے ہیں۔

دہلی کی جامع مسجد ہندوستانی فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ جس کی بنیاد ایک فقر آشنا شہنشاہ نے رکھی، اس نظم کا موضوع ہے۔

اس کا ایک ایک مصرع دینی تجلی سے جگمگا رہا ہے جس سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب عبارت ہے۔

دہلی کی جامع مسجد کو جگن ناتھ آزاد نے اسی انداز سے دیکھا ہے جس انداز سے علامہ اقبال نے مسجدِ قرطبہ کو دیکھا تھا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی۔

(مولانا) عبدالماجد دریابادی۔

"کافرِ ہندی" مسجدِ قرطبہ میں

اقبال کے معتقدِ خصوصی اور ان کے کلام و پیام کے بہترین شارح پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ایک سفر کی روداد منقول از "نشانِ منزل" مؤلفہ آزاد۔
اس طرح سے اسپین کا سفر مسجدِ قرطبہ کی زیارت کیلئے تھا۔ پہلی بار بالِ جبریل میں اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" پڑھنے کے بعد میری وہ کیفیت تھی جیسے ایک بچے کی پہلی بار ایک بہت بڑا عجائب خانہ دیکھنے سے .... اس وقت مسجد قرطبہ دیکھنے کی آرزو بے اختیار میرے دل میں پیدا ہو گئی۔ شاید دعا بن کر زبان پر بھی آئی ہو۔ آخر میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور فرانس سے ہندوستان، میری خوبی تقدیر پیرس سے مارسیلز جانے کے عوض پیرس سے میڈرڈ سے آئی اور وہاں سے قرطبہ اس کے آگے گنی سطروں میں مسجد کی تلاش میں انھیں سرگردانی اٹھانی پڑی۔ اس کی تفصیل کے بعد رقمطراز ہیں۔۔

ایک گلی کے نکڑ تک پہونچ گیا جہاں سے مجھے وہ مینارہ نظر آیا جسے اقبال نے

ع تیرا مینارۂ بلند جلوہ گہ جبریل۔

کہا ہے۔ اس وقت مجھ پر مسرت و کامرانی کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی کہ میرا دل دھڑک رہا تھا اور مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے مسجدِ قرطبہ کو دیکھ رہا ہوں ....اب میں وہاں اذان تو کیسے دیتا اور یہ فرض مجھ سے قبل علامہ اقبال خود ادا ہی

کرچکے تھے ہاں یہ مصرعہ ضرور زبان پر آگیا تھا۔

ع کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق ۔

صفحہ ۲۴۳ سے ۲۴۸

اسے کلامِ اقبالؔ کا فیض سمجھنا چاہئے ۔کہ ایک غیر مسلم کے دل میں اس مسجد کے دیکھنے کی ایسی تڑپ پیدا ہوئی اور اس کا اظہار اس کی زبان و قلم سے ہو کر رہا جس پر مسلمان کو رشک آنا چاہئے۔

علامہ نیاز فتحپوری

جگن ناتھ آزاد نہ صرف شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو شعر و سخن کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اقبال کا جو ابتدا ہی سے ان کا محبوب شاعر رہا ہے .... اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جنابِ آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ دوسروں کے خیال و استدلال کی تکرار نہیں ہے ۔ بلکہ ان میں ایک اضافہ ہے اور بڑا مستحسن اضافہ ۔

"نگار" لکھنؤ

حکیم عبد القوی

آنکھیں ترستیاں ہیں

اس کتاب کے متعلق مصنف کے دیباچہ کی ابتدائی سطریں اس کا صحیح اور جامع تعارف کراتی ہیں۔

یہ مختصر سی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میری یادوں کی داستان کا ورق ہے بلکہ اگر میں کہوں یہ داستان حیات کا ایک ورق ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اس مجموعہ میں بائیس مختلف الجہات شخصیتوں کا ذکر ہے جنھوں نے آزاد صاحب کی زندگی کو کسی نہ کسی شکل میں خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ پہلی تحریر آزاد صاحب کے استاد گرامی قدر مولانا تاجور نجیب آبادی پر اور آخری تحریر ان کے والد ماجد اور اردو کے نامور شاعر تلوک چند صاحب محروم پر ہے ان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق، مسز سروجنی نائیڈو، سر عبدالقادر، مولانا حسرت موہانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی کرشن چندر، عبدالقادر سروری، جاں نثار اختر وغیرہ۔ اس فہرست میں شامل ہیں ہر مضمون جاندار اور نہایت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد صاحب نظم کی طرح نثر اور اچھی نثر پر پوری طرح قادر ہیں۔ اردو زبان سے ان کا انتہائی شغف مسلمانوں اور اسلام سے ان کا تعلق خاطر اور اپنے اصل وطن پاکستان (جسے مجبوراً انھیں بالکل آخر میں ترک کرنا پڑا تھا) سے بے انتہا محبت بلکہ عشق ان مضامین کے مطالعہ سے پوری۔

طرح ظاہر ہوتا ہے۔

مولوی صلاح الدین احمد (ایڈیٹر ادبی دنیا) کے تذکرہ میں آزاد صاحب کے قلم سے یہ بھی پڑھنے میں آیا کہ جس وقت تقسیمِ پاکستان کے بعد ہونے والی بے محابا خونریزی و بدامنی کے باعث تبادلۂ آبادی جاری تھا اور لاہور کے جس محلہ میں آزاد صاحب رہتے تھے اس کی ساٹھ ہزار ہندو آبادی میں صرف آزاد صاحب اکیلے رہ گئے تھے اور سب ہندوستان جا چکے تھے تو اس عالم میں ۱۴ اگست کی رات کو میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانۂ پاکستان سنا

اے سرزمینِ پاک!

ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک

اس کے بعد انھوں نے اس ترانے کے کئی بند نقل کر کے یہ بھی لکھا ہے وہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو غالباً یہ پہلا ترانہ پاکستان تھا جو پاکستان کے نقشۂ عالم پر نمودار ہونے کے ساتھ ہی یعنی ۱۴ اگست کو رات میں ۱۲ بجے سننے والوں تک پہونچا۔"

مسز سروجنی نائیڈو سے مرتبِ کتاب کی ملاقات صرف ایک بار لکھنؤ کے گورنر ہاؤس میں جوش ملیح آبادی کی معیت میں اس وقت ہوئی جبکہ مسز نائیڈو یو پی کی گورنر تھیں اس سلسلہ میں یہ عبارت نظر سے گذری جسے ناظرینِ "صدق جدید" کے علم میں اس حسرت کے ساتھ لانا ضروری ہے کہ قبل اس کے مسز نائیڈو اس سلسلہ میں کچھ کر سکتیں وہ اس دنیا سے یکایک رخصت ہو گئیں۔ جوش صاحب نے ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر کیا اور کہا مجھے تو یہ کشتی تو ڈوبتی نظر آتی ہے۔ آپ بولیں نہیں آپکا خیال غلط ہے اردو کا مستقبل اس ملک میں بہت روشن ہے ذرا فرصت ملے تو اس ذمہ داری کو ہاتھ میں لے لوں گی مجھے اس معاملے میں پنڈت جی (جواہرلال) سے بھی بات چیت کرنی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اردو کے تحفظ کیلئے ایک ادارہ قائم ہو جائے۔

اس مجموعہ کی متعدد تحریریں پہلے بعض رسائل میں چھپ چکیں اور بعض ریڈیو سے نشر ہو چکی تھیں اس کے باوجود ان کی تازگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ سب سے طویل تر اور دل سے لکھا ہوا مضمون آزاد صاحب کے والد تلوک چند محروم صاحب پر ہے!!

حکیم محمد حسین خان شفا
رامپور یو۔پی۔

آنکھیں ترستیاں ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے بائیس ہمعصروں میں ممتاز اشخاص کی وفات پر لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا مقصد مالک رام کی کتاب در تذکرۂ معاصرین یا عبداللطیف اعظمی ایڈیٹر جامعہ کے مضامین وفیات جیسا ہے۔ لیکن طرز تحریر مختلف ہے اس مجموعے میں علاوہ درگا پرشاد دھر کے سب کے سب ادیب و شاعر ہیں۔ آزاد نے دیباچے میں لکھا ہے۔

یہ میری داستانِ حیات کا ایک ورق ہے۔۔۔۔۔ اس میں مذکورہ شخصیتوں نے کسی نہ کسی طرح میری زندگی کو ضرور متاثر کیا ہے۔۔۔ یہ مقالات جو ان تمام حضرات کی موت کے بعد میں نے لکھے ایک طرح سے اپنی زندگی کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہے جو بھری بزم سے ان کے اٹھ جانے سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔۔

میری رائے میں اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا آزاد نے جن شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے غیر منقسم بھارت کے علم و ادب تاریخ و تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ البتہ آزاد نے ان حضرات کی زندگی کے صرف اسی پہلو کو لیا ہے۔ جس سے وہ خود متاثر ہوتے ہیں یا ان کی رائے میں حسین و تعمیری پہلو ہے اس مجموعہ کا پہلا اور آخری مضمون حاصلِ کتاب ہیں جو استاد اور والد کے متعلق ہیں۔۔

کتاب کا نام بھی پہلے مضمون تاجور نجیب آبادی میں مذکورہ شعر سے ماخوذ ہے وہ نمونہ کلام کے تحریر کرتے ہیں

یہ ہیں اس محبوب شخصیت اور نابغۂ عصر کے چند اشعار
جن کی یاد آج بھی آتی ہے تو دل کی کائنات آنسوؤں کا
خراج عقیدت لے کر حاضر ہو جاتی ہے اور بے اختیار یہ
شعر زبان پر آجاتا ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اس مجموعہ میں تلوک چند محروم آزاد کے والد ہیں، تاجور نجیب آبادی
صوفی غلام مصطفٰے تبسّم استاذ ہیں، صلاح الدین احمد، محمد دین تاثیر، سالک،
عبدالقادر، ابوالکلام برگزیدہ بزرگ ہیں۔ جاں نثار اختر، کرشن چندر، نریش
کمار شاد، عرش ملسیانی، بنّے بھائی گہرے دوست۔

اکثر مضامین تاثراتی اور مطبوعہ ہیں جن کو نظر ثانی کے بعد ۱۹۸۱ء میں کتابی شکل دے دی گئی ہے آزاد نے انہیں مقالات کا نام دیا ہے جو قابلِ غور ہے۔

انھوں نے اس مجموعہ کو صرف یادداشت کے سہارے کاغذ و قلم کی مدد سے تیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں اگر کتابوں، بیاضوں، یا کاغذات سے اشعار یا حالات" وغیرہ نقل کرتا تو اس کی نوعیت بدل جاتی۔

ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے۔

یہ سوانحی مضامین وہ آئینے ہیں جن میں آزاد
نے اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے ۔۔۔۔ محبت
بھرے مرقعے سجائے ہیں ۔۔۔۔

آزاد نے سارے مضامین عقیدت، ادب اور احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف زندگی کے حسین و پاکیزہ پہلو کو ابھارنے کیلئے لکھے ہیں جن میں سچائی اور خلوص نیت کے ساتھ تو ہمدردی ہے۔

اکثر فنکار اور خاص طور پر شعراء خودنمائی و خودستائی کے مواقع تلاش کرتے ہیں اس مجموعہ کے تقریباً ہر مضمون میں آزاد کو رستم داستاں بننے کے لئے اپنی خودی کو خدا سے بلند کرنے کا موقع تھا۔ لیکن وہ ہر جگہ خاکسار اور برخوردار نظر آتے ہیں دراصل آزاد کی شخصیت کا امتیاز ہے۔

آزاد حالی اسکول کے ترجمان اور اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں ان کے یہاں نہ تو عصمت چغتائی کے طرح کسی برادر کو، دوزخی بتانے کا عمل ہے اور نہ وہ کسی فرشتہ کو منٹو کی طرح گنجا کرنا گوارہ کرتے ہیں پھر بھی ان کا مضمون عبدالقادر سروری اردو ادب کا معیاری خاکہ ہے۔

آزاد ایک صلح کل انسان، موزوں سرکاری ملازم اور اس نسل کی باقیات میں سے ہیں جس کی تربیت "گلستاں بوستاں اور اخلاق محسنی پر ہوئی تھی ان کے یہاں چشمک د قامت یا معرکہ آرائی کا نام نہیں ہے جس سے داستان میں رنگینی پیدا ہو۔ وہ رشید احمد صدیقی یا مولوی عبدالحق کی طرح طنز سے بالکل کام نہیں لیتے۔ زبان و بیان میں بھی بے حد محتاط اور کچھ خوفزدہ سے معلوم ہیں۔ جوش والی بے باکی نظر نہیں آتی۔ آزاد نے سارے مضامین میں صاف سلجھا ہوا سنجیدہ طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ اور عموماً انہیں واقعات کو بیان کیا ہے جس سے مضمون نگار یا ممدوح زندگی کا آفادی پہلو اجاگر ہو۔ جہاں متنازعہ یا سیاسی مسائل کا ذکر ناگزیر ہو گیا ہے وہاں بھی داستان تلخ کو گوارا اور شیریں بنایا ہے۔ تقسیم وطن ان کے خاندان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ پوری کتاب میں اس کی گونج ہے مگر کہیں الزام تراشی یا منافرت کا شائبہ نہیں۔

عبدالقادر سروری ذیل میں لکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا میں لاہور چھوڑ کر دھلی آگیا
اس زمانہ میں میری نظموں "رکھیو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا
فسوں پھینکا۔ خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا
گذری، میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو۔ کہ اور
اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں" کا دونوں ملکوں
میں غلغلہ تھا۔

وہ صلاح الدین احمد کے ذکر میں اس واقعے کو قدرے تفصیل سے تحریر کرتے ہیں
۱۹۴۷ء کے ذکر سے یاد آیا۔ میرا لاہور کو چھوڑنے کا پروگرام بہت جلدی طے ہوا تھا
اس قدر جلد لاہور چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں تھا بلکہ ارادہ تو وہیں مستقل قیام کا تھا۔ لیکن
ہوا یوں کہ میں شہر کے جس علاقہ میں رہتا تھا۔ فسادات کے دنوں میں یہ علاقہ خالی
ہونا شروع ہو گیا۔۔۔۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ ساٹھ ہزار کی آبادی میں میرے
سوا کوئی ہندو باقی نہیں رہ گیا ہے۔ سب ہندوستان جا چکے ہیں اسی عالم میں چودہ
اگست کی رات کو بارہ بجے میں نے لاہور ریڈیو سے اپنا ترانۂ پاکستان سنا۔

اے سرزمینِ پاک!

ذرے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
روشن ہے کہکشاں سے کہیں آج تیری خاک

اے سرزمینِ پاک!

فن کی قدر اور فنکار کی ناقدری کا یہ تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن صاحبِ معاملہ کے نہ تو چہرے
پر بل آیا اور نہ قلم میں کرختگی آئی جب کہ آزاد کے والد کی پاکستان سے ہجرت کے واقعہ کو
سہیل عظیم آبادی نے اپنی ڈائری میں بڑی تلخی کے ساتھ تحریر کیا ہے اور حکومتِ پاکستان
کو اس ہجرت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ آزاد کو اپنے جذبات اور قلم پر پورا قابو ہے
اذیت رسانی اور دل آزاری مبالغہ و خود ستائی ان کے مسلک کے منافی ہے۔ آزاد
اردو کا شیدائی ہے۔ ان کی ذات اور نگارشات علم و ادب کا قیمتی سرمایہ ہے جو ایک

قطعۂ وطن کے عوض ہم ہندوستانیوں کے حصہ میں آیا ہے۔ بھارت سرکار نے پاکستان کے قومی شاعر اقبال لاہوری کو جگن ناتھ آزاد کے واسطے سے جانا ہے۔ اقبال ان کا محبوب ہیرو ہے۔ تلاشِ اقبال ان کا مشغلہ ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اگرچہ اقبال پر کوئی مضمون نہیں ہے۔ مگر ضمناً بیش قیمت معلومات پھیلی ہوئی ہے۔
اس کتاب کا آخری مضمون آزاد نے اپنے والد پر لکھا ہے جو ان کے فکر و فن خاندانی حالات رسم و رواج کو سمجھنے کا مستند ذریعہ ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

میری ایک چھوٹی بہن دو برس کی عمر میں ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی
اس بچی کو موت کے بعد ہندوؤں کے طریقہ کے مطابق جلایا نہیں گیا
بلکہ دفنایا گیا تھا والد اور میں مسلسل اس کی قبر پر جاتے رہے۔"

آزاد کی فہرستِ تصانیف بہت طویل ہے۔ وہ اب تک تقریباً چھوٹی بڑی پینتیس کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں[۲]۔ خود آزاد کے فن اور شخصیت پر علاوہ مضامین کے حمیدہ سلطان احمد، پرکاش پنڈت اور محمد ایوب واقف مستقل کتابیں لکھ چکے ہیں[۳] زیرِ تبصرہ کتاب کے دیباچہ میں آزاد نے اس جیسی ایک اور کتاب مرتب کرنے کا اشارہ کیا ہے۔ وہ تقریباً دو درجن ممتاز اشخاص کے نام گنا کر لکھتے ہیں۔
میں ان پر ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکا۔ بشرطِ زندگی مجھے ان سب پر لکھنا ہے لمحات فرصت کے انتظار میں ہوں اور اب تو میں خود اس مقام تک پہنچ گیا ہوں کہ بہت جلد میرے دوستوں کو میری یاد میں قلم اٹھانا پڑے گا۔

فاضل مضمون نگار شاید اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ بقول جگن ناتھ آزاد ان کا علامہ اقبال سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور انکی جن ہستیاں ہیں، ہیں انھیں حضرات پر مضامین ہیں جسکے ساتھ آزاد کی ملاقاتیں ہوئی۔

آزاد ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کی پیدائش ہیں ۔ اس مختصر سی صحبت میں پوری کتاب توکجا ایک مضمون کا تفصیلی جائزہ بھی لینا دشوار ہے۔
ان کی یہ کتاب نوجوانوں کے لئے تعمیر سیرت اور مضمون نگاری کی مشق کے لئے داخلِ درس ہونے کے قابل ہے ۔ امید ہے ہند و پاک میں اس کتاب کو قدر کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ . . .

مولینا عبدالماجد دریا بادی۔

جگن ناتھ آزاد شاعر ہی اچھے نہیں بلکہ نثر کے بھی اچھے اور سلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں کچھ روز ہوئے جموں و کشمیر یونیورسٹی کی فرمائش پر انھوں نے تین لکچر ان عنوانوں پر تیار کئے تھے۔

شعرِ اقبال کا پسِ منظر

اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب ولہجہ

اقبال اور اس کا عہد

اور اب یہ کتابی صورت میں یکجا شائع ہوئے ہیں اور شعر، ادب، نقد و نظر، اسلامیات سب کے سب طلبا کے پڑھنے کے قابل ہیں ۔ سلیس شگفتہ انداز میں باتیں خوب سے خوب کی کہہ گئے ہیں اور حقیقت تصوف کے سلسلے میں تو باتوں باتوں میں جا بجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم تو کیا معنی مسلم فاضلوں کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

(صدق جدید، لکھنؤ)

رزاق ارشد

آنکھیں ترستیاں ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اردو کے مستند اور محترم ادیب اور شاعر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب آزاد صاحب کے ان بائیس شخصی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے اپنے ان دوستوں اور بزرگ ادیبوں کی یاد میں تحریر کئے ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان میں سے بیشتر (تقریباً سبھی) نام ایسے ہیں جنہیں اردو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ اور جو ادب میں اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ آزاد صاحب نے ان شخصیات کا جائزہ پوری جزئیات کے ساتھ لیا ہے۔ اور اپنی عقیدت، محبت اور ذہنی وابستگی کے باوجود متعلقہ شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے غیر جانب دار رہے ہیں۔ ادب کے طالب علم آئندہ جب ان شخصیات پر تحقیقی کام کریں گے تو "آنکھیں ترستیاں ہیں" ان کے لئے بہت مدد و معاون ثابت ہوگی۔

آزاد صاحب کی طرز تحریر اتنی دلکش اور پر اثر ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے مذکورہ شخصیت ہماری نظروں کے سامنے چل پھر رہی ہو۔ البتہ چند مضامین کافی مختصر اور تشنہ ہیں جس کا اعتراف خود مصنف کو بھی ہے دراصل یہ مضامین وہ تاثراتی نوٹ ہیں جو آزاد صاحب نے ہنگامی حالات میں فوری طور پر ریڈیو کے لئے قلم بند کئے۔ ریڈیو کے لئے تو یہ بالکل ٹھیک اور مناسب تھے۔ لیکن کتابی صورت میں شائع کراتے ہوئے ان پر نظر ثانی بہت

ضروری تھی۔ ریڈیو تحریر صرف وقتی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن کتاب کی اہمیت اور افادیت کبھی کم نہیں ہوتی بہرحال اتنی متضادالصفات شخصیات پر لکھنا اور ان کے بیرون اور اندرون کی سیر کرانا آسان عمل نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ یہ سوانحی خاکے ہمیں ایک ایسی بستی کی رعنائی بالیدگی سے متعارف کراتے ہیں جو اجڑی ہوئی ہونے کے باوجود آباد ہے۔ کتاب کا دیباچہ سلیم اختر نے لکھا ہے اور انھوں نے سچے دل سے اعتراف کیا ہے۔ کہ "آنکھیں ترستیاں ہیں" اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ جسے موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے خوبصورت اور جاذبِ نظر گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سید احتشام حسین

جگن ناتھ آزاد نے غیر معمولی ذہنی کرب اور کشمکش کو جو ان کے خیالات میں عدمِ توازن اور کج روی کا سبب بن سکتے تھے اپنی شعوری کوششوں سے ارتفاع کی اس منزل پر پہنچایا ہے جہاں آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اپنے دکھ درد، محرومیوں اور ناکامیابیوں، آرزوؤں اور خواہشوں کو ایک وسیع تر دائرے میں اور ایک بلند تر افق میں دیکھنے لگتا ہے۔

۔۔۔۔ انھوں نے کرب کے اندر سے سکون اور یاس کے اندر سے رجائیت، نفرت کے اندر سے محبت اور جذبے کے اندر سے ادراک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین۔

نشانِ منزل

بائیس تنقیدی مضامین کا مجموعہ اقبال کے عاشق جگن ناتھ آزاد کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ موضاعات مختلف اور متنوع ہیں اقبال پرستی ان مضامین کا وصف بھی ہے اور کمزوری بھی اور یہ سلسلہ حسرت موہانی اور اقبال والے پہلے مضمون سے اقبال عالمی کانفرنس تک ہر مقالے پر حاوی ہے۔ آزاد نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کو جابجا خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن ان عظمتوں کی حدبندیوں کو عام طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ آخری دور میں شاعرِ اقبالِ تجدیدیت پسند اقبال کے سامنے پسپا ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کو ماننے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ اقبال اردو شاعروں میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ہومر، ورجل، گوئٹے اور شیکسپئر کے قدو قامت تک نہیں پہنچتے۔

آزاد نے جوش ملیح آبادی سے اقبال پرستی کے جوش میں خاصی زیادتی کی ہے مثلاً صفحہ ۱۶ پر جوش کا ذکر ہی بے محل سا ہے۔ پھر جوش کی دو نظموں پر لیے مقامیں (صفحہ ؟) یہ مشورہ کہ فلسفیانہ شاعری میں کمالِ فن ایجاز ہے نہ کہ اطناب۔ یا جوش کی نظم کھٹکی نئی نیکی کو "ناکام شاعرانہ کوشش" قرار دینا جوش کے ساتھ بے انصافی ہے۔ رہا اقبال کے "فلسفیانہ" شاعری میں ایجاز و اطناب تو کلیم الدین احمد صاحب کے نزدیک

اقبال کی بہترین نظم "مسجد قرطبہ" بھی اطناب، طوالت بیان، تکرار اور شاعری کے بجائے محض مندرج فلسفیانہ مقولوں کو (یا قرآن اور حدیث کے ٹکڑوں کو) منظوم لباس پہنانے کے "عیوب" سے خالی نہیں۔۔۔

جواہر لعل نہرو کا ادبی مرتبہ اور ترقی پسند شاعری کے فن میں "تعمیری ادب" اور پنج سالہ منصوبوں کی فتوحات کو نظم نہ کر پانے کا الزام ترقی پسندوں پر عائد کرنے کی کوشش صفحہ ۴۳ پڑھ کر یاد آتا ہے کہ آزاد حکومت ہند کے پبلسٹی پبلی کیشن آفیسر رہ چکے ہیں۔ اس لئے حکومت وقت کی وکالت سے بے خبر نہیں رہتے[1]۔

(عصر ادب)

---

[1] حیرت ہے ڈاکٹر محمد حسن نے اردو، اقبالیات، اور ہندو مسلم فسادات کے متعلق حکومت وقت کے خلاف جگن ناتھ آزاد کی ان تمام تقریروں تحریروں اور بیانات کو نظر انداز کر دیا ہے جس سے جگن ناتھ آزاد کی ساری زندگی عبارت ہے۔ بعض ترقی پسند شعرا اعتراض کرنے کی بات دوسری ہے ورنہ آزاد کی نظم و نثر کے مجموعوں بالخصوص "ستاروں سے ذروں تک"، وطن میں اجنبی اور لینن کے دیس میں، کے مطالعے سے ہم ایسے قاری اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جگن ناتھ آزاد فکری اور عملی اعتبار سے ترقی پسند ہیں ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی ترقی پسندی کی حدیں بعض دوسرے ترقی پسندوں کے مقابلے میں زیادہ دور تک پہنچتی ہیں۔ (مدیر)

عبدالسمیع بوبیرے
(بمبئی)

اقبال اور مغربی مفکرین

اقبال کے کلام، فلسفہ اور ابلاغ و تبلیغ پر اقبالیات کے ضمن میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

برصغیر کے اس عظیم شاعر کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ اسے "ٹائپ شاعر اور "ہم" کے محدود معنی میں پیش کیا گیا۔ اور تقسیم ہند نے اسے ہندؤں سے برگشتہ کر دیا۔ فنکار اور قلم کار جب اپنے فن یا قلم کی معراج پر پہنچتا ہے تو وہ علاقائی، ملکی، قومی و مذہبی حدود سے بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ وہ صرف انسانیت اور ضمیر کی آواز کا پیغامبر ہوتا ہے رابندر ناتھ ٹیگور ہوں یا اقبال ماحول کے اثر نے ان کی فکری کاوشوں میں ایک خاص احساس کے تحت ابلاغ و تبلیغ کا کام انجام دینے پر انھیں مجبور کیا۔ اس کیفیت پر "ہم یہیں" چسپاں نہیں کر سکتے کہ ٹیگور نے ہندوازم کو فروغ دیا یا اقبال نے اسلامی نظام کو زندہ رکھا۔

ان شعراء نے یا ایسے سینکڑوں شعراء اور ادباء نے اپنے ماحول یا سماج کی خامیوں کو لے کر یا اچھائیوں کو لے کر symbol کے طور پر اپنے اسی پیغام کو دہرایا ہے جو کائناتی حقیقت ہے۔ امن و آشتی کا پیغام، خودداری و نفس کشی کا پیغام، اخوت و بھائی چارے کا پیغام، فکر و دانش کا پیغام۔

اقبال کی زندگی پر ایک نظر دوڑائی جائے تو کئی روشن اور تاریک پہلو ہمارے سامنے آئیں گے

لیکن کلام اس کی زندگی اور شخصیت سے قطع نظر ارفع و اعلیٰ فکری زندگی کے انقلاب ۔۔
کے لئے جستجو میں نظر آئے گا وہ جس ماحول تہذیب اور مذہب کا پرستار اسے ہوسہ
بناتے ہوئے اور خودداری کا سبق دہراتے ہوتے ملے گا۔

اقبال نے حضرت صلعم کی اس حدیث اطلبوا العلم ولو کان بالصین
پر بحیثیت فلسفی و دانش ور عمل کیا۔ اور یونانی و مغربی، عربی و عجمی ہندوستانی واشتراکی
فلاسفروں سے متاثر ہو کر جو کچھ فکری عناصر اپنے کلام میں پیش کئے ہیں اس کا مقصد
یعنی جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کی زبان میں یوں ملتا ہے ۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ فکر انسان کے ارتقاء پر
نظر رکھیں اور اس کی جانب ایک آزادانہ اور نقادانہ رویہ اختیار کریں ۔

زیر نظر کتاب میں خطوط پر اقبال اور فکر یونان، اقبال اور جدید فکر مغرب اقبال اور نیٹشے
شوپن ہائر کارل مارکس، نیٹشے برگساں، ڈانٹے، ملٹن گوئٹے سے ایک تقابلی
مطالعہ ہی نہیں، بلکہ ان کے فکری نظریات پر اقبال کی سیر حاصل بحث اور تاثر کا بھرپور
تجزیہ کیا گیا۔ تمہید اور حرف آخر قابل مطالعہ ہیں۔ مقالات بڑی کاوش سے لکھے گئے
ہیں اور اقبال پر مصنف نے اپنے منفرد لب ولہجہ میں وکالت کی ہے جگن ناتھ آزاد
اقبالیات کے ماہر اور کلام تشریحات کے لئے مقبول ہیں ۔

کتاب محققین کے لئے باعث بحث و تحیص اور شائقین ادب کے لئے باعث
دلچسپی ہے ۔

ادیبؔ حیدرآبادی

آنکھیں ترستیاں ہیں

"آنکھیں ترستیاں ہیں" بائیس ادبی شخصیتوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے جو اللہ کو پیاری ہو چکیں ان شخصیتوں میں علامہ تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد ابوالکلام آزاد، عبدالمجید سالک، غلام مصطفیٰ تبسم، بابائے اردو مولوی عبدالحق، سر عبدالقادر مسز سروجنی نائیڈو، عبدالقادر سروری، سجاد ظہیر، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی اور پنڈت تلوک چند محروم قابلِ ذکر ہیں۔

اس کتاب کا نام شاعرانہ اور اس کی اکثر عبارتیں ادیبانہ ہیں ملک کے مشہور شاعر منشی تلوک چند محروم کے سپوت پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے رنگا رنگ یادوں کے اس مجموعے میں اپنی نثری شاعری کو اس سلیقے سے سمویا ہے کہ اگر اسے اردو ادب کے خزانے میں ایک قابلِ لحاظ اضافے سے تعبیر کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا اس کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے جہاں لائق مصنف کا اندازِ فکر و نظر بخوبی عیاں ہوتا ہے وہاں خود مصنف کی پاکیزہ سیرت کے بعض اہم گوشے بے نقاب ہوتے ہیں ملاحظہ ہو

۱۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ نرم نرم بیلیوں میں اپنا شمار نہیں۔ صفحہ ۴۳

۲۔ میں خود اس لمحے کا منتظر ہوں جب اپنے امیر کارواں کے حضور میں اپنا اظہارِ عقیدت اشعار کے ذریعے سے کر سکوں۔

ع۱ اس درس و تدریس کے دوران میں یہ راز مجھ پر کھلا کہ مقررہ مدت کے اندر کورس کی کتاب کو اول سے آخر تک گھسیٹ کے لے جانے کی کوئی اہمیت نہیں اہمیت اس بات کی ہے کہ شاگردوں میں مفہوم کی تہہ تک پہنچنے اور شعروادب سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا کی جائے،، صـ۶۳

ع۵ ،، اس وقت کا سوال آج بھی میرے لئے یہ کہاں ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے روبرو حوصلے سے بات کرسکوں،، صـ۸

مـ۶ ،، آپ کی یہ دلی تمنا تھی کہ ہندوں اور مسلمانوں کی باہمی محبت اور مروت کا دور واپس آجائے۔ افسوس کہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور ان کی زندگی ہی میں پنجاب کی سرزمین پر انسانی لہو کا ایک دریا بہہ نکلا،، صـ۹۳

ع۷ مذہبی اور صوبائی تعصب کو آپ ہندوستان کے لئے ایک زہر قاتل سمجھتے تھیں اور ہمیشہ اس کوشش میں رہیں کہ غیر ملکی غلامی کے ساتھ ہندوستان غیر ملکی سیاست کی پیدا کی ہوئی ان دولعنتوں سے بھی نجات حاصل کرے اس مقصد کے پیش نظر ۱۹۴۵ء میں عالمگیر مذہب کی کانفرنس کا افتتاح کیا اور افتتاحی تقریر میں ہندوستان کے تمام مذاہب سے مطالعہ کیا کہ وہ اپنی صحیح اور سچی تعلیم لے کر میدان میں آئیں اور ملک کو تعصب اور تنگ نظری کے پھندے سے نجات دلائیں،، صـ۸۹

ع۸ ،، چوں کہ مجھے اس بات سے بے حد دکھ ہوتا تھا کہ دو ایسے دوستوں میں جو وانت کاٹی روٹی کھاتے تھے رنجش پیدا ہوگئی ہے اور میری یہ آرزو رہتی تھی کہ ان کے تعلقات ایک بار پھر خوش گوار ہو جائیں۔ تو میں اکثر کرید کرید کر پوچھتا تھا کہ آپ دونوں کی دوستی کیوں کشیدہ خاطری میں تبدیل ہوگئی وہ جواب میں کچھ نہ کچھ بتا دیتے تھے،، ۲۲

ع۹ ،، میں ہنس پڑا اور بولا سرور صاحب اب کوئی اور بات کیجئے اس بات سے تو اب مجھے EMBARRASMENT ہونے لگی ہے اچانک میں نے ان سے پوچھا EMBARRASMENT کو اردو میں کیا کہیں گے؟ بولے ''الجھن،، اور مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں بات چیت کے دوران میں کئی موقعوں پر جب میں

انگریزی کے مترادف الفاظ کی تلاش میں اٹکا تو ۔ سروری صاحب نے فوراً اردو کا موزوں ترین لفظ بتا کر میری مشکل حل کر دی۔ قریب قریب ہم معنی الفاظ میں ذرا سا نازک فرق ہوتا ہے اس پر ۔ سروری صاحب کی گہری نظر تھی ایک بار اپنے دفتر میں IRRIGATION کی جگہ میں آبپاشی کا لفظ استعمال کیا ۔ سروری صاحب بولے آب رسانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مجھے فوراً احساس ہوا کہ سروری صاحب نے کہیں زیادہ موزوں لفظ استعمال کیا ہے ۔ ۔ صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸

عـ۱۱ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ آج کل نئے "ادیب"، "دوران کے بعد" میں، استعمال نہیں کرتے آپ کا کیا خیال ہے؟ بولے پرانے اساتذہ "دوران کے بعد" میں، استعمال کرتے تھے نہ جانے "میں" استعمال نہ کرنے کی بدعت کیسے شروع ہوئی پھر کہنے لگے ممکن ہے کبھی میرے قلم سے بھی دوران کے بعد "میں" رہ گیا ہو لیکن یہ سہو ہے دوران کے بعد "میں" کا ہونا ضروری ہے ۔

میں چونکہ دوران کے بعد "میں" لکھنا ضروری سمجھتا ہوں اردو میں بھی اور فارسی میں بھی (یعنی بدوران) اس لئے مجھے سروری صاحب کے اس جواب سے یک گونہ اطمینان ہوا" صفحہ ۱۰۹

عـ۱۱ سجاد ظہیر نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا اس سے زیادہ مجھے ان کے لب و لہجے سے دلچسپی رہی کتنی عمدہ اردو میں وہ بول رہے تھے جیسے کانوں میں رس گھول رہے ہوں" صفحہ ۱۴۱

عـ۱۲ "فراق کی رباعیات فراق کی غزل ہی کا ایک دوسرا روپ ہیں فراق کی زیادہ نظمیں سپاٹ اور شعریت سے معرا ہیں صرف انہیں نظموں میں فراق ایک کامیاب شاعر نظر آتا ہے جو فراق کے محدود غزلیہ موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہیں ہاں غزل کی روایاتی موضوع حسن و عشق کو فراق نے جو ایک جدت اور ندرت عطا ہے وہ ایک کارنامہ ہے ان محدود کے باہر اول تو فراق نے کچھ کہا ہی نہیں اور جو کچھ کہا ہے وہ درجہ اول کی تخلیق نہیں جہاں تک ہمہ گیریت VERSATLITY کا تعلق ہے ۔

جاں نثار اختر کا مقام فراق سے کہیں بلند ہے"، صفحہ ۱۶

عـ۱۳ "دراصل فراق کی شاعری کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا ان کی ذہانت اور عالمانہ

گفتگو کا، لیکن یہ گفتگو ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے، انجام کار شاعری کو، معیار نقد بننا ہے اور شاعری جب معیار نقد بنے گی تو اسے خالص ادبی اقدار سے ناپنا ہوگا فراق کے ادب کو غیر ادبی پیمانے سے ناپنے کا طریقہ فراق کی گفتگو اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔“ ص۱۶۲

۱۴؎ ”میں نے ایک بار ان سے پوچھا مولانا! نظم معرا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ دراصل اس سوال کا مقصد اس صنف سخن کے متعلق حسرت صاحب کے خیالات جاننا تھا میں نے محض انہیں PROVORE کرنے کے لئے اس صنف سخن کے بلا ضرورت ہونے کی طرف اشارہ کیا ورنہ دراصل میں خود پابند شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار خیال کرتے نظم آزاد اور معرا دونوں کا انتخاب ۱۹۴۳ء ہی سے کر چکا تھا۔ کہنے لگے معرا شاعری کوئی نئی صنف سخن نہیں ہے غزل کا ہر شعر مطلع کو چھوڑ کر اپنی الگ حیثیت سے معرا شاعری کی مثال ہے جب غزل کے اشعار پر آپ اعتراض نہیں کرتے تو معرا شاعری پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟
محفل میں جس قدر لوگ موجود تھے سب نے اس نکتے کی داد دی بات اگرچہ سامنے کی تھی لیکن اس پر ہم لوگوں کی نگاہ اس وقت گئی جب حسرت صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا۔“ ص۱۶۱

۱۵؎ ”اس دور تشکیل پرور میں یہ شان بے نیازی رشیوں، منیوں اور درویشوں کی یاد تازہ کر رہی ہے۔“ ص۱۶۲

۱۶؎ ”رشید صاحب کے خطوط اور رشید صاحب سے ملاقاتیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں ۔۔۔ رشید صاحب ایک بڑے نثر نگار بڑے نقاد، بلند پایہ معلم اور بڑے انسان تھے۔“ ص۱۶۳

۱۷؎ ”والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ ہوئی لیکن اس سارے واقعے سے انھوں نے کوئی اچھا اثر نہیں لیا رادھا کرشن نے اگرچہ ان پر احسان کیا تھا انھوں نے اس واقعے کا جب بھی ذکر کیا بڑے افسوس سے [illegible] تھا کہ وہ بھی کیا نیکی جو تعصب کی بنا پر کی جائے شاعر ہونے کی حیثیت سے قدر کرتے تو کوئی بات بھی تھی تعصب کی بنا پر قدر دانی کی تو کس کام کی؟ ص۱۶۴

عشاؔ" دو بعض دفعہ تو آپ اس قسم کی نظمیں قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے اس کی نقل افسر موصوف کو بھیجی اور اصل کہیں پھینک دی میں اُن نظموں کی نقلیں کبھی کبھار محفوظ کر لیا کرتا تھا اس وقت ان نظموں کی جانب رجوع کرنا مناسب نہیں کیوں کہ یہ مقالہ یادداشت کے سہارے لکھا جا رہا ہے اور کتابوں، بیاضوں یا کاغذات، سے اشعار نقل کرنے سے اس کی نوعیت بدل جائے گی،، صفحہ ۱۰۲۔

مذکورہ بالا پر مغز اقتباسات کا مطالعہ یقیناً ہمارے آگے کسرِ نفسی، اعترافِ کمال تربیتِ حقیقی۔ قومی یکجہتی، مہارتِ ترجمہ، سادہ بیانی، نقد و تبصرہ، امعانِ نظر، قلندرانہ استغنا نمادادِ عالی ظرفی اور خلقی بے نیازی کا ایک دلکش مرقع پیش کرے گا۔ اس دلچسپ کتاب کو شائع کرکے فاضلِ مصنف نے جہاں وادیِ نگارش کی تنگ و فراخ راہیں طے کرنے کی مستحسن کوشش فرمائی ہے وہاں افسوس ہے کہ زبان و بیان کی بعض کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن ان لسانی فروگزاشتوں کے باوجود "دو آنکھیں ترستیاں ہیں،، ایک ایسی دلآویز کتاب ہے جسے کوئی صاحبِ ذوق پڑھنا شروع کرے تو پھر ختم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ عموماً ہر اچھا شاعر اچھا نثر نگار نہیں ہوتا مگر اس کے برخلاف ایک سے زیادہ ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئیں کہ جس قلم نے گلشنِ شاعری کو آراستہ و پیراستہ کیا اس قلم نے ایوانِ نثر کے بھی گل بوٹے بنا ڈالے۔

مثنوی "طوفانِ محبت،، کے مصنف حضرت ہوشؔ بلگرامی کا نثری کارنامہ ان کی لکھی ہوئی کتاب "مشاہدات،، ہے۔ اسی طرح ممتاز بزرگ غزل گو حضرت صدق جائسی کی شہرۂ آفاق تصنیف "دربارِ دُربار،، ہے ان دونوں تصانیف نے دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ اسی طرح جگن ناتھ صاحب آزادؔ جو سخن سنجی کے مردِ میدان اور ایک شاعرِ غرّا ہیں۔ انھوں نے "آنکھیں ترستیاں ہیں،، میں اپنے کمیتِ قلم کو اسی راہ پر ڈالا جو ان کے جید اساتذۂ ادب نے سجھائی۔ اپنی اس تصنیفِ لطیف میں شروع سے آخر تک وہ متعلقہ موضوع سے ہٹنے نہیں پاتے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ٹھیٹ دل نشیں انداز میں لکھا اور کہیں کہیں سادگی و پرکاری کے حسین

امتزاج کو شاعری کی زبان میں آمد بنا کے چھوڑا اس زمانہ قحط الرجال میں بے عیب نثر کے معاون، تقریبے نمونے دیکھنے کو کہاں ملتے ہیں ؟ امید ہے کہ آزاد صاحب کی یہ ازلی کاوش اگلی پود کے لئے ضرور مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

(ہفتہ وار بانگ درا حیدرآباد)

۸ رجون ۱۹۶۳ء

علی سردار جعفری۔

جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہا۔ اس نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اس میں اپنے خونِ جگر کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی شاعری میں ماضی کی بہترین فنی روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی نظر آتی ہے۔

آزاد کا موضوع دکھیا انسانیت اور اس کی تمنائیں ہیں اس کے ہر ہر شعر میں ماحول کی سخت گیری کا احساس ہے جس نے اس کی شاعری کو گمبھیر بنا دیا ہے اور اس دم گھونٹ دینے والی فضا سے باہر نکل آنے کی خواہش نے اس کی شاعری میں تڑپ اور حوصلہ مندی پیدا کی ہے اس لئے اس کی شاعری ایک زخمی دل کا پکار ہی نہیں بلکہ عہد حاضر کے انسان کی للکار بھی ہے۔

کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ درد، تڑپ تپش، امنگ اور حوصلہ مندی کے امتزاج نے شاعری کو بہت خوشگوار بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ۔

جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب ہندوپاک کے نامور شاعر و ادیب جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور ان کے شعری و ادبی کارناموں کے مطالعے پر مشتمل ہے ۔ اس میں ہندوپاک کے ۲۷ ادیبوں کے مضامین ہیں چوبیس مضامین آزاد کے شعری کارناموں کا جائزہ پیش کرتے ہیں اور تین ان کے نثری کارناموں کا ان مضامین کے لکھنے والوں میں چند ان اساتذہ اور احباب کے علاوہ کہ جو بمبئی کے بعض تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں اور کم لکھتے ہیں ۔ ظ انصاری، گیان چند، ارشد کاکوروی، ملک زادہ منظور زادہ، سید احتشام حسین، رام لعل، مغیث الحسن، شاذ تمکنت، اعجاز حسین، صباح الدین عبدالرحمٰن راجندر ناتھ شیدا، غلام الشیدین، نجیب اشرف ندوی، مہاویر تیاگی، قمر رئیس، امیر چند بہار اور مہر محمد خاں شہاب جیسے مشہور لکھنے والوں کے نام بھی شامل ہیں ۔

یہ مضامین زیادہ تر آزاد کی شخصیت اور ان کے دو ادبی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں ان کی شاعری اور ان کی نثر نگاری ۔ جہاں تک ان کی شاعری سے تعلق رکھنے والے مضامین کا تعلق ہے ۔ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہیں اور معلوماتی ہیں ۔ ان میں آزاد کی شاعری کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے ان میں ایک طرف اگر آزاد کے شعری مجموعے "بیکراں"، "ستاروں سے ذروں تک"، "وطن میں اجنبی"، اور "نوائے پریشاں" پر مشتمل

مضامین ہیں تو دوسری طرف آزاد کی غزل گوئی، نظم نگاری، رباعی نویسی، مرثیہ اور مثنوی نگاری پر بھی بھرپور بحثیں ملتی ہیں۔ ان کی شاعری کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے لیکن جہاں تک آزاد کی نثر نگاری سے تعلق رکھنے والے مضامین کا تعلق ہے وہ کچھ ادھورے اور نامکمل سے ہیں اس سلسلے میں صرف تین مضمون ہمیں اس کتاب میں ملے ہیں۔ وہ ان کی کتاب "اقبال اور اس کا عہد" کے تعارف کے طور پر اور ایک ان کی نثر نگاری کے مجموعے تبصرے کے طور پر گو یہ تینوں مضمون بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں لیکن پھر بھی وہ آزاد کی نثر نگاری کے جملہ محاسن کا احاطہ نہیں کرپاتے کیونکہ آزاد کی ساری نثر کی تمام تر صرف "اقبال اور اس کا عہد"، اور "جنوبی ہند میں دو ہفتے" تک محدود نہیں ہے بلکہ "اقبال اور مغربی مفکرین"، "اقبال، زندگی، شخصیت، شاعری"، "اقبال اور کشمیر"، اور "میرے گذشتہ شب وروز"، جیسی بعض اہم کتابیں بھی اس میں شامل ہیں۔

آزاد کی نثر نگاری کے متعلق اس کمی کی بڑی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ کتاب منظر عام پر تو ۱۹۹۰ء میں آئی ہے مگر جیسا کہ فاضل مرتب کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے اس کو مرتب انھوں نے ۱۹۶۹ء میں کیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۶۹ء تک صرف "جنوبی ہند میں دو ہفتے"، "اقبال اور اس کا عہد"، ہی شائع ہوئی تھیں، باقی ان کی نثری تصانیف ۱۹۷۵ء کے بعد کی ہیں اور خاص طور پر اقبال صدی کی یادگار کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔

آزاد کی نثر نگاری کے سلسلے میں مضامین کی کمی کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کمی کی وجہ سے آزاد کے فن کے دو گوشے کھل کر سامنے نہیں آسکے ہیں۔ ایک ان کی نثر کی ادبی و فنی خصوصیات اور دوسرا ان کا اقبال شناسی۔ آزاد کی نثر کی ادبی و فنی خصوصیات کو تو ان کے مضامین پڑھ کر بھی معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اقبال شناسی کو ان کی ایک انفرادی اور مستقل خصوصیت کے طور پر منظر عام پر لانے کی بے حد ضرورت ہے۔

آج ہم ہندوستان میں بیٹھ کر پوری بے خوفی اور آزادی کے ساتھ اقبال کا نام لیتے ہیں اور ان کے گن گاتے ہیں لیکن کل تک یہ بات نہیں تھی تقسیم ہند نے ہندوستانی عوام کے دل و دماغ پر جو تلخ اثرات چھوڑے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اقبال کا نام لینا بھی کسی جرم

سے کم نہیں تھا لوگ انہیں فرقہ پرست سمجھتے تھے اور انہیں تقسیم کا ذمہ دار گردانتے تھے یہ بھی تو ایک غلط فہمی مگر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی جرأت کون کرے ؟

ہندوستان کے کروڑوں باسیوں میں جس ادیب نے پہلی بار اس غلط فہمی کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کی، وہ تھے جگن ناتھ آزاد تھے۔ آزاد ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اقبال کے دفاع میں سینہ سپر ہو گئے۔ ہندوستانی عوام کے سامنے اقبال کی صحیح تصویر پیش کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا اور کئی سال کے مسلسل جہاد کے بعد انھوں نے یہاں ایک ایسی خوش گوار فضا تیار کر دی کہ آج ہم نہایت بے خوفی سے ساتھ اقبال کو بھی اسی طرح ایک محبوب شاعر سمجھتے ہیں جتنا کہ غالب کو، میر کو، امیر خسرو کو، اقبال شناسی آزاد کی شخصیت اور ان کے فن کا ایک ایسا پاکیزہ گوشہ ہے۔ جس کو اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ اجاگر کئے بغیر ان کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں سمجھا جائے گا۔

کتاب کی ابتدا میں فاضل مرتب کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ آزاد کے ساتھ ان کے روابط کب اور کیسے قائم ہوئے ؟

آزاد کی شخصیت اور فن سے انہیں اس قدر لگاؤ کیوں ہے۔ وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے ان کو جگن ناتھ آزاد کا مطالعہ کرنے اور اسے کتابی روپ دینے پر آمادہ کیا۔

ایوب واقف ایک نوجوان ادیب ہیں وہ بولتے کم اور کام زیادہ کرتے ہیں۔ ادھر دس پندرہ سالوں میں نہایت خاموشی کے ساتھ انہوں نے لکھنے پڑھنے کا کافی کام کیا ہے ان کے بیسیوں ادبی اور تنقیدی مضامین ہندو پاک کے متعدد بلند پایہ ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے قلم میں زور اور تحریر میں تاثیر ہے وہ رنگ برنگی پھولوں کو گونتھ کر گلدستے تیار کرنا بھی خوب جانتے ہیں ان ساری خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر انہوں نے اپنی اس کتاب کو بڑی مفید، معلوماتی اور دلکش دستاویز میں تبدیل کر دیا ہے۔ امید ہے جگن آزاد کی طرح ان کا یہ مطالعہ بھی ہندو پاک میں کافی مقبول ہو گا۔

(ڈاکٹر حامد اللہ ندوی)

اقبال اور اس کا عہد

اقبال ان چند بختاور شاعروں میں سے ہیں جن کی عظمت کا اعتراف ان کی حیات ہی میں کر لیا گیا اور ان کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا یہ سلسلہ جاری ہے اور دن بدن اقبال کی شعری عظمت کا نقش زیادہ گہرا اور ان کی شہرت میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اقبال اب صرف پاکستانی یا اسلامی شاعر ہی نہیں رہے بلکہ اہل دنیا نے انہیں اپنا سرمایہ ——— ابن آدم کا ورثہ ——— سمجھ کر بخوشی قبول کر لیا ہے یہ ایک شاعر کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے کہ لسانی یا جغرافیائی حدبندیاں اس کی راہ نہ روک سکیں اور اس کی مہک چہار دانگ عالم میں پھیل جائے۔

جہاں اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے وہیں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اس ذخیرے میں معیاری کام آٹے میں نمک کے برابر ہے آپ چار پانچ کتابوں کے نام گنوانے کے بعد بغلیں جھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔

سالِ اقبال کے سلسلے میں الادب نے جگن ناتھ آزاد کی کتاب "اقبال اور اسکا عہد" شائع کی ہے جو واقعی ایک اہم کتاب ہے اور اقبالیات کے بے پایاں ذخیرے میں ایک خاص مقام رکھتی ہے یہ کتاب دس بارہ برس پیشتر ہندوستان میں شائع ہوئی تھی

یہ اس کا پہلا پاکستانی ایڈیشن ہے ۔ جگن ناتھ آزاد کو جموں کشمیر یونیورسٹی نے دعوت دی تھی کہ وہ وہاں اقبال پر لکچر دیں دراصل یہ کتاب انہی تین لکچروں کا مجموعہ ہے ۔

اقبال سے جگن ناتھ آزاد کی عقیدت اب بڑی عیاں ہے ۔ لیکن اس کتاب کو انہوں نے محض عقیدت کی نذر نہیں کر دیا بلکہ اقبال کی شعری عظمت کے ان گوشوں کو روشن کیا ہے جو واقعی قابلِ توجہ ہے اور اس طرح اقبال کی شاعری کے نئے پہلو قاری کے سامنے آئے ہیں ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اس کتاب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حقیقت تصوف کے سلسلے میں باتوں باتوں میں جابجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم کیا معنیٰ مسلم فاضلوں کیلئے بھی باعثِ فخر ہو سکتے ہیں اور نیاز فتح پوری جیسے نقاد کی رائے بھی قابل توجہ ہے ۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے جو کچھ ان مضامین لکھ دیا ہے وہ اقبالیات میں اضافہ ہے ۔

"الادب" نے کتاب بہت خوب صورت شائع کی ہے اور کتاب کے آخر میں جگن ناتھ آزاد کے بارے میں بھی دو صفحات لکھ دیئے ہیں تاکہ قارئین کتاب کے مصنف کے بارے میں بھی آگاہی حاصل کر سکیں ۔

(ماہنامہ "کتاب" لاہور)
مارچ ۱۹۷۸ء ۔

قومی آواز لکھنؤ۔

دو ریڈیو فیچر

یہ کتابچہ جگن ناتھ آزاد کے دو فیچرس کا مجموعہ ہے جس میں پہلا فیچر "ہندوستان ہمارا ہے" جو ڈاکٹر اقبال کے کلام پر مبنی ہے اور دوسرا فیچر "بنگال کا جادو" ہے جو تاریخی کتب تزک جہانگیری اور سیر المتاخرین سے ماخوذ ہے۔

یہ دونوں فیچر بالترتیب ریڈیو جموں کشمیر اور آل انڈیا ریڈیو جالندھر سے نشر ہو چکے ہیں اور بہت پسند کئے گئے ہیں جگن ناتھ آزاد کافی عرصہ تک ریڈیو نشریات سے متعلق رہ چکے ہیں[1] اور ادبی لطافتوں کے علاوہ براڈ کاسٹنگ کی نزاکتوں اور حدبندیوں سے پوری طرح واقف ہیں انھوں نے یہ دونوں فیچر اس انداز میں لکھے ہیں کہ تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ ان کو اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے اور دادِ سخن فہمی و واقعہ نگاری لی جا سکتی ہے چونکہ یہ فیچر بنیادی طور پر بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں اس لحاظ سے شروع میں اساتذہ کے لئے کچھ ہدایات دی گئی ہیں۔ اور "فیچر" کی تعریف اس انداز سے کی گئی ہے کہ فیچر لکھنے کے شائقین بھی اس سے

---

[1] غالباً یہ صحیح نہیں ہے جناب اسعد الله دانی کی مرتب کردہ ترتیب جو زیر نظر شمارے میں درج ہے ایسے کسی تعلق کی نشان دہی نہیں کرتی۔ (مدیر)

استفادہ کر سکتے ہیں اور ڈرامائی طریقوں سے اس کی مماثلت کا پوری طرح اندازہ کر سکتے ہیں پہلے فیچر "ہندوستان ہمارا" میں ڈاکٹر اقبال کی زندگی، سادہ مزاجی، خوش کرداری وطن پرستی اور بچوں سے دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ آزاد نے اپنی اقبال شناسی سے کام لیتے ہوئے اقبال کا کچھ غیر مطبوعہ اور ابتدائی زمانہ کا کلام بھی مکالموں میں پیش کر دیا ہے اور کلاس روم کے اندر بچوں کو سلیقہ سے بات کرنے شعر و سخن سے دلچسپی لینے اور اردو پڑھنے پڑھانے کا ذوق دلوں میں پیدا کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے بعض اوقات یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس فیچر میں ہندوستان کم اور اقبال زیادہ ہے۔

دوسرا فیچر "بنگال کا جادو" بہت کچھ جگن ناتھ آزاد کی قوت متخیلہ اور حسن بیاں کی تخلیق ہے۔ بنگالی جادوگروں نے لاہور میں دو دن مسلسل اس ہی قسم کے مختلف کھیل تماشے جہانگیر کو دکھائے تھے جس کا تذکرہ ترک جہانگیری کے علاوہ غلام حسین خاں نے سیر المتاخرین میں بالتفصیل کیا ہے۔ ان کھیلوں میں سے صرف دو کھیل جگن ناتھ آزاد نے منتخب کر کے ان میں رنگ بھر لیے اور مزید تفصیلات بڑے دلکش اور واقعہ نگارانہ انداز میں فراہم کر کے بنگال کا جادو جگایا ہے دونوں فیچر دلچسپ اور مثالی ہیں - اور جگن ناتھ آزاد کی کوششیں کامیاب ہیں

روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ (ضمیمہ ہفتہ وار)

۳۰ اپریل ۱۹۷۸ء

اقبالیات

ڈاکٹر خلیق انجم

اقبالؔ اور مغربی مفکرینؔ

آزادی کے بعد ہندوستان کے اردو والوں پر بہت برا وقت پڑا۔ وہ وطن میں رہتے ہوئے بھی اجنبی ہو گئے۔ وطن سے ان کی محبت اور حکومت سے ان کی وفاداری مشکوک قرار پائی۔ اس صورتِ حال نے اہلِ اردو سے ان کی خود اعتمادی چھین لی وہ ہر اس کام سے گریز کرنے لگے جس سے ان پر "پاکستانی ہونے" کا الزام لگایا جا سکے۔ اردو دشمن عناصر نے اقبال کو پاکستانی شاعر قرار دے دیا۔ اس لئے اردو والوں کو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ اپنے محبوب شاعر اقبال کی بھی قربانی دینی پڑی۔ ہمارے نقاد اقبال پر قلم اٹھاتے ہوئے ڈرنے لگے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں سے اقبال کو تقریباً نکال دیا گیا۔ ان کی صرف ہمالہ، جگنو، نیا شوالہ جیسی معصوم نظمیں نصاب میں شامل کی گئیں۔ اس دورِ آشوب میں اگر کوئی شخص نتائج سے بے نیاز ہو کر اقبال سے اپنی محبت کا برملا اظہار کرتا رہا تو وہ جگن ناتھ آزاد ہیں۔ آزاد نئے حالات سے خائف نہیں ہوئے۔ اور اقبال پر برابر کام کرتے رہے — ہندوستان میں اقبال کے احیاء میں جگن ناتھ آزاد کا بہت اہم رول ہے اور مجھے یقین ہے کہ ماہرینِ اقبالیات آزاد صاحب کی ان خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کریں گے۔

اقبال صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک مفکر اور مدبر بھی تھے انہوں نے اسلامی اور مغربی فکر کے سرچشموں کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ اس عہد میں پیدا ہوئے تھے جب اسلامی فکر مغرب کے سامنے سپر ڈال چکی تھی۔ مغرب کی مادی ترقیوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو احساس کمتری کا شکار بنا دیا تھا۔

اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کے بارے میں اقبال کا عقیدہ تھا، کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ اور وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ مغربی فکر کو نظر انداز کر کے ہم خود کو نقصان پہنچائیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ یورپی تہذیب کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر اسلام کو یورپی خیالات کی روشنی میں پیش کیا جائے اقبال نے اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے۔ ان کے تجرباتی اور تنقیدی ذہن نے رد و قبول کے ذریعے اپنے فلسفیانہ نظام کی تعمیر کی۔ اس نظام کو سمجھنے کے لئے یونانی فلسفیوں کے علاوہ، ہیگل، کانٹ، نطشے، شوپن ہاور، کارل مارکس، ڈانٹے، برگساں وغیرہ کا گہرا مطالعہ ضروری ہے ،، اقبال اور مغربی مفکرین،، میں جگن ناتھ آزاد اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ آزاد صاحب نے مغربی فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کر کے ان عناصر کی کامیاب نشاندہی کی ہے جن کی مدد سے اقبال نے اپنا ایک واضح نظریۂ حیات پیش کیا ہے۔

آزاد بدنام ہونے کی حد تک اقبال کے پرستار ہیں اس کے باوجود پوری کتاب میں ان کا رویہ جانب دارانہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے فکر اقبال کا معروضی مطالعہ کیا ہے اس کتاب کے مطالعے سے جگن ناتھ آزاد کا دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اسلامی تفکر کے ساتھ ہی ساتھ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ اور مارکس اور اینگلز کا جدلیاتی مادی نظام فکر بھی شامل ہے اگر ہم کلام اقبال سے یہ تمام فکری عناصر خارج کر دیتے ہیں تو ان کی نظم و نثر کا اکثر حصہ مفہوم سے عاری ہو کر رہ جاتا ہے اور فکر اقبال کی محض ایک ادھوری اور نامکمل تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی

آزاد کی ایک تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین"

محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد اردو کے معروف شاعر ادیب اور نقاد ہیں لیکن میرے نزدیک ان کی نمایاں اور اہم حیثیت ایک ماہرِ اقبالیات کی ہے اگر ہم تاریخ اقبالیات مرتب کرنے بیٹھیں تو ناگزیر ہوگا کہ ان کا نام نامی علمائے اقبالیات کی فہرست میں بہت نمایاں طریقے سے درج کیا جائے۔ میں تو پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ماہرِ اقبالیات کو لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔

اقبالیات سے ان کی دلچسپی بہت دیرینہ ہے تقسیم برصغیر کے بعد بھارت میں اقبالیات کے لئے فضا نہایت ناسازگار تھی۔ اس کا بڑا سبب اس وقت کی سیاسی فضا تھی۔ علامہ اقبال کو پاکستان کے ساتھ بریکٹ کر دیا گیا گو اس میں شبہ نہیں کہ تصورِ پاکستان کے فروغ و ترویج میں افکارِ اقبال گہرا دخل رہے مگر بھارت میں اقبال اور پاکستان کو قطعی مترادف سمجھا جانے لگا۔ بھارت کے دانش ور طبقے میں اقبال سے بے اعتنائی کا ایک سبب ممکن ہے ڈاکٹر سنہا کی کتاب (Iqbal : The Poet and His Message) (۱۹۴۷ء) بھی ہو کیوں کہ یہ کتاب عین اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی۔ بہر حال تقسیم کے بعد بھارت میں بہت عرصے تک مطالعۂ اقبال کی جانب اعتنا نہیں ہو سکا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ "اردو دشمن عناصر نے اقبال کو پاکستانی شاعر قرار دے دیا ہے اس سے اردو والوں کو اور بہت سی چیزوں کے ساتھ اپنے محبوب شاعر اقبال کی بھی قربانی دینی پڑی ہمارے نقاد اقبال پر قلم اٹھاتے ہوئے ڈرنے لگے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے اقبال کو تقریباً نکال دیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دورِ پرآشوب میں اگر کوئی شخص نتائج سے بے نیاز ہو کر اقبال سے اپنی محبت کا برملا اظہار کر تا رہا تو وہ جگن ناتھ آزاد ہے ۔ آزاد نئے حالات سے خائف نہیں ہوئے اور اقبال پر برابر کام کرتے رہے ۔ ہندوستان میں اقبال کے احیاء میں جگن ناتھ آزاد کا بہت اہم رول ہے"۔ ۔ ۔

بھارت میں مطالعۂ اقبال کا حقیقی معنوں میں آغاز اقبال صدی (۱۹۷۳) سے ہوا ۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۳ء تک کے عرصے میں بھی اقبالیات کی طرف متوجہ رہے ۔ ان کی کتاب "اقبال اور اس کا عہد" پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ۔ ہندوستان میں اقبال شناسی کی یقیناً اور بھی بہت سی وجوہ ہیں ۔ مگر اس کا ایک اہم سبب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبالیات کے ساتھ وابستگی بھی ہے ۱۹۷۳ء تک اقبالیات پر آزاد صاحب کی اگرچہ صرف ایک ہی کتاب شائع ہوئی لیکن اس عرصے میں وہ برابر ہوم ورک کرتے رہتے تھے ۔ چنانچہ اقبال صدی کے بعد ان کی تصانیف یکے بعد دیگرے منظر عام پر آنے لگیں ۔

اقبالیات پر میرے علم کی حد تک ، ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔

۱ ۔ اقبال اور اس کا عہد ۱۹۶۰ء

۲ ۔ اقبال اور مغربی مفکرین ۱۹۷۵ء

۳ ۔ اقبال کی کہانی ۱۹۷۶ء

۴ ۔ اقبال ، زندگی ، شخصیت اور شاعری ۔ ۱۹۷۷ء

۵ ۔ اقبال اور کشمیر ۱۹۷۸ء

۶ ۔ اقبال ، ایک ادبی سوانح حیات

۷۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو ۱۹۸۱ء

۸۔ اقبال ہیز پوئٹری اینڈ فلاسفی (انگریزی)

۹۔ اقبال ماینڈ اینڈ آرٹ (انگریزی) ۱۹۸۳ء

۱۰۔ مرقعِ اقبال ۱۹۷۳ء

ان میں سے متعدد کتابیں پاکستان میں بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں ــــــ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اقبالیاتی ذخیرہ صرف متذکرہ بالا کتابوں تک محدود نہیں ـــــ انھوں نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے "جاوید نامہ" کا نثری ترجمہ کیا ہے " روداد اقبال " (سوانحِ اقبال) لکھ رہے ہیں جو غالباً علامہ اقبال کی سب سے مفصل اور مبسوط سوانح ہوگی۔ علاوہ ازیں اقبال پر ان کے مقالات، لیکچروں، تبصروں اور مذاکروں کو مرتب کیا جائے تو کم از کم چار پانچ کتابیں تیار ہو سکتی ہیں ـــــ آزاد صاحب کے اقبالیاتی ذخیرے کا توجہ طلب پہلو اس کا تنوع ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے لکھا نوجوانوں کے لئے بھی اور اقبال کے سنجیدہ اور بالغ نظر قارئین کے لئے بھی۔ اردو میں لکھا اور انگریزی میں بھی ـــــ ان کی سب کتابیں نثری ہیں، مگر اقبال پر ان کی بہت سی نظمیں بھی ملتی ہیں، خصوصاً وہ نظمیں جو ان کے دورۂ اسپین اور زیارتِ مسجد قرطبہ سے متعلق ہیں ـــــ فی الحقیقت پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اقبالیات سے وابستگی اور ان کی اقبال شناسی ایک مفصل مطالعے کی متقاضی ہے (اس لئے جس تامل اور فرصت کی ضرورت ہے، فی الوقت وہ میسر نہیں اس لئے اس کام کو ہم آئندہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں) سردست ان کی تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" پر مختصر اظہارِ خیال مقصود ہے۔

"اقبال اور مغربی مفکرین" آزاد صاحب کے اس مقالات کا مجموعہ ہے ـــــ یہ مقالات مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ مگر ان میں ایک طرح کی موضوعی ہم آہنگی ہے اس اعتبار سے یہ ایک مستقل اور مربوط تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ جس کا موضوع اقبال اور مغربی فلسفے کا باہمی تعلق ہے مصنف نے "تمہید" اور ابتدائی مقالات میں موضوع زیرِ بحث پر مجموعی

گفتگو کرتے ہوئے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال اور مغربی فلاسفہ و افکار کا ذہنی قرب و بعد، اقبالیات کا نہایت اہم مسئلہ ہے اس موضوع پر لکھنے والے بالعموم افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

اہل قلم کی ایک جماعت نے مذہبی جوش میں یہ ثابت کرنے کیلئے پورا زور لگا دیا ہے کہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف مغربی فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تنقید کی ہے۔ دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے۔ جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کا پرتو ہیں ——— آزاد صاحب کو دونوں گروہوں سے اختلاف ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اعلیٰ شاعری کسی فلسفے کی تائید یا تردید کا نام نہیں ہے ——— ایک بڑا وسیع المطالعہ شاعر دوسروں کے نظریات کو پسند بھی کر سکتا ہے ناپسند بھی دوسرے بڑے شعراء اور فلسفیوں کے افکار سے اثر پذیر بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ——— اقبال ایک بڑے شاعر اور فن کار تھے اور ایک وسیع النظر فلسفی بھی۔ انھوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ یورپی فکر و نظر کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ قیام یورپ کے دوران میں انھوں نے بیکن، لاک، کانٹ، فشٹے، شوپن ہائر، کارل مارکس، نیٹشے، برگساں، دانتے، ملٹن، گوئٹے اور بہت سے دوسرے مصنفین و مفکرین کے نظریات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ——— پروفیسر آزاد نے متذکرہ بالا مفکرین سے اقبال کی اثر پذیری کا ایک ایک مقالات میں جائزہ لیا ہے۔ ہر مقالے میں وہ متعلقہ مفکر کا تعارف کراتے ہیں اس کے افکار کے نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں اور پھر اقبال کے ہاں اس کے اثرات کس نوعیت کے ہیں اور کس درجے میں ہیں ——— ان موضوعات پر اکا دکا مقالات تو کئی اصحاب نے لکھے ہیں مگر کوئی مربوط کاوش نہیں ہوئی اس اعتبار سے جناب آزاد کا یہ کام اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔

ابتدا میں "تمہید" کے زیر عنوان موضوع کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اقبال

اور فکرِ یونان،، کے عنوان سے مقالۂ افتتاحیہ، ایک اعتبار سے کتاب کے اصل مباحث کے پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔

تمام مقالات اپنی جگہ خوب ہیں مگر ,,اقبال اور کارل مارکس،، میرے نزدیک اس کتاب کا بہترین مقالہ ہے۔ یہ مقالہ نہایت ہی مفصل ہے (کتاب کے ۸۰ صفحات) اور موضوع کے جملہ پہلوؤں پر محیط۔ ان کا خیال ہے کہ اشتراکیت کی جانب اقبال کا جھکاؤ ضرور تھا مگر اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر سمجھتے تھے ــــــــ گذشتہ برسوں میں اقبال کے ہاں ,,اسلامی سوشلزم،، کی تلاش و دریافت کیا جاتا رہا ہے پروفیسر آزاد نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ,,اقبال کو اسلامی اشتراکی کہنا، اقبال، اسلام اور اشتراکیت تینوں کے ساتھ بے انصافی کرنے کے مترادف ہے،، راقم الحروف کو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس موضوع پر اس قدر سیر حاصل اور جامع مقالہ نہیں لکھا گیا یا کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔

حال ہی میں پاکستان سے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے ,,اقبال اور آئن سٹائن،، کے عنوان سے ۵۳ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقالے کا اضافہ کیا ہے ــــــ یہ مقالہ بھی دوسرے مقالات کی طرح ان کے وسعتِ مطالعہ کی دلیل ہے۔

,,حرفِ آخر،، میں انھوں نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال کے فکر و نظر نے جس فن کارانہ کمال کے ساتھ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل کا کام دیا ہے وہ ہمارے مشرقی ادب کا متاع گرانمایہ اور لازوال سرمایہ ہے۔

,,اقبال اور مغربی مفکرین،، اپنے موضوع پر ایک عالمانہ مطالعہ ہے ــــــــ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں ایک وقیع مقام رکھتی ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اس کتاب سے اقبالیات کے طالب علم برسوں تک استفادہ کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر غلام قدوسی

اقبال اور اس کا عہد

"اقبال اور اس کا عہد" پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تصنیف ہے جو اسکولوں کی نصابی کتابوں کے سائز میں چھپی ہے اور ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ پروفیسر آزاد کے تین مضامین کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ مضامین علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن ان کے موضوعات اقبال شناسی کے تین بڑی جہتوں کا احاطہ کرتے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔ حرفِ اول جو دیباچے کے طور پر ہے۔ کتاب کی غرض وغایت کی طرف اشارہ کرتا ہے اسی حرف اول میں اقبال کی نثری تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ ان کی معروف انگریزی تصانیف کے جن کے اردو ترجمے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اور ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا ہیں "مثنوی اسرار خودی" کا دیباچہ بھی نہایت اہم ہے جو مثنوی کے پہلے ایڈیشن کے بعد پھر کبھی مثنوی کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ پروفیسر آزاد اس دیباچے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے ایک مقالے میں اس کے طویل اقتباسات نقل کرتے ہیں۔

اس کتاب کے مشتملات تین ہیں۔ شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر، اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب ولہجہ" اور "اقبال اور اس کا عہد" ان میں سے ہر موضوع اپنی جگہ مہتم بالشان ہے۔ مصنف نے اپنے وسیع وعمیق مطالعے کی روشنی میں معلومات کا بے شمار خزانہ مہیا کر دیا ہے۔ خاص طور پر اقبال کے ساتھ پروفیسر آزاد کو جو شغف ہے اس کا ثبوت

ان کے اندازِ بیان اور ان کی تحریر کی ہر سطر سے ملتا ہے۔

پہلا مقالہ، شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر ہے اس کے زیرِ عنوان تمہیداً تفہیمِ اقبال کی نارسائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور کم فہمی یا غلط فہمی کی بنیاد پر اقبال کو مختلف خانوں میں جس طرح تقسیم کیا گیا ہے اس کی مذمت کی گئی ہے اسی کے ساتھ اس خیال کی پرزور تردید کی گئی ہے کہ علامہ اقبال نے ہندوستان سے بے تعلقی برتی ہے۔ یا اپنے سیاسی تصورات کی بنا پر اپنے وطن کے فکری نظام سے علٰحدہ ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر آزاد ایسے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بیکار قسم کی نعرہ بازی سمجھتے ہیں۔ ہندوستان اور اس کے تمدن سے وابستگی ہرگز ایسی رجعت ٹھہری نہیں۔ اس تمہید کے بعد پروفیسر آزاد کلامِ اقبال سے ہندوستانیت کے پوشیدہ اور نمایاں عناصر کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ "بانگ درا" سے نظموں اور اشعار کے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ وہ "ہمالہ"، "تصویرِ درد"، اور "آفتاب" سے حوالے دیتے ہیں اس اس سلسلے میں نظم "آفتاب" کے ساتھ شائع ہونے والی "تمہید"، جو اب بانگ درا میں شامل نہیں ہے لیکن آزاد نے اسے رسالہ "مخزن" سے اخذ کرکے مضمون میں شامل کیا ہے نہایت اہمیت رکھتی ہے اور اس تمہید کی قدر و قیمت اس سے ظاہر ہے کہ اس نظم سے متعلق علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کی جو وضاحت ہوتی ہے وہ نظم کو پڑھ کر بھی نہیں ہوتی۔ کم از کم آفتاب سے متعلق اقبال کے پیش کردہ خیال کا پس منظر اس "شذرہ" تمہیدی سے نمایاں ہوتا ہے۔

پھر پروفیسر آزاد نے اقبال کی ان نظموں کا حوالہ دیا ہے جو ان کی وطنی شاعری کے ضمن میں مشہور و معروف ہیں۔ مثلاً تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، سوامی رام تیرتھ وغیرہ، اس ضمن میں اس نظم کا ذکر بھی آگیا ہے جو دوسرے موضوع پر ہے لیکن جس میں ہندوستان سے تعلقِ خاطر کا پہلو نکل آیا وہ ہے "سرگذشتِ آدم"، اس بحث میں وطنیت سے متعلق اقبال کے نظریات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور اقبال کے مختلف مجموعوں سے اور ان کے خطوط سے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ کارآمد مضمون کا وہ حصہ ہے جس میں اقبال کی فارسی

تصنیف "جاوید نامہ" سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اور طویل بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث مضمون کے معتد بہ حصے پر محیط ہے اور اقبال شناسی کے جہت میں قدر و قیمت سے خالی نہیں ہے۔ "پیام مشرق" اور "ارمغان حجاز" کے حوالے بھی زیر بحث آئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی عنصر کی کما حقہٗ نشاندہی پر مبنی ہے۔

کتاب کا دوسرا مقالہ اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب و لہجہ ہے۔ اس میں لفظ تصوف کی لفظی چھان بین کو بے محل قرار دیتے ہوئے اس کی اصلیت اور روح پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مولانا روم اور حافظ سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے امیر خسرو خواجہ میر درد، جامی، عطار اور رابندر ناتھ ٹیگور تک کو متصوفانہ شاعری سے وابستہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کی پہلی تصنیف "مثنوی اسرار خودی" کے پہلے اڈیشن کی ہنگامہ خیزیوں کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ جزو مقالہ بنایا گیا ہے اس مثنوی کے دیباچے میں علامہ اقبال نے خواجہ حافظ شیرازی کے بارے میں جو کچھ لکھا اور پھر مثنوی کے اشعار میں حافظ پر جس طرح اظہار خیال کیا اس سے ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اگرچہ آگے چل کر دیباچہ کا وہ حصہ اور وہ اشعار حذف کر دیئے تھے جن سے فتنوں کا در کھلتا تھا۔ لیکن آج تک تصوف سے متعلق اقبال کا خیال کا ذکر کرتے ہوئے اس مضمون اور ان اشعار کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ پروفیسر آزاد نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس زمانے کی بحث آرائیوں کا ذکر کیا ہے جو خواجہ حسن نظامی اور یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی سے بھی وابستہ ہیں اور اقبال کے ان خطوط سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو انہوں نے اکبر اور خواجہ صاحب کو لکھے تھے۔ ضمناً "رموز بیخودی" کی بحث بھی آئی ہے اور اقبال کے افکار کے سرچشموں کا سراغ بھی ملتا ہے اس طرح پروفیسر آزاد نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں۔ کلام اقبال کے مختلف مجموعوں سے حوالے دیئے گئے ہیں اور اردو و فارسی دونوں کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے۔ "پیام مشرق" "زبور عجم"، "بال جبریل"، "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" وغیرہ کے حوالے "اسرار و رموز" کے علاوہ ہیں۔ بحث کے دوران

ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" سے بھی اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اقبال کا نظریۂ تصوف ارتقائی مراحل سے گذرا ہے۔ شروع میں وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ بعد کو اس سے روگردانی کی اور بالآخر عجمی تصوف کی بے عملی سے انہوں نے اختلاف کیا ورنہ درحقیقت اقبال کا رجحان تصوف کی اصل سوچ سے جداگانہ نہیں ہے پروفیسر آزاد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ جائزہ اپنے طور پر موضوع کو سمیٹنے کی کوشش ہے ورنہ علامہ اقبال کا کلام بحر بیکراں ہے۔ جس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ممکن نہیں۔

کتاب کا تیسرا مقالہ "اقبال اور اس کا عہد" ہے اس مقالے میں اقبال شناسی کی ایک اور جہت پیش کی گئی ہے۔ اور وہ ہے عہدِ اقبال سے کلامِ اقبال کا تعلق کیونکہ شاعر کو اگر اس کے عہد سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو بالخصوص اقبال کو ان کے عہد کے پس منظر میں ہی زیادہ سمجھا جاسکتا ہے۔ پروفیسر آزاد نے ۱۸۵۷ء سے اپنے جائزے کا آغاز کیا ہے۔ اور ہندوستان کے قومی سیاسی تہذیبی دھاروں کو اپنے مضمون میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے بھی اقتباس پیش کیا گیا ہے اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان کے کلام کی روشنی میں اس طرح کی گئی ہے کہ فن برائے زندگی کے باب میں اقبال کے ذہن کی کارفرمائیاں ذہن میں آسکیں۔ کلامِ اقبال کے متعدد حوالے پیش کئے گئے ہیں۔ ضمناً فن کی تخلیق کی بحث چھڑ گئی ہے۔ غالب، آتش، جوش اور وحشت کے اشعار سے فنِ شعر گوئی کے مضمرات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ "مرقعِ چغتائی" کے دیباچے کا ذکر بھی آیا ہے۔ جو اقبال نے لکھا تھا۔ مغرب و مشرق کے فن برائے فن والے ادبا اور شعرا سے اقبال کی بے زاری کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں فنونِ لطیفہ سے متعلق اقبال کا نقطۂ نظر ان کے اشعار کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون میں بھی "جاوید نامہ" سے حوالے دیئے گئے ہیں اور اقبال کے مختلف مجموعوں سے استناد و استشہاد کرتے ہوئے "بانگِ درا" کی ان نظموں سے بھی اقتباسات اخذ کئے گئے ہیں "خضرِ راہ اور جوابِ خضر" کے سلسلے کے منظومات

نمایاں ہیں۔

اس مضمون میں مصنف کا انداز اس بات پر ہے کہ کلامِ اقبال دراصل عہدِ اقبال سے شاعر کے تعلق کا آئینہ ہے۔ ایک طرف آویزش نظر آتی ہے اور دوسری طرف مفاہمت۔ لیکن اس مفاہمت میں مصلحت اندیشی نہیں ہے۔ اقبال نے اپنے عہد کے نام پیغام دیا ہے۔ پیغام اس قابل ہے کہ اسے عملی زندگی اور ذہنی اور فکری زندگی کے لئے مشعلِ راہ بنایا جائے۔ ضمناً نطشے، ڈاکٹر تاثیر، گوئٹے، اور شوپن ہاور وغیرہ کے نام بھی آئے ہیں۔ پروفیسر آزاد نے ان فلسفیوں کے اقوال یا حوالہ جات سے استفادہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ اقبال شناسی کی جہت میں ایک ایسے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو آگے کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ۴ صفحات پر مشتمل کتابیات بھی ہے۔ جس میں انگریزی کی ۱۳ اور اردو کی ۵۸ کتابوں کے نام درج ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے اختصار کے ساتھ اس کتاب کے مقالے لکھے گئے ہیں لیکن مصنف نے دیدہ ریزی اور مطالعے کو نظر انداز نہیں کیا اور تمام ضروری گوشوں کو سامنے لانے کیلئے ماخذ و حوالہ جات کو کھنگالا ہے۔۔۔

پاک و ہند مشاعرہ — پروفیسر جگن ناتھ آزاد جنہیں ۲۱ اپریل کو حیدرآباد میں اقبال ایوارڈ ملنا تھا خاص کر میاں چنوں کے مشاعرے میں تشریف لائے اور یوں ان کو ایوارڈ دیئے جانے کی تقریب ملتوی کر دی گئی لاہور ایئرپورٹ پر بھارتی شعراء کے استقبال کیلئے وی آئی پی لاؤنج میں صوبائی وزیرِ صنعت [illegible] کے علاوہ مجلسِ فکر و ادب میاں چنوں کے سکریٹری پروفیسر [illegible] حسین [illegible] محمد [illegible] بھی [illegible] اور [illegible] حسین [illegible] اور [illegible] ہاشمی موجود تھے آخر میں بھارتی مہمانوں کو [illegible] [illegible] [illegible]

پروفیسر صدیق جاوید -
(شعبہ اردو گورنمنٹ کالج - لاہور)

اقبال اور اس کا عہد

جگن ناتھ آزاد اپنے شعری کاموں اور تنقیدی کاوشوں کی بنا پر اردو ادب میں ایک ممتاز مرتبے کے مالک ہیں۔ وہ اردو اور فارسی کلاسیکی روایت کے بھی رمز شنا ہیں۔ نیز وہ علامہ اقبال کے ایک ہم عصر اور اردو کے خوش فکر شاعر تلوک چند محروم کے فرزند ہیں۔ اس طرح شعر و ادب کا ذوق انہیں وراثت میں ملا انھوں نے فارسی ادبیات میں باقاعدہ تعلیم اورنیٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیا جہاں انھوں نے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (مرحوم) اور ڈاکٹر سید عابد علی عابد (مرحوم) صوفی غلام مصطفی تبسم (مرحوم) پروفیسر علیم الدین سالک (مرحوم) اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جیسے اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔ ان نسبتوں سے ان کے ذہنی پس منظر اور علمی ذوق کے نکھار پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا علامہ اقبال کی شاعری سے انہیں شغف ہوا۔ اسی بنا پر شعری تخلیقات کے بعد تصنیف و تالیف میں اقبالیات ان کا محبوب اور دل پسند موضوع ٹھہرا۔ اقبال پر مضامین کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

"اقبال اور اس کا عہد"، اقبال اور مغربی مفکرین - مرقع اقبال - اقبال کی کہانی، بچوں کا اقبال - اقبال اور کشمیر - اقبال - زندگی، شخصیت اور شاعری اور جاوید نامہ۔

کا اردو ترجمہ زیر طبع ہے۔ مزید برآں وہ ان دنوں سلسلۂ اقبالیات کی ایک اہم ضرورت۔ اقبال کے سوانح حیات کی ترتیب میں مصروف ہیں زیرنظر مضمون میں ان کی کتاب "اقبال اور اس کا عہد" کا جائزہ لیا گیا ہے۔

"اقبال اور اس کا عہد" سولہ سترہ سال پہلے ہندوستان میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب ان توسیعی لیکچروں پر مشتمل ہے۔ جو جگن ناتھ آزاد نے جموں و کشمیر یونیورسٹی کو دعوت پر قلمبند کرکے پڑھے تھے وہ سطور بھی جو مصنف نے تمہید کے طور پر سامعین کے سامنے پڑھیں کتاب میں "حرف اول" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں اس برصغیر میں اور بیرون ہندو پاک اقبال کی مقبولیت کے ذکر کے ساتھ اظہارِ تاسف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

ہمارے ادب کی بدقسمتی یہی ہے کہ اقبال اپنے قدر دانوں کے ہاتھوں کچھ اس غلط انداز میں پیش ہوئے ہیں کہ عامۃ الناس میں اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تقسیم ہند کے بعد جہاں پاکستان نے اقبال کو اپنا ملی ہیرو قرار دیا وہاں ہندوستان نے اقبال سے ایک طرح کی بے اعتنائی برتی۔ یہ بے اعتنائی انہیں غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے جو پرستارانِ اقبال نے اقبال کے بارے میں پیدا کی ہیں۔ اور ابھی تک جن کا سلسلہ جاری ہے۔ صنا

اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کا سبب اقبال اور کلامِ اقبال سے بے اعتنائی کے باعث جگن ناتھ آزاد کے نزدیک مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے تعصبات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جگن ناتھ آزاد کو اقبال کی اسلام سے شیفتگی کی بنا پر بے اعتنائی کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس سلسلے میں ان کی درج ذیل دلیل کافی وزن رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی تو ملٹن اور ڈانٹے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے۔ اور تلسی داس اور رابندرناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عشقِ مذہب عشقِ بنی نوع انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر

آتے تو اسے کم نظری کے سوا اور کسی بات پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ ص ۱۰

آزاد نے اپنے ان توسیعی لیکچروں میں سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اقبال کے بارے میں سامعین کے اذہان صاف ہوں۔ لہذا متذکرہ غلط فہمیوں کا بڑی حد تک ازالہ کرتے ہوئے انھوں نے ایسا طرزِ استدلال اختیار کیا کہ اقبال کے ساتھ ناانصافی بھی نہ ہو اور سامع اور قاری پر اقبال کا نقطۂ نگاہ بھی واضح ہو جائے۔ اس کیلئے فاضل مضمون نگار نے حقائق کو تاویلات سے توڑا مروڑا نہیں۔ اس مضمون کا لبِ لباب یہ ہے کہ دوسرے کلاسیک اور عظیم ہندوستانی شاعروں کی طرح اقبال ہندوستان کے بھی شاعر ہیں۔ یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اقبال کو ہمیشہ ہندوستان سے محبت اور ہندوستان کے مسائل سے دلچسپی رہی ہے۔ اقبال کی ہر دور کی نظموں میں سے حوالے فراہم کئے گئے ہیں البتہ وہ اقبال کے ذہنی اور فکری سفر کے ایک موڑ پر غلط راہِ استدلال کی طرف نکلنے ہی والے تھے آجاتے ہیں۔ وہ اقبال کا ہندوستانی پس منظر تیار کرتے ہوئے پہلے دور کی نظموں — ہمالہ، آفتاب، تصویرِ درد، اور سرگذشتِ آدم، کا ذکر کرتے ہیں اور جب اقبال کی نظم ترانۂ ہندی، پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں

اس نظم کا جب بھی اور جہاں بھی ذکر ہوتا ہے۔ پرستارانِ اقبال یہ فرمانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ تو علامہ اقبال کا ۱۹۰۸ء سے پہلے کا کلام ہے۔ جب کہ وہ وطن پرستی کے غلط نظریے کے قائل تھے۔ بعد میں جب وہ یورپ گئے تو ان کے نظریے میں ایک تبدیلی رونما ہوئی اور ان کی شاعری نظریۂ وطن کی حلقہ بندیوں سے آزاد ہو کر اسلامی عقائد کی وسیع فضا میں سحر آفرینیاں کرنے لگی۔ اور نظمیں ملکی نہیں بلکہ ملّی نقطۂ نگاہ سے کہی جانے لگیں وغیرہ وغیرہ یہی نقاد اسی سانس میں علامہ اقبال کے سر یہ سہرا باندھنے کی کوشش بھی فرماتے ہیں کہ انھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ گویا پاکستان کا تصور پیش کرتے ہی ملکی اور سیاسی نظریات کا تضاد ختم ہو گیا۔ ص ۲۲-۲۳

بظاہر یہ تضاد بنتا ہے کہ اقبال نے وطن پرستی کے مخالفت کے ساتھ ایک نئے وطن کا خاکہ نہ صرف پیش کیا۔ بلکہ اسے برصغیر کے مسلمانوں کا سیاسی نصب العین بنا دیا

دراصل یہ لفظ جتنا مبہم ہے اتنا ہی واضح اور روشن بھی ہے۔ اب برصغیر کی تحریک آزادی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ علامہ اقبال نے کن معروضی موضوعی اور تاریخی اسباب کے نتیجے میں ۱۹۳۰ء کا خطبہ ارشاد فرمایا اور اپنی وفات تک علامہ نے جو مختلف بیان دیئے وہ بڑی حد تک اسی خطبے کی توضیحات ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس میں اختلافی فقرہ آزاد نے جملہ معترضہ کے طور پر کہا تھا۔ ورنہ اسی صفحہ پر انھوں نے وطن پرستی سے گریز کی بہت عمدہ توضیح و تشریح کی ہے۔ ان دو صفحوں پر محیط وضاحت میں سے یہاں چند سطور درج کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

۔۔۔۔ یورپ۔۔۔۔ کے دوران قیام میں انھوں (اقبال) نے دو باتیں دیکھیں۔ ایک تو یہ کہ یورپی ممالک اپنی اپنی ہوس اقتدار میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے دوسرا یہ کہ اہل یورپ جن میں برطانیہ پیش پیش تھا۔ ایشیا اور بالخصوص مسلم ممالک کے ساتھ ناگفتنی سلوک کر رہے تھے ایک مسلم ملک کو دوسرے ممالک کے خلاف صف آرا کرنے کے بہانے ڈھونڈے جا رہے تھے۔۔۔۔ اس صورتِ حال کا جب اقبال کے دردمند دل نے مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک ان ممالک میں اتحاد نہیں ہوتا ان کے یورپ کی غلامی سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں اور اتحاد کیلئے یہ ضروری تھا کہ ان بکھرے دانوں کو ایک روحانی رشتے میں پرو دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک کے لئے یہ روحانی رشتہ اسلام کے ہمہ گیر تصور کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلامی برادری کا یہی وہ نظریہ ہے جسے نقادان اقبال نے یہ لباس پہنا دیا کہ یورپ سے واپسی پر وہ وطنیت کے خلاف ہو گئے اور اسکی جگہ انہوں نے اسلام کے ہمہ گیر نظریئے کو دی۔ حالانکہ اسلام کے ہمہ گیر نظریہ اس نظم میں بھی موجود ہے۔ جسے اسلام کے ہمہ گیر نظریئے کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔ ص ۲۳۔۷۵

اس مضمون کے آخری دو تہائی حصے میں مصنف نے (بالِ جبریل) ،، پیامِ مشرق ،، بندگی نامہ ،، جاوید نامہ ،، اور ضربِ کلیم کی نظموں اور اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی ہے۔ کہ اقبال نے وطنیت کے نظریئے کی مخالفت کے بعد بھی ہندوستان کی تعریف کی ہے۔ حتیٰ کہ جب اقبال مولانا رومی کے رہنمائی میں مختلف افلاک سے ہوتے ہوتے فلک زحل تک پہنچے ہیں (تو وہاں) فلک زحل کے چند اشعار میں صرف یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اقبال سرزمین ہند کے ساتھ کتنی بے پایاں محبت رکھتے ہیں،، ص ۳۹

بہر حال یہاں حاصلِ کلام کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کو ملی شاعر قرار دینے کی چند در چند وجوہات ہیں۔ دنیا کے کسی کلاسیکی شاعر نے اقبال کی طرح کبھی ایک قوم یا ملت کو اپنا مخاطب خاص نہیں بنایا۔ یہ تو اقبال کو عظمت ہے کہ اس کا کلام مسلمانوں کے روحانی، تہذیبی اور ثقافتی رنگ میں رنگا ہونے کے باوجود بھی اپنے اندر ایسے عناصر رکھتا ہے جو ایک آفاقی شاعر کے کلام کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔

فکرِ اقبال کے دائمی موضوعات میں اقبال کا نظریۂ تصوف بھی شامل ہے اقبال جیسے مفکر شاعروں کے سلسلے میں یہ رویہ عام ہو جاتا ہے کہ اکثر قارئین اور ناقدین مروج تاثرات سے ہی کام چلانے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اقبال کے بارے میں یہ تاثر خاصا محکم ہو چکا ہے کہ وہ تصوف کے صرف خلاف ہی نہ تھے بلکہ اس کے سخت دشمن تھے۔

جگن ناتھ آزاد کی کتاب کا دوسرا موضوع "اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب ولہجہ" اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اقبال کے صوفیانہ افکار کی دریافت اور بازیافت کی (بیک وقت) کوشش کی گئی ہے۔ محض ناقدین کی آرا پر انحصار کرنے والوں کیلئے آزاد کی درج ذیل رائے کو قبول کرنا مشکل ہوگا۔

اقبال کا شمار اردو یا فارسی کے صوفی شعراء میں نہیں کیا جاتا لیکن یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اقبال تصوف سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے ہیں بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ اقبال کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے

بریز ہے تو غلط نہ ہوگا ۔ ۔ ۔ (اس کا) ایک سبب تو یہ ہے کہ اقبال نے فارسی کے جن شعراء کا کسی نہ کسی حیثیت سے اثر قبول کیا وہ اپنے اپنے انداز سے تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ ان صوفی شعراء میں رومی، عطار اور سنائی کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔ ۔ ۔ ص ۵۵-۵۶

جب اقبال نے مثنوی "اسرارِ خودی" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تو اس کے خلاف صوفیوں کے حلقے میں بڑا شدید ردعمل ہوا حد یہ ہے کہ حضرت اکبر الہ آبادی خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے اصحاب بھی حافظ کے متعلق اس مثنوی کے اشعار سے برانگیختہ ہوئے اور ان تک اقبال کے مقصود و معانی کا ابلاغ نہ ہو سکا۔ اقبال نے اس سلسلے میں بہت کچھ وضاحتیں بھی کیں مگر دوسرے ایڈیشن میں حافظ کے بارے میں اشعار حذف کرنے ہی پڑے اس سلسلے میں آزاد نے دیباچہ "اسرارِ خودی" اور اقبال کے وضاحتی خطوط کے طویل اقتباسات نقل کرنے کے بعد درج ذیل نتیجہ نکالا۔ جو کم و بیش اقبال ہی کے الفاظ میں ہے۔

اقبال تصوف کے خلاف نہیں تھے بلکہ اس تصوف کے خلاف تھے جسے انہوں غیر اسلامی تصوف سے تعبیر کیا ہے ۔ ۔ ۔ اصل میں اقبال نے اپنے دور میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ حقیقتوں سے فرار کی تعلیم نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو فنا کر دیا ہے اور نتیجہ مسلمانوں کے دین و ادب سے بوئے رہبانی آنا شروع ہو گئی ۔ یہ فرار اور گریز کی تعلیم کہاں سے آئی؟ قرآن حکیم تو انسان کو عملِ صالح کی دعوت دیتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم تصوف کے اس بظاہر دلکش لیکن بباطن خطرناک رستے سے آئی ہے جو ادبیات، فنون لطیفہ اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر مسلط ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ ص ۶۹-۷۰

وحدۃ الوجود کا نظریہ فلسفہ تصوف کی جان اور ایمان ہے اقبال کو ایک گروہ وحدت الوجودی ثابت کرتا ہے دوسرا کہتا ہے کہ انہوں نے اس نظریے کو رد کر دیا تھا اور وہ وحدت الشہود کے قائل ہو گئے تھے اور بعض کے نزدیک وہ پھر وحدۃ الوجود کی

...بن کر رہ گئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد تیسرے گروہ سے متفق نظر آتے ہیں انہوں نے
...مضمون کے دوسرے حصے میں نظریۂ وحدۃ الوجود کی تعریف ایسے انداز میں کی ہے
...وضاحت اور وضاحت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اپنی فطری پیچیدگی کے باوصف
...فہم بن جاتا ہے پھر اس تعریف اور وضاحت کی روشنی میں اقبال کی شاعری کے
...ادوار میں ان کے صوفیانہ لب و لہجہ کی نشاندہی کی ہے اور اس سلسلے میں آزاد
اقبال کے ۱۹۱۰ء تک کے کلام سے استناد کیا ہے بقول جگن ناتھ آزاد۔۔

۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء تک کا عرصہ ایسا ہے جس میں اقبال حیرت انگیز طور پر
...موضوع پر خاموش ہو گئے۔۔۔ وحدۃ الوجود کے عام نظریئے کی صریحی مخالفت
...ان کے اس دور کے افکار میں موجود ہے (کیونکہ اس) دور میں اقبال اس خیال
...شدت سے قائم ہیں کہ تصوف یا وحدۃ الوجود یا ویدانیت کا قرآن حکیم یا حدیث سے
...تعلق نہیں۔۔۔ ص۳

جگن ناتھ آزاد جیسے فاضل ماہر اقبالیات سے جب ایک بدیہی واقعاتی
...سرزد ہوتی ہے تو اس پر افسوس ہوتا ہے اپنے محولہ بالا مضمون ہی میں
...جگہ لکھتے ہیں کہ سفر یورپ کے دوران میں علامہ اقبال نے ایرانی فلسفے
...وف کا مطالعہ کیا واپسی پر ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا، کے عنوان
...ایک کتاب لکھی۔ اس میں آپ نے تصوف کے موضوع پر مفصل بحث
...۔۔۔ یہ کتاب ۱۹۰۹ء میں لکھی گئی تھی ص۸۲-۸۳

...یہاں میں یورپ سے واپسی ۱۹۰۹ء میں کتاب کا لکھا جانا درست نہیں
۔ اپنی کتاب "اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ" میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
...کی تصانیف کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

(Development of Metaphysics in persia)
...ڈی کے لئے یہ مقالہ لکھا گیا تھا اور ۱۹۰۸ء میں لندن کے تاجر کتب
...نے شائع کیا (اقبالیات کا تنقیدی مطالعہ ص۲۱) یا ...

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ جگن ناتھ آزاد اس کتاب کو فکر اقبال میں ایک سنگ میل شمار کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اقبال نے اس کتاب کے بعد وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر لب کشائی نہیں کی اور تقریباً بارہ برس بعد (یاد رہے صفحے پر بھی وہ اسی دوران کا سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۲۲ء کے سنین سے تعین کر چکے ہیں) اقبال کے فکر و خیال میں زبردست تبدیلی ہوئی اور وہ خود وحدۃ الوجود کی قرآنی تعبیر کے قائل ہو گئے ۔ ۔ ۔ اس کیفیت کو بعض نقادوں نے تضاد کا نام دیا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس میں تضاد کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک بالغ نظر مفکر کی تحقیق و تلاش اور جستجو کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے ۳۵ اس کے بعد مصنف موصوف نے پیام مشرق، زبور عجم، گلشن راز جدید، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے اشعار سے اپنا موقف کی توثیق کا کام لیا ہے آخر تحقیق و تدقیق اور غور و خوض سے بقول آزاد اقبال پر ۔ ۔ ۔ حقیقت منکشف ہوئی ۔ ۔ (کہ) شیخ اکبر نے قرآن اور حدیث ہی کو اپنے نظام فکر کا ماخذ بنایا ہے تو انھوں نے شیخ اکبر کے نظریے کی شدید مخالفت ترک کر دی لیکن ایک بنیادی فرق شیخ اکبر اور علامہ اقبال کی تعلیم میں آخر تک رہا اور وہ فرق عقیدے کا نہیں بلکہ طریق کار کا ہے شیخ محی الدین ابن عربی انائے مطلق کو اصل قرار دے کر انائے مقید کو اس کی ایک قرار دیتے ہیں لیکن اقبال انائے مطلق کے عوض انائے مقید کو اپنی فکر کا اساسی نقطہ بتاتے ہیں۔ یعنی وہ خودی سے خدا تک پہنچتے ہیں۔ ۔ "۳۶"

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ تصوف مسائل اقبال کا ایک متنازعہ مسئلہ رہا ہے ہم دیکھتے ہیں یہاں جگن ناتھ آزاد نے یہ متنازعہ مسئلہ فیصلہ کن انداز میں پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا آخری مضمون "اقبال اور اس کا عہد" پہلے دو مضمونوں سے مختلف ہے کیونکہ ان دونوں مضمون میں مخصوص موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ ایک لیکچر ہے جس کے لئے عموماً وقت کی قید ہوتی ہے ۔ دوسرے لیکچر طول کلام اور تفصیلات کا بھی متحمل نہیں ہوتا۔ اس لئے تبصرے

مضمون میں چند اشاروں سے کام لے کر اقبال کے فکر وفن کے مجموعی تاثر کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کے آغاز میں ۱۸۵۷ء کو قومی، سیاسی اور تہذیبی سفر کا ایک یادگار موڑ قرار دیتے ہوئے حالی کے مقدمہ شعروشاعری کے اقتباس کے حوالے سے ہندوستان کے شعروادب کے ان مذموم پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے قومی اخلاق کو گھن لگ جاتا ہے اور ہماری شاعری کا حال یہ تھا کہ وہ لکھنؤ کی معاملہ بندی اور دہلی کی نکتہ آفرینی کے مدار سے ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اگرچہ اس طلسم کاری کو باطل کرنے میں حالی کی مسدس اسم اعظم کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر اقبال کا ظہور روایتی اردو شاعری میں رسمی اور فرسودہ سخن طرازی کا غروب ثابت ہوا۔ بقول جگن ناتھ آزاد۔

اقبال نے ہماری توجہ شعر کے (اس) نام نہاد حسن سے ہٹا کر موضوع و معانی کی طرف مبذول کی۔ اس موضوع و معانی کی طرف جو الفاظ سے ہم آہنگ ہو کر شعر دلنشیں کی تشکیل کا باعث بنتا ہے ص۹۹ ... ہر بڑے شاعر کا کلام اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فن اور ہنر کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ کلام اقبال میں بھی یہ اشارے واضح انداز سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فن میں جہاں اقبال جلال وجمال دونوں کیفیتوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں وہاں وہ اس سے ایک اعلیٰ تر زندگی کے حصول کا مقصد بھی وابستہ کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں صحیح فن وہنر وہ ہے جو ہمارے عزم اور ولولے کو آگے بڑھانے فرسودگی ماحول کے خلاف ہمیں بغاوت پر اکسائے۔ ایک صالح زندگی کی ترغیب دے۔ ہمیں مشکلات اور رکاوٹوں پر فتح پانا سکھائے۔ ہر منزل کے بعد نئی منزل ہمارے سامنے لے آئے اگر فن وہنر اس معیار پر پورے نہیں اترتے تو وہ پھر اقبال کے نزدیک افسانہ و افسوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے" ص۱۰۲

سطور بالا میں اقبال کے ادبی اور فنی مقصود و مطلوب کا بیان ہوا ہے۔ مصنف موصوف نے مرقع چغتائی کے دیباچے اور اقبال کے اشعار کی مثالوں سے اقبال کا فن و ہنر کا تصور بڑی جامعیت سے پیش کیا ہے۔ شعروادب اور فنون لطیفہ کے بارے میں اقبال

کے تصورات واضح کئے بغیر اقبال فکر اشکال کے دائرے سے نہیں نکلتا اس نکتہ کو آزاد نے سمجھا اور برتا ہے۔ اقبال کے تصور فن کی پیشکش جس منطقی نتیجے کے متقاضی تھی اس مضمون کے آخری صفحات میں اس نتیجے کا بڑا موثر طریقہ پر استخراج ہوا ہے اور ایک طرح سے یہ صفحات پیام اقبال کے ان پہلوؤں کے امانت دار ہیں جن سے اقبال ایک عہد آفریں شاعر قرار پاتے ہیں۔ آزاد کے مطابق۔

ہم اقبال کے ۔ ۔ ۔ خیالات کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتے اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ انسانیت کی بلندی سے کہی ہے ۔ ۔ ۔ فکر اقبال میں یہ عظمت اقبال کے اس بنیادی عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان عظیم ہے ،، ص۱۰۹

اقبال کی عظمتِ فکر ثابت کرنے کے لئے یہاں کلام اقبال کے رجائی پہلو کو بڑی جامعیت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ زندگی میں مایوسی، بے چارگی، بے یقینی اور اندوہ گینی کے حوصلہ شکن مقامات پر کلام اقبال جس طرح راہنمائی کرتا ہے اس کو آزاد نے غالب اور عمر خیام کے ساتھ اقبال کے موازنے سے ثابت کیا ہے۔ کلام اقبال کا یہ عنصر ایسا ہے جو انہیں انسانیت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ پہلو اس لئے بھی لائق ستائش ہے کہ۔

"اقبال نے انسان کے اندر قوتِ یقین پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ہماری شاعری میں اولین کوشش ہے ،، ص۱۱۷

اس طرح آزاد نے اقبال کی بعض دوسری اولیات کی طرف توجہ دلائی ہے مثلاً بقول آزاد:۔

(۱) اقبال سے پہلے ہماری غزل محض ایک انفعالی کیفیت کے گرد گھوم رہی تھی اقبال نے آکر اسے غنائیت میں رچا ہوا ایک باوقار لہجہ عطا کیا غزل کی داخلیت کو برقرار رکھتے ہوئے اقبال نے اسے مسائل حیات سے آشنا کیا اور اسے گھٹے ہوئے تعفن آمیز ماحول سے نکال کر کھلی فضا میں سانس لینے کی توفیق بخشی،، ص۱۱۸

۲۔ ۔ ۔ ۔ سرمایہ و محنت کی آویزش کا موضوع ۔ ۔ ۔ سب سے پہلے اقبال

ہی کی فکر نکتہ آفریں اردو شاعری میں لائی۔" صفحہ ۱۱۸

اقبال کی نظم "خضر راہ" کے حوالے سے سرمایہ و محنت کی آویزش کا تذکرہ اس نظم کے شعروں کے ذریعہ کیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کے کلام میں حریت فکر اور آزادی و غلامی کے موضوعات پر اقبال کا نقطہ نظر (تصورات) پیش کیا ہے۔ یہ تصورات ایسے روشن چراغ ہیں جن سے محکوم اقوام کے ولولوں اور امنگوں کے شعلے زندگی حاصل کریں گے اور رت رد پ بدلتے ہوئے استعماری ہتھکنڈوں اور سازشوں کے محل راکھ کے ڈھیر ہوتے رہیں گے کیونکہ۔

"اقبال کی آزادی کا تصور صرف ہندوستان کی آزادی کا نہیں بلکہ مشرق کے تمام غلام ممالک کی آزادی کے تصور کا آئینہ دار ہے صفحہ ۱۲۲ ۔۔۔۔ ہندوستان ہو دوسرے مشرقی ممالک جہاں کہیں فکر و فن خواجگی نے اپنا دام ہوس پھیلا رکھا ہے اقبال وہیں اپنی ضرب کاری لگاتے ہیں ۔۔۔ غلامی کی حالت میں وہ قیام کو بے حضور اور سجدے کو بے سرور پاتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ عالم غلامی میں وہ سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ حق صرف آزاد مردوں ہی کو پہنچتا ہے۔ صفحہ ۱۲۳ ۔۔۔ اقبال نے اپنے عہد کے نام جو پیغام دیا ہے وہ آزادی انسان کا پیغام ہے۔" صفحہ ۱۲۴

ایک دو موقعوں پر جگن ناتھ آزاد نے کسی حد تک بے موقع یہ بات کہی ہے کہ کلام اقبال ایک انسان کا کلام ہے اور کلام اقبال الہامی کلام نہیں ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اقبال کے ہر لفظ اور ہر مصرعے پر ایمان لے آئیں نہ ہی اقبال ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں۔" صفحہ ۱۲۹ آزاد کی اس رائے سے کسی بھی صاحب نظر کو اختلاف نہیں ہو سکتا مگر جس سیاق و سباق میں وہ ذہن میں درج آخری جملے قلمبند کرتے ہیں وہاں ان کا اپنا ذہن صاف نہیں اور وہ ایک نہایت معمولی نکتہ پر الجھن اور انتشار کا شکار ہو گئے مثلاً وہ اقبال کے فوق البشر کے تصور کے ضمن میں عقابیت اور شاہینیت کے میلان اور اس پر اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں۔

۔یہ اعتراض بادی النظر میں بہت وزنی نظر آتا ہے لیکن اس موضوع پر اقبال کے اشعار اگر تمام سیاق وسباق کے ساتھ پڑھے جائیں تو اعتراض کا جواب ان ہی اشعار میں مل جاتا ہے ،، ص۱۲۸ ۔۔۔اس سلسلے میں یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے ۔

جو کبھی کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اور اگلے ہی صفحہ پر اس شعر کے بارے میں لکھا ہے :۔

،،شاہین اور کبوتر کی مثالوں سے ذہن فوری طور پر ظالم اور مظلوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔اس مفہوم کے لئے اگر کبوتر پر جھپٹنے کے علاوہ کوئی اور مثال پیش کی جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا ۔۔۔۔۔ ص۱۲۹

غالباً اس الجھن اور انتشار کا سبب یہ ہے کہ وہ اقبال سے جذبۂ عقیدت بلکہ اقبال پرستی کی متجاوزانہ حدود کا ایسا احساس رکھتے ہیں جو ان کے ہاں کسی حد تک نفسیاتی دباؤ کی صورت اختیار کر گیا ہے اس طرح کی صورت حال زیر نظر کتاب میں کئی جگہ کہیں دو ٹوک الفاظ میں اور کہیں Undertone معلوم ہوتی ہے ان میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال پر لکھنے والے کچھ زیادہ ہی خود شعوری اور پاسِ وضع احتیاط کا شکار ہو جاتے ہیں اگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک برقرار رہی تو خطرہ ہے کہ کہیں کلامِ اقبال سنہرے، مزین اور منقش اوراق کے سرد خانے کی نذر نہ ہو جائے بہر حال مجموعی طور پر اقبال اور اسکا عہد جگن ناتھ آزاد کی ایک کامیاب تصنیف ہے اس میں قدم قدم پر اقبال سے گہرے شغف اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے ۔ان کے نزدیک اقبال بنیادی طور پر شاعر ہیں اگر چہ وہ بحیثیت شاعر اقبال کی بلندیٔ نگاہ اور عظمتِ فکر کے قائل نظر آتے ہیں مگر محض ملتِ اسلامیہ کے مفکر و رہنما کے طور پر اقبال کی حیثیت سے انہیں اتفاق نہیں ہے ۔ دو تین موقعوں پر جگن ناتھ آزاد نے ، گاندھی ، جواہر لال نہرو ، اور ابوالکلام آزاد کو برصغیر کی تحریک آزادی کے ہیرو قرار دیا ہے ۔انہوں نے اپنے مضمون ،،شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر،، میں آزادیٔ ہند کے لئے اقبال کی کوششوں کو سراہا ہے مگر قائد اعظم محمد علی جناح

اور دیگر مسلم اکابرین کی ملکی اور قومی خدمات کا اعتراف تو کیا ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ پاکستانی ایڈیشن کے ناشر نے ایک جگہ فٹ نوٹ میں اس امر کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی زیرِ نظر کتاب قابلِ توجہ ہے۔ اس میں زبان، طرزِ بیان اور اسلوب کے اعتبار سے بعض ایسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً اقبال پر لکھنے والوں کے لئے جن کا حصول عام تعلیمی معیار کے پیش نظر اقبالیات کا ایک اہم تقاضا ہے۔ بہر طور فکرِ اقبال کی تفہیم اور شعرِ اقبال کی تحسین کا مقصد لکھنے والوں کے پیش نظر رہنا چاہئے۔ عالموں کے لئے مقالہ لکھنا شاید سود مند نہ ہو۔ بلکہ وقت کا ضیاع ہو کر جو پہلے ہی عالم ہیں ان کے معلومات میں کیا اضافہ ہوگا۔ غالباً اظہار و بیان کے اعتبار سے وہ مضمون یا کتاب کامیاب سمجھی جائے گی جس سے عالموں کے ساتھ ساتھ تیسرے درجے کے قارئین بھی لطف اندوز ہو سکیں۔ اقبال کا نورِ بصیرت عام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ناقدین اور مصنف شعری اسلوب سے اجتناب کریں اور نثری اسلوب بنائیں جگن ناتھ آزاد نے نثری اسلوب کے تمام امکانات کو "اقبال اور اس کا عہد" میں موثر انداز میں استعمال کیا ہے۔

اجنتا

ایک طویل تمثیلی نظم۔

جو ہندوستان کے نو سو برس کی تہذیب ہی کا ایک مرقع نہیں بلکہ شاعر کے نظریۂ فن کا ایک انوکھا اور اچھوتا اظہار بھی ہے۔

آزاد اپنے سحرِ بیان سے اس نظم کے طفیل، قاری کو ہندوستان کے اس ثقافتی دور کے روبرو لے آتا ہے جس نے اپنی ژرف نگاہی، دروں بینی اور انفاسِ گرم کی بدولت پتھروں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔

یہ نظم اس اعتراض کا منھ بولتا جواب ہے کہ اردو شاعری میں قدیم ہندوستانی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں مفقود ہیں۔

مکتبۂ جامعہ اردو بازار دہلی

جگن ناتھ آزاد کا اظہار خیال

[مندرجہ بالا مقالہ جناب ریاض چودھری نے لاہور سے جگن ناتھ آزاد کو بھیجا اس کے جواب میں جگن ناتھ آزاد نے جو خط ریاض چودھری کو لکھا اس کا اقتباس نیچے درج کیا جا رہا ہے۔]

ڈاکٹر صدیق جاوید کا مقالہ میں نے پڑھا ہے مجھے پسند ہے اقبال کے نظریۂ وطنیت کے بارے میں مجھے اور زیادہ وضاحت سے لکھنا چاہئے تھا ذرا فرصت ملے تو اس باب کے بعض حصوں پر نظر ثانی کردوں۔ اقبال کے نظریۂ وطنیت کے متعلق میرے نزدیک بنیادی بات یہ ہے کہ اقبال محب وطن تھے نیشنلسٹ نہیں تھے نیشنلزم کا تصور یورپ سے آیا اور اقبال نے اس کی مخالفت کی ہے۔ حب وطن کی بات دوسری ہے اور تصور پاکستان کا جواز بھی جبھی پیدا ہوتا ہے جب ہم اقبال کو محب وطن تسلیم کریں۔ ہمیں اقبال کے تصور حب وطن اور نیشنلزم کے نظریئے کو آپس گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ "بانگ درا" میں ایک نظم ہے "وطنیت" اس دور میں سے اور ہے جام اور جم اور اس کا ذیلی عنوان ہے "وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے" گویا اقبال نے وطنیت کے تصور پر نہیں بلکہ وطن کے سیاسی تصور پر ضرب کاری لگائی ہے۔

اقوام میں مخلوق خدا رہتی ہے جس سے اقبال کی شاعری میں حب وطن کوئی ایسا اہم پہلو ہے یا نہیں کہ اس پر آج ایک مقالہ لکھا جائے ایک اضافی نوعیت کا سوال ہے لیکن میرا مقالہ ۱۹۳۸ء یا ۱۹۵۲ء کی تحقیق ہے۔ آپ کو شاید علم ہے گا کہ اس وقت ہندوستان میں اقبال کا نام تک سننے میں نہیں آرہا تھا آپ آج ہندوستان میں اقبال صدی تقاریب کے جوش و خروش پر نہ جائیے بلکہ آج سے بیس (۲۰) سال پہلے کے زمانے پر نظر ڈالئے جب ہندوستان میں پاکستانی ہائی کمیشن کے علاوہ کہیں یوم اقبال کا نام سننے میں نہیں آتا تھا۔ اقبال پر ڈاکٹر سچدانند سنہا کی کتاب کو چھوڑ کے جو ۱۹۴۷ء میں تقسیم سے قبل چھپی۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد را اقبال اور اس کا عہد، اس موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہے اسی زمانے میں مجنوں گورکھپوری کی کتاب بھی آئی تھی "اقبال" لیکن وہ تو ہندوستان کے anti Iqbal ماحول کے عین مطابق تھی یعنی بحیثیت مجموعی اقبال کے نظریات کی تردید میں تھی۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کی کتاب کو بھی anti Iqbal ہی کہہ سکتے ہیں۔ فراق گورکھپوری اقبال پر آج بھی جب اعتراضات کرتے ہیں تو وہ دراصل مجنوں کے لگے ہوئے نوالے چباتے ہیں (یعنی آج سے پچیس تیس سال قبل) میں نے محسوس کیا کہ اگر اقبال کے ساتھ اہل ہند نے یہی بے نیازی جاری رکھی تو ہندوستان کے اردو کے عظیم ترین شاعر سے محروم ہو جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ ہندوستانی ادب اردو شاعری کے اس ڈکشن سے بیگانہ نہ ہو جائے گا

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا

گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات

یا

کھول آنکھ فلک دیکھ، زمین دیکھ، فضا دیکھ،

"ترانۂ ہندی،، آج آپ کو پسند ہو یا نہ ہو لیکن ہندوستان کی ساری قوم پرستانہ اردو شاعری ہیں۔ درگا سہائے سرور، برج نرائن چکبست۔ ظفر علی خاں

تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، برق دہلوی، شمیم کرہانی اور سیماب اکبرآبادی کی ہیں ـــــ آہنگ کا مصرع نظر نہیں آتا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

یا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا

صرف یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ساری موجودہ ہندی شاعری ہندی کے اس لہجے سے ناآشنا ہے۔

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

جی ہاں! یہ مصرع ہندی بھاشا میں ہے لیکن موجودہ ہندی بھاشا کی ساری شاعری میں اس آہنگ اور اس لہجے کا مصرع نہیں ملے گا۔ یہ بات میں ہندوستان میں ہندی کے اکثر شعرا سے کہہ چکا ہوں اور یہ تمام شعراء اس ضمن میں میرے ہم خیال ہیں۔ یہ میں خالص شاعری کی بات کر رہا ہوں۔ نظریات کی نہیں۔ (ویسے میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ کسی شاعر کے نظریات اور شاعری میں حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات محض ادبی بددیانتی ہے کہ ہم موضوع کا سہارا لے کر "میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے"، کو "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"، پر ترجیح دیں)"

۱۹۵۵ء میں جموں و کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر فیضی صاحب نے مجھے یونیورسٹی میں غالب پر لیکچر دینے کی دعوت دی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ غالب پر پھر کبھی لیکچر دے دوں گا پہلے آپ مجھ سے اقبال پر تین لیکچر دلوائیے۔ فیضی صاحب جیسے سناٹے میں آ گئے۔ بولے ۱۹۴۷ء سے آج تک جموں و کشمیر میں کسی نے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ آپ سوچ لیجئے۔ میں نے کہا اس میں سوچنے کی کیا بات ہے غالب بھی بڑا شاعر ہے۔ اقبال بھی بڑا شاعر ہے اگر غالب پر لیکچر ہو سکتے ہیں تو اقبال پر بھی ہو سکتے ہیں۔ فیضی صاحب نے میری بات مان تو لی۔ اگر میں اقبال کا نام تجویز کرتا

اور غالب ہی پر تین لیکچر دیے پر آمادہ ہو جاتا تو یقیناً وہ زیادہ خوش ہوتے۔
اب اس اقبال پر ہندوستان میں لیکچروں کی ابتدا کرنا جس کا کشمیر سے راس کماری تک کوئی نام بھی نہیں لے رہا تھا بہت آسان کام نہیں تھا۔ اس وقت اس موضوع کا سہارا لئے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا تھا میں یہاں اس بات کی ایک بار پھر وضاحت کردوں کہ میں اقبال کے فن اور نظریئے کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھتا اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے نظریئے کو فن بنا کے پیش کیا ہے اور میں اسی فن ہی کو ہندوستانی ادب کی متاعِ بے بہا سمجھتا ہوں اور میری خواہش تھی کہ ہندوستانی دانشوراور ہندوستانی اہلِ قلم کی نظروں سے اس فن کی عظمت اوجھل نہ ہو جائے —— میں اپنی بات کو یہاں صرف ایک مثال سے واضح کروں گا۔ یہ شعر۔

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو۔

ایک نعتیہ شعر تو ہے ہی لیکن ہر نعتیہ کلام محض نعتیہ ہونے کی وجہ سے فن پارہ تو نہیں ہو سکتا۔ آج بھی جب میں ایم۔ اے۔ فائنل کو یہ شعر پڑھاتا ہوں تو پورے ایک پیریڈ میں اس کے محض آہنگ اور لفظ و معنی کے باہمی ربط پر بحث ختم نہیں ہو سکتی ورنہ یہ بات تو دو فقروں میں ختم ہو سکتی ہے کہ یہ نعتیہ شعر ہے اور یہ اس کے معنی ہیں چلئے چھٹی ہوئی۔ اقبال کے فکر و فن کا یہ امتزاج اقبال کی ساری شاعری کے پسِ منظر میں ہوتے دیکھئے۔

۱۹۵۰ء میں اقبال کی شاعری کے اس سرچشمے تک جسے آپ
Religion thought in Islam کہیں یا
Social economic thought یا Political thought
اُنے قارئین یا سامعین کو لے جانے کے لئے مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی اور وہ سہارا اس کی اس شاعری نے دیا جسے میں ہندوستانی پسِ منظر کی شاعری کہتا ہوں —— اور یہ سہارا کلامِ اقبال کے غلط تجزیے پر مبنی نہیں تھا

فکرِ ہندی کی رد اقبال کی نظم و نثر میں پوری شدت کے ساتھ جلتی نظر آتی ہے فکرِ مغرب کی رد کی طرح اور مغربی یا ہندوستانی فلسفے کے ساتھ فکرِ اقبال کے تعلق پر روشنی ڈالنے سے اس حقیقت پر کوئی حرف نہیں آتا کہ اقبال کا بنیادی سرچشمہ افکارِ اسلام ہے میرا خیال ہے میرا نقطۂ نگاہ واضح ہو گیا۔

(۲)

فاضل مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ آزاد نے "شعرِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر" میں آزادیٔ ہند کے لئے اقبال کی کوششوں کو بھی سراہا ہے مگر قائدِ اعظم محمد علی جناح اور دیگر مسلم اکابرین کی ملکی اور قومی خدمات کا اعتراف تو کیا ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ پاکستانی ایڈیشن کے ناشر نے ایک جگہ فٹ نوٹ میں اس امر کی نشاندہی کی ہے۔

اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آزادیٔ ہند کے تعلق سے اقبال کے علاوہ جن رہنماؤں کا نام اس کتاب میں آیا ہے وہ ہیں بہادر شاہ ظفر، بخت خاں، نانا صاحب گاندھی، ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو اور حسرت موہانی ——— اس سلسلے میں غالب اور حالی کا نام بھی آیا ہے اور موضوع اور مناسبت کے ساتھ۔ جو نام میں نے درج نہیں کئے ان کے لئے نام نہ لکھنے کی کوئی نئی دلیل پیش کرنے کے عوض یہی کہوں گا کہ میرا جواب مندرجہ بالا تحریر میں موجود ہے ناشر کے فٹ نوٹ پر مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں میں صرف تیس برس پہلے کے اس دور کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جب یہ مقالہ لکھا گیا

(۳)

مجھے اعتراف ہے کہ میرے مقالے میں DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA ——— کی تاریخ اشاعت غلط چھپ گئی ہے یہ کتاب اقبال کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا تھیس ہے جو انھوں نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے تمام یورپ کے دوران میں لکھا۔ یہ غلطی اس مقالے میں کیسے راہ پا گئی اس کے متعلق

کچھ کہنے سے قاصر ہوں لیکن لیکن اس غلطی کو کتابت کی یا پروف ریڈنگ کی غلطی قرار دے کر میں اپنی ذمہ داری عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کتاب کے پروف کسی نے بھی پڑھے ہوں اس غلطی کی ذمہ داری سراسر مجھ پر ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں ۱۹۰۹ء کی جگہ صحیح تاریخ ۱۹۰۵ء درج کر دی جائے گی۔ ایسے اس تھیس کی کہانی خاصی طویل ہے دراصل یہ علامہ اقبال کا ڈسرٹیشن ہے جو انھوں نے بی۔اے کیمرج کیلئے لکھا یہ روداد پھر کسی موقعہ پر سنائی جائے گی۔

جموں یونیورسٹی جموں
۳۱ جولائی ۱۹۷۸ء

شاہد احمد دہلوی۔

آزاد اردو کے ان شاعروں میں جو تقسیم کے بعد ابھرے۔ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اصل میں تقسیم سے ان کے دل کو جو چوٹ لگی اسی نے انہیں بڑا شاعر بنا دیا۔ وطن کی یادوں نے جس درد و غم کو ابھارا وہ غزلوں کی قالب میں ڈھل کر اعلیٰ شاعری بن گیا۔ اردو کی غنائی شاعری کی روایت میں میر کا غم بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر آزاد کا غم غم دوراں ہے جو غم جاناں کا جامہ پہن کر سامنے آتا ہے۔

("ساقی" کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء)

ڈاکٹر تہمینہ اختر ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی
دوبئی (متحدہ عرب امارات)

فکر اقبال کے بعض اہم پہلو

"فکر اقبال کے بعض اہم پہلو" پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تازہ ترین کتاب ہے۔ اس سے قبل پروفیسر آزاد اقبال اور اقبالیات کے متعلق نو یا دس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس میں اور ان کی پہلی تمام کتابوں میں فرق یہ ہے کہ اس سے قبل لکھی ہوئی تمام کتابیں تصانیف ہیں اور یہ کتاب تالیف کی ذیل میں آتی ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ جو چھ ابواب پر مشتمل ہے ایک طرح سے کتاب کی تمہید یا ابتدائیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ اقبال کے متعلق جو بیس مقالات پر مشتمل ہے اس حصے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشمولہ تمام مقالات پاکستانی اہلِ قلم حضرات کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

کتاب کے مرتب جگن ناتھ آزاد نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اس کتاب میں اقبال پر صرف پاکستانی مصنفین کے مقالات کیوں شامل کئے گئے۔ دیباچے میں لکھا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے علمی اور ادبی حلقوں کا ایک دوسرے کے کام سے اور بالخصوص اقبالیات پر کام سے متعلق (جو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ

یرات ہے ابے [illegible] سن بات نہیں۔ زیرِ نظر کتاب اس دھندلی تصویر کے ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش ہے۔ اقبال پر پاکستان میں جو کام ہو رہا ہے ایک جھلک اس کتاب "فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو" میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔۔۔۔۔۔

اپنی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر آزاد لکھتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ممکن ہے ہم میں سے اکثر حضرات مصنفین پاکستان کے ان مقالات میں مندرج خیالات و افکار سے متفق نہ ہوں لیکن یہ کوئی ایسی وجہ نہیں کہ ہم ان مصنفین کے افکار پر غور کرنے سے انکار کر دیں۔ اقبال ایک شاعر فلسفی یا فلسفی شاعر تھے اور فلسفے میں اختلافاتِ نظریات کی ہر قدم پر گنجائش ہوتی ہے۔ اقبال نے خود IN ISLAM
THE RECONSTUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT
میں لکھا ہے کہ فلسفے میں قطعیت نام کی کوئی شے نہیں۔ اسی طرح اقبال کے سیاسی افکار کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر آزاد لکھتے ہیں" دوسری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ اقبال کے کلام کا خاصا حصہ سیاسیات سے متعلق ہے اور فلسفے کی طرح سیاسیات بھی ہمیشہ سے ایک متنازعہ فیہ موضوع چلا آرہا ہے اس لئے اقبال کے کسی سیاسی نظریئے کی تاویل میں بھی اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ سلسلہ بحث و تحقیص کے ذریعے سے آگے چل سکتا ہے اور ادب میں اس کی اجازت ہے۔ ہاں جس چیز کی اجازت نہیں ہے وہ کج بحثی ہے۔ اور اقبال یا کسی بھی علمی یا ادبی موضوع پر بات چیت کرتے وقت ہمیں اس سے گریز لازم ہے۔

دراصل اس بحث میں آزاد نے اس مسئلے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں اقبال پر اختلاف رائے کے باعث اکثر نقادانِ کلامِ اقبال کے سامنے آتا رہتا ہے۔ اقبال کے متعلق جو کچھ پاکستان میں لکھا جا رہا ہے اس سے اہلِ ہندوستان بڑی حد تک بے خبر ہیں اور جو کچھ ہندوستان میں لکھا جا رہا ہے اس سے اہلِ پاکستان بڑی حد تک نا آشنا ہیں۔ آزاد کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے (اور اس سے اختلاف کی گنجائش شاید کم ہی ہو) کہ جب تک اقبال پر اہلِ پاکستان کی تحریریں اہلِ

ہندوستان کے سامنے اور اہلِ ہندوستان کی تحریریں اہلِ پاکستان کے سامنے نہیں آئیں گی اس وقت تک اس موضوع پر بحث کا صحیح خطوط پر چلنا دشوار ہے آزاد اس ضمن میں ادبی اختلافات کو پوری اہمیت دیتے ہیں اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> جہاں تک میرا تعلق ہے اس محفل میں شریک ہونے والے مقالہ نگار حضرات کے بعض خیالات سے مجھے اتفاق ہے اور بعض خیالات سے میں متفق نہیں ہوں لیکن جن خیالات سے میں متفق نہیں ہوں ان کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے متعلق بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رہے اس لئے نہیں کہ اتفاق رائے کی صورت نکل سکے بلکہ اس لئے کہ دماغوں کی کھڑکیاں کھلی رہیں اور فکر و نظر کے قافلے آگے بڑھتے رہیں۔

شاید یہی سبب ہے کہ آزاد نے اپنی اس کتاب کو جلد اول کہا ہے۔ غالباً وہ اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اس امر کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکیں کہ اقبال کے متعلق پاکستانی اور ہندوستانی ادیبوں کی تحریریں جتنی زیادہ تعداد میں ایک دوسرے کے سامنے آئیں گی اتنا ہی گرد آلود مطلع صاف ہوتا چلا جائے گا اور فکرِ اقبال کی روشنی سے دلوں کے آئینے منور ہوتے چلے جائیں گے۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے یہ کتاب اقبال کے فکر سے متعلق ہے اور اس میں پاکستان کے نامور اہلِ قلم نے اقبال کے فکر اور فلسفے کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے اسی سلسلے میں چند عنوانات سے یہ واضح ہو سکے گا کہ یہ کتاب فکرِ اقبال کے کن پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ مثلاً نقدِ اقبال کا تجزیاتی مطالعہ، مسجدِ قرطبہ، اقبال کا فلسفۂ دیر و حرم، علامہ اقبال اور خودی، اقبال اور عقلیت پسندی، علامہ اقبال کا نظریہ قانون، اقبال کا تصورِ عشق، اقبال اور جمہوریت، تصورِ ریاست اقبال کی نظر میں، جاوید نامہ کے معارف و بصائر، علامہ اقبال کے کلام، نظریۂ تعلیم اقبال کی اجتہادی کاوشیں اور فکرِ اقبال کے بنیادی عناصر وغیرہ

ان مقالات کے مصنفین بالترتیب ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، نصیر احمد ناصر، سید قدرت نقوی، حکیم محمود رضوی، غبار یاور، عثمان علیخان، رحیم بخش شاہین، عبداللطیف سیٹھی، پروفیسر محمد ظہیر الدین صدیقی، محمد حنیف اعوان، محمود رضوی، اور جسٹس قدیر الدین احمد ایسے نامور اہلِ قلم ہیں جن کے مطالعۂ اقبال میں ژرف نگاہی اور بصیرت ایک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اس کتاب کا پہلا حصہ جو چھ مقالات پر مشتمل ہے ایک طرح سے تمہید یا ابتدائیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چھ مقالات اپنے اندر ایک جہانِ معنی لئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی بدولت اقبالیات کے بعض ایسے پہلو اور مباحث ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ جو اس کتاب کے علاوہ شاید اور کہیں نظر نہ آئیں مثلاً جگن ناتھ آزاد کے مذکورہ دیباچے کے بعد ملک کے نامور شاعر اور نقاد علی سردار جعفری نے ہندوستان میں منعقدہ جشنِ اقبال (۱۹۳۸ء) کی روداد اس بھرپور انداز سے سنائی ہے کہ اس پر "افسانہ آں شبے کہ بیاد گذشت" کا گماں ہوتا ہے۔ اس کے بعد جگن ناتھ آزاد کا مضمون ہے۔ "اقبال عالمی کانگرس لاہور، (۱۹۷۷ء) گویا ایک اقبال اسکالر نے اگر ہندوستان کے جشنِ اقبال کی داستان سنا کر تصویر کا ایک پہلو ہمارے سامنے رکھا ہے تو دوسرے اقبال اسکالر نے پاکستان کے جشنِ اقبال کی داستان سنا کر اس تصویر کو مکمل کر دیا ہے۔
جگن ناتھ آزاد کا وطن مالوف ہے اور اقبال کا شاعرِ محبوب۔ اور جب ہم جگن ناتھ آزاد کی لکھی ہوئی لاہور میں جشنِ اقبال کی یہ روداد پڑھتے ہیں تو بے اختیار غالب کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

کتاب کا چوتھا باب بھی اس موضوع پر ہے اور اس کا عنوان ہے "اقبال بین الاقوامی کانگرس لاہور" یہ ہندوستان کے مشہور محقق و مورخ سید صباح الدین عبدالرحمن کا ایک مبسوط مقالہ ہے جس میں اس بین الاقوامی کانگرس چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی درج ہے اگر اقبال عالمی کانگرس لاہور کے متعلق پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مقالہ ادبی شگفتگی کا شاہکار

ہے تو اسی موضوع پر سید صباح الدین عبدالرحمن کا مضمون علمی بصیرت سے مالامال ہے
آزاد کی تحریر کو اگر ہم بجا طور پر اردو نثر کا اعلیٰ نمونہ قرار دے سکتے ہیں تو صباح الدین عبد
الرحمن کے مضمون کو بلا تامل تاریخی دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے جو اس کانگرس کے
متعلق تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کے لئے ایک چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پانچواں باب پروفیسر آزاد کا ایک انٹرویو ہے جو ان سے دوسری نگر ٹائمز کے
ایڈیٹر صوفی محمد غلام نے لیا تھا۔ بظاہر تو یہ انٹرویو اقبال بین الاقوامی کانگرس لاہور ہی کے
متعلق ہے لیکن صوفی غلام محمد کے پے در پے سوالات جگن ناتھ آزاد کو آج سے پینتیس
چالیس برس پہلے کے لاہور اور راولپنڈی میں لے گئے ہیں اور آزاد اس کتاب ماضی کی
ورق گردانی کرتے ہیں تو نہ جانے تاریخ ادب اردو کے کتنے ہی غیر تحریر شدہ ابواب
اور کتنے ہی بھولے بسرے کردار ہماری نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

چھٹا باب علی سردار جعفری کے سفر پاکستان کے تاثرات پر مبنی ہے۔ اور
یہ بھی دراصل ایک انٹرویو ہے جو احسن علی مرزا نے سردار جعفری سے لیا ہے ادبیات
معاشیات اور سیاسیات کا تجربہ کرنے میں علی سردار جعفری کا جواب نہیں اور ان کی
روداد سفر پاکستان اسی تجربے ہی کی ایک داستان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جعفری
کی سیاست آشنا اور باریک بین نگاہوں نے اپنے چند روز کے سفر میں پاکستان
کی زندگی سے قریباً ہر پہلو کا مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ مطالعہ ان کے ایک آدھ گھنٹے کے
انٹرویو میں سمٹ آیا ہے جو انھوں نے احسن علی مرزا کو دیا تھا۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ جگن ناتھ آزاد اور علی سردار جعفری
کے ذکر پاکستان میں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے آزاد لاہور اور راولپنڈی کا ذکر کرتے
ہوئے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان کا سارا علم، سارا فلسفہ جذبات کی
نذر ہوتا نظر آتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ماضی میں گم ہو کر کسی خواب
کی روداد سنا رہے ہیں اور وہ بھی خواب آفریں انداز سے لیکن سردار جب سفر
پاکستان کی روداد سناتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ ان کا انداز بیان جذباتی نہیں ہوتے

پاتا لیکن یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ ان کی نگاہیں اس وقت آنے والے دور پر مرکوز ہیں
"فکر اقبال کے بعض اہم پہلو" کا یہ ابتدائی حصہ جو ایک سو سے زیادہ صفحات
پر مشتمل ہے۔ انتہائی دلچسپ ہے اور اول سے آخر تک اس پر دلکش ناول کا گمان
ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے علمی مباحث سے لبریز ہے۔ گویا
کتاب کا حصۂ اول اگر اقبالیات کی ایک تصویر جمال ہے تو دوسرا حصہ تصویر جلال ہے
یہ دونوں حصے مل کر ہمارے سامنے وہ جہانِ تفکر پیش کرتے ہیں جسے ہم فکرِ اقبال کے
نام سے موسوم کرتے ہیں۔

"فکر اقبال کے بعض اہم پہلو" جہاں ایک عام قاری بالخصوص فکر اقبال کے
مطالعے سے دلچسپی لینے والے قاری کے لئے ایک اہم کتاب ہے۔ وہاں یونیورسٹیوں
کے اساتذہ اور طلبہ کیلئے بھی اس کی اہمیت کم نہیں بالخصوص ان طلبہ کے لئے جو فکرِ اقبال کا
گہرائی میں جا کے مطالعہ کرنے کے آرزومند ہوں۔۔

جنوری ۱۹۸۴ء

رفیع صاحب کے مزار پر

ہندوستان کے ایک عظیم سپوت کی موت پر جگن ناتھ آزاد کے
خونچکاں تاثرات کا مرقع جو "ز دل خیزد بہ دل ریزد" کی منھ بولتی تصویر ہے
مدت ہوئی مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے جگن ناتھ آزاد کے بارے
لکھا تھا کہ آزاد کے غمِ دل نے مرثیے کی روایت میں ایک گراں بہا اضافہ
کیا ہے۔ مولانا نے یہ رائے مرثیے کے بارے میں دی تھی جو "بیکراں"
میں شامل تھی۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم کا مرثیہ مولانا صلاح الدین احمد کی گراں
قدر رائے کی ایک تائیدِ مزید ہے۔

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی

فرید احمد برکاتی
شعبۂ اردو فارسی راجستھان یونیورسٹی
جے پور۔

اقبالیات پر
راجستھان یونیورسٹی میں توسیعی خطبات

۷ رسے ۱۲ ر جنوری ۱۹۸۱ء تک شعبۂ اردو راجستھان یونیورسٹی جے پور کے زیر اہتمام اقبال پر پانچ توسیعی خطبات ہوئے۔ معروف ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد (صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی) یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اقبال نرائن کی دعوت پر جے پور تشریف لائے تھے۔

خطبات کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا تھا وہ تھے اقبال کا نظریہ زمان اقبال کا نظریہ انسان، اقبال کی اصلاحیں اپنے کلام میں اور اقبال اور پریم چند اور اقبال مسلمانوں کا شاعر۔

۷ رجنوری کو ۱۱ بجے دن کو اس سلسلہ کا پہلا خطبہ "اقبال اور پریم چند" کے موضوع پر ہوا۔ شعبۂ اردو کے بزرگ استاد ڈاکٹر محمد علی زیدی نے اس نشست کی صدارت کی۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر فضل امام نے آزاد صاحب کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ اردو دنیا میں ایک قابل قدر شاعر اور اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ اقبالیات پر آپ کی قیمتی تصانیف اور مضامین سے ہندوستان میں اقبالیات کے احیاء میں بڑی مدد ملی ہے اور اس فضا کو بدلنے میں معاون ثابت ہوئے جو تقسیم ہند کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ اقبالیات

پر آپ کی مرتب کردہ نمائش ایک بڑا کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں آپ کا ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں ایک مقام ہے اقبالیات کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست بھی مرتب کی جائے تو اس میں آزاد صاحب کے کارناموں کا ذکر ناگزیر ہوگا۔ پروفیسر آزاد کے اکتسابات و انکشافات میں جو وزن و وقار ہوتا ہے وہ ان کے موروثی ادبی ماحول کا نتیجہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اقبالیات توسیعی خطبات کا جو خواب ہم نے ایک سال پہلے دیکھا تھا وہ آج ۱۹۸۲ء میں شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب اقبال نرائن کی توجہ اور دلچسپی سے یہ پروگرام ممکن ہو سکا ہے۔

اس نشست کے کنوینر ڈاکٹر مسز روشن اختر کاظمی نے آزاد صاحب کو خطبہ کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ آزاد صاحب کی شخصیت کئی پہلوؤں کی حامل ہے ان کی شاعرانہ حیثیت کچھ کم اہم نہیں۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالہ طویل نظموں کے باب میں آپ کی گرانقدر تخلیقات سے بحث کی ہے!

پروفیسر آزاد نے وائس چانسلر صاحب اور صدر شعبۂ اردو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک ۱۹۸۱ء میں مجھے اس خدمت کیلئے مدعو کیا گیا تھا لیکن تقریباً ایک سال بعد مجھے یہاں حاضری کا موقع نصیب ہوا ہے

تا دو نیزہ رسد و عدہ بہ کار کہ ہست
تا زحد بگزراند دستان نکشاید
سود ے نہ ہر یاری ہر بار کہ ہست
رگل منشار دامن ہر خار کہ ہست

در میانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر فضل امام نے میرے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ ان کی دوستی اور محبت ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ اقبال پر میرے خیال میں صحیح معنوں میں کام اب شروع ہوا ہے۔ یوں تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اقبال کی تلاش تو اب شروع ہوئی ہے۔ اقبالیات کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ کام ہے جو ان کی زندگی ہی میں

شروع ہو چکا تھا۔ مثلاً محمد الدین فوق کا کام A VOICE FROM THE EAST
وغیرہ۔ پھر اقبال کے انتقال کے بعد اور اب اقبال صدی کے موقع پر جو کچھ لکھا گیا اور لکھا جا
رہا ہے۔ لیکن اب تک اقبال کو بحیثیت شاعر کے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ اقبال
ایک شاعر پہلے ہیں اور باقی سب کچھ بعد میں آج کے موضوع سے متعلق آپ نے فرمایا کہ
اقبال اور پریم چند ایک نیا موضوع ہے اس لئے میری اس کوشش کو مکمل نہ سمجھا جائے
پہلی بار جس موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اس میں فرد گذاشتوں کا ہونا قدرتی بات ہے

پروفیسر آزاد نے اپنے خطبے میں اقبال اور پریم چند کی ان ذہنی مماثلتوں کا ذکر کیا
جو ایک باخبر، حساس اور باشعور ذہن والے ادیب و شاعر کی تخلیقات میں عصری زندگی اور
سماجی و سیاسی تحریکوں سے اثر پذیری کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے عوامی استحصال اور قومی
معیشت پر غیر ملکی چیرہ دستیوں احساس اور انعکاس پریم چند اور اقبال دونوں کے یہاں
موجود ہے اور بعض حیثیتوں سے دونوں کا ردعمل یکساں محسوس ہوتا ہے اگرچہ پروفیسر آزاد
نے بار بار اس بات کی وضاحت کی کہ ایک شاعر اور افسانہ نگار میں فکری سطح پر بھی مماثلتیں
تلاش کرنا آسان نہیں کیونکہ دونوں کی اپروچ میں بڑا فرق ہوتا ہے مماثلتوں کا ذکر کرتے
ہوئے انھوں نے کہا کہ اقبال اور پریم چند میں ایک بات اور بھی مشترک ہے اور وہ یہ ہے
کہ دونوں پر فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا جا رہا ہے اور یہ الزام اقبال کے تعلق سے بھی غلط ہے
اور پریم چند کے تعلق سے بھی۔

سوالات کے وقفہ میں ڈاکٹر فیروز احمد (لکچرار شعبۂ اردو نے) سوال کیا کہ جیسا کہ آپ
نے خطبے کے آخر میں فرمایا کہ اس موضوع پر ابھی غور و خوض کی بہت گنجائش ہے اور اسے
مکمل نہیں کہا جا سکتا پھر بھی میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ "گودان" کا ایک کردار گوبر جو شہری
زندگی کا عادی ہے۔ گاؤں واپس آکر ہر چیز پر تنقید کرتا ہے کیا ایسی کوئی چیز ہمیں اقبال کے
یہاں مل سکتی ہے۔

پروفیسر آزاد نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ایک شاعر
اور افسانہ نگار میں مماثلتیں تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ اقبال کے یہاں پلاٹ کی شکل میں

ایسی مماثلت تلاش نہیں کی جاسکتی۔ ہاں ایسے موضوعات پر پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے دوران اقبال کی تقاریر میں فکری مماثلتیں ضرور تلاش کی جاسکتی ہیں۔ شاعری میں تو اقبال نے جزئیات و واقعات کو نظر انداز کیا ہے۔ ان کے کلام میں آفاقیت حاوی ہے۔ مثلاً آپ کو یاد ہوگا امانتِ رسولؐ کے نتیجہ میں لاہور اور کراچی میں فسادات ہوئے تھے، ضرب کلیم میں اس زمانہ کی یادگار ایک نظم ہے

؎ نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور۔

لیکن نظم میں لاہور یا کراچی کے فسادات کا کوئی حوالہ نہیں اگرچہ اس نظم کا محرک یہی حادثہ ہے۔ ڈاکٹر دیریندر صاحب (شعبہ ہندی) نے خطبہ میں مذکور ایک خط کے اقتباس کے سلسلے میں سوال کیا جو اقبال نے مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ آزاد صاحب نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اس اقتباس سے یہی بتانا مقصود تھا کہ عام خیال کے خلاف اقبال کیا کہہ رہے ہیں۔ اور آپ نے اس اقتباس کو پھر پڑھ کر سنایا۔

ڈاکٹر محمد علی زیدی نے صدارتی تقریر میں خطبے کے موضوع کو سراہا اور اسے قابلِ ستائش کوشش قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ میں خود حیران تھا کہ ایک شاعر اور افسانہ نگار میں وہ کیا قدر مشترک ہوسکتی ہے لیکن آپ کے جامع مقالہ نے اقبالیات کے موضوع پر ایک نیا گوشہ پیدا کر دیا ہے۔ آپ نے معاشی استحصال اور سرمایہ پرستی کے خلاف اقبال کے نظریہ کی وضاحت کی اور ڈاکٹر دیریندر کے سوال پر روشنی ڈالی۔

۲۸ جنوری کے خطبے کا موضوع تھا اقبال کی اصلاحیں اپنے کلام میں" یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اقبال نرائن صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی دن حاضر ہوں گے مصروفیات اور انتظامی مسائل کے باوجود آج انھوں نے اس وعدہ کا ایفا کیا جو ان کی اردو دوستی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے پاس خاطر کا واضح ثبوت تھا۔ ان کی یہ حاضری، مشروط تھی۔ کہ اگر درمیان سے اٹھ کر جانا پڑے تو انہیں معذور سمجھا جائے بشمول معزز مہمان سبھی نے ان کی اس نشست کی صدارت کو ممنونیت اور فراخدلی سے قبول کیا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر فضل امام صاحب نے وائس چانسلر صاحب کی تشریف ارزانی کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے ان کی عنایات اور شعبۂ اردو کی تعمیر و ترقی میں ان کی خصوصی توجہ اور دلچسپی کا ذکر کیا کہ آپ نے شعبۂ اردو کے سالانہ "ادبی مجلہ" کے اجرا کے لئے ایک خطیر رقم مقرر فرمائی اور مختلف قسم کے تعلیمی و تدریسی پروگراموں کے انعقاد کے لئے ہر ممکن مدد فرمائی ہے امید ہے کہ آپ کی یہ محبت اور شعبہ پر شفقت آئندہ بھی باقی رہے گی۔

ڈاکٹر فیروز احمد صاحب (کنوینر) نے آج کے خطبے کا موضوع بتاتے ہوئے کہا۔ آج کا خطبہ اقبال کے بدلتے ہوئے تصور فن اور ان کے فکری اور فنی ارتقا کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ فنکار اپنی تخلیقات کو آخری شکل دینے تک حک و اصلاح کا عمل جاری رکھتا ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر یہ ایک طویل عمل ہوتا ہے جس کا بڑا حصہ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اقبال نے بھی دوسرے بڑے شاعروں میر و غالب کی طرح اپنے کلام پر حک و اصلاح کا دروازہ کھلا رکھا۔ اقبال کو ایک مفکر کی حیثیت سے تو شروع ہی سے پیش کیا جاتا رہا ہے کہ وہ ایک شاعر پہلے ہیں اور فلسفی بعد میں۔ اقبال کو بحیثیت شاعر و فن کار پیش کرنے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مرتبہ اقبال شناسوں میں بہت بلند ہے۔

خطبہ شروع کرنے سے قبل آزاد صاحب نے وائس چانسلر صاحب کی دعوت ان کی تشریف آوری اور اس نشست کی صدارت قبول فرمانے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ یہ آپ کی علم دوستی اور ادب نوازی کا بین ثبوت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کل کا خطبہ اقبال اور پریم چند پر تھا جس میں دونوں کی فکری مماثلتوں کی جستجو کی گئی تھی اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ غلام قومیں جب آزادی سے ہمکنار ہوتی ہیں تو وہ اپنے ماضی سے قومی و ملی تعمیر کیلئے توشہ اور زادِ سفر فراہم کرتی ہیں۔ قوم کے باشعور افراد اس طرح خود اپنا اور اپنی قوم کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرتے ہیں۔ اقبال اور پریم چند دونوں کے یہاں یہی جذبہ کار فرما نظر آتا ہے یہ قدامت پرستی یا رجعت پسندی نہیں بلکہ قومی و مذہبی اقدار کی بازیافت اور اپنی جڑوں کی تلاش ہے۔

پروفیسر آزاد نے اقبال کی فارسی اور اردو کلام میں ان کی ترمیموں اور اصلاحوں کا تاریخی تسلسل کے ساتھ جائزہ لیا اور ان کے خطوط اور مضامین سے حوالے دیئے۔ اقبال نے

اپنے معاصرین کے مشوروں اور اعتراضات کو بے مثال وسیع القلبی اور قدردانی کی نگاہ سے دیکھا اور ان کے پیش نظر اپنے کلام میں ترمیم و اصلاح کی یا غور و خوض کے بعد ان کو مسترد کر دیا۔ یہ اصلاحیں فکری اور فنی دونوں نوعیتوں کی تھیں۔ پروفیسر آزاد نے ان اصلاحوں کا خاص طور سے جائزہ لیا جو اقبال نے اپنے کلام میں ایجاز و اختصار یا تاثیر و توضیح میں اضافہ کی غرض سے کی ہیں۔ آزاد صاحب نے ان اصلاحوں کی نوعیت اور ان کی علت بیان کرنے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اور ان سے اقبال کے مذاقِ شعری میں مسلسل ارتقاء اور فنی رچاؤ کی جانب ان کے رجحان کو بخوبی واضح کیا اور بعض اصلاحوں سے قبل کے کلام کی عمدگی کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس نکتے کو بڑی وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا کہ اقبال کے ان دعووں کے علی الرغم جو ان کے متعدد اشعار میں موجود ہیں مثلاً۔

؎ نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست

یا میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ۔ اور خوردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند۔ وغیرہ۔ انہیں طرزِ ادا اور لسانی و فنی باریکیوں کا کس قدر خیال رہتا تھا۔

آزاد صاحب نے اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا اور وہ یہ ہے جب مثنوی رموزِ بے خودی چھپی تو جسٹس دین محمد نے اس کے مطالعے کے بعد اقبال سے کہا میری تو یہ ساری مثنوی نہایت عمدہ اور معیاری ہے لیکن اس شعر کا تو جواب نہیں

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

اقبال نے جواب دیا۔ دین محمد! یہ میری چالیسویں کوشش کا نتیجہ ہے۔ آزاد صاحب نے اپنے اس جائزۂ اصلاحات میں اسرار و رموز، بانگِ درا، ضربِ کلیم بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز وغیرہ سے حوالے دیئے اور فارسی حوالوں کا ترجمہ خاص طور سے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے سنایا۔ جس سے طلبہ کی توجہ تمام تر مقالے کی طرف مبذول رہی۔ آخر میں انھوں نے وضاحت کی کہ اس سے اقبال کے فنی اور فکری ارتقا کو پیش کرنا

مقصود تھا انہوں نے اس مقالے سے اس اصول کا بھی استنباط کیا کہ فکری و فنی اعتبار
سے ہم صرف اقبال کے اصلاح و ترمیم شدہ کلام ہی کو بطور سند پیش کر سکتے ہیں۔
سوالات کے وقفے میں ایک سوال کے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اقبال
اور جوش اردو کے دو قادرالکلام شاعر ہیں جوش یہ خوب جانتے ہیں کہ انہیں کیا کہنا
ہے۔ لیکن اقبال یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں کیا نہیں کہنا ہے۔

وائس چانسلر صاحب نے اپنی صدارتی تقدیر میں پروفیسر آزاد صاحب اور شعبۂ
اردو کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ میرا مطالعہ اقبال پر بہت سرسری سا ہے لیکن اس خطبے
سے میں بہت مستفید اور محظوظ ہوا ہوں۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال خود
اپنے کلام کے کتنے اچھے کریٹیک (ناقد) تھے اور یہ بھی کہ خود آزاد صاحب اقبالیات کے
کتنے اچھے ناقد ہیں میں بھی کبھی اردو اور فارسی کا طالب علم رہا ہوں۔ لیکن یہ بہت
پرانی بات ہے۔ میرا موضوع تدریس بھی ادب نہیں بلکہ سیاست ہے۔ اور اب تو کچھ
عرصہ سے میرا سروکار صرف انتظامیہ امور سے رہ گیا ہے۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی ایسے
پروگراموں میں شرکت کا بہانہ ڈھونڈھ لیتا ہوں۔ شاید اپنی انتظامی ذمہ داریوں سے
وقتی طور سے فرار حاصل کرنے کیلئے یا شاید اس لئے کہ بنیادی طور پر میرا پیشہ تعلیمی ہے
جو مجھے ایسے مشاغل کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ وائس چانسلر صاحب نے اپنی دلنواز
اور پروقار مسکراہٹ کے ساتھ جو ان کی شخصیت کا اہم حصہ ہے بھی شرکا اور آزاد
صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

پروگرام کے مطابق ۹ جنوری کا خطبہ "اقبال کے نظریۂ زماں" پر ہونا تھا ایک
خالص فلسفیانہ اور علمی موضوع اور آج کیمپس پر یونیورسٹی کے طلبہ کی ہڑتال کی وجہ سے صورت
حال بہت امید افزا نہیں تھی کہ طلبہ کی ناکہ بندی میں سامعین کس طرح پہونچ سکیں گے
لیکن مقررہ وقت (۲ بجے دن) سے تھوڑی ہی دیر بعد ہیومے نیٹز بلاک کا لاؤنج جو
عرف عام میں کمرہ نمبر ۵ کہلاتا ہے۔ خاصا بھرا پرا نظر آنے لگا۔ یونیورسٹی سے باہر کے شرکا
میں ستر سالہ بزرگ جناب بچھمی نرائن فارغ تلمید حضرت سیماب اکبر آبادی اور ریٹائرڈ

آئی سی. ایس ... ماب کھیم چند ماتھر کی موجودگی قابلِ رشک بھی تھی اور حوصلہ افزا بھی۔

اس نشست کے کنوینر فرید احمد برکاتی (استاد شعبہ اردو) نے تاخیر سے پروگرام شروع ہونے کی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کل جو خطبہ آپ نے سماعت فرمایا تھا وہ ایک خالص ادبی موضوع پر تھا جس کے ذریعہ ہم نے اقبال کے مذاق شعری کے ارتقا اور فنی نزاکتوں سے اقبال کے اعتنا کا مطالعہ کیا یہ خطبہ اس نظریے کے خلاف کافی و شافی بنیاد فراہم کرتا ہے کہ اقبال کے یہاں فن یا شاعری کو محض ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے یہ فکر انگیز انکشاف بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اقبال کی وہ مثنوی جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں کہ

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست۔

اسی کا ایک شعر اقبال کی چالیسوں کوشش کا نتیجہ تھا۔ آزاد صاحب نے بجا فرمایا تھا کہ فکر کی اہمیت اپنی جگہ مسلم لیکن اقبال اپنے فکر و فن سے ،، دلِ مرداں،، شکار کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے فنی پختگی ضروری تھی۔ آج کا موضوع خالص فلسفیانہ ہے۔ فلسفہ کا وہ نازک مسئلہ ہے جس نے عہدِ یونان سے لے کر دورِ حاضر تک کے حکما اور فلاسفہ کو مشغول رکھا بالآخر موجودہ عہد میں یہ ایک انقلاب انگیز سائنسی فلسفہ جو تھی سمت پر منتج ہوا اقبال کو مسئلہ زماں سے خاص شغف تھا اور ان کے نظامِ فکر میں اسے اہم اور کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس موضوع پر فکرِ اقبال کے کچھ نئے گوشے ہمارے سامنے آئیں گے۔

پروفیسر آزاد صاحب نے اپنے خطبے کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا جیسا کہ ابھی میرے عزیز نے کہا یہ ایک خالص فلسفیانہ اور علمی موضوع ہے اور اس کا تعلق ایک ادق مسئلے سے ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ یہ مقالہ فلسفے کی اصطلاحات سے گراں بار نہ ہو اسی لئے میں نے عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر آزاد نے اپنے اس طویل مقالے کے بہت سے حصے جو خالص فلسفیانہ مباحث پر مشتمل تھے۔ تنگیِ وقت کے پیشِ نظر حذف کر کے اسے مختصر کر کے پڑھا۔ انھوں نے مسئلہ زماں پر معاصر فلاسفہ اور قدیم فلاسفہ سے اقبال کے استفادہ کی نشاندہی کی اور خود اقبال کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ آپ نے اس موضوع پر ماہرینِ اقبالیات کی آرا کا استقصا کرتے ہوئے

اس بات پر زور دیا کہ اس وقت سے ہے کہ جب کہ اقبال نے امام شافعی کے قول الوقت سیف
کی شاعرانہ اور فلسفیانہ تاویل و توجیہہ کی ہے مسئلہ زمان پر اقبال کا نقطۂ نظر تبدیل ہوتا رہا۔ اقبال نے
اپنے نظریے کی بنیاد حدیث لی جامع اللہ اور حدیث لا تسبوا الدھر پر رکھی تھی لیکن
اس میں ارتقا تبدیل ہوئی ہے۔ کیونکہ آخری دور کے کلام میں اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ نہ ہے
زماں نہ ہے مکاں لا الٰہ الا اللہ تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کو خدا کا مترادف نہیں
بلکہ شیونِ الٰہیہ میں سے سمجھتے ہیں۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ (لا تسبوا
الدھر جسے حدیث کہا جاتا ہے) کے بارے میں جب یہ تحقیق ان کے علم میں آئی ہوگی کہ یہ
حدیثِ قدسی ہے اور اس کے الفاظ اور ترتیب الفاظ وہ نہیں جو اقبال کے علم میں آئی تھی تو انھوں
نے اپنے نقطۂ نظر میں ترمیم کی ہوگی کیوں کہ جیسا کہ میں نے کل کے مقالہ میں عرض کیا تھا اقبال
اپنے افکار و اشعار پر بار بار نظرِ ثانی کرتے رہتے تھے۔ آزاد صاحب نے فرمایا کہ اس قسم کے
موضوعات کے باب میں اقبال پر تنقید کرتے ہوئے اقبال کے ناقدین کا انداز یا تو خالص
منطقی ہو جاتا ہے یا محض شاعرانہ۔ اقبال پر تنقید کرتے ہوئے منطق کے ساتھ ساتھ وجدان
کو بھی رہنما بنانا چاہئے۔ اس حیثیت سے آپ نے پروفیسر عالم خوندمیری کی ایروڈیٹ کو سراہا
اور ان کے مقالات کی بھی نشاندہی کی جہاں وہ خالص علمی اور منطقی انداز اختیار کر لیتے
ہیں۔

سوالات کے وقفے میں آپ نے ایک موقع پر فرمایا کہ یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ
اقبال کا نقطۂ نظر صحیح تھا یا غلط۔ نہ اس پر محاکمہ کرنا ہے بلکہ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کے افکار
اس مسئلہ پر کیا تھے۔ اور اس میں کیا ارتقا یا تبدیلی رونما ہوئی۔

اس نشست کے صدر جناب حکیم چند ماتھر جو شہر کے معروف اردو دوست بزرگ
اور پرانی قدروں کے امین ہیں درخواست کی گئی کہ اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔ صاحب
موصوف نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ ان خطبات کا اہتمام ایک مستحسن اور مفید قدم
ہے اور توقع ظاہر کی اس پروگرام سے راجستھان میں اقبال کے مطالعہ سے شغف بڑھے گا
اور ذوق و شوق پیدا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ اقبال ایک عظیم شاعر تھا اقبال کی شاعری سے

ہمیں اپنے فکر و عمل کی شمع روشن کرنی چاہئے۔ شعبۂ اردو اور جگن ناتھ آزاد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے موصوف نے اپنی تقریر ختم کی۔

۱۰ ؍ جنوری کا خطبۂ اقبال کے نظریۂ انسان پر تھا آج کا موضوع بھی نوعیت کے لحاظ سے علمی تھا اس نشست کی صدارت یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر جناب دیانگر (سابق پی وی سی) نے فرمائی شعبۂ اردو کے لکچرار جناب مدبر علی زیدی صاحب نے بحیثیت کنوینر آج کے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ کل جو مقالہ ہوا تھا وہ اقبال کے نظریۂ زمان پر ایک نہایت پر مغز اور فکر انگیز بحث تھی۔ آج کا عنوان "اقبال کا نظریۂ انسان" ہے میرے خیال میں نظریہ کے بجائے ہم اسے اقبال کا تصور انسان بھی کہہ سکتے ہیں "زمان" کی طرح اقبال نے انسان کا بھی ایک مخصوص تصور اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اب تک ہونے والے مقالات کے بارے میں مدبر علی زیدی صاحب نے فرمایا کہ ان مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت عالمانہ شان اور کھلے ذہن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں پروفیسر آزاد اپنی رائے کا اظہار کرنے سے قبل دیگر مصنفین کی آرا کو نہایت وسیع النظری اور احتیاط کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

خطبہ شروع کرتے ہوئے آزاد صاحب نے فرمایا کہ حضرات آج مجھے پھر معذرت کرنی پڑ رہی ہے کہ آج کا موضوع بھی خشک ہے لیکن جمعیت خاطر کا ایک پہلو اس میں یہ مضمر ہے کہ یہ مقالہ مختصر ہے پروفیسر صاحب موصوف نے اقبال کی شاعری خطبات اور دیگر حوالوں سے، ان کے عظمت آدم کے تصور کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے آپ نے ان کا فرق بھی واضح کیا۔ جو اقبال نے انسان کے لئے باعتبار مدارج ارتقائی استعمال کی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہبوطِ آدم کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ بائبل سے مختلف ہے فلاسفۂ اسلام کے برخلاف وہ ہبوطِ آدم کو سزا کے بجائے انعام تصور کرتے ہیں کیوں کہ یہ انسان ہی تھا جس نے مشیتِ الٰہی کی تکمیل کی یعنی اس کا وہ خرابہ آباد کیا جس کو آباد کرنے سے اس کے فرشتے بھی قاصر تھے۔ اس ضمن میں آپ نے بتایا کہ جنت اور جہنم اقبال کے نزدیک مقامات نہیں بلکہ کیفیتوں کا نام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اقبال کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر ہمیں نظر

آتا جس نے انسان کی عظمت اور اس کی اہمیت کو اس طرح پیش کیا ہو اقبال کی یہ انسان دوستی عدیم النظیر ہے وہ عظمت کے قائل ہیں اور روز ازل انسان کی تخلیق جس مقصد اعلیٰ کے تحت کی گئی تھی اسی پر اس کو فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک انسان ہی اس کائنات کا محور ہے۔

سوالات کے وقفے میں خود صاحب صدر نے چند سوالات کئے۔ اور یہ بھی کہا کہ یہ بات آزاد صاحب کے مقالے کے ذریعہ سے پہلی بار ہمارے سامنے آرہی ہے کہ اقبال کے نزدیک آدم کا جنت سے نکالا جانا آدم کے لئے سزا نہیں بلکہ انعام تھا۔ آزاد صاحب نے اقبال کے اس نظریئے کے زیادہ وضاحت سے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی یہ تاویل اکثر علمائے اسلام کی تاویل سے مختلف ہے۔ اور میرے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اقبال کی "تشکیل جدید" کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے کہا کہ یہ کتاب شائع نہ ہوتی تو اچھا تھا اور مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کہا تھا کہ اس میں بہت سی غیر اسلامی باتیں کہی گئی ہیں۔ خود اقبال نے اپنی اس کتاب کے بارے میں جو انگریزی زبان میں ہے کہا تھا کہ اگر یہ کتاب خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں چھپی ہوتی تو عالم اسلام میں تہلکہ برپا ہو جاتا۔

اقبال جس زمانہ میں یہ خطبات لکھ رہے تھے تو انہوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ آج کل میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں جس کا نام ہو گا UNDER STAND IT ISLAMS ! ان سب باتوں کی روشنی میں ہم یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اقبال نے ان خیالات کا اظہار پہلی بار کیا ہے اقبال نے جو نظریات پیش کئے وہ قرآن کی روشنی میں گویا ان کا اپنا نقطۂ نظر تھا۔ امام رازی نے بھی تو ایک نئی اور غیر روایتی تفسیر لکھی تھی۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ اقبال بھی تفسیر کا حق رکھتے تھے۔ آپ نے کہا کہ ملٹن اور دانتے گھوش کے بارے میں میرا مطالعہ نہیں ہے اس لئے میں اقبال کے تعلق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا

پروفیسر دیا کرشن صاحب نے صدارتی تقریر میں اقبال، ٹیگور اور ملٹن اور دانتے کے

تقابلی مطالعے کی ضرورت پر زور دیا اور اپنے سوالات کی وضاحت کی۔

۱۷ رجنوری کے خطبہ کا موضوع طے شدہ پروگرام سے قدرے مختلف تھا اقبال کی شاعری کا ہندوستانی پس منظر کے بجائے آج پروفیسر آزاد نے "اقبال مسلمانوں کا شاعر" کے استفہامیہ عنوان کے تحت خطبہ دیا۔ اس نشست کے کنوینر تھے ڈاکٹر محمد علی زیدی صاحب اور صدر شعبہ ڈاکٹر سید فضل امام رضوی صاحب صدارت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر زیدی نے آج کے موضوع کا تعارف کرتے ہوئے کہا کہ اس موضوع کی تجویز میں نے بطور خاص آزاد صاحب کے سامنے رکھی تھی میرے رفقائے شعبہ نے بھی اس کی تائید کی اور آزاد نے اسے بخوشی منظور فرمایا۔ یہ سوال خود بار بار میرے ذہن میں آیا ہے میں چاہتا تھا کہ آزاد صاحب سے پوچھوں کہ کیا اقبال صرف مسلمانوں ہی کا شاعر ہے ہمیں امید ہے کہ آزاد صاحب اس سوال پر جو اقبال کے سلسلے میں ایک اہم سوال ہے روشنی ڈالیں گے اور اس کا شافی جواب دیں گے دراصل اقبال کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور میرے خیال میں بعض وقت ایک پہلو دوسرے کو سمجھنے میں مدد دینے کے بجائے غلط فہمی کا باعث ہو جاتا ہے۔ زیدی صاحب نے یہاں اقبال کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی بات سے خوبصورتی کے ساتھ گریز کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے معزز مہمان کی شخصیت کے بھی کئی پہلو ہیں لیکن ہم محض ناقد ہی کی حیثیت سے ان کی شخصیت سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یعنی شاعرانہ پہلو بھی تو ہے کیا اچھا ہو کہ آج وہ ہمیں اپنے کلام سے بھی مستفید فرمائیں۔

آزاد صاحب نے اپنے خطبے میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام سے حوالے دے کر واضح کیا کہ اقبال کا ذہنی افق اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اسے مخصوص اور محدود تعصبات میں قید کر کے دیکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اقبال ایک بت شکن ہے جو ہر قسم کی عصبیت اور تنگ نظری پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اقبال برصغیر سے ابھرنے والی ایک آفاقی آواز تھی جس نے ہمارے فکر و فن کو متاثر کیا ہے۔ اقبال اگر مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اگر وہ ساآزاد ہندوستان میں ان کی مستقبل کی

طرف سے فکرمند تھے تو یہ ایک فطری بات تھی۔ لیکن اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے اور موضوعات کے کیف و کم پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں ہی کے بارے میں نہیں کہتے بلکہ برصغیر اور پورے ایشیا کی بات کرتے ہیں۔ اقبال نے اسی لئے انسان کی عظمت کے گیت گائے ہیں وہ انسان کو جس بلندی پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں اور جس طرح بار بار عظمت کا احساس دلانا چاہتے ہیں یہ بات کسی ہندوستانی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ انھوں نے انسان کے لئے مرد مومن مرد حق اور مرد کامل کی جو اصطلاحیں استعمال کیں وہ انسانی عظمت کے لئے ان کا آئیڈیل تھیں اور ان کا مفہوم اقبال کے یہاں متعین ہونے کے باوجود جب وہ گرونانک صاحب کے لئے یہ کہتے ہیں کہ

ع ہند کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے۔

تو ان کی وسعت قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال تو کافروں کی مسلم آئینی تک کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پروفیسر آزاد نے اقبال کی وسعت فکر اور آفاقی نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ اقبال مسلمانوں کا بھی شاعر ہے لیکن اس کا پیغام عام انسانیت کے لئے ہے۔ وہ انسان کے مستقبل کے لئے بحیثیت مجموعی سوچتا ہے اور یہ اس کا عقیدہ ہے کہ ایشیا کی تہذیبی اور مذہبی اقدار کے ذریعے مستقبل میں انسان کی قسمت سنواری جا سکتی ہے۔

سوالات کے وقفے میں ڈاکٹر فیروز احمد صاحب نے پوچھا۔ کلام اقبال سے ابھی آپ نے جو مثالیں اور تجزیہ پیش فرمایا ہے اس سے یہ بات کوئی واضح ہوتی ہے کہ اقبال تنہا مسلمانوں کا شاعر نہیں۔ لیکن میرے خیال میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو ایک غیر مسلم کے ذہن میں پھر بھی شبہات پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ مثلاً اقبال کے خط جناح صاحب کے نام یا ۱۹۳۲ء کا ان کا خطبۂ صدارت اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے آزاد صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑی دور کی بات ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں برطانوی حکومت کے غلام تھے لیکن مسلمانوں کے مسائل نازک تر ہے تھے اور اقبال اگر اس مسئلے کے حل کیلئے بے چین تھے تو کیا تعجب کی بات تھی مسلمانوں

کے ان مسائل کا حل دوسروں کے لئے بھی مفید ہوگا۔ اور پھر یہ ایک فطری بات بھی تھی کیوں کہ اگر کسی شخص کے گھر میں اس کی ماں بیمار ہو اور پڑوس کا کوئی فرد بھی بیمار ہو تو آپ ہی بتلایئے اسے اپنی ماں کی فکر زیادہ ہوگی یا پڑوسی کی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب نے دوسرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ بات بار بار عرض کی ہے کہ میں اقبال پر جو کچھ لکھتا ہوں اس کا مقصد ان کی وکالت کرنا نہیں ہے بلکہ نقد و تحقیق کی روشنی میں جن نتائج پر پہونچتا ہوں انہیں پیش کر دینا میرا کام ہے۔ جسے آپ خود دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کو بھی زور دیا کہ اقبال کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے ہمیں صرف انہی اشعار کو بطور سند پیش کرنا چاہیئے جو اقبال نے اصلاح و ترمیم کر کے باقی رکھے ہیں۔ فیروز احمد صاحب نے یہاں پھر ایک بار اپنے سوال کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ کیا اقبال کے خطوط بھی اس اصول کے پابند ہوں گے؟ آزاد صاحب کا جواب تھا کہ اقبال کے خطوط کا مطالعہ ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اقبال نے اپنے خطوط میں کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کی۔ مجھے یہاں آکر بہت مسرت ہوئی اور میں نے آپ حضرات کے درمیان بہت اچھا وقت گذارا اس وقت مجھے وہ شعر یاد آرہا ہے۔ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔ میں آپ سب کی محبت، خلوص اور پذیرائی کا بہت ممنون ہوں۔ آپ نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دے کر عزت بخشی۔

اس آخری نشست کے صدر ڈاکٹر فضل امام صاحب (صدر شعبہ) نے اپنی تقریر میں پروفیسر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کیا اور آج کے موضوع پر اپنے مخصوص خطیبانہ اور سحر کارانہ انداز میں محاکمہ کرتے ہوئے کہا کہ ادب ہو یا علم و فن کی کوئی شاخ افہام و تفہیم کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ ادب میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ فن کی اقدار بھی بدلتی ہیں اور افکار و نظریات میں تبدیلی آتی ہے۔ اقبال کے کلام اور افکار کی بہت سی شرحیں اور توجیہیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام صاحب نے فرمایا کہ اقبال نے اسلام کا لفظ اس کے وسیع تر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اقبال عظمتِ آدم کے قائل تھے

وہ انسان کو اس عظیم اور بلند ترین مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے جسے قرآن مجید میں لفظ
خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان کی نظر میں مشرق و
مغرب اور رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا وہی انسان مسلم کہلانے کا مستحق ہے جس میں
شرافتِ آدم اور عظمتِ آدم کا جوہر ہو اور وہی اقبال کا آئیڈیل بھی ہے۔ اقبال کی شاعری
دراصل "انسانم آرزوست" کی درد بھری پکار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے
اپنے فکر و فن کو مشرق و مغرب کے سرچشموں سے جلا دی اور ہر مکتب فکر سے خوشہ چینی کی
لیکن کسی ایک کو بالادستی جتانے کا حق نہیں دیا کیونکہ وہ خود ایک اہم نظامِ فکر کے مبلغ
تھے [illegible] ان کی آنکھ میں حجاز و نجف کا سرمہ تھا۔

صدارتی تقریر کے بعد سامعین کے اصرار پر آزاد صاحب نے اپنے چند تازہ شعر
مرحمت فرمائے اور معذرت کی کہ نہ میرے پاس بیاض ہے اور نہ اب وہ مشاعروں میں
شرکت کا مزاج رہا ہے۔ خصوصاً اقبالیات کے علمی موضوعات کے بعد بیت بخشی کچھ
عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

صحبتِ یار آخر شد!

۱۳ جنوری کو پروفیسر آزاد صاحب نے چند گھنٹے طلبہ کے ساتھ گزارے آپ نے
شعبۂ اردو کے طلبہ اور ریسرچ اسکالرس سے مختلف موضوعات پر غیر رسمی گفتگو کی۔ اردو تعلیم
اردو ادب کا نصابِ تعلیم۔ ریسرچ کے موضوعات کے علاوہ طلبہ نے آزاد صاحب سے
ان کے دورۂ پاکستان اور جوش صاحب سے ملاقات کی بابت پوچھا۔ اساتذہ اور
طلبہ کے درمیان آزاد صاحب نے کی تصویر کا طلبہ نے اہتمام کیا تھا۔ اس پروگرام کے
بعد نہایت پر لطف اور خوش گوار ماحول میں یہ صحبت آخر تمام ہوئی۔

پس نوشت:۔ پروفیسر دیا کشن صدر شعبۂ فلسفہ کی زیر صدارت پروفیسر
آزاد نے اقبال کے نظریۂ انسان پر اپنا مقالہ پڑھا اور اس میں ہبوطِ آدم کے تعلق سے
قرآن پاک اور بائبل کے فرق کو واضح کیا تو پروفیسر دیا کشن نے کہا کہ ہمارے لئے یہ ایک

نئی بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے پروفیسر آزاد کو دعوت دی کہ وہ اس موضوع پر ایک لیکچر ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی میں دیں۔ چنانچہ ۲۸ فروری کو تاریخی لیکچر دینے کے بعد پروفیسر آزاد نے ہبوط آدم کے موضوع پر انگریزی میں ایک لیکچر ڈیپارٹمنٹ آف فلاسفی میں دیا۔

رازی

رازیات

ڈاکٹر ان تقریبات کے زیجوں بیچ بھارت سے جگن ناتھ آزاد آپہنچے جمعرات کی شام کو دائرۂ مصنفین اقبال ٹاؤن کے اجلاس میں مہمانِ خصوصی تھے۔ جمعہ کو دوپہر کو ڈاکٹر سلیم اختر کے گھر پر کھانے پر مدعو تھے۔ اس محفل میں احمد ندیم قاسمی، آغا سہیل، مسعود اشعر، ڈاکٹر خواجہ زکریا، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، حسن رضوی، طاہر تونسوی اور متعدد دوسری علمی و ادبی شخصیات شریک طعام و کلام رہیں۔ یہ محفل کوئی تین گھنٹے چلی دلچسپ علمی ادبی زعفرانی باتیں یہ ایک خوبصورت اجتماع تھا۔ اگلے روز جگن ناتھ آزاد کی انگریزی میں کتاب اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ کی رونمائی فلیٹیز ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ تفصیل آئندہ سہی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

اقبالیات کا ایک غیر مسلم خادم

ایک جلسہ منعقدہ اعظم گڑھ کے صدر اور شریک ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تقریر میں کہا۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت کے تو سب قائل ہیں لیکن ہندوستان کے سماجی نظام میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد اقبال کو اپنا صحیح منصب دلوانے میں جگن ناتھ آزاد نے جو کام کیا ہے وہ ہندوستان میں کسی مصنف نے نہیں کیا ہے۔

اور آپ نے اس ضمن میں آزاد کی تصنیف "اقبال اور اس کا عہد" اور آزاد کی مرتب کردہ اقبال نمائش کا ذکر کیا۔

اور انہیں آزاد کا قول ہے کہ

"اقبال کی شاعری کو اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ اقبال کی نثر کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

کس کو خیال ہو سکتا تھا کہ اقبال کا خادم سب سے اول نمبر پر ایک غیر مسلم نکلے گا۔ جیسا کہ اردو افسانہ نویسی کا تاجدار اس سو برس

کے عرصہ میں ایک غیر مسلم رتن ناتھ سرشار (مصنف فسانۂ آزاد) نکلا اور اردو تذکرہ نگاروں میں ایک اور غیر مسلم لالہ سری رام (مصنف خمخانۂ جاوید) نکلا۔

ہفتہ وار صدق جدید لکھنؤ

ابوالاثر حفیظ جالندھری

میں اردو شاعری کی موجودہ روش سے کچھ زیادہ پرامید نہ رہا تھا لہذا جب میں نے "بیکراں" کا پیکٹ کھولا اور ورق الٹنے شروع کئے تو مجھے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ شعر و سخن کا یہ چھوٹا سا مجموعہ میرے دل و دماغ کو پھر اس لذت و سرور سے بہرہ ور کر دے گا جو کبھی میں اپنی روح میں موجود رکھتا تھا۔

اے جگن ناتھ آزاد مبارک باد قبول کر۔ تیرے کلام نے ثابت کر دیا کہ

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است
خم و خمخانہ بامہر و نشاں است

(آزاد کے نام ایک خط سے اقتباس)

اقبال نمائش

اقبال نمائش

شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی جموں

۱۵ر اپریل ۸۳ء

محبی حبیب سوز صاحب۔ آداب

یوں تو دیکھیے اس کے اس نمبر میں جو آپ مرتب کر رہے ہیں مجھے خود کچھ نہیں لکھنا چاہیے لیکن میرے چھوٹے موٹے کاموں میں اقبال نمائش کی تدوین و تشکیل ایک ایسا کام ہے جس کے متعلق شاید میں خود ہی کچھ عرض کر دوں گا۔

جس وقت میں یہ نمائش مرتب کر رہا تھا اس کے متعلق میں نے ملک کے اردو انگریزی اخبارات میں چھوٹے چھوٹے مضمون لکھے تھے۔ علامہ اقبال کی بعض تحریروں اور تقریروں کی تلاش میں میرے خطوط بھی ہندوستان میں اردو اور دوسری زبانوں کے اخبارات میں چھپے تھے۔ ساتھ ہی اس کے متعلق مختلف نیوز ایجنسیوں اور نامہ نگاروں کی طرف سے بھیجی ہوئی خبریں بھی اخبارات میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ گویا ایک طرح سے اس نمائش کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تاریخ بھی مرتب ہوتی جا رہی تھی ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۳ء کو جناب اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند

نے اس نمائش کا افتتاح کیا تو ان کے علاوہ مہمانِ خصوصی جناب شیخ محمد عبداللہ گورنر جموں و کشمیر جناب ایل کے جھا اور وزیراعلیٰ جناب سید میر قاسم نے بھی تقریریں کی تھیں۔

ان چاروں حضرات نے زبانی تقریریں کی تھیں جنہیں بعد میں ٹیپ ریکارڈ میں سے نقل کر کے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ جناب محمد یوسف ٹینگ سکریٹری جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صدر شعبۂ اردو کشمیر یونی ورسٹی نے اپنے اپنے خطبات استقبالیہ لکھ کر تیار کر لئے تھے۔ ٹینگ صاحب کا خطبۂ استقبالیہ کلچرل اکیڈمی کی جانب سے تھا اور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا کشمیر یونی ورسٹی کی جانب سے۔ ٹینگ صاحب نے تو اپنا خطبہ نمائش کی افتتاحی تقریب میں پڑھ دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کسی بنا پر چونکہ تشریف نہیں لا سکے تھے اس لئے ان کا خطبۂ استقبالیہ پڑھا نہیں جا سکا لیکن یہ تحریر دلپذیر میرے پاس محفوظ رہی۔ اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ ان تمام تقاریر اور نمائش کے بارے میں اپنی تحریروں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر دوں گا تاکہ اس تاریخی نمائش کی ایک مستقل یادگار باقی رہ جائے۔

لیکن ہوا یوں کہ میرے سری نگر سے جموں منتقل ہونے اور جموں میں ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے کے باعث میری اکثر کتابیں، مسودے، نمائش کی تقریب کے نیگیٹو اور بعض تصاویر ضائع ہو گئیں۔ موجودہ مکان میری تمام کتابوں اور مسودوں کے لئے ناکافی تھا اور ناکافی ہے۔ اس میں جو مسودے اور سیکڑوں کتابیں بہ امر مجبوری گیراج میں رکھی تھیں وہ بارش کی زد میں آ گئیں۔ اور نتیجتاً ان کتابوں اور کاغذات کا زیادہ تر حصہ تباہ و برباد ہو گیا اور اب جو دیکھتا ہوں کہ اقبال نمائش کا مسودہ جو پہلے بھی مختلف فائلوں میں بکھرا ہوا تھا اب انتہائی نامکمل صورت میں نظر آتا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم جناب ایل کے جھا، جناب اندر کمار گجرال اور جناب سید میر قاسم کی تقریروں کا جو ٹیپ سے نقل کی گئیں تھیں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ چودہ برس پرانے وہ ٹیپ ریکارڈ بھی کہاں محفوظ ہوں گے جبکہ ان چودہ برس میں ان کی کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوئی الا

ان ٹیپ ریکارڈوں کے بارے میں مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ ریڈیو کشمیر سری نگر کے تھے یا مرکزی حکومت کے سانگ اور ڈراما ڈویژن کے یا حکومت جموں کشمیر کے ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن کے۔ گویا اس وقت اس نمائش کے تحریری ریکارڈ کا جہاں تک تعلق ہے اس کی قریب قریب وہی صورتِ حال ہے جو نظامی گنجوی نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

نسب نامۂ دولت کیقباد

ورق بر ورق ہر سلائے بروباد

باقی تحریریں کچھ مکمل اور کچھ نامکمل صورت میں کاغذات کے انبار میں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن اور جناب محمد یوسف ٹینگ کی تحریریں بارش کے پانی سے اس قدر خراب ہو چکی ہیں کہ ان کی بعض سطریں پڑھی نہیں جا رہی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس نمائش کے بارے میں جتنا کچھ میٹریل اس وقت سامنے ہے اس محفوظ کر لیا جائے۔ اب اس نمائش کے متعلق کتاب تو میں کیا مرتب کر سکوں گا اس وقت جو دوسرے کام ہاتھ میں ہیں وہ بھی مکمل ہو جائیں تو بڑی بات ہے اس لئے اس نمائش کے متعلق جتنا کچھ میٹریل میرے پاس ہے وہ اس خط کے ساتھ آپ کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ اس نمبر میں "اقبال نمائش" کے زیرِ عنوان ایک باب مرتب کر کے اس میٹریل کو محفوظ کر لیں۔ ہو سکتا ہے اقبال کے فکر و فن کا کوئی عاشق میرے بعد اس کام کو وہاں سے شروع کرے جہاں میں نے اسے چھوڑا ہے۔ لیٹویا (روس) کی مشہور شاعرہ آلنگا لیساد سکا اپنی ایک نظم میں کہتی ہیں۔

افسان کا انسان کے ساتھ ایک گہرا رشتہ ہے

ایک فرد کے شروع کئے ہوئے کام کو

کبھی ختم نہیں ہونا چاہئے

دوسروں کو چاہئے کہ جہاں وہ کام رکنے لگے

اسے ہاتھ میں لے لیں۔

تاکہ یہ ایک مسلسل زنجیر بنتی چلی جائے۔

اور اقبال تو ایک ایسی زنجیر ہے، جو ہندوستان اور پاکستان کو ایک رشتۂ محبت میں باندھ سکتی ہے۔ اسی امید اور اسی خیال کے ساتھ میں یہ تمام کاغذات آپ کو بھیج رہا ہوں۔ خدا کرے میرا یہ کام اقبالیات کے کسی اور طالب علم کی بدولت اور آگے بڑھ سکے۔ والسلام

نیازمند
جگن ناتھ آزاد

پس نوشت:۔

جب میں یہاں تک لکھ چکا تو گم شدہ اوراق میں سے ایک ورق سامنے آیا۔ یہ ورق فہرستِ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں نے اس کتاب کا کیا نقشہ بنایا تھا۔

آزاد

اقبال نمائش

تجویز:۔ کشمیر یونی ورسٹی، سری نگر۔
منصوبہ بندی اور رابطہ:۔ پریس انفارمیشن بیورو۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات۔
عکاسی:۔ فوٹو ڈویژن، وزارتِ اطلاعات ونشریات
تزئین وتشکیل:۔ ایگزیبیشن یونٹ، ڈائرکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی
وزارت اطلاعات ونشریات

جن اداروں کا تعاون حاصل رہا۔
عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری حیدرآباد۔
اقبال اکیڈمی، حیدرآباد۔
خدابخش لائبریری، پٹنہ۔
مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ۔
رضا لائبریری، رام پور،
دہلی یونی ورسٹی لائبریری، دہلی۔
جموں یونی ورسٹی لائبریری، جموں،
کشمیر یونی ورسٹی لائبریری، سری نگر۔
ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن، آندھرا پردیش
ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن، بہار
ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن جموں کشمیر
اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر
تحقیق، انتخاب وترتیب تصاویر:۔ جگن ناتھ آزاد۔

فہرست مضامین

حصہ اول

اقبال نمائش، سری نگر،

حصہ دوم

حصہ سوم

حصہ چہارم

جگن ناتھ آزاد

حرفِ اوّل

تقسیمِ ہند کے پہلے کی بات ہے یومِ اقبال کا انعقاد ہم اردو والوں کے لئے سارے ہندوستان میں ایک ادبی تہوار کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندوستان کا کوئی شہر ہو ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی یاد پورے جوش و خروش اور دل گرمی و دل سوزی کے ساتھ منائی جاتی تھی۔

دراصل یومِ اقبال منانے کا سلسلہ علامہ اقبال کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا غالباً جنوری یا فروری ۱۹۳۸ء کی بات ہے لاہور میں انٹر کالج مسلم برادرہڈ نے پہلا یومِ اقبال منایا۔ لیکن اسے ہم پہلا یومِ اقبال نہیں کہہ سکتے کیونکہ انٹر کالج مسلم برادرہڈ کی طرف سے یومِ اقبال کا اعلان ہوتے ہی انجمن ترقی اردو راولپنڈی نے جس کا میں نائب سکریٹری تھا۔ راولپنڈی میں یومِ اقبال منانے کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح سے حیدرآباد میں بھی یومِ اقبال منانے کا اعلان ہوا۔ اور یہ تینوں یومِ اقبال، اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ایک ہی دن منعقد ہوئے۔ راولپنڈی میں یومِ اقبال دو دن منعقد ہوا۔ اور دونوں دن سر عبدالقادر مرحوم نے اس کی صدارت کی۔

لاہور میں جو یومِ اقبال منایا گیا وہ اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کے لئے مسلم برادرہڈ نے شریک ہونے والے ادیبوں سے باقاعدہ اردو اور انگریزی میں

مقالات لکھوائے۔ خواجہ غلام السیدین، ایف۔ایم۔ درانی، سردار گورنجین سنگھ طالب شیخ میرالدین اور شیخ محمد عمر فاروق نے انگریزی میں اور علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید ظفر الحسن، چودھری غلام احمد پرویز، راجہ حسن اختر اور سید عابد علی عابد نے اردو میں اپنے گراں قدر مقالات پڑھے۔ اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اپنی دلکش نظم "اقبال حفیظ کی نظر میں" اور حفیظ ہوشیارپوری نے اپنا کلام "اقبال اور فلسفۂ مغرب" کے عنوان سے پیش کیا۔ بعد میں یہ تمام مقالات اور منظومات مسلم بورڈ بدنے ایک کتاب کی شکل میں پیش کئے جس کا اردو میں نام "مقالات یوم اقبال" ہے۔ اور انگریزی میں "ASPECTS OF IQBAL" اس کتاب کے حصہ انگریزی کی ابتدا میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا گراں قدر دیباچہ ہے جس میں تاثیر مرحوم نے اقبال کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں یوم اقبال منانے کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا پاکستان میں یہ سلسلہ جاری رہا اور مجھے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک متعدد بار پاکستان کے مختلف شہروں میں یوم اقبال میں شرکت کا موقع ملا۔ لاہور۔ راولپنڈی اور کراچی کے علاوہ ڈھاکا اور چٹاگانگ میں بھی یوم اقبال کئی مرتبہ منایا گیا اور اکثر مجھے ان تقاریب میں شرکت کا اتفاق ہوا۔

یہاں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان میں اقبال کی شاعری اور فلسفے کے جس پہلو کو جان تقریب یاد کیا جاتا ہے وہ اقبال کے سارے نظریۂ حیات کا احاطہ کرتا ہے یا نہیں کیونکہ یہ چند سطور کسی ادبی بحث کے طور پر نہیں لکھی جارہی ہیں کہنا صرف یہ ہے کہ قریباً بیس پچیس برس تک ہندوستان میں یوم اقبال کی تقریب زیب طاق نسیاں رہی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ کارنامہ غالباً گجرال کمیٹی کا ہے جس کے فیصلے کے مطابق آل انڈیا ریڈیو نے سال رواں کے شروع میں اقبال صدی تقریب کا آغاز کیا یہاں یہ بحث غیر ضروری ہے کہ کیا ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء اقبال کی تاریخ پیدائش ہے یا ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اس پر ہندوستان کے متعدد جرائد میں خاصی بحث ہو چکی ہے اور

ابھی غالباً اور چلے گی لیکن ایک اچھے کام کی ابتدا میں اس بحث کو حائل نہیں ہونا چاہئے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ بحث یوم اقبال منانے کی راہ میں حائل نہیں ہوئی۔

آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اس سلسلے میں خاصے اہم اور معیاری پروگرام پیش کئے لیکن ظاہر ہے کہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں لمبے چوڑے سیمینار جو دو دو تین تین روز تک جاری رہیں ممکن نہیں۔ یہ کام علمی اور ادبی اداروں کا ہوتا ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ غالب اکیڈمی نئی دہلی نے اس سلسلے میں ایک قدم اٹھایا اور ۲۲ر فروری ۱۹۷۳ء ہی کو غالب اکیڈمی کے ہال میں ایک مشترکہ یوم غالب و یوم اقبال منایا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سروپ سنگھ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے کی اور جناب مالک رام، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، جناب عتیق صدیقی، اور جناب کمال احمد صدیقی نے اپنی اپنی تقریروں نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی، اور ایک نہایت ہی اہم کڑی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا اقبال سیمینار ہے جو ۲۲ر مارچ سے ۲۵ر مارچ تک یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے پروفیسر آل احمد سرور کی زیر نگرانی اس سیمینار کو ہر اعتبار سے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس میں پروفیسر مسعود حسین خاں ڈاکٹر باقر مہدی، ڈاکٹر منظر عباس نقوی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، جناب شبیر احمد غوری، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، جناب میکش اکبرآبادی ڈاکٹر اولاد احمد صدیقی، ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر وحید اختر، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر عبدالحق، جناب عیاذ انصاری جناب

لہ راقم التحریر کے نزدیک صحیح تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ہے اور اس وقت جبکہ یہ سطور پریس کو جا رہی ہیں یہ بحث بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی اور پاکستان اقبال صدی تقاریب کمیٹی دونوں اسی تاریخ پر متفق ہیں اس سلسلے میں راقم التحریر کے مقالات مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ ۸ر مارچ ۱۹۷۳ء، ہندوستان ٹائمز نئی دہلی ۱۰ فروری ۱۹۷۳ء اور اسٹیڈیز ان اسلام نئی دہلی (ملاحظہ ہوں)۔

بشیر بدر، جناب علی سردار جعفری، جناب عتیق حنفی، جناب شمیم حنفی، جناب شمس الرحمن فاروقی، قاضی عبدالرحمن اور جناب شمیم تہرانی نے اپنے مقالات پڑھے۔ یہ مقالات عنقریب ہی مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ایک مجموعے کی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

اس کے چند روز بعد دہلی یونیورسٹی نے اقبال کی یاد میں ایک سمپوزیم منعقد کیا جس میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، اقبال سنگھ اور بعض دوسرے حضرات نے تقریریں کیں۔ مقالہ صرف سردار جعفری نے پڑھا۔ جہاں تک تقریروں کا تعلق ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اقبال کی شاعری، اور فلسفہ زبانی تقریروں کا نہیں بلکہ تحریری مقالوں کا موضوع ہو تاکہ مقالہ جب پڑھا جائے تو اس پر بحث ہو سکے اور جہاں تک ممکن ہو اقبال کے فکروفن کے نئے گوشوں کی نقاب کشائی ہو۔ اقبال، غالب، شیکسپیئر، فردوسی، کالی داس، ٹیگور، دانتے، ملٹن، گوئٹے، اور اس معیار کے دوسرے فنکاروں کے بارے میں محض تقریریں کر دینا میرے نزدیک تحصیل حاصل ہے۔ یہ موضوعات مقالات کے متقاضی ہیں۔

مئی ۱۹۷۸ء میں اقبال صدی تقاریب حیدر آباد میں منائی گئیں۔ جن کا اہتمام اقبال اکیڈمی حیدر آباد نے آندھرا پردیش کی کوئی چودہ پندرہ ادبی انجمنوں کے تعاون سے کیا۔ یہ تقاریب پانچ دن جاری رہیں۔ اور ان کا کینوس خاصا وسیع تھا۔ ان میں مقالات بھی پڑھے گئے۔ تقریریں بھی ہوئیں۔ اقبال کے کلام پر تضمینیں بھی پیش ہوئیں اور اقبال کی نظموں کے انگریزی ترجمے بھی۔ ایک اجلاس میں شعراء نے اقبال کو اپنی اپنی نظموں میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اور ایک شام کلام اقبال کو موسیقی میں پیش کرنے پر وقف ہوئی۔

اقبالیات کی ایک نمائش حیدر آباد کی ” تقاریب کا ایک اہم جزو تھی اس میں حیدر آباد کے فنکاروں نے اقبال کو اور کلام اقبال کو اپنے اپنے موقلم سے پیش کر کے نمائش میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

کشمیر یونیورسٹی کا ہفتۂ اقبال بڑے اہتمام سے ۲۰ تا ۲۶ جون ۱۹۷۳ء
میں منایا گیا۔ یہ ہفتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات کے صدر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کی کوششوں
کا نتیجہ تھا۔ جموں و کشمیر کے علم دوست گورنر جناب بھگوان سہائے نے
صدارت کی اور مندرجہ ذیل حضرات نے اس میں اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔
ڈاکٹر حامدی کاشمیری، ڈاکٹر عبدالحق، قاضی غلام محمد، باقر مہدی اور جگن ناتھ
آزاد۔

اقبال نمائش جس کا تفصیلی بیان زیر نظر کتاب میں موجود ہے اسی ہفتۂ اقبال
کا ایک جزو ہے جو ہفتۂ اقبال کے پانچ ماہ بعد ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو سری نگر میں منعقد
ہوئی۔ جناب اندر کمار گجرال، مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نے اس کا افتتاح کیا
سید میر قاسم، وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر نے صدارت کی۔ اور شیخ محمد عبداللہ مہمان خصوصی
کی حیثیت سے تشریف لائے۔ تقریب افتتاح کے موقعے پر ان تین حضرات کے
علاوہ جناب ایل کے جھا، گورنر جموں و کشمیر نے بھی سامعین سے خطاب کیا۔

یہ نمائش ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء تک جاری رہی اور ہر روز کوئی ایک ہزار سے
زیادہ حضرات یہ نمائش دیکھنے آتے رہے۔ ڈی اے وی پی کی رپورٹ کے
مطابق نمائش دیکھنے والوں کی کل تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

اس بات چیت کو ختم کرنے سے پہلے دو باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک
تو یہ کہ دسمبر ۱۹۷۳ء میں جناب اندر کمار گجرال کی قیام گاہ پر ہندوستان بھر کے نمائندہ ادیبوں
اور شاعروں کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں کافی غور و خوض کے بعد آل انڈیا اقبال صدی
تقاریب کمیٹی کی تجویز پاس ہوئی اور کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آج اس کمیٹی کی جدید ترین
صورت یہ ہے۔

مربی — راشٹرپتی جناب فخرالدین علی احمد

صدر — جناب درگا پرشاد دھر سفیر ہند برائے روس

نائب صدر — پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر عابد حسین، جناب

اندر کمار گجرال پروفیسر نورالحسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر نارائن متین، ڈاکٹر بھرت رام، جناب کرشن چندر۔

جنرل سکریٹری۔ جناب علی سردار جعفری

جوائنٹ سکریٹری جگن ناتھ آزاد۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ محمد یوسف ٹینگ

دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کی یاد میں منعقدہ تقاریب کا ذکر اس اقبال کا ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جو ۱۴ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی کی آندھرا پردیش شاخ کے اہتمام سے جوبلی ہال حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ یہ سیمینار پانچ نشستوں پر مشتمل تھا۔ سردار جعفری۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری، اور عابد علی خاں جنہوں نے اس اجلاس کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ علمی اور ادبی دنیا کے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

اس اجلاس کا افتتاح جناب درگا پرشاد دھر نے کیا۔ آپ کا خطبۂ صدارت اقبال اور فکرِ اقبال کے موضوع پر ایک علمی مقالہ تھا۔ اس میں آپ نے اقبال صدی تقاریب کمیٹی کے اس پروگرام کا تفصیل سے ذکر کیا جو یہ کمیٹی ۷ نومبر ۱۹۷۷ء تک ملک کے سامنے پیش کر چکی تھی۔

ہندوستان کے مختلف حصوں سے مندرجہ ذیل چودہ ادیب اس اجلاس میں شریک ہوئے اور انہوں نے اقبال کے فکروفن پر اپنے مقالے پڑھے۔

سردار جعفری، ڈاکٹر عالم خوندمیری، پروفیسر حسن عسکری، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر گوربچن سنگھ طالب، ڈاکٹر مغنی تبسم مولانا احمد سعید اکبرآبادی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر محمد حسن۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور جگن ناتھ آزاد۔

یہ نمائش کس طرح معرضِ وجود میں آئی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے اور نمائش کی کہانی کے عنوان سے یہ روداد جس کے بعض حصے میں نے نمائش کی تیاری کے دنوں میں لکھے تھے زیرِ نظر کتاب میں پیش جا رہی ہے۔ یہ کہانی سنانے کا ایک مقصد یہ بھی

ہے کہ چونکہ اقبال صدی تقاریب دوران میں یہ نمائش ہندوستان کے اکثر شہروں میں دکھائی جائے گی۔ اہل نظر حضرات اس روداد کی روشنی میں اسے اور بہتر بنانے کے لئے اپنے قیمتی مشورے دے سکیں۔۔

۱۱رجنوری ۱۹۷۸ء

: یہ مندرجہ بالا تحریر استاد محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کی نظر سے گذری۔ تو انھوں نے مجھے ۱۸ر دسمبر ۱۹۷۸ء کو ایک خط لکھا جس کا متعلقہ حصہ نیچے درج کیا جارہا ہے۔ تاکہ پہلے یوم اقبال کے بارے میں جس کے متعلق میں بے خبر تھا صحیح اطلاع قارئین کے سامنے آسکے۔۔۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

ہاں آخر میں آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سب سے پہلا یوم اقبال ۱۹۳۸ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور نے منایا تھا۔ اس انجمن کا میں صدر تھا۔ اور خواجہ عبدالوحید صاحب (جو آج کل کراچی میں ہیں) اس کے سکریٹری تھے۔ صبح کی نشست کی صدارت سر عبدالقادر نے کی تھی۔ اور شام کی نشست کی صدارت جسٹس آغا حیدر نے۔ سٹیفز میں ایک پارٹی بھی ہوئی تھی جس میں علامہ خود بھی تشریف لائے تھے۔

یہ واقعہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہے اور اخبارات کے فائلوں میں بھی ہے لیکن مسئلہ کریڈٹ کا ہے۔ لوگ اس واقعے کو نظر انداز کرنے پر مصر ہیں۔ چلئے ہم اپنا کریڈٹ چھوڑتے ہیں۔ اس میں کیا رکھا ہے۔۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

سری نگر
۱۵رجنوری ۱۹۷۸ء

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد

نمائش کی کہانی

کشمیر یونیورسٹی نے ۷۳ء کے شروع میں جب ہفتہ اقبال منانے کا پروگرام بنایا تو یونیورسٹی کی ہفتۂ اقبال کمیٹی نے اقبال نمائش کو بھی ایک جزو کے طور پر تقریروں اور مقالات کے علاوہ اس میں شامل کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن صدر شعبۂ اردو راقم الحروف کے یہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ اقبال نمائش کی ترتیب و تشکیل کا کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں۔ ہفتۂ اقبال کا باقی کام یونیورسٹی خود سنبھال لے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جہاں پروگرام کے باقی حصے ایسے ہیں جن پر زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ وہاں نمائش ایک ایسا کام ہے جس کے لئے چند دنوں کی نہیں بلکہ کئی مہینوں کی محنت درکار ہے۔ میں نے اس ضمن میں اس اردو نمائش کا ذکر کیا جسے ۱۹۶۱ء میں میں نے پریس انفارمیشن بیورو کے لئے جناب امداد صابری اور جناب عتیق صدیقی کی مدد سے ترتیب دیا تھا اور جس کا افتتاح وگیان بھون میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ اس نمائش کی تشکیل و تزئین کے لئے فوٹو ڈویژن اور ڈیزائن ڈویژن نے مسلسل کئی ہفتے کام کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد حسن کو معلوم تھا کہ میرے پاس اقبال کی تحریروں اور تصویروں کا خاصا ذخیرہ موجود ہے لیکن غالباً وہ اس خیال سے خالی الذہن تھے کہ یہ تمام تصویریں اور

اتحریریں موجودہ صورت میں اس ادبی کارنامے کے شایانِ شان نہیں ہیں جسے ہم اقبال نمائش کے نام سے پیش کر سکیں۔ ان تصویروں اور تحریروں کو بڑے سائز میں بنانا۔ ان پر مناسب عنوانات جلی قلم سے لکھوانا، انہیں ماونٹ کر کے الگ الگ پینل پر سجانا، ایک محنت طلب اور وقت طلب کام تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ میرے ذخیرے کا ایک خاصا حصہ دہلی سے میری غیر حاضری کے باعث دیمک کی نذر ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ملک کے مختلف حصوں سے ان تصویروں کو حاصل کرنے کی کوشش ضروری تھی تب کہیں جا کے ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑ سکتی تھیں اور ہم ایک تاریخ وار صورت میں حیات اقبال کے مختلف گوشے اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے یہ ساری صورتِ حال کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر خواجہ نورالدین (مرحوم) کے سامنے رکھی۔ انہوں نے حکومتِ ہند کے وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب اندر کمار گجرال سے بات کی گجرال صاحب نے انوار جمال صاحب قدوائی سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ میں اس نمائش کا ایک مختصر سا خاکہ بنا کے پیش کروں۔ اس خاکے کی موجودگی میں قدوائی صاحب کے ساتھ مفصل بحث ہوئی۔ انہوں نے خاصے گراں قدر مشورے اس سلسلے میں دیئے۔ اور فرمایا کہ اقبال کے اشعار کی مصوری والا حصہ عبدالرحمٰن چغتائی کی نمائندگی کے بغیر نامکمل رہے گا۔ چنانچہ میں نے عملِ[1] چغتائی کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے ان تین تصویروں کے علاوہ جو اس نمائش میں شامل ہیں اور کچھ نہ مل سکا۔

اقبال صدی تقاریب حیدر آباد

انہی دنوں مجھے حیدر آباد میں اقبال صدی تقاریب میں شرکت کا موقع ملا

---

[1] عملِ چغتائی بہت بعد میں (غالباً ۱۹۸۰ء میں) مجھے تحفتہً محب گرامی قدر عبدالرحیم چغتائی کی طرف سے موصول ہوا اور اقبال نمائش کی ترتیب نو میں عبدالرحیم صاحب کے شکریئے کے ساتھ چند تصاویر شامل کی گئیں

یہ تقاریب اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے زیر اہتمام منائی گئیں۔ اور اقبالیات کی نمائش ان تقاریب کا ایک خاص جزو تھا۔ میں یہ نمائش دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ اس نمائش میں ہر خاص و عام کو دعوتِ نظر دے رہا تھا۔ تصاویر بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں لیکن یہ تصاویر اقبال کی زندگی کو تاریخ وار پیش نہیں کر رہی تھیں۔ اکثر اہم کڑیاں اس سلسلے سے غائب تھیں۔ اقبال کے خطوط بھی تھے لیکن زیادہ تر وہی جو انہوں نے حیدرآباد کے ادبا اور اہل قلم کو لکھے تھے کوئی چالیس کے قریب اقبال کے اشعار بھی مصوری کی صورت میں موجود تھے اور یہ سب تصویریں حیدرآباد کے مصوروں کی بنائی ہوئی تھیں۔ میں نے اس ذخیرے میں سے بھی بعض نوادر سری نگر کی اقبال نمائش کے لئے منتخب کئے جو سید فیض اللہ صاحب حسینی، پرنسپل انوار العلوم کالج حیدرآباد اور برادر محترم عابد علی خان، مدیر "سیاست" حیدرآباد کی عنایت سے مجھے فوراً حاصل ہو گئے۔ چنانچہ اس نوادر کی بدولت میں نے کشمیر یونی ورسٹی کی اقبال نمائش میں ایک گوشہ "حیدرآباد میں اقبال نمائش کے نام سے شامل کر لیا اور یہ شعبہ آج ہماری اقبال نمائش کا ایک اہم شعبہ ہے۔

عبدالرشید عمادی صاحب کے نام علامہ اقبال کے مکتوب کا نگیٹو مجھے جناب عابد خاں کے افرزند عزیزم زاہد علی خان نے عنایت کیا لیکن بدقسمتی سے وہ کہیں ادھر ادھر ہو گیا اور اصل خط سے دوبارہ اس کا نگیٹو تیار کرانا پڑا۔

یہاں شری وامن راؤ، ڈائریکٹر انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ، آندھرا پردیش کا شکریہ ادا کرنا صریحاً احسان فراموشی ہوگی جن کی توجہ سے مذکورہ نادر تصویروں اور تحریروں کے نگیٹو مجھے بآسانی حاصل ہو گئے ؂

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔

علی گڑھ، پٹنہ، رامپور،

انعقادِ نمائش کا شوق حیدرآباد سے مجھے پٹنے لے گیا جہاں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی بدولت میں نے خدابخش لائبریری کے نوادر سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جناب ایم۔این۔جھا ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ حکومتِ بہار نے توجہ خاص کرم فرمائی کی اور مطلوبہ نوادر کے نیگیٹو بہت کم وقت میں بنوا کے مجھے دے دیئے جھا صاحب کی اس عنایت کے لئے ان کا تہہ دل سے شکرگذار ہوں۔

پٹنے سے میں لکھنؤ آیا خیال تھا لکھنؤ یونی ورسٹی سے میں بہت کچھ حاصل کر سکوں گا لیکن وہاں پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں فساد ہو گیا ہے اور یونیورسٹی کی اکثر عمارتوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ میں ایک آدھ دن لکھنؤ میں رکا لیکن یونی ورسٹی تک رسائی نہ ہو سکی۔ چنانچہ میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس لوٹا۔

اس سفر میں میری اگلی منزل علی گڑھ یونی ورسٹی تھی۔ وہاں پروفیسر آل احمد سرور اور رضوی صاحب کی عنایت سے ہفتوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا۔ یہی لطف وکرم مولانا امتیاز علی اور ان کے فرزند عرشی زادہ کی طرف سے رضا لائبریری رامپور میں میرا منتظر تھا۔ ان تمام حضرات کے بارے میں جن کی توجہ میری مشکل کو آسان بناتی چلی گئی یہی کہہ سکتا ہوں کہ

ع کرم کردی الٰہی زندہ باشد۔

مسجدِ قرطبہ

میری ناقص رائے میں "مسجدِ قرطبہ" صرف اقبال ہی کی عظیم ترین نظم نہیں ہے بلکہ ساری اردو شاعری میں اس وقت عظیم ترین شہ پارہ ہے۔ اس نظم کو نمائش میں پیش کرنا میں بہت ضروری سمجھتا تھا چنانچہ اپنے کاغذوں میں اس مسجد کے بارے میں وہ مواد تلاش کرنا شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں اس مسجد کی زیارت کے بعد ہسپانیہ سے اپنے

ساتھ لایا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کاغذات میں مجھے توریس بلباس کی تصنیف۔
LA MEZQUITA DE CORDOBA MADINAT
AL - ZAHRA - دستیاب ہوگئی۔ مسجد قرطبہ کی تصویروں سے مزین یہ کتاب
فوٹوگرافی کے ان نادر نمونوں پر مشتمل ہے جو تصویر کشی کے فن میں شاہکار کی حیثیت
رکھتے ہیں ان کے نیگیٹو مجھے میرے دوست جناب پی۔ اے بقایا، ڈائریکٹر۔
انفارمیشن حکومت جموں وکشمیر نے بنوا دیئے جن کی بدولت میرے بنائے ہوئے خاکے
میں رنگ آمیزی کا کام مکمل ہو گیا۔ بقایا صاحب کا شکریہ ادا کئے بغیر میری تحریر یقیناً نامکمل
رہے گی۔

اقبال کی یہ تمام تصویریں اور اردو انگریزی تحریریں جو دنیا کے ادب میں جاودانی
مقام رکھتی ہیں۔ دہلی میں میرے عزیز دوست وی۔ این۔ ککڑ کی زیر نگرانی اس صورت
میں ظہور پزیر ہوئیں جس صورت میں آج ناظرین انہیں نمائش میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے
میں میرے محترم دوست سے کے نائر کا مشورہ اور رہنمائی جو ملیالم اور انگریزی ادب میں
کرشنا چیتینے کے نام سے مشہور ہیں، قدم قدم پر حاصل رہی ہے۔ سے کے نائر اور وی۔ این
ککڑ کی اس توجہ بلکہ دل گرمی اور دل سوزی کے بغیر میرے یا ڈاکٹر محمد حسن کے خیال کا اس
طرح عملی جامہ پہننا ممکن نہ تھا۔ میں اس توجہ کے ان دونوں کا سپاس گزار ہوں۔

فن لطیف کوئی بھی ہو ناتمام ہے۔

ابھی یہ نمائش تکمیل کی منزلوں میں منزلوں میں تھی کہ میری درخواست پر دہلی یونیورسٹی
کے بعض اردو اساتذہ جن میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبدالحق اور
ڈاکٹر فضل الحق کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ میری اس کوشش کو جسے میں
کوشش ناتمام کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ایک نظر دیکھنے کے لئے آئے
مجھے یہ مسرت ہے کہ انہوں نے میری کاوش کو بہ نظر تحسین دیکھا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں

سے نوازا۔ ان احباب کی یہ فرمائش کہ یہ نمائش چند روز کے لئے دہلی یونیورسٹی میں بھی منتقل کی جائے میرے لئے فخر و مسرت کا باعث ہے۔

مالک رام، عابد علی خاں، مدیر "سیاست" حیدرآباد، شہباز حسین، ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ، غلام رسول سنتوش، ڈاکٹر گیان چند، صدر شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی جموں کے سکے کنگ، سید حامد جوائنٹ سکریٹری وزارت داخلہ، سید مظفر حسین برنی، ایڈیشنل منسٹری آف پٹرولیم اینڈ کیمیکلز، قرۃ العین حیدر، بیگم حامدہ حبیب اللہ اور سبحان صاحب سابق نمائندہ، ٹائمز آف انڈیا، کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ایڈمنگ روم میں اس نمائش کو دیکھا۔ ان تمام کرم فرماؤں کے گراں قدر مشورے اس نمائش کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہوئے۔

مذکورہ بالا تمام حضرات کی عنایات کا نتیجہ اقبال نمائش، سری نگر کی صورت میں اہل ملک کے سامنے ہے۔ میں خوش ہوں کہ ڈاکٹر محمد حسن کی خواہش اور میری محنت بار آور ہوئی۔

ڈاکٹر محمد حسن کے کشمیر یونیورسٹی سے طویل چھٹی پر چلے جانے کے بعد ان کے جانشین ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا تعاون مجھے قدم قدم پر حاصل رہا۔ سری نگر میں اس نمائش کو عملی صورت دینے کے لئے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اہم مشورے دیئے۔ دراصل ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کے گراں بہا مشورے مجھے اس وقت بھی حاصل رہے جب میں اس نمائش کی Master copy مرتب کر رہا تھا۔ اور اب سری نگر میں ۲۷ اکتوبر کو اس نمائش کے انعقاد کے لئے انہوں نے ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال کر میرے کام کو آسان بنا دیا ہے۔

یہ نمائش غالباً ملک کے اور حصوں میں بھی جائے گی۔ مثلاً پروفیسر آل احمد سرور نے علی گڑھ میں، سردار جعفری نے بمبئی میں، بیگم حامدہ حبیب اللہ لکھنؤ میں، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پٹنے میں، اور جناب عابد علی خاں نے اسے حیدرآباد میں منعقد کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میری گذارش یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں جو حضرات اس نمائش کو دیکھیں وہ از راہ کرم اپنے تاثرات سے مجھے مطلع فرمائیں۔ تاکہ صرف یہی نہیں

کہ اپنی خامیوں سے مجھے آگاہی ہو سکے بلکہ ان اشارات اور مشوروں کی روشنی میں اس نمائش میں مزید اضافے کئے جا سکیں۔ سر دست تو علامہ اقبال کے الفاظ میں مجھے اپنی ناچیز کوشش کے بارے میں یہی کہنا ہے۔

تمام مضموں مرے پرانے کلام میرا خطا سراپا۔
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا۔

نمائش کے مختلف گوشے

یہ تحریر ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نمائش کے مختلف گوشوں کا ایک مختصر سا ذکر کر دیا جائے۔ ان گوشوں کی ترتیب یہ ہے:

(۱) اقبال کی کہانی تصویروں کی زبانی۔
(۲) اقبال اور ان کا خاندان۔
(۳) اقبال کے اساتذہ۔
(۴) تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گذر
(۵) اقبال اور مسجد قرطبہ
(۶) غرناطہ بھی دیکھا میری آنکھوں نے لیکن
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں۔
(۷) دو دوست۔ علامہ اقبال اور مہاراجہ کرشن پرشاد۔
(۸) اقبال کی مرتب کردہ درسی کتب۔
(۹) تصانیف اقبال کے اولین ایڈیشن
(۱۰) اسکول، کالج، اور یونی ورسٹی میں اعزازات۔
(۱۱) یادگار مشاعرہ۔
(۱۲) پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شعر

(۱۳) اسلامی طرز کے پسندیدہ نام
(۱۴) اقبال کی اردو تحریریں (بہ خطِ اقبال)
(۱۵) اقبال کے اردو مکاتیب (بہ خطِ اقبال)
(۱۶) "سلام و پیام"، پر اقبال کے مکتوب (بہ خطِ اقبال)
(۱۷) اقبال کے انگریزی مکاتیب (بہ خطِ اقبال۔
(۱۸) اقبال کے خطوط بیگم عطیہ فیضی کے نام (بخطِ اقبال)
(۱۹) اقبال کی انگریزی تحریریں (بہ خطِ اقبال)
(۲۰) کلامِ اقبال بہ خطِ اقبال
(۲۱) کلامِ اقبال اولین صورت میں
(۲۲) تراجمِ اقبال
(۲۳) اقبال اور پریم چند
(۲۴) مفسرینِ کلامِ اقبال
(۲۵) لغت اور زبان کی باریکی پر اقبال کی نظر
(۲۶) اقبال مصوروں کی نظر میں۔
(۲۷) کلامِ اقبال مصوروں کی نظر میں۔
(۲۸) اقبال کے اشعار خطاطی کے نمونے۔
(۲۹) چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک۔

(اقبال کے انتقال پر رابندر ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو، جواہر لعل نہرو، سبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد، سر شہاب الدین اور دوسرے زعما کا اظہارِ غم)

(۳۰) متفرقات

ایک زیرِ تجویز گوشے کا عنوان جو ابھی تک اس نمائش میں شامل نہیں کر سکا "موضوعاتِ اقبال" ہے مدا سے شامل نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ عنوان کئی ضمنی عنوانوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ اور اگر ہر عنوان پر تصاویر جمع کی جائیں تو صرف

اسی گوشے کے لئے تصاویر کی تعداد قریب قریب اتنی ہی ہو جاتی جتنی تعداد ساری نمائش کی تصویروں کی ہے۔ موجودہ صورت میں نمائش قریباً پانچ سو تصاویر پر مشتمل ہے۔ ارمغانِ اقبال ۔ کا گوشہ شامل کرنے سے یہ تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی۔ اور اتنی بڑی نمائش کو سنبھالنا عملی اعتبار سے ایک دشوار کام ہوتا۔

جب کوئی تین چار ماہ کی تلاش و جستجو کے بعد اگست ۱۹۷۳ء کے شروع میں پانچ سو تصاویر کے قریب جمع کر کے ایگزیبیشن یونٹ کے حوالے کر دی گئیں تو انعقاد نمائش کا مسئلہ سامنے آیا۔ اس اندازے پیش نظر کوئی ایک ڈیڑھ ماہ میں یہ تمام (P LL LMAN ١٠٨) تیار ہو جائیں گے۔ ستمبر ۱۹۷۳ء کا آخری ہفتہ انعقاد نمائش کیلئے طے کر لیا گیا۔ کشمیر یونی ورسٹی کی خواہش یہ تھی کہ اس نمائش کا افتتاح جناب اندر کمار گجرال مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات کریں۔ اور یہ فیصلہ مناسب بھی تھا کیونکہ گجرال صاحب نے شروع ہی سے اس نمائش کی ترتیب و تشکیل کے ساتھ جس دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اور اس لئے عملی سہولیات کا بہم پہنچائی تھیں۔ اس کے پیش نظر یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد گجرال صاحب ہی کے نام سے اسے منسوب کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے ساتھ گجرال صاحب کا تعلق خاطر اس بات کا متقاضی تھا کہ اس نمائش کا افتتاح ان ہی کے ہاتھوں ہو۔ لیکن گجرال صاحب پارلیمنٹ اور اردو کمیٹی کے کام میں کچھ اس طرح مصروف تھے کہ ستمبر کے آخر میں وہ اس کام کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

دوسری اکتوبر کو انہیں یورپ روانہ ہونا تھا چنانچہ انہوں نے سید میر قاسم وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر کو بھیجا کہ میں چونکہ ۲۲ر اکتوبر کو ہندوستان واپس آؤں گا۔ اور ۲۷ر اکتوبر سے قبل مجھے فرصت نہ مل سکے گی اس لئے آپ میرا انتظار نہ کریں اور سری نگر میں اقبال نمائش کا انعقاد کریں۔ گجرال صاحب نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ اس نمائش کا افتتاح قاسم صاحب ہی کریں۔ قاسم صاحب نے اس

کے جواب میں گجراں صاحب کو لکھا کہ ہم آپ کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نمائش کا افتتاح آپ ہی کریں۔ اور آپ کی سہولت کے پیشِ نظر یہ نمائش ۲۷ اکتوبر ہی کو منعقد ہوگی

شیخ محمد عبداللہ اور اقبال

اس دوران میں اگرچہ اقبال کی تحریریں اور تصویریں جمع کرنے کے کام سے فارغ ہو چکا تھا اور ان تصویروں کے BLOW UP دہلی میں تیار ہو رہے تھے۔ لیکن بعض خطوط اور تحریروں کے بارے میں ابھی تک میرا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ان کے متعلق میرے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات تھے۔ چنانچہ نمائش کے سلسلے میں تھوڑی بہت تلاش و جستجو کا کام مسلسل جاری رہا۔ میں یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

شیخ عطاء اللہ نے اپنی کتاب "اقبال نامہ" کے حصہ اول میں اقبال کے تین خطوط پر یہ عنوان قائم کیا ہے۔ "نامعلوم مکتوب الیہ کے نام" اور اس کے نیچے لکھا ہے۔

یہ خطوط سید نعیم الحق صاحب کا عطیہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شیخ عبداللہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

ان سے میں پہلا خط یکم ستمبر ۱۹۳۳ء کا ہے دوسرا ۱۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کا اور تیسرا بغیر تاریخ کے۔ میں یہ تینوں خطوط (مطبوعہ صورت میں) لے کر محترم شیخ محمد عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے تینوں خطوط کو توجہ سے پڑھا اور چالیس [illegible] برس پرانے واقعات پر کچھ دیر غور کرنے کے بعد فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی خط میرے نام نہیں ہے۔ ہاں پہلے اور تیسرے خط میں جس مقدمے کا ذکر ہے۔ وہ میرا ہی مقدمہ ہے۔ میں ۱۹۳۳ء میں نظر بند تھا۔ ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے

کہ علامہ اقبال میرے مقدمے کی پیروی کے متعلق بعض وکلاء سے خط وکتابت کررہے تھے۔

میں اقبال نمائش کے سلسلے میں اس سے قبل بھی شیخ صاحب سے مل چکا تھا میرا خیال تھا کہ چونکہ شیخ محمد عبداللہ اور علامہ اقبال کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اور دونوں میں خط وکتابت رہی تھی۔ اس لئے ممکن ہے اقبال کے چند خطوط مجھے شیخ صاحب کے یہاں سے مل جائیں لیکن شیخ صاحب نے فرمایا کہ میرے پاس [illegible] خاصی تعداد میں لیکن ۳۳ء سے ۳۴ء کے زمانے میں پولیس نے جب چھاپے مارے تو اکثر اہم کاغذات اور مسودات کے ساتھ یہ خط بھی ضائع ہو گئے۔

اسی دوران میں جناب مالک رام سری نگر تشریف لائے۔ انہیں اقبال نمائش کے بارے میں پہلے ہی سے علم تھا کہ یہ اس وقت تکمیل کی منزلوں میں ہے اور عنقریب سری نگر میں اس کا افتتاح ہو رہا ہے۔ مالک رام صاحب اس سے قبل انگز یمیشن پونٹ کے ایڈمنگ روم میں آکر اس نمائش کو چھوٹے سائز کی تصویروں میں دیکھ چکے تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے مجھے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا تھا۔ اب سری نگر میں جب کشمیر نمائش کی بات چلی تو انہوں نے پوچھا کہ اس نمائش کا کیٹیلاگ تو تیار ہو چکا ہوگا۔ میرا جواب نفی میں پا کے انہوں نے کہا کہ نمائش کے لئے کیٹیلاگ کرنا بہت ضروری ہے ساتھ ہی انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ کیٹیلاگ کے علاوہ اقبال کا شجرۂ نسب اور حیات اقبال کی اہم تاریخوں کا بیان بھی لازمی ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی اس بات چیت میں شریک تھے۔ انہوں نے مالک رام صاحب کی ہامی بھری۔ اور مجھ سے کہا کہ اگر کیٹیلاگ حیات اقبال کی اہم تاریخیں ترتیب وار اور شجرۂ نسب تیار ہو جائے تو ہم اسے کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے کتابی صورت میں چھپوا دیں گے۔ بات اس سے آگے بڑھی۔ مالک رام صاحب نے کہا کہ نمائش تو ایک بار یا متعدد بار منعقد ہو کے ختم ہو جائے گی۔ یہ کتاب ایک یادگار کے طور پر رہ جائے گی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کتاب میں کلام اقبال کے ہندوستانی پس منظر پر بھی ایک

مقالہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ کلامِ اقبال کا یہ پہلو اس وقت اہلِ ملک کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ اور اسے منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس سارے کام کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔ میں نے بھی "ہر چہ از دوست می رسد نیکوست" کے پیشِ نظر یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ حالانکہ اقبال نمائش کے انعقاد میں صرف چند ہی روز باقی رہ گئے تھے۔ گویا میں جس کام کو بڑی حد تک سمیٹ کر ایک طرح سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے بعض حصوں کو از سرِ نو شروع کرنا پڑا۔

شجرۂ نسب۔

مقالے، حیاتِ اقبال کی اہم یادداشتوں اور فہرستِ تصاویر کے کام میں تو زیادہ وقت صرف نہ ہوا۔ پہلے ہی قدم پر ہمت نے جواب دے دیا۔ اقبال کا شجرۂ نسب اور خاندانِ اقبال اگرچہ میرے لئے نئے موضوع نہیں تھے۔ اور میں گذشتہ ربع صدی میں ان موضوعات پر ہندوستان اور پاکستان میں ماہرینِ اقبالیات مثلاً مولانا غلام رسول مہر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ جناب ممتاز حسن سکریٹری وزارت مالیات حکومتِ پاکستان۔ اور تفسیرِ وحید الدین مؤلف روزگارِ فقیر سے متعدد بار بات چیت کر چکا تھا۔ لیکن یہ گرہ نہ کھلنا نہ کھلی کہ اقبال کے جدِ امجد بابا لول حج کے کتنی پشتوں بعد شیخ جمال الدین پیدا ہوئے۔ یہ بات بھی قطعی طور پر مجھے معلوم نہیں ہو سکی کہ شیخ جمال الدین نے اپنے بیوی بچوں سمیت اٹھارہویں کے آخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی یا انیسویں کے شروع میں قرائن سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں ترکِ وطن کیا۔ میرے محترم مولانا عبدالمجید سالک کی یہ تحریر کہ سن ۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد بابا سالح کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بیشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی۔ واقعات و حقائق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ کیوں کہ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ

وہ جوان تھے۔

بہر طور یہ اور اس طرح کی دشواریاں شجرہ مرتب کرنے کی راہ میں حائل ہوئیں۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ شیخ جمال الدین کے بعد کوئی کڑی ٹوٹی نظر نہیں آتی اور یہ شجرہ میں نے جاوید اقبال اور منیرہ تک اہل نظر حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں اتنی احتیاط بھی ضروری ہے کہ جن تاریخوں کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا وہ درج نہیں کی گئیں۔

اظہارِ تشکر

بالعموم ہوتا یہ ہے کہ ایسے کاموں کے لئے کمیٹیاں بنادی جاتی ہیں جن کی وجہ سے یہ کام جب تکمیل پاتے ہیں تو بڑی حد تک اسقام اور خامیوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اقبال نمائش کی تشکیل و تکمیل کیلئے کوئی کمیٹی نہیں بنی۔ اس کام کی ذمہ داری تنہا مجھی پر تھی میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس کام کو ہاتھ لگایا۔ اور اب جبکہ یہ نمائش سری نگر میں منعقد ہو رہی ہے میرا دل اس خیال سے دھڑک رہا ہے کہ میری خامکاری نے اقبال نمائش کے نام پر جو کچھ پیش کر دیا ہے۔ خدا جانے یہ اقبال کے شایان شان ہے بھی یا نہیں۔

بہر طور مجھے اس سلسلے میں شائقینِ کلامِ اقبال سے اپنی کاوش کے متعلق صرف یہی کہنا ہے۔

ذرہ برخود فرو پیچد بیابانے نگر۔

اگرچہ اس کام کے لئے کوئی کمیٹی قائم نہیں ہوئی۔ لیکن میں جب اقبال تصویروں اور تحریروں کی تلاش میں ملک کے مختلف شہروں میں گیا تو میں نے اکثر ان حضرات سے انتخاب تصاویر کے بارے میں مشورہ کیا جنہیں اقبال اور کلام اقبال سے دلچسپی ہے۔ ان میں سے اکثر نام اس روداد کے پہلے حصے میں آچکے ہیں۔ بعض اور اسمائے گرامی جن کی اعانت مجھے قدم قدم پر حاصل رہی۔ یہ ہیں۔

جناب شیخ محمد عبداللہ۔ جناب خواجہ نورالدین، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ ڈاکٹر محمد حسن،

جناب پیر غیاث الدین، جناب محمد یوسف ٹینگ - جناب پی - این بقایا - جناب فرحت گیلانی - ڈاکٹر گیان چند - جناب بلراج پوری - جناب انور جمال قدوائی - سید سجاد ظہیر مرحوم - جناب غلام ربانی تاباں - جناب حیات اللہ انصاری - جناب علی جواد زیدی - نواب زادہ راحت سعید چھتاری - جناب مہدی عباس حسینی - پروفیسر آل احمد سرور - پروفیسر خورشید الاسلام - پروفیسر اسلوب احمد انصاری - ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی - ڈاکٹر یوسف حسین خاں - ڈاکٹر مسعود حسن خان - ڈاکٹر گوپی چند نارنگ - علی سردار جعفری - ڈاکٹر وحید اختر - محترمہ زاہدہ زیدی - جناب ایچ ایم رضوی - جناب مسعود علی ذوقی - قاضی عبدالودود - ڈاکٹر عابد رضا بیدار - اکبر علی عرشی زادہ - جناب ایم - این - جہا - جناب شمس الرحمٰن فاروقی - جناب خلیل اللہ - سید عبدالوہاب بخاری - جناب عبدالقادر حمادی جناب زاہد علی خان - جناب وامق راؤ - جناب محمد منظور احمد - ڈاکٹر رحیم الدین کمال - پروفیسر عالم خوندمیری - جناب اختر حسن - جناب امیر احمد خسرو - جناب امتیاز علی خاں عرشی - جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ - جناب میکش اکبر آبادی -

یہ فہرست حافظے کی مدد سے بنائی گئی ہے - اور یقیناً نامکمل رہ گئی ہوگی لیکن میرا مقصد اس تحریر سے کوئی نام گنوانا نہیں ہے بلکہ محض ان حضرات کی خدمت میں اظہار تشکر پیش کرنا ہے - جن کے قیمتی مشورے مجھے قدم قدم پر حاصل رہے -

اسی طرح جن اداروں سے اقبال کی تصویریں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں یا ان کے عکس حاصل کرنے میں امداد ملی ان کے منتظمین کا بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں - ان اداروں کے نام یہ ہیں -

عثمانیہ یونی ورسٹی لائبریری حیدرآباد - اقبال اکیڈمی حیدرآباد - خدا بخش لائبریری پٹنہ - دہلی یونی ورسٹی لائبریری دہلی - ابوالکلام آزاد لائبریری علی گڑھ - رضا لائبریری رامپور کشمیر یونی ورسٹی لائبریری سری نگر - جموں یونی ورسٹی لائبریری جموں -

---

سری نگر ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء

(۳)

یہ مژدہ کہ سری نگر میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اقبال نمائش کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے گوشے گوشے میں بجلی کی سرعت سے پھیل گیا۔ اور ریاست کی اکثر علمی ادبی، سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں کی طرف سے انعقاد نمائش کے لئے دست تعاون دراز ہوا۔ کشمیر یونیورسٹی کی اعانت ہمیں پہلے ہی حاصل تھی۔ اب اور جماعتوں نے بھی ہمارا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ ان میں کلچرل اکیڈمی اور محکمہ اطلاعات کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جناب محمد یوسف ٹینگ سکریٹری کلچرل اکیڈمی، جناب پی این بقایا۔ ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات اور جناب غلام نبی توری۔ ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات کا بروقت تعاون ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوا۔

آخر وہ تاریخی دن آپہنچا جو برصغیر میں شاید پہلی بار شاعر مشرق کے نام سے ساتھ ایک تصویری نمائش کی صورت میں منسوب ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی کے وہ اساتذہ وطلبہ جو ادبی کام میں ہمارے شریک تھے اور جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب پی این بقایا اور جناب غلام نبی توری مسرور تھے۔ کہ وادی کشمیر کو اقبال نمائش پیش کرنے کی اولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اور مجھ پر گھبراہٹ کی ایک کیفیت طاری تھی۔ جو کمرۂ امتحان میں داخل ہوتے وقت اس طالب علم پر طاری ہوتی ہے جس نے امتحان کے لئے پوری طرح تیاری نہ کی ہو۔ اس امتحان کے لئے میری بھی تیاری مکمل نہیں تھی۔ اقبال کی دختر نیک اختر منیرہ اور اقبال کی اساتذہ فرایڈ فیسر وائناسرٹے اور فرایڈ فیہ۔ یعنی ان کی تصویریں کوشش کے باوجود مجھے دستیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ بھوپال جانے کا مجھے وقت نہیں مل سکا تھا اور نتیجۃً اقبال کی پنشن کے بارے میں سر راس مسعود کا وہ خط جو انہوں نے نواب سر حمید اللہ خاں والی بھوپال کو لکھا تھا میں حاصل نہیں کر سکا۔ اس خط کا ایک ایک حرف شعر و ادب کی قدردانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور میں اسے نمائش میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

بھوپال ۔ جانے کے باعث پنشن کی منظوری ملنے کے بعد اقبال کا سر راس مسعود کے نام بھی میری دسترس سے باہر رہ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال اور بھوپال کے زیرِ عنوان سپکٹس کو میں جس طرح سے پیش کرنا چاہتا نہ کر سکا اسی طرح چند اور خامیاں بھی میری لگا میں تھیں، جو مجھے بری طرح کھٹک رہی تھیں اور جنہیں وقت ملنے پر میں رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا ۔

ہزاروں خواہش ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے ۔

ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ گیارہ سے جناب اندر کمار گجرال تشریف لائے ۔ میں تھوڑی دیر ان کی معیت میں رہ کر ایک بار پھر جناب شیخ محمد عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ کوئی ایک ہفتہ قبل ان کے برادرِ نسبتی کرنل غلام قادر کا انتقال ہو گیا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اپنے غم و اندوہ کے باعث شیخ صاحب تشریف نہ لا سکیں ۔ چنانچہ میں ایک طرح سے یاد دہانی کرنا چاہتا تھا شیخ صاحب نے، اگرچہ ابھی کرنل غلام قادر کے انتقال کا صدمہ تازہ تھا، تشریف لانے کا پکا وعدہ کیا اور وقت مقررہ پر تشریف لائے ۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے جلسے کی کارروائی شروع ہوئی ۔ ڈائس پر جناب میر قاسم وزیرِ اعلیٰ جموں و کشمیر، جناب ایل ۔ کے جھا گورنر جموں و کشمیر جناب اندر کمار گجرال وزیرِ اطلاعات و نشریات حکومتِ ہند ۔ اور مہمانِ خصوصی جناب شیخ محمد عبداللہ جلوہ افروز تھے ۔ جناب محمد یوسف ٹینگ کلچرل اکیڈمی اور جناب پی ۔ این بقایا ریاستی محکمہ اطلاعات کی نمائندگی کر رہے تھے ۔ سامنے صفوں اور کرسیوں پر کوئی پانچ سو کے قریب مہمانانِ گرامی تشریف فرما تھے ۔ باہر سے آئے ہوئے حضرات میں ڈاکٹر رفیق زکریا کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔

کارروائی ہوئی ۔ جناب محمد یوسف ٹینگ سکریٹری کلچرل اکیڈمی ۔ مہمانانِ خصوصی جناب محمد عبداللہ گورنر جموں و کشمیر جناب ایل ۔ کے جھا وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر جناب سید میر

قاسم صدر جلسہ افتتاح اور مہتمم تقریب نمائش جناب اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے اپنی تقاریر میں اقبال کی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب محمد یوسف ٹینگ نے خاندان اقبال کی جائے سکونت کے بارے میں تحقیق پر زور دیا۔ جناب شیخ محمد عبداللہ نے اقبال ریسرچ سنٹر قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا اور فرمایا کہ مجھے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے کا مشورہ علامہ اقبال نے دیا تھا۔ جناب ایل کے جھا نے اقبال کے سکولر کردار پر روشنی ڈالی۔ جناب سید میر قاسم نے اقبال کے شعوری ارتقاء کی منزل بہ منزل نشاندہی کی اور جناب اندر کمار گجرال نے کلام اقبال کے آفاقی پہلو کو اجاگر کیا۔ آپ نے اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے دردِ وطن کی تان دردِ عالم ہی پر ٹوٹتی تھی۔ اس ضمن میں آپ نے خاص طور سے اقبال کے آخری دور کی نظم "شعاعِ امید" کا حوالہ دیا اور کہا کہ اگرچہ اس نظم کے نقطۂ عروج پر خورشید ہندوستان کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

لیکن خورشید کے پیغام کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی ایک شوخ کرن، پر اپنی تمنا کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر۔

ان تمام تقریروں کے لئے زیر نظر کتاب میں ایک الگ باب وقف کیا گیا ہے جب تک ہمیں انتظامات وغیرہ کے سلسلے میں کلچرل اکیڈمی کشمیر اور محکمۂ اطلاعات و نشریات جموں و کشمیر کا تعاون حاصل نہ ہوا تھا اس وقت خیال یہ تھا کہ خطبۂ استقبالیہ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر شکیل الرحمن پڑھیں گے۔ بعد میں پروگرام میں تبدیلیوں کی

بناپر خطبہ استقبالیہ کلچرل اکیڈمی کی طرف سے جناب محمد یوسف ٹینگ نے پیش کیا لیکن ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اس موقع کے لئے جو خطبۂ استقبالیہ تیار کیا تھا۔ وہ ایک ادب پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے شائقین کلام اقبال کو محروم رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے تقاریر والے باب میں یہ خطبہ بھی شامل کیا جا رہا ہے

جناب شیخ محمد عبداللہ نے جنہوں نے تین روز قبل اس ساری نمائش کو ایک گھنٹے سے زائد وقت دے کر پوری توجہ سے دیکھا تھا اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ "اس نمائش میں "اقبال اور کشمیر" نام کا کوئی سیکشن نہیں ہے اگر یہ کسی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے تو میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور اگر یہ بات غیر شعوری طور پر ہوئی ہے تو اس کمی پورا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ میں نے اس کے جواب میں مختصراً کہا کہ "اقبال اور کشمیر" نامی سیکشن کی عدم موجودگی کسی قسم کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر یہ خامی ہے تو اسے نمائش میں میری متعدد خامیوں میں سے ایک خامی سمجھا جا سکتا ہے اس نمائش میں جس قدر بھی کوتاہیاں اور خامیاں ہیں ان کے لئے میرے سوا اور کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ درحقیقت اس نمائش کی بعض خامیاں اس وقت تک ایک خلش بن کر میرے دل میں موجود ہیں مثلاً "اقبال کا خاندان" نامی سیکشن میں منیرہ کی ایک تصویر کی عدم موجودگی ۔ "اقبال کے اساتذہ" والے سیکشن میں پرایڈ فیسر نگلسن، سٹ اور رفرا پروفیسر لین۔ پی کی لتہ مازیر کی کمی۔ خلافت ہاوس بمبئی اور بھوپال کے تعلق سے اقبال کے ہاتھ کی لکھی اکثر تحریروں کا فقدان وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ یہ نمائش اقبال کی تصویروں اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اس لئے جب تک اقبال کی کوئی ایسی تصویر نہ مل جائے جو انہوں نے قیام کشمیر کے دوران میں کھنچوائی ہو یا کشمیر کے تعلق سے ان کے ہاتھ کی کوئی تحریر حاصل نہ ہو جائے۔ اقبال اور کشمیر نام کا سیکشن بنانا دشوار ہے۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ کشمیر کے تعلق سے اقبال کا ایک خط جناب محمد الدین فوق کے نام اس نمائش میں شامل ہے۔ اگر شیخ صاحب اور دوسرے حضرات مشورہ دیں تو اس خط کو اقبال کے اس شجرۂ نسب کے ساتھ جو میں نے مرتب کیا ہے۔ شامل کر کے

اسے "اقبال اور کشمیر" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے بات بنے گی نہیں۔ اس لئے سر دست یہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ محترم المقام شیخ صاحب کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ کشمیر کے تعلق سے اقبال کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کی تلاش جاری ہے اگر تین چار خطوط یا تحریریں دستیاب ہو جائیں یا کسی کشمیری مصنف کی کوئی ایسی مستند پرانی کتاب مل جائے جس سے حیاتِ اقبال کے کسی گوشے پر روشنی پڑتی ہو یا اقبال کا کلام کسی کشمیری مصور کی نقوش کی صورت میں حاصل ہو جائے تو میرے لئے "اقبال اور کشمیر" نام کا شیکشن مرتب کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ مناسب تصاویر کی موجودگی میں "اقبال اور مسجد قرطبہ"، اقبال اور الحمرا۔ اور اقبال حیدرآباد کے مصوروں کی نظر میں" کے زیرِ عنوان تکنیکی اعتبار سے مشکل شیکشن جب مرتب ہو گئے تو "اقبال اور کشمیر" مرتب کرنے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ہاں مناسب تحریروں اور نقوش کی فراہمی شرط ہے۔ ؎ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے۔

ہاں تو میں جلسۂ افتتاحِ نمائش کا ذکر کر رہا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے جناب اندر کمار گجرال نے اپنی تقریر کے ساتھ نمائش کا افتتاح کیا۔ رسمِ افتتاح کے ساتھ ہی تمام مدعو حضرات نمائش گاہ میں داخل ہوئے اور ہر ایک نے پچیس منٹ تک اس نمائش کے بعض حصوں کو دیکھا ٹھیک پانچ بج کر پچپن منٹ پر اقبال ایلنڈ زندہ کے ساتھ دن کا پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ دوسرے دن یعنی ۲۷ اکتوبر سے مشرق کے اس فلسفی شاعر کی یاد میں نمائش ہر خاص و عام کے لئے کھل گئی جس کے ہر ہر نقش نے انسان کو یہ پیغام دیا تھا۔

تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ
آں چناں زی کہ بہ ہر ذرہ رسانی پرتو

سری نگر
۲۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء

تصاویر کے ماخذ

اقبال نمائش کی تصاویر کے لئے تلاش و جستجو کی کہانی میں بیان کرچکا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے اکثر تصاویر اور تحریریں مختلف روزناموں، ہفتہ وار اخبارات، ماہناموں، اور کتابوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بعض تحریروں کے عکس اور تصاویر میرے پاس موجود تھیں۔ اور بعض مجھے اپنے دوستوں کے ذریعے سے ملیں۔

لیکن یہاں یہ اعتراف ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر تصاویر میں نے فقیر سید وحیدالدین مرحوم کی تالیف "روزگار فقیر (اول و دوم)" جناب بشیر احمد ڈار سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی پاکستان (کراچی) کی کتاب "انوار اقبال"، مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب "ذکر اقبال" اور شیخ عطاء اللہ کی تالیف "اقبال نامہ" سے حاصل کیں۔

روزگار فقیر کی دونوں جلدیں مجھے کراچی میں میرے محترم دوست فقیر وحیدالدین نے عطا کی تھیں۔ اور "انوار اقبال" (مجھے محب صادق ممتاز حسن احسن کی عنایت سے جنہوں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے) ملی تھی۔ "ذکر اقبال" خود سالک صاحب مرحوم کا عطیہ ہے۔ اگر یہ تینوں کتابیں میرے پاس نہ ہوتیں تو اقبال نمائش کی تیاری میں خاصی دقت کا سامنا ہوتا۔

مسجد قرطبہ کی تصاویر میں نے TORRES BALBAS کی تصنیف LA MEZQUITADE CORDOBA Y LAS RUINAS DMADINAT سے حاصل کی ہیں جو میں اپنے ساتھ ۱۹۴۲ء میں سپانیہ سے لایا تھا۔ "زمانہ" کانپور، "ادیب" الٰہ آباد، "المعصر" الہ آباد، "مخزن" دہلی، "مخزن" لاہور اور "ماہِ نو" لاہور، "پاکستان ٹائمز" لاہور۔ "نوائے وقت" لاہور اور "جنگ" کراچی کے بعض شمارے بھی اس

سلسلے میں بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

یہی ان تمام متفرق کتابوں، ماہناموں یا روزناموں کا ذکر بہت دشوار ہے۔ جہاں سے بعض تصویریں یا اقبال کی تحریر کا کوئی حصہ میں نے حاصل کیا۔ ممکن ہے کسی کتاب یا رسالے کا نام مجھے اس وقت یاد نہ رہا ہو۔

فقیر سید وحیدالدین مرحوم کے ساتھ میری آخری ملاقات کراچی میں ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ میں جناب ممتاز حسن کے ہاں مقیم تھا اور انہیں کے ساتھ میں فقیر صاحب سے مل گیا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم تھا کہ یہ میری ان کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔

فقیر صاحب نے اس ملاقات میں جب مجھے "روزگار فقیر" جلد دوم عطا کی تو اس میں اقبال کی تصاویر کی اتنی تعداد دیکھ کے حیران رہ گیا۔ میں نے اس وقت ان سے عرض کیا کہ ان تصاویر کو تو ایک البم کی صورت میں شائع ہونا چاہئے۔ انھوں نے فرمایا کہ اقبال کی تصاویر پر مشتمل میں ایک البم بھی شائع کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ ان تصاویر کے علاوہ میرے پاس بھی اقبال کی تصاویر اور تحریروں کے عکس کی خاصی تعداد موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان تمام تصویروں اور تحریروں کو ملا کر ایک ضخیم البم شائع کیا جائے۔ فقیر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس البم کے علاوہ جو اس وقت میں مرتب کر رہا ہوں ایک البم آپ مرتب کریں۔ یہ البم ہندوستان کی مختلف زبانوں میں چھاپے جائیں۔ ممتاز حسن مرحوم نے اس تجویز کو بے حد پسند کیا اور کہا کہ آپ کو "انوار اقبال" میں سے بھی تصاویر لینا چاہئیں۔ اور اس کے علاوہ وہ بھی جہاں جہاں سے تصویریں یا تحریریں ملیں انہیں البم کی صورت میں یکجا کر دینا چاہئے لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ البم ہندوستان کی متعدد زبانوں میں ہو۔ بالخصوص ہندی میں کیونکہ "اقبال ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ میراث ہے۔"

لیکن اقبال ایسے عظیم شاعر اور مفکر کی تصویریں اور تحریروں کے عکس جمع کرنے کے معاملے میں یہ کام کی ابتدا ہے۔ یہ ذمہ داری نئی نسل کے قدردانِ اقبال کی ہے کہ

وہ اس کام کو آگے بڑھائیں تاکہ انجام کار یہ کام اقبال کی عظمت کے شایان شان بن سکے۔

ع۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

اقبال نمائش کی تشکیل و تکمیل کی کہانی ہر اعتبار سے نامکمل رہے گی اگر میں یہاں اپنے رفیق کار فرحت گیلانی کی اُس امداد کا ذکر نہ کروں جو مجھے حاصل رہی۔

اس روز سے کہ جب میں نے اقبال نمائش کی بنیادی کاپی (MASTER COPY) تیار کرنا شروع کی نمائش کی تکمیل تک فرحت گیلانی نے ہر منزل میں میرا ہاتھ بٹایا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اگر وہ اس سلسلے میں اپنا قیمتی وقت نہ دیتے تو مقررہ تاریخ تک اقبال نمائش کی تکمیل ممکن ہی نہیں تھی۔ ان کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا انتہائی خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

جگن ناتھ آزاد

سری نگر
۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء

جگن ناتھ آزاد کو اقبال ایوارڈ

حیدرآباد ڈاک سے اقبال اکیڈمی حیدرآباد نے اپنا سالانہ اقبال ایوارڈ اس سال پروفیسر آزاد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ جس کی ابتدا ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی پہلے سال پروفیسر غلام دستگیر رشید کو دیا گیا تھا۔ دوسرے سال یہ ایوارڈ ڈاکٹر عالم خوندمیری کو (بعد از مرگ) دیا گیا تھا اس سال یہ ایوارڈ اقبال اسکالر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دیا جا رہا ہے۔ ایوارڈ کی تقریب عنقریب حیدرآباد میں منعقد ہوگی۔

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی
جولائی ۱۹۸۷ء

خطبۂ استقبالیہ

جناب محمد یوسف ٹینگ، سکریٹری کلچرل اکیڈمی سری نگر

اقتباس

صدرِ محترم، معزز مہمانِ خصوصی، عالی جاہ گورنر صاحب، جناب گجرال صاحب اور حضرات! اقبال کو سرزمین کشمیر سے جو نسبت اور کشمیر کی تحریک آزادی سے جو قربت رہی ہے۔ اس کے پیشِ نظر اقبال کی زندگی، شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر حاوی اس تصویری نمائش کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لئے ہم سب عاشقانِ اقبال آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیری تھے یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اقبال نے خود کو "گلِ خیابانِ جنتِ کشمیر" کہہ کر اپنے کشمیری نژاد ہونے پر فخر کیا ہے۔ یہ ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے۔ لیکن اقبال نے اپنے فن اور فکر کے چراغ جلا کر انسانیت کے احساسِ جمال اور اس کی بصیرت کے افق میں جو وسعت اور گیرائی پیدا کی اس کے لئے ساری دنیا ان کی احسان مند ہے۔ اقبال کی شخصیت اتنی عظیم اور ان کا فن اس قدر دلاویز ہے کہ انہیں کسی خاص چوکھٹے یا قالب میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے ایک دوسرے سیاق و سباق میں اپنے بارے میں کہا ہے کہ

ہمہ می گویند کہ در خانقاہ میں اقبال
کہ کتنا ظریف و خوش اندیشہ و رنگیں سر دماغ

موجودہ نمائش کو اگرچہ اقبال کی زندگی اور فن کے تمام پہلوؤں پر محیط قرار دینا درست نہ ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نمائش اس پہلو میں ایک نہایت شاندار ابتدا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں یہ اقبالیات کے اس خاص پہلو پر اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ اقبال کو اگرچہ انتقال کئے ہوئے صرف ۲۵ سال کا عرصہ گذرا ہے لیکن ان کی زندگی افسانے اور اساطیر کے دھند میں پوشیدہ ہونا شروع ہو چکی ہے۔ ان کے مخالف ان پر طرح طرح تہمتیں تراشتے ہیں اور ان کے عقیدت مند انہیں انسان کی بجائے کسی ماورائی دنیا کا باشندہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس سارے افراط و تفریط میں وہ زندہ، جوان اور خوش ذوق و خوش فکر اقبال ہماری نگاہوں سے چھپ جاتا ہے جس نے انسانی جمالیاتی سرحدیں وسیع کریں۔ آج کی نمائش میں ہمیں اقبال ایک رند پاکباز اور ایک نامہ شاہد باز کی رنگا رنگی میں ملتے ہیں۔ اقبال جو ایک طرف تو مسجد قرطبہ میں محو نماز ہیں اور دوسری طرف عطیہ فیضی کے ساتھ محو کلام۔ شاید انہیں مواقع کے لئے کہا گیا تھا۔

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

نمائش میں اقبال کی بھرپور، بالیدہ، بارآور اور بار زندگی کے دھڑکتے اور گنگناتے ہوئے لمحے ہماری نگاہوں کے سامنے حرکت کرنے لگتے ہیں اور اقبال اپنے تاریخی، تہذیبی اور سماجی پس منظر کے سارے کیف و کم کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ اگر نمائش کو دیکھنے کے بعد حیات اقبال کے کچھ گوشوں کی غیر موجودگی کا احساس ابھرے تو اسے بھی اس نمائش کی کامیابی کا ایک معیار ماننا پڑے گا۔ کیونکہ نقش ثانی تو خود اقبال کے الفاظ میں نقش اول کا محتاج ہوتا ہے۔

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

اس نمائش کی ترتیب اور تنظیم کے لئے مرکزی وزارت اطلاعات اور اس کے خوش ذوق وزیرِ مملکت جناب اندر کمار گجرال اور مرکزی وزارت اطلاعات کے سکریٹری جناب انور جمال قدوائی کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے ملک کے مایۂ ناز اقبال شناس جناب جگن ناتھ آزاد اس نمائش کے خالق ہیں اور انہیں اقبال اور کلام اقبال سے جو شیفتگی ہے۔ حاصل یہ نمائش اسی کا ایک خوبصورت اظہار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آزاد صاحب کی اقبال شناسی، خوش فکری اور ان کی محنت کے بغیر یہ نمائش تخلیق کے اس رتبے کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ آزاد صاحب نے تصاویر کی فراہمی میں ہی اپنا خون جگر صرف نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کی ترتیب اور تشکیل میں اپنے شاعرانہ مزاج کی تمام نفاستوں اور نزاکتوں کا نیاضانہ استعمال کیا ہے مجھے ذاتی علم ہے کہ مسجد قرطبہ کی بعض تصاویر کو اقبال کے متعلقہ اشعار کے زاویوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں انھوں نے کتنی دماغ سوزی سے کام لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نمائش کے سارے حسن تہذیب اور جمال تزئین کا سہرا جناب جگن ناتھ آزاد کی لگن اور اقبال نوازی کے سر ہی جاتا ہے۔

جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں کشمیر اور اقبال کی اس نمائش میں ایک بڑا خوبصورت ربط موجود ہے۔ اقبال نے صرف کشمیر کے لئے آنسو ہی نہیں بہائے ہیں بلکہ انہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے بڑے کشمیریوں کو اپنے دیدۂ تر کی ساری شادابیاں بخش دی۔ خوش قسمتی سے جناب شیخ محمد عبداللہ اس وقت مہمان خصوصی کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ وہ اقبال کے ممتاز مداح ہی نہیں ان کے عزیز دوست بھی رہے ہیں اور اس طرح سے ان کی موجودگی اس تقریب کو تاریخی وزن و وقار بخشنے کا موجب بنی ہے خود ان کا بیان ہے کہ جب ۱۹۳۱ء میں تحریکِ آزادی کی ابتدا میں اپنے جلسوں میں کلام اقبال سناتا تھا۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ دلوں سے چنگاریاں اور فضاؤں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اقبال نے جدید کشمیری شاعری کے امام حضرت مہجور کاشمیری کو بھی

متاثر کیا۔ انہوں نے مہجور کو ۱۹۳۲ء میں لکھا، میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت کا عنقریب پلٹا کھانے والا ہے۔ اور ان کے آئینۂ ادراک میں نظر آنے والا یہ کشف پورے سال کے بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں پردۂ افلاک سے باہر آگیا جب اقبال کے الفاظ میں ہی

"ملتے برخیز از خاکِ قبور" مہجور کے بعد عبدالاحد آزاد، رحمان راہی، غلام رسول نازکی اور دینا ناتھ نادم جیسے سرخیل شعراء کے چراغ سے چراغ جلاتے رہے ہیں اور اس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں۔

جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

آخر میں یہ عرض کرنے جسارت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ گاؤں جہاں سے اقبال کے اجداد آج سے سالہا سال پہلے ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوئے۔ ایک شایانِ شان یادگار کیلئے آج بھی نوحہ کناں ہے۔ یہ آزادی کے بعد ہمارے ذوقِ حسن و زیبائی پر ایک قرض ہے۔ اس معدنِ گوہر کے زبان ہوتی تو کچھ اس طرح محوِ کلام ہوتا

یعقوب کے نہ کلبۂ احزاں تلک گئے
صد کاروانِ مصر کے کنعاں تلک گئے

میں ایک اور بار آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں

سری نگر۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء

استقبالیہ

جو

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، ایم۔ اے، ڈی۔ لٹ صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے
اقبال نمائش کی افتتاحی تقریب منعقدہ ۷ ہر اکتوبر ۱۹۷۳ء کیلئے لکھا۔

فضیلت مآب جناب ایل۔ کے جھا صاحب۔
صدر گرامی منزلت، عزت مآب جناب سید میر قاسم صاحب۔
مہمان خصوصی محترم جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب۔
ذی احترام عزت مآب جناب اندر کمار گجرال صاحب۔
اراکین کمیٹی "اقبال نمائش"
مہمانان گرامی، خواتین حضرات۔

(اقتباس)

کشمیر یونیورسٹی کی "اقبال نمائش" مشرق کے ایک عظیم دانشور اور ایک بڑے فنکار کو ایک بار پھر سمجھنے اور اس سے اپنے باطنی رشتوں کو پرکھنے اور داخلی رشتے کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی ایک کوشش ہے۔ پچھلے برسوں میں بھی ہم اقبال سے دور نہیں رہے۔ آزادی کے بعد مختلف طبقوں کے لوگوں نے ان کے افکار و خیالات اور ان کے شعری تجربوں سے گہری روشنی حاصل کی ہم جب بھی روشنی

کے طالب ہوتے اقبال کی طرف بھی دیکھا ہوتا کہ وہ سراپا روشنی ہیں۔ روشنی کا طالب پروانہ ہوتا ہے جگنو نہیں ہوتا۔ اقبال نے کہا تھا۔

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب یہ روشنی سراپا

(۲)

ہم پروانے ذوق و جستجو کی تپش لئے "طور شمع" کے کلیم بن کر ہمیشہ بیقرار رہے اقبال ہمیشہ جگنو کی طرح اپنی روشنی کے ساتھ چمکتے رہے۔ اقبال نمائش اسی روشنی کو پانے کی ایک کوشش ہے۔

صدر محترم! اس تاریخی نمائش کا افتتاح کشمیر میں ہو رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری میں اس دھرتی کی خوشبو ہر جگہ موجود ہے۔

جناب والا! اسی سال کشمیر یونی ورسٹی نے "اقبال ہفتہ" منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کی یہ خواہش تھی کہ اقبال نمائش کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ اس وقت میرے اور میرے عزیز دوستوں کے ذہن میں اس نمائش کی تصویر نہیں تھی۔ ہم نے صرف یہ چاہا تھا کہ کشمیر کے بزرگوں اور دوستوں سے گذارش کر کے اقبال کی چند تصویریں اور ان کی تحریریں حاصل کریں۔ اور چھوٹی سی نمائش کا انتظام کریں۔ ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ ہم لوگوں کے اس چھوٹے سے خواب کی تعبیر اتنی خوبصورت ہوگی۔ دعا دیتے ہیں اردو کے معروف شاعر اور اپنے عزیز دوست جناب جگن ناتھ آزاد کو جنہوں نے ایسی تجویز رکھی کہ ہم اقبال کو ان کی تصویروں اور ان کی اپنی تحریروں کے ذریعے ایک بار پھر پانے کے لئے بیقرار ہو گئے۔ ہم نے کشمیر یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب خواجہ نور الدین مرحوم کے سامنے یہ تجویز رکھی اور انہوں نے جناب اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات و نشریات حکومت ہند سے بات کی اور اس کے

گے اب اس چھپے سے۔ تو اب ان کی تصویریں سامنے آ رہی ہیں۔

جناب صدر! یہ اقبال نمائش جناب آئی۔ کے۔ گجرال صاحب کی اقبال شناسی اور اردو نوازی کا ایک معنی خیز اشارہ ہے۔ جب انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کی اس تجویز کو منظور نہیں فرمایا بلکہ ذاتی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت ہند کے ایسے اراکین کے ذمے یہ کام سپرد کیا جو صرف ذمہ داری کے احساس کے ساتھ نہیں اقبال سے اپنی عقیدت اور محبت کے جذبے کے ساتھ بھی اس دلچسپ لیکن انتہائی دشوار کام میں لگ گئے اور آج ان ہی حضرات کی محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ جان پرور نمائش ہو رہی ہے۔ جناب آئی۔ کے۔ گجرال کے اس کرم کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے

جناب صدر، آپ کی اجازت سے کشمیر یونیورسٹی اور شعبۂ اردو کی طرف سے عزت مآب جناب اندر کمار گجرال صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ اس محفل میں تشریف لائے ہمیں عزت بخشی۔ اس تاریخی نمائش کا افتتاح قبول کرنا فرمایا اور ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ میں آپ کا پر خلوص استقبال کرتا ہوں

اس تاریخی نمائش کی تشکیل اور ترتیب میں جناب جگن ناتھ آزاد کے خون جگر کی پہچان ہر جگہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد صاحب اس نمائش کے خالق ہیں۔ جناب اندر کمار صاحب، تدوانی سے مفید مشوروں کے بعد جگن ناتھ آزاد صاحب نے اس نمائش کا ایک خاکہ بنایا اور ایک فنکار کی طرح اس کی تخلیق میں مصروف ہو گئے۔ اس کے سلسلے میں دہلی، علی گڑھ، حیدرآباد، رامپور اور پٹنہ کا سفر کیا۔ "اقبال نمائش" ان کے لئے تخلیق کا عمل تھا۔ وہ اس کی تخلیق میں تنہا ہیں اور اس نمائش کو مرتب کرتے ہوئے وہ اسی کرب سے گذرے ہیں جس سے ایک باشعور فنکار گذرتا ہے۔ ۔ ۔

جناب جگن ناتھ آزاد اردو کے ایک جانے پہچانے اور معروف شاعر ہیں اور اس حیثیت سے انہیں سب جانتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو ابھی تک نگاہوں سے چھپا ہوا تھا۔ آزاد علامہ اقبال کے عاشق ہیں اس بڑے حکیم نکتہ داں پر انہوں نے بہت کام کیا ہے۔ دو سال قبل انہوں نے کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر علامہ

اقبال پر تین توسیعی لیکچر دیئے تھے۔ اس کے بعد جموں یونی ورسٹی کی دعوت پر انھوں نے جموں میں اقبال پر لیکچر دیئے۔ پچھلے دنوں ایک بار پھر کشمیر یونی ورسٹی کی دعوت پر علامہ اقبال کے افکار و خیالات پر ایک توسیعی لیکچر دیا۔ "اقبال شناسی"، جگن ناتھ آزاد کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ جس کے لئے میں کشمیر یونی ورسٹی کی طرف سے انہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اقبال کے نورِ بصیرت کو عام کرنے میں وہ جس لگن سے کام کر رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہوئے میں ان کے لئے خداوند کریم سے دعا کرتا ہوں۔

جناب صدر صاحب آپ ملک میں سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کے ایک بڑے علمبردار ہیں۔ جب آپ طالب علم تھے تو اقبال آپ کے مطالعے کا ایک خاص موضوع تھا۔ اس بات کا ذکر آپ نے اپنی تقریروں میں کیا ہے آپ کی بھی یقیناً یہ خواہش ہے کہ ان تصویروں کی علامتی روشنی نئی نسل تک پہنچے۔

اس محفل کی تازگی اہمیت کا احساس اور بڑھ گیا ہے۔ جب ہم اس محفل میں آج ایک عظیم قائد عالی جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب کو اپنے قریب دیکھ رہے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی اور شعبۂ اردو کی طرف سے میں ان کا پرتپاک استقبال کرتا ہوں۔ آپ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس محفل میں شریک ہیں اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ آپ کی ذات ایک شجرِ سایہ دار کی ہے آپ کو دیکھ کر مجھے اقبال کا محبوب پھول "لالہ" یاد آتا ہے جو دل سوز ہے، سرمست ہے، خودرو ہے، اور دل کی وساطت سے آفاق کی تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس محفل میں تشریف لائے۔ ہمیں عزت بخشی۔ اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ایک بار پھر آپ کا پرتپاک استقبال کرتا ہوں۔

اقبال نمائش
فہرست تصاویر

(۱)

صدر دروازہ

۱ ۔ اقبال ——— محو مطالعہ

۲ ۔ اقبال ——— ایامِ پیری میں

(۲)

اقبال کی کہانی تصویروں کی زبانی

۳ ۔ اقبال ۔ لاہور ۔ ۱۸۹۹ء

۴ ۔ ایک تاریخی اجتماع ۔ مہمانِ خصوصی نواب سر سلیم اللہ ۔ اقبال کرسی [illegible]
صف میں دائیں طرف پہلے نمبر پر ۔ تیسرے نمبر پر خواجہ الف دین ۔ ان
کے آگے خواجہ محمد دین ایڈووکیٹ ۔ فرش پر منشی محمد دین فوق امرتسر [illegible]
[illegible] ایک تاریخی اجتماع فرش پر بیٹھے ہوئے دائیں
[illegible] عبدالقادر ۔ حافظ [illegible]

پہلی صف ، دائیں سے بائیں : غلام محمد منشی ، مرزا اکبر حیدری ، نواب وقار الملک حکیم محمد اجمل خاں ، مولانا الطاف حسین حالی ، عزیز مرزا محسن الملک ، مرزا محمود علی خاں منشی محبوب عالم ، کرسیوں پر دوسری صف ۔ دائیں سے بائیں ۔ علی الدین حسن ، مولانا شبلی نعمانی ، پروفیسر آرنلڈ ، نذیر احمد ، نواب ابوالحسن خان ، تیسری صف میں کھڑے ہوئے ۔ دائیں سے بائیں ۔ مولینا ظفر علی خاں (دستار میں) ، اقبال ، مولوی نور المنیب اللہ حیدرآبادی ۔ چوتھی صف میں ، دائیں سے بائیں :- ابوالحسن ، خواجہ غلام الثقلین ، حبیب الرحمن خاں شروانی مسعود علی ندوی وغیرہ ۔ دہلی ۱۹۰۲ء

۶۔ کیمبرج میں ایک پکنک ۔ اقبال تیسرے نمبر پر بیٹھے ہیں ۔ پس منظر میں سید علی بلگرامی کی قیام گاہ ۱۹۰۶ء

۷۔ اقبال ہائیڈل برگ میں ۔ دائیں طرف استادہ ۱۹۵۶ء

۸۔ اقبال ۔ لندن ۱۹۰۷ء

۹۔ اقبال اور عطیہ فیضی ہائیڈل برگ ۱۹۵۷ء

۱۰۔ اقبال ۔ جرمنی ۱۹۰۷ء

۱۱۔ میونخ (جرمنی) کا ایک گروپ فوٹو ۔ اقبال کرسیوں کی صف میں بائیں طرف سے پہلے نمبر پر ۱۹۰۷ء

۱۲۔ اقبال ۔ لندن ۱۹۰۷ء

۱۳۔ تاریخی گروپ ۔ اسلامیہ ہائی اسکول ہوشیارپور کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر ۔ سنگ بنیاد نواب وقار الملک مشتاق احمد نے رکھا ۔ تصویر میں :- میاں محمد شفیع صاحبزادہ ۔ اقبال احمد خاں اور دوسرے معززین ۔ اقبال میاں محمد شفیع کے پیچھے استادہ ۔ دسمبر ۱۹۰۸ء

۱۴۔ گورنمنٹ کالج لاہور ۔ اقبال پہلی صف میں دائیں سے تیسرے نمبر پر ۱۹۱۰ء

۱۵۔ شاہی مسجد لاہور۔ اقبال "حضور رسالت مآب میں" پڑھ رہے ہیں، "گراں جو مجھ پہ ہنگامہ زمانہ ہوا" ۱۹۱۱ء

۱۶۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا کی عیادت کے موقع پر۔ اقبال دائیں طرف سے تیسرے نمبر پر۔ فقیر سید افتخار الدین بائیں طرف سے پہلے نمبر پر۔ ہوشیارپور ۱۹۱۱ء

۱۷۔ اقبال لاہور ۱۹۲۰ء

۱۸۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان۔ لاہور ۱۹۲۲ء

۱۹۔ شملے کا ایک گروپ پہلی صف میں دائیں طرف سے۔ اقبال ہز ایکسیلنسی سردار عبدالقدوس خان اور نواب ذوالفقار علی خان پچھلی صف میں نواب زادہ رشید علی خاں اور نواب زادہ خورشید علی خاں ۱۹۲۲ء

۲۰۔ اپنی لائبریری میں۔ لاہور ۱۹۲۲ء

۲۱۔ اقبال۔ شملہ ۱۹۲۲ء

۲۲۔ اقبال۔ لاہور ۱۹۲۳ء

۲۳۔ اقبال۔ لاہور "پیام مشرق" کی اشاعت کے فوراً بعد ۱۹۲۵ء

۲۴۔ ڈاکٹر سید علی نقی کی الوداعی پارٹی۔ درمیان میں گورنر پنجاب۔ سر میلکم ہیلی دائیں طرف اقبال اور بائیں طرف سید علی نقی گورنمنٹ ہاؤس لاہور ۱۹۲۶ء

۲۵۔ خالصہ کالج امرتسر کی ایک تقریب ۱۹۲۷ء

۲۶۔ بعض سکھ معززین کے ساتھ امرتسر ۱۹۲۷ء

۲۷۔ مدراس کے اساتذہ، طلباء اور معززین شہر کے ہمراہ اقبال دائیں طرف سے آٹھویں نمبر پر ۱۹۲۹ء۔

۲۸۔ اقبال میسور میں۔ بائیں طرف فلسفے کے پروفیسر اے۔ آر۔ واڈیا اور ڈاکٹر گوپالا سوامی ۱۹۲۹ء

۲۹۔ سلطان ٹیپو کے مزار پر۔ سرنگا پٹم ۱۹۲۹ء

۳۰۔ حیدرآباد میں ۱۹۲۹ء

۳۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں۔ پہلی صف میں دائیں سے بائیں۔ خواجہ سجاد حسین ریمز ہاٹم۔ اقبال۔ سر راس مسعود۔ خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر خالد شیلڈرک ۱۹۲۹ء

۳۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں (نا) ایک نادر گروپ (۱۹۲۹ء)

۳۳۔ طلبائے حیدرآباد دکن کے ہمراہ۔ لاہور ۱۹۲۹ء

۳۴۔ اقبال۔ لاہور۔ ۱۹۳۱ء

۳۵۔ لندن روانہ ہونے سے قبل۔ دائیں سے بائیں۔ شوکت کاظمی افغان کلچرل اتاشی۔ اقبال۔ صلاح الدین سلجوقی۔ افغان قونصل بمبئی۔ میر ریاض احمد، سکریٹری سفارت افغانستان۔ بمبئی ۱۹۳۱ء۔

۳۶۔ امیر تاشیر گل کی کھینچی ہوئی تصویر۔ پیرس ۱۹۳۱ء

۳۷۔ امیر تاشیر گل کی کھینچی ہوئی ایک اور تصویر پیرس ۱۹۳۱ء

۳۸۔ اقبال اور سر محمد ظفر اللہ خاں بکنگھم پیلس، لندن ۱۹۳۱ء

۳۹۔ دوسری گول میز کانفرنس۔ لندن ۱۹۳۱ء

۴۰۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر۔ اقبال (دائیں طرف) بائیں طرف مولانا شوکت علی اور دائیں طرف تیسرے نمبر پر سر عبدالقادر۔ چھٹے نمبر پر سید امجد علی۔ لندن ۱۹۳۱ء

۴۱۔ فلسطین میں۔ اقبال دائیں طرف سے چوتھے نمبر پر عمائدین عرب کے درمیان مفتی اعظم امین الحسینی بیٹھے ہیں۔ یروشلم ۱۹۳۱ء

۴۲۔ موتمر اسلامی۔ اقبال پہلی صف میں دائیں طرف ان کے بعد السید عبدالعزیز و دو شیخ عبدالقادر المدفر ہیں۔ یروشلم دسمبر ۱۹۳۱ء

۴۳۔ اقبال۔ بمبئی۔ ۱۹۳۱ء

۴۴۔ دوسری گول میز کانفرنس۔ لندن ۱۹۳۱ء

۴۵۔ تیسری گول میز کانفرنس۔ لندن ۱۹۳۲ء

۴۶۔ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر۔ دائیں سے بائیں۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خان
حافظ ہدایت حسین۔ اقبال۔ ہزہائی نیس سر آغا خان چودھری
ظفراللہ خان۔ عبدالحلیم غزنوی۔ سید امجد علی۔ لندن ۱۹۳۲ء

۴۷۔ نیشنل لیگ لندن کا استقبالیہ۔ اقبال۔ سید امجد علی۔ لیڈی سائمن وغیرہ
۱۹۳۲ء

۴۸۔ لندن میں ایک استقبالیہ۔ ۱۹۳۲ء

۴۹۔ چند احباب کے ساتھ۔ کھڑے ہوئے۔ چودھری رحمت علی بیٹھے ہوئے
پیر حسن الدین۔ علامہ اقبال اور میاں عبدالحق۔ ۱۹۳۲ء

۵۰۔ لورینگ ہوٹل لاہور کا استقبالیہ۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے واپسی پر ۱۹۳۲ء

۵۱۔ سفر افغانستان۔ سر راس مسعود۔ سید سلیمان ندوی۔ اقبال ۱۹۳۳ء

۵۲۔ افغانستان میں۔ تیسرے نمبر پر اقبال ہیں ان کے ساتھ سر راس
مسعود ۱۹۳۳ء

۵۳۔ کابل کی دعوتِ استقبالیہ۔ علامہ اقبال کے ساتھ سر راس مسعود نظر
آرہے ہیں۔ ۱۹۳۳ء

۵۴۔ اقبال۔ لاہور ۱۹۳۳ء

۵۵۔ اقبال۔ لاہور۔ "جاوید نامہ" کی اشاعت کے فوراً بعد ۱۹۳۲ء

۵۶ ڈاکٹریٹ کے لباس میں۔ لاہور ۱۹۳۳ء

۵۷۔ پنجاب یونیورسٹی۔ ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری۔ لاہور ۱۹۳۳ء

۵۸۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ۔ پہلی صف میں بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں
پروفیسر احسان سمیع حقی۔ علامہ عبداللہ یوسف علی۔ سر عبدالقادر،
حبیب الرحمٰن شیروانی، اقبال (صدر) خلیفہ شجاع الدین (صدر مجلس)

استقبالیہ)، خان بہادر ملک زمان مہدی خان، پروفیسر محمد اقبال سکریٹری
خان بہادر سید مقبول شاہ، دوسری صف: ڈاکٹر بی۔ اے۔ قریشی
پروفیسر اے۔ احمد، مسٹر غلام محمد، ملک برکت علی، مولوی غلام محی الدین
قصوری، ڈاکٹر منصور احمد، ایم۔ ایو۔ کیو۔ شیروانی، شیخ عظیم اللہ ایم اسلم
پروفیسر محمد شفیع، تیسری صف: ... براحمد، پروفیسر محمد دین تاثیر، فضل حق، کے
ایل۔ قاضی محمد حسن، پروفیسر مولوی ظفر اقبال، سید عبداللطیف تپش۔ ڈاکٹر
عبدالحلیم، ڈاکٹر ایم۔ صدیق، شمس العلماء محمد عبدالرحمٰن، مولوی مرتضیٰ حسین،
پچھلی قطار میں: پروفیسر علیم الدین سالک، پروفیسر ایس عبدالقادر، ایس
ایم۔ عبداللہ، ممتاز حسن، پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ، ڈاکٹر اظہر علی، غلام مصطفےٰ تبسم
ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر حسین ہمدانی، ایم۔ اے چغتائی، ایچ۔ ایم شیروانی
لاہور ۱۹۳۴ء

۵۹۔ اقبال۔ لاہور ۱۹۳۴ء

۶۰۔ غیر رسمی انداز نشست۔ لاہور ۱۹۳۵ء

۶۱۔ اقبال۔ لاہور۔ ۱۹۳۵ء

۶۲۔ وفد جامعہ ازہر مصر کے ساتھ۔ اقبال پہلی صف میں بائیں طرف سے تیسرے نمبر پر۔ پیچھے علامہ کے صاحبزادے جاوید اقبال کھڑے ہیں۔ دوسری صف میں۔ پہلے نمبر پر چودھری محمد حسین، اور چوتھے نمبر پر خلیفہ شجاع الدین۔
لاہور ۱۹۳۷ء

۶۳۔ دولت کدۂ سر راس مسعود۔ بھوپال ۱۹۳۷ء

۶۴۔ خواب گاہ۔ جاوید منزل۔ لاہور ۱۹۳۸ء

۶۵۔ آخری سفر۔ لاہور ۱۹۳۸ء

۶۶۔ آرامگاہ ابدی۔ بادشاہی مسجد لاہور

۶۷۔ زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری ... کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی۔۔

(۳)
تصاویر جن کی تاریخ متعین نہیں ہو سکی

۶۸ - ۷۵

۷۶ - اگرچہ اس تصویر کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ امر مصدقہ ہے کہ اقبال کے عزیز دوست اور حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد نے شیروانیوں کے لئے جامہ وار کے دو ٹکڑے تحفے کے طور پر ڈاکٹر صاحب کو دیئے تھے۔ ایک کی شیروانی ڈاکٹر صاحب نے خود بنوائی۔ اور دوسرا ٹکڑا شیخ اعجاز احمد کو دیا جو ۱۹۶۲ء تک ان کے پاس موجود تھا۔

۴۔ اقبال اور ان کا خاندان۔

۷۷۔ شیخ نور محمد۔ اقبال کے والد

۷۸۔ علامہ اقبال کی والدۂ محترمہ۔

۷۹۔ اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال کے ساتھ۔

۸۰۔ بڑے بھائی شیخ عطا محمد۔

۸۱۔ بھتیجے شیخ اعجاز احمد۔

۸۲۔ جاوید اقبال

۸۳۔ دیرینہ خادم علی بخش (۳۹ سال کی رفاقت)

۵۔ اقبال کے اساتذہ

۸۴۔ شمس العلماء مولوی سید میر حسن۔

۸۵۔ حضرت داغ دہلوی

۸۶۔ پروفیسر ٹامس آرنلڈ

۸۷۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ

۸۸۔ ڈاکٹر میکٹیگرٹ

۸۹۔ ذاتی پروفیسر سینے شال۔

۶۔ تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر

۹۰۔ اقبال منزل محلہ کشمیریاں سیالکوٹ

۹۱ اقبال منزل کا وہ کمرہ جو مسجد ابجید سالک کے نزدیک ہے اور اقبال کی ولادت کا کمرہ ہے

۹۲۔ اقبال منزل میں مطالعے کا کمرہ۔

۹۳۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ۔ جہاں دسویں درجے اور انٹر میڈیٹ کی تعلیم پائی

۹۴۔ مسجد حسام الدین، محلہ کشمیریاں (سیالکوٹ) اقبال کی پہلی درس گاہ۔

۹۵۔ ہائیڈل برگ جرمنی میں دوران تعلیم کی قیام گاہ۔

۹۶۔ ہائیڈل برگ کے مکان کے رجسٹر میں قیام اقبال سے متعلق اندراج

۹۷۔ حکیم شہباز الدین اور حکیم امین الدین کی قیام گاہیں۔ بازار حکیماں لاہور میں۔ جہاں اقبال اور ان کے دوستوں کی ادبی محفلیں گرم رہتی تھیں۔

۹۸۔ جاوید منزل لاہور۔ زندگی کے آخری تین سال کا مسکن۔

۹۹۔ جاوید منزل لاہور۔ اقبال کا ذاتی کمرہ۔

۱۰۰۔ کواڈرینگل (گورنمنٹ کالج لاہور کا پرانا ہوسٹل۔ (زمانہ طالب علمی کی اقامتگاہ)

۱۰۱۔ گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۸۹۵ء میں یہاں بی۔ اے۔ کے درجے میں داخلہ لیا۔

۱۰۲۔ انجمن حمایت اسلام۔ جہاں اقبال نے ۱۹۰۰ء میں اپنی معرکہ آرا نظم

نالۂ یتیم" پڑھی۔

۱۰۳۔ گورنمنٹ ہاؤس لاہور۔ جہاں ۱۹۲۲ء میں گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے حکومت ہند کی جانب سے اقبال کو سر کا خطاب دیا۔

۱۰۴۔ بھاٹی گیٹ لاہور کا مکان (سنہ ۱۹۰۰ء سے سنہ ۱۹۰۵ء)

۱۰۵۔ ٹرنٹی کالج کا ایک رخ یہاں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۷ء میں کیمبرج یونی ورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔

۱۰۶۔ ۱۰ کیل اسٹریٹ کیمبرج } دوران تعلیم کی دو اقامت گاہیں

۱۰۷۔ بنٹنگڈن روڈ کیمبرج }

۱۰۸۔ ہائیڈل برگ یونی ورسٹی جہاں ۱۹۰۷ء میں اقبال نے اپنا تھیسس Development of Metaphysics in Persia مکمل کیا

۱۰۹۔ لندن یونی ورسٹی جہاں نومبر ۱۹۰۷ء سے فروری ۱۹۰۸ء تک اقبال نے عربی کے لیکچرر کے طور پر کام کیا۔

۱۱۰۔ لنکنز ان لندن۔ یہاں اقبال نے ۱۹۰۵ء میں لاء ڈگری کے لئے داخلہ لیا ۱۹۰۸ء میں انہیں یہاں بیرسٹر ایٹ لاء کی ڈگری دی گئی۔

۱۱۱۔ انارکلی لاہور میں اقبال کا مکان (۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۲ء تک)

۱۱۲۔ چیف کورٹ لاہور۔ یہاں اقبال نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء سے پریکٹس شروع کی۔

۱۱۳۔ پنجاب یونی ورسٹی لاہور۔ یہاں اقبال کئی برس عربی امتحانوں کے ممتحن رہے۔

۱۱۴۔ بریڈلا ہال لاہور۔ جہاں ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو اقبال نے اپنی مشہور نظم "صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی" پڑھی۔

۱۱۵۔ قیام گاہ میکلوڈ روڈ لاہور (۱۹۲۲ء۔ ۱۹۲۵ء)

۱۱۶۔ پنجاب لیجسلیٹو کونسل لاہور، اقبال جس کے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک

مصر ایپ ہے۔

۱۱۷۔ وہ مکان جس میں اقبال نے پیرس میں قیام کیا۔ اسی مکان میں اقبال کی مشہور مستشرق ڈاکٹر مانیسون (Dr. Massignon) سے ملاقات ہوئی۔

۱۱۸۔ پیرس میں نپولین کا مقبرہ۔
"راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز۔ اقبال۔

۱۱۹۔ میسولینی کا محل۔ پلازو وینزیا، روم

۱۲۰۔ پلازو وینزیا روم۔ اقبال اور مسولینی کی ملاقات کا کمرہ۔

۱۲۱۔ اٹیلین رائل اکیڈمی روم کا صدر دفتر جہاں اقبال نے ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر اوجی کی دعوت پر اسلام پر لیکچر دیا۔

۱۲۲۔ مسلم انشورنس کمپنی لمیٹڈ (لاہور) کا صدر دفتر اقبال ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیرمین رہے۔

۱۲۳ شیش محل بھوپال } جہاں ۱۹۳۶ء کے بعد اقبال نے متعدد بار قیام کیا
۱۲۴ ریاض منزل بھوپال }

۱۲۵ شیش محل بھوپال کے باغ کا ایک رخ۔

۷ ۔ اقبال اور مسجد قرطبہ۔

۱۲۶۔ مسجد قرطبہ میں محو نماز

۱۲۷ ۔ اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود

۱۲۸ ۔ تیرا مینارہ بلند جلوہ گہ جبرئیل۔

۱۲۹۔ دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں

۱۳۰۔ تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار

۱۳۱ - تر تر ے در و بام پر وادی ایمن کا نور -

۱۳۲ - آب روان کبیر -

۱۳۳ - مسجد سے باہر آتے ہوئے -

۸ - غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے لیکن
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں -

۱۳۴ - الحمرا کا ایک رخ

۱۳۵ - الحمرا کا ایک اور رخ -

۹ - اقبال نمائش حیدرآباد

مئی ۱۹۷۳ء میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد (آندھرا پردیش) کے زیرِ اہتمام حیدرآباد میں اقبالیات کی ایک نمائش ہوئی جس میں علامہ اقبال کی تحریریں اور ان کی شخصیت اور شاعری پر لکھی ہوئی کتابیں خاصی تعداد میں پیش کی گئیں اس کے علاوہ حیدرآباد کے مصوروں کی بنائی ہوئی اقبال کی تصویریں اور اقبال کے اشعار رنگین تصاویر کی صورت میں نمائش کی زیب و زینت کو دو بالا کر رہے تھے اس نمائش کی نو تصاویر اور ۱۱ مصوری کے نمونے اقبال نمائش سری نگر میں پیش کئے گئے -

تعدادِ تصاویر ۱۳۶ - ۱۵۶

۱۰ - اقبال کا شجرۂ نسب

۱۵۷

۱۱- اقبال تاریخوں کی روشنی میں

۱۲- دو دوست

۱۳- دیباچۂ اسرارِ خودی

۱۴- اقبال کی مرتب کی ہوئی درسی کتب

۱۵- اقبال اور پریم چند

۱۶- تصانیفِ اقبال کی اولین اشاعتیں۔

۱۸۷- Lebenslauf اقبال کی لکھی ہوئی مختصر سوانح حیات۔

۱۸۸- اسرارِ خودی سنہ ۱۹۱۵ء

۱۸۹- رموزِ بیخودی سنہ ۱۹۱۸ء

۱۹۰- بانگ درا سنہ ۱۹۲۳ء

۱۹۱- پیامِ مشرق سنہ ۱۹۲۵ء

۱۹۲- زبورِ عجم سنہ ۱۹۲۷ء

۱۹۳- The Reconstruction of Religious Thought سنہ ۱۹۳۰ء

The Reconstructic Thought In islam کا دیباچہ

۱۹۴- The Reconstruction of Religious Thought In Islam. کا دیباچہ

۱۹۵- مسافر سنہ ۱۹۳۴ء

۱۹۶- بالِ جبریل سنہ ۱۹۳۵ء

۱۹۷- مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، سنہ ۱۹۳۶ء

۱۹۸- "پیامِ مشرق" کا نسخہ جو اقبال نے چودھری ظفر اللہ خاں کو نذر کیا۔

۱۹۹- "ضربِ کلیم" کا نسخہ جو اقبال نے ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تحفۃً دیا

۲۰۰- "جاوید نامہ" کا نسخہ جو اقبال نے ڈاکٹر سید عبدالباسط کو تحفۃً دیا۔

۲۰۱- "جاوید نامہ" کا نسخہ جو اقبال نے غازی محی الدین اجمیری کو ہدیۃً دیا۔

۱۷- اسکول کالج اور یونیورسٹی میں اعزازات

۲۰۲- مڈل کا سرٹیفکیٹ سنہ ۱۸۹۱ء

۲۰۳- ہائی اسکول کا سرٹیفکیٹ سنہ ۱۸۹۳ء

۲۰۴- انٹرمیڈیٹ کا سرٹیفکیٹ سنہ ۱۸۹۵ء

۲۰۵- بی۔ اے کی ڈگری سنہ ۱۸۹۷ء

۲۰۶ - ایم-اے ڈگری ۱۸۹۹ء
۲۰۷ - کیمبرج یونیورسٹی سے ریسرچ سرٹیفکیٹ ۱۹۰۷ء
۲۰۸ - میونخ یونیورسٹی کی طرف سے پی-ایچ-ڈی-کی سند ۱۹۰۷ء
۲۰۹ - میٹرک میں امتیازی حیثیت کا تمغہ
۲۱۰ - عربی (بی-اے) میں امتیازی حیثیت کا تمغہ-
۲۱۱ - ایم-اے (فلسفہ) میں پنجاب بھر میں اول آنے کا تمغہ

۱۸ - روزگارِ فقیر کے چند اوراق

۲۱۲ - پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شعر
۲۱۳ - مسلمان بچیوں کے نام-
۲۱۴-۲۱۶ - یادگار مشاعرہ

۱۹ - مکاتیبِ اقبال بخطِ اقبال (اردو)

۲۱۷-۲۱۸ - ظفر احمد صدیقی کے نام
۲۱۹ - مہاراجہ سرکشن پرشاد
۲۲۰-۲۲۱ - تلوک چند محروم کے نام "سلام و پیام" کے بارے میں-
۲۲۲ - سلام و پیام
۲۲۳ - میجر شمس الدین قریشی کے نام
۲۲۴ نواب بہادر یار جنگ کے نام
۲۲۵-۲۲۶ - اسمٰعیل میرٹھی کے نام
۲۲۷ - حافظ محمد اسلم جیراجپوری
۲۲۸ - نامعلوم مکتوب الیہ کے نام
۲۲۹ - ڈاکٹر محمد عباس علی خاں کے نام

۲۳۰-۲۳۲- سید نذیر نیازی کے نام

۲۰۳ - خواجہ عبدالوحید کے نام

۲۳۴ - شیخ عنایت اللہ کے نام

۲۳۵- پروفیسر الیف - ایم - شجاع منعمی کے نام

۲۳۶- مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

۲۳۷- محمد رمضان صاحب کے نام -

۲۳۸- نامعلوم مکتوب الیہ کے نام

۲۳۹ -سر سید راس مسعود کے نام

۲۴۰ - نواب صدر یار جنگ بہادر کے نام

۲۴۱- سید غلام بھیک نیرنگ کے نام

۲۴۲

۲۴۳-۲۴۴- فقیر وحیدالدین کے نام

۲۴۵-۲۴۶- ضیاءالدین احمد برنی کے نام

۲۴۷- سید محمد سعیدالدین جعفری کے نام

۲۴۸ اقبال کے بڑے بھائی شیخ محمد عطاء کا خط

غلام رسول مہر کے نام اقبال کی فارسی نظم ،، تنہائی کے بارے میں

۲۴۹ محمدالدین فوق کے نام

۲۵۰ سید محمد مرتضیٰ کے نام

۲۵۱ - ۲۵۲ غلام رسول مہر کے نام

۲۰- کلام اقبال بزبان

۲۵۳- ہمارا دیس　　　سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۲۵۴-　　　اے ہمایوں! زندگی تیری سراپا سوز تھی

۱۲۔ اقبال کی اردو تحریریں (بخط اقبال)

۳۷۱ - عمل - حفاظت حسین (کراچی)

۳۷۲ - عمل - سراج علی (حیدرآباد آندھرا پردیش)

۳۷۳ - عمل - حمید (لاہور)

۲۷ - کلام اقبال مصوروں کی نظر میں

۳۷۴ - یارب درونِ سینہ دل باخبر بدہ - عمل - عبدالرحمٰن چغتائی

۳۷۵ - صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا - عمل - عبدالرحمٰن چغتائی

۳۷۶ - روح رومی پردہ ہا را بردرید - عمل - آقائے بہزاد

۳۷۷ - دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر
جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب } صادقین

۳۷۸ - رست کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل } صادقین

۳۷۹ - نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر } صادقین

۳۸۰ - دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں - عمل حفاظت حسین

۳۸۱ - زندگی مضمر ہے تری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں } باقر امانت فانی (حیدرآباد آندھرا پردیش)

۳۸۲ جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا } عمل بی - اے ریڈی

(حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۳۸۳ - موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے } عمل نواب میر محمود علی خاں

(حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۳۸۴۔ گرمی آرزو فراق شورش ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق قطرہ کی آبرو فراق
عمل ڈی دیوراج
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۸۵۔ پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے
عمل۔ نذر محمد
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۸۶۔ رنگ ہو یا خشت سنگ چنگ ہو یا حرف صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔۔
عمل سوریہ پرکاش
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۸۷ کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
عمل۔ ایلا پال
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۸۸ ہو اگر خود نگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
عمل موہن دت
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۸۹۔ جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔
عمل۔ اے۔ آر۔ رحیم
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۰۔ یہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
یہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
عمل۔ ایس۔ ایچ حسین
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۱۔ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس۔۔
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
عمل شاہ علی
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۲۔ راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نغمۂ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
عمل ایلا پال
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۳۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
عمل۔ ایلا پال
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۴۔ اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔۔۔
عمل ایس۔ ایم۔ زکریا
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۵۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے ۔ عمل ۔ایس۔ایچ۔حسین
(حیدرآباد۔ آندھراپردیش)

۳۹۶۔ مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
ڈی ۔ دیورلج
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۷ ۔ خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
نریندر رائے (حیدرآباد آندھراپردیش)

۳۹۸۔ یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح مناجات
نذر۔ محمد (حیدرآباد، آندھراپردیش)

۳۹۹۔ نیا شوالہ
محمد اسمٰعیل (حیدرآباد (آندھراپردیش)

۴۰۰ ۔ خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ
سعید بن محمد (حیدرآباد آندھراپردیش)

۴۰۱ ۔ چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
اپلا۔ پال (حیدرآباد آندھراپردیش)

۴۰۲ ۔ مجھے پھونکتا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں
نریندر رائے (حیدرآباد آندھراپردیش)

۴۰۳ ۔ عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی ۔
ڈی ۔ ایل ۔ این ۔ ریڈی ۔
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۴۰۴۔ شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا ۔
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا
شاہ علی (حیدرآباد، آندھراپردیش)

۴۰۵ ۔ سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
شاہ علی
(حیدرآباد، آندھراپردیش)

۴۰۶ - سورج نے جاتے جاتے شام سیہ بنا کر } ایس - اے - حسین
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے } (حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۴۰۷ تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو فاش کر دیا } ڈی - ایل - این - ریڈی
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں } (حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۴۰۸ - ہوئی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار } گوری شنکر
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار } (حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۴۰۹ - نیا شوالہ ونود کمار (حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۴۱۰ جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی }
ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ }
محمد اسمٰعیل (حیدرآباد، آندھرا پردیش)

۲۸ - اقبال کے اشعار خطاطی کے نمونے

۴۱۱ - ۴۱۳

۲۹ - کلامِ اقبال اولین صورت میں

۴۱۴ - طلبائے علی گڑھ کالج کے نام

۴۱۵ - سوامی رام تیرتھ

۴۱۶ - پیغامِ راز

۴۱۷ - نانک

۴۱۸ - غزل (چمک تیری عیاں بجلی میں آتش میں شرارے میں۔)

۴۱۹ - گورستانِ شاہی

۴۲۰ - مرزا غالب

۴۲۱ - فلسفۂ غم

۴۲۲ - عہدِ طفلی
۴۲۳ - ماتمِ پسر
۴۲۴ - صدائے درد

۳۰ - متفرقات

۴۲۵ - ماہنامہ "مرقع" کا سرورق ۔
۴۲۶ - کلامِ محروم سے متعلق اقبال کی رائے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے لئے (انگریزی)
۴۲۷ - ۴۲۸ - پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے لئے ایک اجلاس کی روداد
۴۲۹ - ایک دستاویز (انگریزی)
۴۳۰ - من کہ محمد اقبال بیرسٹرایٹ لار لاہور
۴۳۱ - وصیت نامہ
۴۳۲ -
۴۳۳ - استاد کی عظمت
۴۳۴ - محکمۂ تعلیم پنجاب کا خط
۴۳۵ - اقبال کا جواب
۴۳۶ - ٹیکسٹ بک کمیٹی کی جانب سے شکریہ کا خط
۴۳۷ - پہلا یومِ اقبال لاہور ۱۹۳۸ء
۴۳۸ نقشِ چغتائی
۴۳۹ - ۴۴۰ - فقہ کے موضوع پر اقبال کی تحریر
۴۴۱ شیخ نور محمد نہ کہ حاجی نور محمد

۳۱ - چوں رخت خویش بر بستم ازیں خاک

۴۴۲ ۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

۴۴۳ ۔ مولانا ابوالکلام آزاد

۴۴۴ ۔ پنڈت جواہر لعل نہرو

۴۴۵ ۔ شریمتی سروجنی نائیڈو

۴۴۶ ۔ شری سبھاش چندر بوس

۴۴۷ ۔ سر تیج بہادر

۴۴۸ ۔ راجہ نریندر ناتھ

۴۴۹ ۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ

۴۵۰ ۔ روزنامہ ٹریبون لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء

۴۵۱ ۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

۴۵۲ ۔ "ٹائمز آف انڈیا" ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

۴۵۳ ۔ "اسٹیٹس مین" ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء

۲۳ ۔ انگریزی، اردو، ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں اقبال پر کتابیں

۴۵۴-۴۵۵ ۔ A voice from The East

نواب ذوالفقار علی خان

۴۶۰ ۔ Persian Psalms آرتھر جے آربری

۴۶۱ ۔ بانگ درا ۔ گورمکھی رسم الخط میں

۴۶۲ ۔ ضرب کلیم گورمکھی رسم الخط میں

۴۶۳-۴۷۲ ۔ جاوید نامہ ۔ آرتھر جے ۔ آربری (انگریزی ترجمہ)

۴۷۳ ۔ Poems. From Iqbal وی ۔ جی ۔ کرنین۔

۴۷۴ ۔ Gabriels Wing مس انیمیری شمل

۸۷۵۔ (Message De orient) پیام مشرق کا فرانسی ترجمہ } ایوامیرووچ اور محمد رچیا۔

۸۷۶۔ The secrets of The Self
آر۔ اے۔ نکلسن

نامکمل باقی صفحات ضائع ہو گئے

منظومات میں صرف ایک کتاب قابلِ ذکر ہے۔ جگن آزاد کا مجموعہ بیکراں۔ آزاد تلوک چند محروم کے بیٹے ہیں۔ اور اس طرح شاعری ان کو وراثت میں ملی ہے لیکن ان کی ذاتی دردمندی نے اس شاعری میں ایک عجیب اور ایک نیا کیف پیدا کر دیا ہے جس کا لطف حال سے زیادہ مستقبل میں آئے گا۔ لیکن وہ دردِ انسانیت جوان کے ایک ایک مصرعے میں نظر آتا ہے۔ اس وقت بھی دل و نگاہ کو جذب کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں ایسی بلندی کے نشان ہیں جو پا بر نئی منزلیں ڈھونڈتی ہے ایسی سادگی ہے جو پرکار اور پراثر ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

آل انڈیا ریڈیو دہلی
۲۴ دسمبر ۱۹۵۹ء۔

ملاقاتیں

اقبالؒ

ایشیا کی بیداری کا شاعر ہے

اُن کا شمار عالمی شعراء میں ہوتا ہے

ممتاز بھارتی دانشور

جگن ناتھ آزاد کا انٹرویو

ملاقات :۔ آصف جھلی ۔ ۔

سوال :۔ جگن ناتھ آزاد صاحب! آپ کو اقبال کی شخصیت، فن یا فکر نے

متاثر کیا ہے؟

جواب:۔ مجھے ابتدا میں اقبال کی شاعری یعنی اقبال کے فن نے متاثر کیا اور عمر کے اس حصے میں متاثر کیا جب میں اقبال کے اشعار کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا اور اقبال کے نظریات کی گہرائی میں اترنا تو میرے لئے بہت دور کی بات تھی۔ میں تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا کہ میرے نانا کیول رام اقبال کا ایک شعر گنگنایا کرتے تھے۔

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

یہ شعر سنتے ہی مجھ پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں اس کا سبب تو بیان نہیں کر سکتا کیونکہ اس عمر میں، میں اس شعر کے مفہوم سے قطعاً ناآشنا تھا لیکن یہ شعر مجھ پر سحر طاری کر دیتا تھا۔ یہ اقبال یا کلامِ اقبال کے ساتھ میرا پہلا تعارف تھا۔ وقت گذرتا گیا درسی کتب میں اقبال کی نظمیں پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ نظمیں بالعموم یہ ہوا کرتیں۔ "ایک پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا" وغیرہ۔ لیکن ان نظموں سے زیادہ ذہن میں شعر وہی گونجتا رہتا تھا۔

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

گویا دسویں جماعت تک اقبال کی جتنی نظمیں درسی کتب میں میں نے پڑھیں۔ ان سب نے مل کر بھی اتنا متاثر نہیں کیا۔ جتنا مذکورہ بالا ایک شعر نے۔

انٹرمیڈیٹ کے درجے میں جب میں آیا تو ایک دن والدِ محترم نے مختصر سے ذخیرۂ کتب میں چند چھوٹے چھوٹے کتابچے نظر پڑے۔ یہ علامہ اقبال کی طویل اور مختصر نظموں پر مشتمل تھے۔ مثلاً، شکوہ جوابِ شکوہ، شمع اور شاعر، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام، ہلال، فریادِ امت، وغیرہ۔ یہ کتابچے لاہور سے مرغوب ایجنسی نے شائع کئے تھے۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیا۔ تو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ شاعری اس تمام شاعری سے مختلف ہے۔ جو میں اس وقت تک

پڑھتا چلا آرہا تھا۔ یہ کتابچے میں نے اتنی بار پڑھے کہ یہ تمام نظمیں مجھے زبانی یاد ہوگئیں والد محترم نے کلامِ اقبال کے ساتھ میرا یہ انہماک دیکھا تو انہوں نے مجھے پڑھنے کے لئے "بانگِ درا" دی۔ یہ پوری بھی میں نے اسی ذوق سے پڑھی ایک بار نہیں کئی بار اور یہ بھی مجھے زبانی یاد ہوگئی۔ یہاں سے کلامِ اقبال کے ساتھ صحیح معنوں میں میری دلچسپی کا آغاز ہوا۔ جہاں تک اقبال کے فکر یا دوسرے لفظوں میں فلسفیانہ نظریات کا تعلق ہے ان پر غور و خوض میں نے بعد میں شروع کیا۔

سوال :- فکرِ اقبال کے کس پہلو نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

جواب :- فکرِ اقبال کا ایک پہلو اقبال کی انسان دوستی ہے اور فکرِ اقبال کے اسی پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

سوال :- آپ کو علامہ اقبال سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل ہوئی؟

جواب :- جب میں لاہور آیا تو میرے والد نے کہا کہ وہاں دو شخصیتوں سے ضرور ملنا۔ ایک علامہ اقبال سے۔ دوسرے مہاتما ہنس راج سے۔ ان دونوں میں قدر مشترک فقر اور استغنا تھا۔ بڑے آدمیوں سے ملنے کا حوصلہ نہ اب مجھ میں ہے اور نہ ہی اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ میں اپنی اس کمزوری کی وجہ سے علامہ اقبال کے ساتھ ملاقات نہ کر سکا۔

سوال :- برصغیر میں گذشتہ نصف صدی میں پروان چڑھنے والی فکر ادب اور شاعری پر اقبال کی چھاپ کس قدر ہے؟

جواب :- جہاں تک ہماری شاعری پر اقبال کی چھاپ کا تعلق ہے اس پر ہمیں دو طرح سے غور کرنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اقبال کے اسلوب نے اقبال کے بعد کی شاعری کو کس طرح سے متاثر کیا۔ دوسرا یہ کہ اقبال کے سوچنے کے انداز سے ہماری شاعری کس طرح سے متاثر ہوئی۔

اقبال کے اسلوب نے ہماری شاعری پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا۔ جتنا میر تقی میر کی شاعری نے ڈالا ہے۔ ہمارے کتنے ہی شاعروں نے فخریہ طور پر میر تقی میر کے

انداز میں اشعار کہنے ہیں یہ شعرا کس حد تک کامیاب ہوئے یہ ایک دوسری بات ہے
لیکن ان شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جنھوں نے میر کے انداز میں شعر کہنے کی کوشش
کی۔ اس فہرست میں فراق گورکھپوری بھی آجاتے ہیں۔ ابن انشا بھی اور ناصر کاظمی بھی۔ ان
شعرا نے میر کے انداز میں اچھے اشعار بھی نکالے ہیں۔ لیکن اقبال کے انداز میں جن نے بھی
شعر کہنے کی کوشش کی تو یہ لوگ ردکھی پھیکی شاعری سے آگے نہیں بڑھے۔ ایسے
شعرا کے ہاں خطابت تو آگئی لیکن یہ لوگ خطابت کو شاعری میں نہ ڈھال سکے۔ اسی
طرح سے شاعری میں اقبال کا اتباع کرنے والے لوگ فکر کو جذبہ بھی نہ بنا سکے اس لئے
میں یہ کہوں گا کہ اقبال کا اسلوبِ سخن اقبال کے ساتھ شروع ہوا۔ اور اقبال ہی کے ساتھ
ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود جوش ملیح آبادی اور جگر مرادآبادی ایسے شعرا کے کلام میں
ہمیں اقبال کی گونج کہیں نہ کہیں سنائی دے ہی جاتی ہے۔ مثلاً جگر کی غزل۔

ع جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

بڑی حد تک نغمۂ اقبال ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ جہاں تک اقبال
کی سوچ کا تعلق ہے۔ اس کا اثر ہماری شاعری پہ بہت زیادہ ہوا اور میں یہ سمجھتا ہوں
کہ ادب کی سازی ترقی پسند تحریک اقبال کے فکر کی مرہونِ منت ہے۔ اقبال کا یہ
اثر ترقی پسند تحریک کے بعد ہمارے اس رجحان پر بھی ہوا ہے جسے ہم جدیدیت کا نام
دیتے ہیں۔ اس ضمن میں متعدد شعرا کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بھارت کے ایک
نئے شاعر بانی کی غزل۔

اے ستارو اس خلا میں اک سفر میرا بھی ہے۔

خاصی حد تک اقبال کے فکر اور انداز بیان سے متاثر نظر آتی ہے۔

سوال :۔ آپ کی نظر میں اقبال کی تعلیمات، شاعری اور فکر بھارت کی نئی
تہذیبی اور ثقافتی تشکیل میں کوئی کردار ادا کر سکتی ہے۔

جواب :۔ بھارت کی نئی تہذیب اور ثقافت میں کئی عناصر کام کر رہے ہیں۔
ان عناصر میں اقبال کی فکر کو ایک عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس وقت بھارت کی

ستادن یونیورسٹیوں میں ایم۔اے۔کی سطح پر اردو پڑھائی جا رہی ہے۔اور تقریباً ان تمام یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں اقبال ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ظاہر ہے کہ ملک کے طول اور عرض میں پھیلی ہوئی ستادن یونیورسٹیوں میں جب اقبال پر کام ہو رہا ہے تو اس کا اثر بھارت کی تہذیبی اور ثقافتی تشکیل پر بھی پڑ رہا ہے۔اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان میں اقبال کی عقلیت پسندی کو جس پر اقبال نے اپنے مضامین میں بھرپور انداز سے روشنی ڈالی ہے۔بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔

سوال:۔ آزاد صاحب! جب آپ اقبال کو اپنا شاعر کہتے ہیں تو آپ کی نظر میں وہ برصغیر کا شاعر ہوتا ہے یا بھارت کا۔

جواب:۔ میں اس موضوع پر پشاور یونیورسٹی میں ایک مقالہ پیش کر چکا ہوں یہ مقالہ میری کتاب "نشانِ منزل" میں شامل ہے۔ اس مقالے میں میں نے دلائل اور شواہد کے ساتھ یہ کہنے کی کوشش کی ہے۔کہ اقبال مسلمانوں کا بھی شاعر ہے۔ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کا شاعر بھی ہے۔ایشیا کی بیداری کا شاعر بھی ہے۔اور عالم انسانیت کا شاعر بھی ہے۔اقبال اتنا بڑا شاعر ہے کہ اسے ہم صرف کسی ایک ملک کا یا برصغیر پاک و ہند کا شاعر نہیں کہہ سکتے۔اقبال کا شمار عالمی شعراء میں ہوتا ہے۔

سوال:۔ کیا بھارت میں اقبال کی فکر اور شاعری کے فروغ سے بھارتی سیکولرازم اور ہندومت کی نشاۃ ثانیہ کی گذشتہ سو سال سے چلنے والی تحریکات میں رکاوٹ اور تضاد جنم نہیں لے گا۔

اگر عملی طور پر دیکھا جائے تو سیکولرازم کے معنی بھی وسیع المشربی کے ہیں اور اقبال کے فکر نے بھی وسیع المشربی کی تعلیم دی ہے۔اس لئے تکنیکی اعتبار سے نہ سہی عملی اعتبار سے فکر اقبال اور بھارتی سیکولرازم میں کوئی تضاد نہیں۔ بھارت کو ہم لوگ کثرت میں وحدت کی ایک تصویر بنانا چاہتے ہیں۔اور فکر اقبال اس تصویر کا ایک نہایت ہی خوبصورت پہلو ہے۔

القومی

سوال:۔ اقبال سے آپ کی دلچسپی نجی حیثیت میں ہے یا آپ اسے من حیث

جو اُس کے لئے ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کئے ہوتے ہیں۔

جواب:۔ اقبال کی شاعری سے میری دلچسپی بالکل ذاتی حیثیت سے شروع ہوئی۔ میرے لڑکپن میں جب میں اول اول اقبال کی شاعری سے متاثر ہوا تو میرے سامنے اقبال کی حیثیت صرف ایک ایسے شاعر کی تھی جس کے کلام سے میرا وجدان لذت اندوز ہو رہا تھا۔ لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اقبال محض شاعرانہ اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فکری اعتبار سے بھی روشنی کا ایک مینار ہے جو برصغیر ہند و پاک کی فضا کو منور کر رہا ہے۔

سوال:۔ اقبال، میر اور غالب کا بھارت میں کیا مستقبل ہے جبکہ بھارت میں اردو زبان نجی اور سرکاری سطح پر روز بروز سکڑ رہی ہے؟

جواب:۔ یہ صحیح ہے کہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہم اردو والوں کے دلوں پر ایک مایوسی چھا گئی تھی۔ کیونکہ ہمیں اس وقت ہندوستان میں اردو کا مستقبل بہت تاریک نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب حالات بہت حد تک بدل چکے ہیں۔ بھارت میں اردو کا مستقبل بڑی حد تک تابناک ہے۔ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ بھارت کی ستاون یونیورسٹیوں میں اردو ایم۔ اے۔ کی سطح پر پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں مجھے یہ کہنا ہے کہ بھارت میں اردو کے ایک سو دس روزانہ اخبارات ہیں۔ اسی ہفتہ وار اخبارات ہیں اور ماہناموں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ جن میں سے بعض کی اشاعت ایک ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ ہے۔

بھارت کی قریباً تمام ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں جن کا بجٹ انفرادی طور پر لاکھوں روپے سالانہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ مرکز اور ریاستوں کی سطح پر متعدد ادارے مثلاً انجمن ترقی اردو، نیشنل بک ٹرسٹ اور آنڈیا غالب اکیڈمی وغیرہ اردو کی نشر و اشاعت کے لئے خاصا کام کر رہے ہیں۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بعض ریاستوں میں پرائمری سطح پر اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں اس بات سے متفق نہیں کہ اردو زبان بھارت میں بھی

اور سرکاری سطح پر روز بروز سکڑ رہی ہے۔

سوال:۔ کیا آئندہ سو یا دو سو سالوں میں بھارت سے اسلامی تہذیب کے اثرات معدوم ہو جائیں گے۔ یا وہ اتنی بے اثر ہو جائیگی کہ محض اس کے باقیات ہی رہ جائیں گے۔

جواب:۔ جو بات میں نے اردو زبان کے ضمن میں کہی ہے وہی بات مجھے اسلامی تہذیب کے بارے میں بھی کہنا ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اب بھارت میں اردو بھی باقی رہے گی اسلام بھی باقی رہے گا اور اسلامی تہذیب کے نقوش بھی زندہ رہیں گے۔ اس وقت بھارت میں جو تہذیب تشکیل پا رہی ہے اس میں اسلام بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے جو بھارت میں ہمیشہ رہے گا۔

سوال:۔ آزادی کے بعد بھارت میں جو شاعری، ادب، افسانہ اور ناول پروان چڑھ رہا ہے۔ کیا اس پر مغربی یا اسلامی اثر ہے یا وہ خالصتاً سیکولرزم کے گرد اپنے تانے بانے بن رہا ہے۔

جواب:۔ آزادی کے بعد مختلف زبانوں میں جو شاعری، ادب، افسانہ اور ناول پروان چڑھ رہا ہے۔ اس پر مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس میں مغربی فکر بھی ہے۔ اسلامی فکر بھی ہے۔ ہندو فکر بھی اور لا مذہبی کے عناصر بھی ہیں۔ اس لئے یہ درست نہ ہوگا کہ وہ خالصتاً سیکولرزم کے گرد اپنے تانے بانے بن رہا ہے۔

سوال:۔ وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بھارت میں جنم لینے والا ادب اور پاکستان میں جنم لینے والا ادب علیحدہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ بڑی وفاداریوں تک پہنچنے کے لئے پہلے چھوٹی وفاداریاں نبھانا ضروری ہوتا ہے۔ کہ پہلے آپ کو اپنے محلے کا اچھا شہری بننا ہوگا پھر اپنے شہر کا اور پھر آپ سارے ملک کے اچھے شہری بن سکیں گے۔ اسی طرح بھارت کا اچھا شہری بننے کے لئے بھی پہلے اپنے شہر کا اچھا شہری بننا ہوگا اس اصول کا اطلاق

ہر شاعر اور ہر ادیب پیدا ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر بھارت اور پاکستان میں پیدا ہونے والے ادب کی جہاں پہچان یہ ضروری ہے کہ وہ پاکستانی ادب اور بھارتی ادب کہلائے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ایک مقام پر آ کر ان دونوں ملکوں کا ادب بنی نوع انسان کا ادب بھی ہو اور یہ وسیع المشربی کی فضا میں پروان بھی چڑھے۔

سوال :۔ اقبال کے بعد پاکستان اور بھارت کے کن شعراء نے آپ کو متاثر کیا ہے؟

جواب :۔ حفیظ جالندھری مرحوم کی شاعری کا میں شروع سے معترف ہوں۔ ان کے کلام کی دھیمی رو اور نغمگی کی کیفیت اردو شاعری کا لازوال سرمایہ ہے۔ یہ نغمگی والی بات میں صرف ان کے گیتوں کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ان کی ساری شاعری کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ جن میں ان کی نظمیں بھی شامل ہیں غزلیں بھی اور طویل مثنوی شاہنامہ اسلام بھی۔ ان کی شاعری میں ایک ایسا جادو ہے جس کی مثال اردو کے بہت کم شاعروں کے کلام میں ملتی ہیں۔ یہ حفیظ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ پطرس بخاری نے کلام حفیظ کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "نغمہ زار" کے دیباچہ میں کہا تھا "جالندھر کے نغمہ پرور شیر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ مدت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے جس کے ترنم کی بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن بن کر آنکھوں کے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

اگر ہم موجودہ صدی کے ابتدائی دور کی اردو شاعری کا مطالعہ کریں تو اس میں حفیظ کی آواز ایک نئی اور انوکھی آواز نظر آتی ہے۔ انہوں نے بحر اور اوزان کے جو تجربے کئے وہ تجربے ہمارے دیکھتے دیکھتے مستقل قدروں کی صورت اختیار کر گئے۔

مجھے اس بات کا بڑا قلق ہے کہ حفیظ کے فن کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جانا چاہئے تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ تاہم تاریخ ادب میں حفیظ کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سوال :۔ جدید یا روایتی آپ اپنے لئے کون سی اصطلاح پسند فرمائیں گے
اور اس اصطلاح کو آپ نے اپنی شاعری میں کس حد تک نبھایا ہے؟

جواب :۔ میں اپنی شاعری کو نہ تو روایتی شاعری سمجھتا ہوں اور نہ ہی ان معنوں میں جدید سمجھتا ہوں ۔ جن میں جدت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے ۔ میں روایت کا احترام کرتا ہوں ۔ لیکن اپنی شاعری کو روایت کا اسیر نہیں بنانا چاہتا ۔ میری کوشش یہ ہے کہ میری شاعری روایت اور جدت کا ایک مقام اتصال ہو ۔ ایک طرف اس کی دسترس میں گذرا ہوا کل ہو اور ایک طرف آنے والا کل ۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں ۔ یہ دیکھنا میرے قاری کا کام ہے

سوال :۔ شاعری میں آپ کس چیز کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں ۔ شعریت زبان، نظریہ یا تیکنیک؟

جواب :۔ تکنیک ہو یا نظریہ ہو یا زبان ہو ۔ ان کی اہمیت شاعری میں صرف اسی وقت ہے ۔ جب یہ شعریت میں ڈھل جائیں تو گویا میں سب سے زیادہ اہمیت شعریت کو دیتا ہوں ۔

سوال :۔ اچھی شاعری اور بڑی شاعری میں کیا فرق ہے ؟

جواب :۔ اچھی شاعری تو میں محض خوبصورت شاعری کو کہتا ہوں لیکن بڑی شاعری کے لئے بڑے خیال کا ہونا ضروری ہے ۔ جب عظیم خیال جذبہ بنتا ہے اور شعر کی زبان میں ڈھلتا ہے تو بڑی شاعری معرض وجود میں آتی ہے ۔ محض خوبصورت اور اچھی شاعری بڑے خیال کے بغیر بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن بڑی شاعری بڑے خیال اور گہرے تفکر کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔

سوال :۔ اپنی شاعری کے ذریعے آپ نسلِ انسانی کو آدرش دے رہے ہیں ؟

جواب :۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعری کا پیغام دینا نہیں ہے ۔ ہاں پیغام خود شاعری بن جائے تو بات دوسری ہے ۔ زیادہ واضح لفظوں میں میں یہ عرض کروں گا

کہ مقصد کو سامنے رکھ کے اگر شعر کہا جائے تو وہ شعر محض ایک مشینی کوشش بن کر رہ جائیگا مقصدی شاعری سے میں یہ مراد لیتا ہوں کہ مقصد شعر میں ڈھل جائے یعنی مقصد فن پر حاوی نہ ہو بلکہ فن مقصد پر حاوی ہو۔ اب اپنی شاعری کے بارے میں میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس میں کوئی نظریہ یا کوئی نقطۂ نگاہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے مقصد کو سامنے رکھ کے کبھی شعر نہیں کہا۔ اگر میری شاعری میں مقصدیت نظر آتی ہے تو وہ میری شعوری کوشش نہیں ہے۔ بلکہ آپ اسے میری شعر کہنے کی صلاحیت کا حصہ ہی سمجھئے۔

سوال :۔ اپنے چند اشعار سنائیے جو خود آپ کو بھی پسند ہیں۔

جواب :۔

ع شاید کوئی ادھر سے تیشہ بدست گذرے میں اک مجسمہ ہوں پتھر میں سو رہا ہوں

ع اک دروازے کو لے آزاد جب چھوڑا تو پھر
کیا بتاؤں کتنے دروازوں پہ رسوائی ہوئی۔

ہم جنوں میں چاک داماں کی رفو کرتے رہے اور ہوں گے جن کو ہوگا چاک دامانی پہ ناز

لہجہ بدل گیا ہے تیری گفتگو کا آج۔
اس واسطے کہ آج مجھے تجھ سے کام ہے۔

ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت کیا خبر کیا بات اس کے کفر میں پوشیدہ تھی

کہتے ہیں کہ آتا ہے مصیبت میں خدا یاد۔
ہم پر تو وہ گذری کہ خدا بھی نہ رہا یاد

درونِ خانہ بھی ضو ہو بیرونِ خانہ بھی ضو دیا جلاؤ تو دہلیز پر رکھو آؤ

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور
ہفتہ وار خصوصی اشاعت ۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء

زیرِ طباعت ۔

باتیں ہماری یاد رہیں (خود نوشت سوانح حیات) کولمبس کے دیس میں بیٹکن
کے دیس میں ۔ (سفرنامے) حیاتِ مرحوم (والد محترم کی سوانح عمری) جستجو،
بوئے رمیدہ (مجموعہ ہائے کلام)
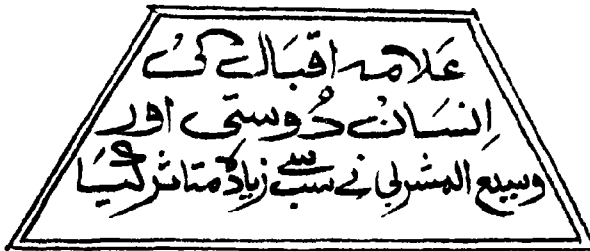
سوانحی خاکہ

نام:- جگن ناتھ آزاد

والدِ محترم:- پروفیسر تلوک چند محروم

پیدائش:- عیسیٰ خیل ضلع میانوالی ۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء

تعلیم:- ایم۔ اے۔ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

ملازمت:- پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی۔ جموں۔

مطبوعہ تصانیف۔

شاعری:- بیکراں، ستاروں سے ذروں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں،

طویل نظمیں:- اردو، دہلی کی جامع مسجد، ابوالکلام آزاد، ماتم نہرو۔ اجنتا

اقبالیات:- اقبال اور اس کا عہد، اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال اور کشمیر، اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری، اقبال کی کہانی، محمد اقبال (ایک ادبی سوانح حیات) مرقع اقبال، اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ

بھارت کی ستاون یونیورسٹیوں میں
اقبالیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے

تنقید:- نشانِ منزل۔

خاکے:- آنکھیں ترستیاں ہیں

مقالات:- پاکستان، بھارت، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، روس، برما اور نیپال کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی و ادبی اداروں میں اقبالیات اور ادبیات کے موضوع پر ۲ سو سے زائد تحقیقی مقالے پیش کیے۔

شمیم اکرام الحق
راولپنڈی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

باتیں اور ملاقاتیں

کیسے لگے آپ کو۔۔۔؟

کیسے کا تو پتہ نہیں، ہاں اپنے سے لگے"

ہندوستان سے آئے ہوئے ایک مہمان شاعر اور ادیب کے بارے میں اپنائیت سے بھرپور یہ تبصرہ ایک پاکستانی میزبان کا تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نہ صرف ہندوستان کے ایک نامور شاعر اور ادیب بلکہ نقاد، محقق، ماہر تعلیم اور ماہرین اقبال میں سے ہیں۔ اقبال شناسوں میں انہیں کلام اقبال کا حافظ سمجھا جاتا ہے۔ وہ غالباً واحد پرستار اقبال ہیں۔ جنہیں شاعر مشرق کا سارا کلام ازبر ہے۔ اقبال کے عاشق تو ہم نے بہت دیکھے مگر ایسا عاشق نہ دیکھا۔ نہ سنا کہ اقبال کی "مسجد قرطبہ" پڑھی اور اسے دیکھنے چل دیئے۔ اور وہاں جا کر کونوں کھدروں میں جھانکتے پھرے۔ قیاس کرتے رہے، کہ پیر و مرشد نے کہاں بیٹھ کر یہ نظم کہی ہوگی۔ "دریائے نیکر کے کنارے" پڑھی تو ایک بار پھر بستر باندھ لیا اور دریائے نیکر دیکھنے چل دیئے۔ یہ عمل ان کا نظمیں پڑھ پڑھ کر سفر کرنے کا، ساری زندگی جاری رہا اور جاری ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد آج کل اکیڈمی آف لیٹرز کی دعوت پر پاکستان آئے ہوئے ہیں

وہ برصغیر کے اسی خطے میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ راولپنڈی کے گارڈن کالج
سے بی۔اے۔ کیا۔ ایف۔ اے پنڈی کے ۔ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سے کیا۔ گارڈن
کالج میں دوران تعلیم ہی ان کی ادبی سرگرمیوں کا شہرہ ہونے لگا تھا۔ بطور شاعر ادبی حلقوں
میں روشناس پہچانے بلکہ مانے جانے لگے تھے۔ گارڈن کالج کے ادبی مجلے کے ایڈیٹر بھی
تھے۔ پھر ایم۔ اے کے لئے اورینٹل کالج لاہور چلے گئے۔

تعلیم سے فراغت پاکر جگن ناتھ آزاد "اخبار جے ہند" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس سے قبل
آپ نے انگریزی اخبار "ٹریبون" میں اسٹرنگر کے طور پر بھی کام کیا۔ قیام پاکستان سے بہت
پہلے علامہ اقبال ان کی زندگی ہی میں، وہ علامہ کے فکر و فن کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے لگے
تھے۔ اور اقبال کے فن پر ان کے پرمغز مقالے اس وقت کے معروف ادبی رسائل میں جگہ
پاتے تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق لاہور کے سرگرم رکن تھے۔ اسی رشتے سے کئی دیرینہ ساتھیوں
نے پہچانا اور محبت سے گلے لگایا۔ قیام پاکستان کے بعد پروفیسر صاحب ہندوستان تشریف
لے گئے۔ اپنی جنم بھومی اور اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ کر۔ مگر اقبال کی محبت کو جسم و جان کی
گہرائیوں میں اس وقت بھی چھپا رکھا تھا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ اپنا ایک تعارف ہے
ماہر اقبال کے طور پر پوری دنیا میں جہاں جہاں اقبال شناس موجود ہیں۔ وہاں پروفیسر آزاد
بھی موجود ہیں لیکن یہ تعارف اور بھی دو آتشہ ہو جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر جگن
ناتھ آزاد برصغیر کے مشہور اور مقبول شاعر تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں۔ تلوک چند
محروم اردو ادب کی تاریخ کا حصہ تو ہیں ہی لیکن پاکستان کی درسی کتب میں بھی ایک عرصے
تک طلبہ ان کا کلام پڑھتے رہے ہیں۔

پروفیسر آزاد کے پنڈی میں قیام کے دوران مختلف اداروں نے تقاریب کا
اہتمام کیا۔ اتنی گرمجوشی اور محبت سے ان کا استقبال کیا گیا کہ باوجود تھکن اور ناسازی طبع
کے پروفیسر آزاد ہر اس جگہ گئے جہاں انہیں مدعو کیا گیا۔ دلچسپ باتوں اور پرلطف کلام
سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے ہونے والی شام ہمدرد کے مقررہ

اس مرتبہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد تھے۔ انہوں نے "ہندوستان میں مقامِ اردو" کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اور بہت سے ان سوالوں کا جواب دیا جو ہندوستان سے آنے والے ادیبوں کو دیکھ کر ذہن میں کلبلاتے لگتے ہیں مگر تشنہ رہتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں اردو کا حال جاننے کے لئے تو ہر شخص بے چین رہتا ہے۔ پروفیسر آزاد نے پہلی ہی ملاقات میں ان باتوں کا جواب دے دیا جو پوچھی جانی متوقع تھیں دوسرے روز وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں یومِ اقبال کی تقریب میں مہمانِ خصوصی تھے۔ یہاں بھی انہوں نے مقالہ پڑھنے کے بجائے دلچسپ یادداشتوں سے نوازا۔

اسی شام اکیڈمی آف لیٹرز نے ایک شاندار استقبالئے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جس میں پنڈی اسلام آباد کے تمام ادیب، شاعر اور فن شناس خواتین و حضرات جمع تھے۔ یوں تو ہر محفل میں پروفیسر آزاد سے کلام کی فرمائش ہوتی رہی اور وہ گلے کی خرابی کے باوجود ترنم کے ساتھ کلام پیش بھی کرتے رہے مگر اکیڈمی آف لیٹرز کے استقبالئے میں حاضرینِ محفل نے جی بھر کر پروفیسر موصوف کو سنا۔ پنڈی میں پروفیسر آزاد کے قیام کے دوران کے بھی قلم اور پاؤں ان کے ساتھ ساتھ گردش میں رہے۔ سو آئیے ان سے ہونے والی باتوں ملاقاتوں اور شعروں کا لطف آپ بھی اٹھائیے۔

یہ شام ہمدرد کی محفل ہے۔ حسبِ معمول بھری پری۔ مگر اہلِ ذوق خواتین و حضرات کا مجمع کثیر ہے۔ ادب کے "ہمدرد" کی محفل ہے۔ کرسیٔ صدارت پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس۔ ایم زماں تشریف فرما ہیں۔

اکیڈمی آف لیٹرز کے ڈائریکٹر مسیح الدین صدیقی نے مہمان خصوصی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تعارف کرایا۔ اب پروفیسر جگن ناتھ آزاد تالیوں کی گونج میں مائیک کے سامنے آئے ہیں۔ میں معذرت چاہوں گا کہ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی۔ دراصل قصور میرا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے آنے میں دیر کر دی۔ میرا گلا خراب ہے۔ ایک مدت سے میں سفر میں ہوں۔ یہاں آنے سے پہلے ہندوستان میں یومِ اقبال کی تقاریب کے سلسلے میں ملک کے طول و عرض میں بھاگا بھاگا پھرا۔ پھر اسی افراتفری میں

یہاں آگیا۔ گلا کافی دنوں سے خراب ہے مگر جم کر علاج نہ کر سکا۔ مقام کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اور دوائیں بھی بدلتی رہیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔،

"کسی نے مشورہ دیا کہ اب حکیم صاحب سے علاج کروائیں طب مشرق سے استفادہ کریں"

ہاں تو میں آج آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں کہ ہندوستان میں مقام اردو کے موضوع پر بات کروں۔ میں آپ کو یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا کہ ہندوستان میں ہر شخص کا اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ اور نہ ہی یہ کہوں گا کہ وہاں اردو کا کوئی مقام نہیں۔ میں صورتِ حال آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ آپ خود فیصلہ کریں۔ پشاور میں مجھ سے سوال ہوا کہ ہندوستان میں اردو کا رسم الخط ہی ختم کر دیا گیا ہے۔ اور یہ غلط فہمی یہاں عام پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس اطلاع میں کوئی صداقت نہیں

کسی زبان کے ادب پارے کا کسی اور رسم الخط میں شائع ہوتا۔ اس زبان کے مقبول ہونے کی علامت ہے۔ اس کے زوال پزیر ہونے کی نہیں۔ میرزا غالب سے لے کر ہمارے عہد تک مختلف شعراء کا کلام مختلف اسکرپٹ میں شائع ہوتا رہا ہے اس سے یہ قیاس کرنا کہ یہ کسی سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ غلط ہے اردو کو ختم کرنے کی سازش نہیں بلکہ اس کی مقبولیت کا سبب ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں ملک کی پچپن یونیورسٹیوں میں اردو کا شعبہ موجود ہے۔ جہاں ایم اے اردو کا کورس کرایا جاتا ہے اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت کی تعداد سے بھی آپ اس کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ حالانکہ تعدادِ اشاعت کے بڑھ جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہو گیا ہے۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں اور نہ آپ کو کرنا چاہتا ہوں۔

"ہندوستان میں اردو کے فلمی اور مذہبی رسائل کی تعدادِ اشاعت زیادہ ہے۔ اردو کے بعض روزانہ اخبارات کی تعدادِ اشاعت ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روزانہ تک ہے۔ ملک بھر میں اردو کے پچاسی روزنامے نکل رہے ہیں۔ تقریباً

ہر ریاست میں اردو اکیڈمیاں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں جن کے
ذمے اردو ادب کی کتب کی اشاعت کے علاوہ ہر سال میں ہر ریاست میں
بہترین تخلیق پر پہلا دوسرا اور تیسرا انعام بھی دینا شامل ہے۔ اترپردیش، راجستھان
بہار، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، تامل ناڈو، آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر،
ان سب ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں۔ جن کے لئے خاصا بجٹ مختص
ہوتا ہے۔ جن ریاستوں میں الگ سے اردو اکیڈمیاں قائم نہیں ہیں۔ مثلاً جموں و
کشمیر، پنجاب، ہریانہ وغیرہ، وہاں کی کلچرل اکیڈمیوں اور بھاشا وبھاگوں میں اردو کے
مضبوط اور فعال شعبے شامل ہیں۔ صرف ناگالینڈ اور آسام میں نہیں ہے۔ آج کل
یہ تجویز زیر غور ہے کہ مختلف ریاستوں
میں اردو کے بارے میں پہلے
کیا جائے کہ وہ متعلقہ ریاست
کی پہلی سرکاری زبان ہے۔ یا دوسری
یہ طے کرنا بے حد ضروری میرے
خیال میں۔

انھوں نے اقبال کی نظمیں پڑھ کر اسپین اور جرمنی کا سفر اختیار کیا

اقبال صدی پورے ہندوستان میں
بڑے جوش و خروش کے ساتھ منائی
گئی۔ آندھرا پردیش میں اردو دوسری بڑی سرکاری زبان ہے۔ اس کے علاوہ وہاں
انجمن ترقی اردو بھی اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بہت کام کر رہی ہے۔

ہندوستان میں اردو کے مقام کے بارے میں آج سے تیس سال پہلے
مجھ سے سوال کرتے تو میرا جواب مختلف ہوتا۔ مگر آج میں آپ کو مدلل جواب دے
سکتا ہوں۔ ہماچل پردیش میں اردو زبان کا خصوصی شعبہ موجود ہے اقبال شناسی زور
پر ہے۔ جب میں یہاں آنے کے لئے رخت سفر باندھ رہا تھا۔ تو مالیر کوٹلہ میں یوم اقبال
اقبال میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام منایا جا رہا تھا۔ یہ بڑا فعال ادارہ ہے۔ ہر سال

یومِ اقبال بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ اقبال پر کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی
کی جاتی ہے۔ محمد کفایت اللہ اس کے اور ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔

ویسے تو ان دنوں پورے ہندوستان میں یومِ اقبال منایا جا رہا ہے اقبال
کی تصویروں کی نمائش، ان کی تحریروں کے بلاکس کی نمائش مشاعرے مذاکرے
بہت کچھ ہو رہا ہے۔ اور ہر سال ہوتا ہے۔ مگر اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں
کہ یومِ اقبال کیسے منایا جاتا ہے۔ کتنی اکیڈمیاں کام کر رہی ہیں اخبارات و رسائل
کی تعداد اشاعت کیا ہے۔ جبکہ علمی و ادبی رسائل کی تعداد اشاعت حوصلہ افزا نہیں
میرے نزدیک اردو کی ترقی و ترویج کے لئے مناسب اقدام یہ ہے کہ اسے ابتدائی کلاسوں
سے اسکولوں میں لازمی مضمون کے طور پر رائج کیا جائے۔ آئین کی چودہ سرکاری زبانوں
میں اردو کا نام موجود ہے۔ یہ بھی اطمینان بخش ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں اور بھی کئی
زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن کی ترویج و ترقی کے لئے کام ہو رہا ہے۔ مگر آئین انہیں سرکاری
زبان کے طور پر تسلیم نہیں کرتا۔ اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ میں نے اس ذکر میں کہیں
مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ حالات مایوس کن نہیں۔ امید افزا ہیں۔

قوموں کی زندگی میں بیس تیس سال کوئی معنی نہیں رکھتے۔ آپ اندازہ نہیں
کر سکتے کہ آزادی کے بعد دس پندرہ سال ہم اردو والوں پر اور اردو پر کیسے گذرے ہیں
کئی برس تک ہم اقبال کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ نہ ریڈیو پر نہ تقریر میں نہ کسی تعلیمی ادارے
میں نہ محلے میں اور اب اقبال پر جشن منائے جا رہے ہیں۔ جب اسکولوں میں اردو لازمی
قرار دے دی جائے گی۔ تب ہم مطمئن ہوں گے کہ اصل کام شروع ہوا ہے۔ اور اب
اردو کا مستقبل روشن ہے۔ یہ پودا پھولے پھلے گا۔ اور ایک بار پھر تناور درخت
بنے گا۔

عون محمد رضوی کا سوال :۔ لیکن مرکز کی طرف سے اردو کے لئے کچھ بھی نہ ہوا
اور آئین کی تسلیم شدہ زبانوں میں اردو کا کوئی ذکر نہیں تو کیوں؟

آزاد :۔ یہ مسئلہ مرکز کا نہیں۔ ریاستوں کا مسئلہ ہے آئین کی تسلیم شدہ۔

زبانوں میں اردو کو ٹریدہے۔ یہ الگ بات کہ حروف تہجی کے اعتبار سے سب سے آخر

میں ہے یعنی یو (ل)

حمید علوی:۔ اردو پڑھنے والوں میں کسی خاص مذہب کے لوگ شامل ہیں

یا ہر مذہب کے لوگ پڑھتے ہیں؟

آزاد:۔ صحیح اعداد و شمار تو میں نہ بتا سکوں گا۔ مگر مثال پیش کرتا ہوں کہ میری یونیورسٹی

میں میرے شعبے میں پرولیس کے پندرہ طالب علم ہیں۔ جن میں آٹھ مسلم اور سات

ہندو ہیں۔ اسی طرح فائنل میں ۲۴ طالب طالب علموں میں ۱۴ اور ۱۰ کا تناسب ہے

ویسے میں نے کبھی اس طور پر جائزہ نہیں لیا۔ کیونکہ میرے خیال میں علم میں مذہبی تناسب

کی بات مناسب نہیں لگتی۔ ویسے ایک بات اور ہے۔ کہ اردو اور ہندی بول چال

میں اس قدر قریب ہیں کہ یہ قربت بھی اردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

عطا حسین کلیم:۔ درسی کتب میں اقبال کے کس خاص دور کا کلام پڑھایا جاتا

مثلاً نظم "نیا شوالہ" وغیرہ۔

آزاد:۔ درسی کتب میں صرف اقبال یا نیا شوالہ کو ہی شامل نہیں کیا گیا۔ اس میں

دوسرے شاعر بھی موجود ہیں۔

سوال:۔ کچھ ادبی جرائد کی بات ہو جائے۔

آزاد:۔ جیسے اردو میں معیاری ادبی جرائد چھپ رہے ہیں۔ اب وہ ضخامت

کے اعتبار سے ایسے تو نہیں ہیں جیسے نقوش، اوراق، فنون اور سیپ لیکن اچھے جرائد

ہیں۔ اور ہر اعتبار سے معیاری ہیں مثلاً، شب خون، شاعر، زبان و ادب، گفتگو

روح ادب، سیاره، شیرازه، تعمیر، توازن، لمحے لمحے وغیرہ۔

سوال:۔ ایک غزل کا سوال ہے۔ اس سوال کی پذیرائی تالیوں سے ہوئی مگر پروفیسر

آزاد بولے میں تھک گیا ہوں۔

عطا حسین کلیم:۔ یہی تو مقام غزل ہے۔

حاضرین کے پر زور اصرار پر پروفیسر آزاد ایک خوبصورت غزل خوبصورت ترنم کے ساتھ

سناتے ہیں۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی یوم اقبال کی تقریب میں صدارت ڈاکٹر آفتاب احمد کر رہے ہیں۔ جو آزاد کے دیرینہ ساتھی ہیں۔ پروفیسر صدیق شبلی، پروفیسر آزاد کا تعارف کرواتے ہیں۔ کہ ان کا آغازِ شہرت حافظ کلام اقبال کے طور پر ہوا تھا۔ آج حافظ کلام اقبال کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر آزاد مائیک پر آئے۔ اقبال کے بارے میں غیر رسمی باتیں کروں گا۔ مقالہ پھر کبھی سہی۔ میں ۲۰ اپریل کو لاہور پہنچا تو وہاں اقبال اکیڈمی کی طرف سے یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کی دعوت ملی۔ تقریب میں ایک فاضل مقرر نے ایک بات کہی۔ جس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔ اور ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی تقریر میں اس کا جواب بھی دیا۔ مگر میری بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہاں میں نے بحث کو مناسب نہ جانا مگر آج میں آپ کو بتاتا ہوں۔ فاضل مقرر نے کہا کہ آج کل اقبال کو عالم انسانیت کا شاعر قرار دے کر اسے شاعر اسلام ہونے کے اعزاز سے محروم کرنے کی سازش کی جا رہی ہے مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ پاکستان سے باہر ساری دنیا میں اقبال شناس موجود ہیں۔ جو اقبال پر کام کر رہے ہیں تو کیا ان سب کے درمیان کوئی سازش کام کر رہی ہے اقبال کے کلام کا بنیادی منبع و سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن

اقبال کا پیغام ساری انسانیت کے لئے ہے

وحدیث صرف مسلمانوں کے لئے خداوند و رسول کا پیغام ہے۔ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا۔ اور میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ قرآن وحدیث کا پیغام صرف عربوں یا مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ سارے عالم انسانیت کے لئے تھا۔ اس لئے اقبال کا کلام جو قرآن وحدیث کی تفسیر ہے۔ وہ صرف مسلمانوں کے لئے کیسے ہوا۔ ویسے بھی شاعر کسی مذہب، قوم، ملک یا خطے کی ملکیت نہیں ہوتے۔ ان کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہوتا ہے۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے یہ ازلی وابدی حقیقت ہے۔ مگر اس کی روشنی صرف اہل مشرق کے لئے وقف نہیں۔ اقبال خود بھی اپنے کلام کو سب کیلئے

پیغام سمجھتے تھے ۔ جب "اسرار خودی" لکھ رہے تھے ۔ تو مہاراجہ سرکشن کو خط لکھا کہ ایک مثنوی لکھ رہا ہوں ۔ جو بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم ساری دنیا کے لئے ہے ۔

کلام اقبال پڑھتے ہوئے ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ فلاسفر اقبال کو یاد رکھا جاتا ہے شاعر کو بھول جاتے ہیں ۔ حالانکہ علامہ کی حیثیت دونوں طرح مسلم ہے ۔ میں نے جب اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" پڑھی تو اتنا متاثر ہوا کہ مسجد قرطبہ دیکھنے چل پڑا ۔ وہاں جاکر مسجد کے سامنے بہنے والی نہر کا نظارہ کیا ۔ اور قیاس گذرا کہ یہاں بیٹھ کر علامہ پر یہ نظم وارد ہوئی ہوگی ۔ نہر کا عجب منظر تھا آٹھ چھوٹی لہروں کے بعد ایک بڑی موج آتی تھی جو نہر میں پڑے ہوئے بڑے پتھر سے ٹکرانے کے بجائے اس پر سے گذر جاتی تھی ۔ میں نے غور کیا نظم کی ساخت اور نہر کی روانی میں گہرا تعلق تھا ۔ اسی طرح دریائے نیکر کنارے نظم پڑھی تو دریائے نیکر کا حسن دیکھنے چل دیا جس نے علامہ کو اتنا متاثر کیا تھا ۔ اقبال کا کلام شاعرانہ حسن اور معنوی و صوری محاسن سے مالامال ہے ۔ ہم نے غلطی کی کہ اقبال کی شاعری فلسفہ سمجھ لیا ۔ اور فلسفے کو نظر انداز کر دیا ۔

ان دنوں ایک سفرنامہ لکھ رہا ہوں مگر جب سے یہاں آیا ہوں لکھنے کی مہلت نہیں ملتی ۔ آپ کے خلوص و محبت میں پور پور ڈوبا ہوا ہوں ۔ جب آرام کے لئے اجازت ملتی ہے تو میں نیند قربان کر کے لکھنے بیٹھتا ہوں ۔ پاکستان کے صدر مملکت سے ملاقات کے دوران میں نے گذارش کی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور لکھنے والوں کا تبادلہ بے حد ضروری ہے ۔

کلام سنانے کی فرمائش ہوتی ہے ۔ آزاد صاحب پوری کرتے ہیں اور وہی شام ہمدرد والی غزل سناتے ہیں ۔

اسی شام اکیڈمی آف لیٹرز کی طرف سے اسلام آباد ہوٹل میں استقبالیہ دیا جا رہا ہے ۔ آزاد صاحب کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہے ۔ مگر سوال وہی ہیں جن کا جواب اوپن یونیورسٹی میں پروفیسر موصوف دے چکے ہیں ۔ ایک سوال پروفیسر احسان نے یہ کیا کہ ہندوستان میں چند رہ بیس سال تک اقبال کا نام لینا جرم تھا تو کیوں ؟ ۔

آزاد:۔ کہہ دیجئے کہ ہم ادب میں بھی مذہبی و سیاسی حد بندیاں کرتے ہیں۔ لیکن پروفیسر آزاد جب کلام سناتے ہیں تو انہیں مذہبی و سیاسی حد بندیوں سے ماورا ہو کر داد دی جاتی ہے۔ اس غزل کی بھی بالخصوص فرمائش ہوتی ہے جو موصوف زور زور سے سنا رہے ہیں۔ صاحب وہی کافروالی غزل سنائیں۔
آزاد مسکراتے ہیں جی ہاں کافر ہی کی غزل ہے۔

غزل

پھر بھی کم تھا گرچہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو ہم کو یہ خیال آیا بہت

سیم و زر کیا شئی ہے یہ لعل و گہر کیا چیز ہیں
آنکھ بینا ہو تو علم و فن کا سرمایا بہت

کیا خبر کیا بات اس کے کفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

گھر سے اک ویرانئ دل لے کے نکلا تھا مگر
کارواں یادوں کے ہیں دل میں بسا لایا بہت

اس جگہ کھونے کا پانے کا عجب مفہوم ہے
ہم نے آکر جس جگہ کھویا بہت پایا بہت

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعویٰ علم کا
انتہا یہ ہے کہ اس دعوے پہ شرمایا بہت

دیر ہی کی روشنی میرے لئے کافی نہ تھا
میں حرم کا نور بھی دل میں بسا لایا بہت

یوں تو اے آزاد تیرے شعر کا سو رنگ ہیں
مجھ کو لیکن یہ ترا لہجہ پسند آیا بہت

دو سال پرانی ایک نظم سنا رہا ہوں، بارہ سال بعد مزارِ اقبالؒ پر حاضر ہوا تھا عجیب کیفیت تھی۔ نظم کا عنوان تھا۔ دلی سے لاہور تک۔

نظم

منزلِ جاناں کو جب یہ دل رواں تھا دوستو
تم کو میں کیسے بتاؤں کیا سماں تھا دوستو

ہر گماں پہنے ہوئے تھا ایک ملبوسِ یقین
ہر یقیں جاں دادۂ حسنِ گماں تھا دوستو

دل کی ہر دھڑکن مکان و لامکاں پر تھی محیط
ہر نفس رازِ دو عالم کا نشاں تھا دوستو

ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتا تھا مجھے اپنا وجود
میں تلاشِ دوست میں یوں سرگرداں تھا دوستو

مرقدِ اقبال پر حاضر تھی جب دل کی تڑپ
زندگی کا ایک پردہ درمیاں تھا دوستو

قرب نے پیدا کیا تھا خود ہی دوری کا سماں
فاصلہ ورنہ کوئی حائل کہاں تھا دوستو

بے خودی نے جب مرے ہونٹوں نے چوما قبر کو
میرا سینہ سجدہ گاہِ قدسیاں تھا دوستو

روبروئے جلوۂ مرقد وجودِ کم عیار
ذرۂ ناقص شرمسارِ امتحاں تھا دوستو

جلوہ گاہِ دوست کا عالم کہوں اب تم سے کیا
جلوہ ہی جلوہ وہاں تھا میں کہاں تھا دوستو

کاش تم بھی میری پلکوں کا نظارہ دیکھتے
یہ نظارہ کہکشاں در کہکشاں تھا دوستو

غزل

کیا گلہ غیروں کا خود ہی سانحے کر چلے
پتھروں کے شہر میں ہم آئینے کر چلے

ہم ہیں اور ان میں ازل کے روز جو حائل رہا
ہم وہی روزِ ابد تک فاصلے کر چلے

باوجودِ کسمپرسی دل کہیں تنہا نہ تھا
ہر جگہ یادوں کا ہم اک قافلے کر چلے

ان دنوں کچھ جادہ و منزل کا عالم اور ہے
جس کو چلنا ہو فقیروں کی دعا لے کر چلے

دیا جلاؤ تو دہلیز پر رکھو آزاد — درونِ خانہ بھی ہو بیرونِ خانہ بھی ضو
شراب پی کے غم اپنا غلط نہ کر پیارے — کہ غم متاعِ دل و جاں ہے پھر ملے نہ ملے

غزل

کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے — زندگی بھر زندگی کی آرزو کرتے رہے
جب حریفوں کی زباں تھی شعلہ گفتاری میں غرق — ہم تغزل کی زباں میں گفتگو کرتے رہے
اور ہونگے جن کو ہوگا چاک دامانی پہ ناز — ہم جنوں میں چاک دامن کو رفو کرتے رہے
اصل میں ہم تھے تمہارے ساتھ محوِ گفتگو — جب خود اپنے آپ سے ہم گفتگو کرتے رہے

کوئی یہ آزاد سے پوچھے کہ اپنے دل سے دور
تم کہاں جا کر تلاشِ رنگ و بو کرتے رہے

اخبارِ خواتین کراچی
۱۰ تا ۱۶ مئی سن ۱۹۸۰ء

علم و ادب

روزنامہ جنگ کراچی جمعہ ایڈیشن
۲۸ مارچ ۱۹۸۹ء

بھارت کے مشہور شاعر و دانشور اور ماہر اقبالیات
جناب پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے نذیر لغاری کا خصوصی انٹرویو

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد بھارت میں علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری پر جو تحقیقی کام ہوا ہے۔ ہم آپ سے اپنے قارئین کے لئے اس کام کی تفصیل جاننا چاہیں گے

جواب:۔ شروع میں کئی برس تک اقبال بھارت میں شجر ممنوعہ رہے ۱۹۶۷ء تک تو صورت حال یہ تھی کہ ہمارے ہاں اقبال ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے بارے میں بھی عمومی رویہ معاندانہ تھا۔ سب سے پہلے اقبال کے بارے میں سنجیدہ کام کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ان کی تاریخ پیدائش کا معاملہ اٹھا۔ جو لوگ علامہ اقبال کی شاعری کو پسند کرتے تھے، وہ متحرک ہوئے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ علامہ اقبال ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے بیسیوں محققین نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش یہی لکھی ہے۔ مگر یہ تاریخ صحیح نہیں تھی۔ پاکستان میں اقبال کی تاریخ پیدائش کا تعین کرنے کے لئے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ بھارت میں بھی آل انڈیا اقبال صدی تقریبات کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد اس کمیٹی کے سرپرست تھے۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات دندر کمار گجرال صدر، معروف بھارتی سفارت کار ڈی۔ پی دھر نائب صدر اور علی سردار جعفری اس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ جبکہ میں جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اقبال صدی تقریبات کے سلسلے میں اور بھی بہت سی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ جن میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد

دکن اور اقبال ادبی مرکز بھوپال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں کلکتہ یونیورسٹی جواہر لعل یونیورسٹی دہلی، عثمانیہ یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی میں کمیٹیاں بنائی گئیں۔

مرکزی کمیٹی اور دیگر کمیٹیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اقبال صدی تقریبات کا آغاز ۲۲ر فروری ۱۹۷۳ر سے شروع کیا جائے۔ میں اس تاریخ سے متفق نہیں تھا۔ میں اسی تاریخ کو صحیح قرار دیتا تھا جو مجھ سے پہلے فقیر سید وحید الدین لکھ چکے تھے یعنی ۹ر نومبر ۱۸۷۷ر۔ اس تنازع کے سلسلہ میں ۱۰ر فروری ۱۹۷۳ر کو میرا ایک مضمون ہندوستان ٹائمز میں چھپا میں نے مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا کہ علامہ اقبال ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ر کو نہیں بلکہ ۹ر نومبر ۱۸۷۷ر کو پیدا ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کے انتقال کے دوسرے روز ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ر کو میاں محمد شفیع (م س) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا اس مضمون میں اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ر لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر اینا میری شمل نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ جبکہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔ فقیر وحید الدین نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔ مگر انھوں نے اپنی تحقیق کو یہ لکھ کر کمزور کر دیا کہ ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ر کو شیخ نور محمد کے ہاں محلہ کشمیریاں سیالکوٹ میں علامہ اقبال کے بڑے بھائی پیدا ہوئے تھے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ علامہ اقبال کا خاندان محلہ کشمیریاں میں کبھی نہیں رہا علامہ اقبال کا خاندان محلہ چوڑی گراں میں مقیم تھا جسے زرد دروازہ بھی کہا جاتا تھا میرے مضمون کی اشاعت کے بعد پاکستان ٹائمز میں ایک مضمون چھپا جس میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کی تحقیقات کے سلسلے میں پاکستان میں قائم کردہ کمیٹی کو سفید ہاتھی قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اس کمیٹی نے لاکھوں روپے تباہ کر دیئے۔ میرے مضمون کی اشاعت چند روز بعد پاکستان کی کمیٹی کا نتیجہ آیا جس میں بتایا گیا تھا کہ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ر ہے۔ اس طرح اس بات کا فیصلہ ہو گیا۔

سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال صدی تقریبات کے لئے بھارتی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی نے بڑی دلچسپی لی تھی۔ اور اس سے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھی کیا یہ بات درست ہے؟

جواب:۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اقبال صدی تقریبات کے لئے نہ انھوں نے کوئی ہدایت جاری کی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان سے تو ہم نے بہت بعد میں رابطہ کیا تھا۔

سوال:۔ بھارت کی کتنی یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر قائم کی گئی ہے!

جواب:۔ اقبال چیئر کے قیام کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جن دنوں بھارت کے دانشور اور محقق علامہ اقبال پر تحقیق کرنے کے سلسلے میں پرجوش ہوئے ان دنوں کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ تھے۔ شیخ عبداللہ بھارت کے ان چند زندہ لوگوں میں سے تھے جن کی علامہ اقبال سے راہ و رسم تھی۔ مہاراجہ کے دور میں جب شیخ عبداللہ کو گرفتار کیا گیا تو پٹنہ کے ایک وکیل مسٹر نعیم الحق نے شیخ صاحب کا مقدمہ لڑنے کیلئے بلا معاوضہ خدمات پیش کی تھیں۔۔ علامہ اقبال کی مسٹر نعیم الحق سے خط و کتابت تھی۔ علامہ اقبال کے ان مکتوبات میں شیخ عبداللہ کا ذکر موجود ہے۔

شیخ عبداللہ کہا کرتے تھے کہ میں اقبال کا دوست نہیں بلکہ ان کا نیازمند تھا۔ میں نے ایک مرتبہ شیخ صاحب سے کہا کہ شیخ صاحب اقبال کے نیازمند کی حیثیت سے آپ پر یہ فرض اور قرض بنتا ہے کہ آپ کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر قائم کریں۔ انھوں نے اس سلسلے میں مجھ سے ایک نوٹ تیار کرنے کو کہا چنانچہ میں نے سات آٹھ صفحات پر مشتمل ایک نوٹ تیار کیا اور ممتاز بھائی پارلیمنٹرین مسٹر شمیم احمد شمیم کو ساتھ لے کر شیخ صاحب کے پاس گیا شیخ صاحب بہت مصروف ہوتے تھے۔ مگر میں اور شمیم صاحب ان کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال چیئر کے قیام کی اجازت دے دی اور اس طرح سب سے پہلے اقبال چیئر کشمیر یونیورسٹی میں قائم ہوئی۔ پروفیسر آل احمد سرور اس چیئر کے سربراہ مقرر ہوئے اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر قائم ہوئی۔ بھارت کے علاوہ پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی لاہور اور برطانیہ میں کیمبرج یونیورسٹی میں بھی اقبال چیئر قائم ہے لیکن سب سے پہلے یہ چیئر کشمیر یونیورسٹی میں قائم ہوئی۔ اور اس کا سہرا شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے سر ہے۔۔

سوال:- آپ کی زیر نگرانی علامہ اقبال کے بارے میں ایک نمائش بھی تو منعقد ہوئی تھی ؟

جواب:- جی ہاں، ہوا یوں کہ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے مجھے علامہ اقبال نمائش کے انعقاد کے سلسلے میں کہا گیا تھا۔ میرے پاس ان کی پانچ چھ سو تصاویر ان کے ہاتھ کی تحریریں اور ان کے فوٹو اسٹیٹ تھے۔ میں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے کہا کہ آپ نمائش کے انعقاد کے سلسلے میں گجرال صاحب کو لکھیں کیونکہ نمائش کے سلسلے میں چندہ جمع کرنا مناسب نہیں ہے۔ وائس چانسلر نے گجرال صاحب کو خط لکھا جس کے جواب میں مجھے ٹیلی پرنٹر پر پیغام موصول ہوا اور مجھے دہلی پہنچنے کی ہدایت کی گئی۔ ان دنوں وزارتِ اطلاعات ونشریات کے سکریٹری انور جمال قدوائی تھے۔ قدوائی صاحب بھی عاشقِ اقبال تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر نمائش کی تفصیلات طے کیں۔

جب نمائش کے تمام انتظامات مکمل ہوگئے تو اس کے افتتاح کا معاملہ درپیش آیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس نمائش شیخ محمد عبداللہ مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوں۔ افتتاح شیخ عبداللہ کریں۔ مگر اس وقت وزیر اعلیٰ سید میر قاسم تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے گجرال صاحب سے بات کرنے کو کہا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اجازت دے دیں۔ گجرال صاحب سے میں اجازت حاصل کر لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اجازت دے دی اور اس کے بعد میں گجرال صاحب سے اجازت حاصل کرلی۔ بہرحال شیخ صاحب اس نمائش میں مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ سری نگر کے بعد جواہر لعل یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی یونیورسٹی اور دیگر جگہوں میں یہ نمائش ہوئی۔ دہلی کے بعد پٹنہ، بمبئی، چنڈی گڑھ، لکھنؤ، دینم باڑی مدراس، جموں اور دیگر شہروں میں یہ نمائش منعقد ہوئی۔ اس طرح اقبال کے بارے میں جو مخالفانہ خیالات تھے وہ بڑی حد تک کم ہوگئے۔ اس کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی اقبال کا کلام آنا شروع ہوگیا اور اس کے علاوہ اُن کے متعلق

پروگرام بھی۔ دراصل وزارتی سطح پر اس کام کا کریڈٹ اندر کمار گجرال اور انور جمال قدوائی کو جاتا ہے۔

سوال:۔ اقبال صدی تقریبات نمائش اور ان دنوں کی سرگرمیوں سے قبل کیا بھارت میں اقبال کے بارے میں مکمل خاموشی تھی؟

جواب:۔ بہت تھوڑا کام ہوا تھا۔ ۴۷ ۱۹۴۷ء میں سچدانند سنہا اور پھر مجنوں صاحب کا کام سامنے آیا۔ ان دونوں کا نقطۂ نظر اور اپروچ مخالفانہ تھی۔ سنہا صاحب اقبال کو شاعر نہیں بلکہ ناظم سمجھتے تھے۔ جب کہ مجنوں صاحب کا اعتراض یہ تھا کہ اقبال کی شاعری میں مجازی رُسے بہت زیادہ ہے۔ مگر جب حکومت کی طرف سے کام شروع ہوا تو جو لوگ خاموش بیٹھے تھے انہوں نے کام شروع کر دیا۔ اور پھر آل احمد سرور، علی سردار جعفری، وحید اختر، صباح الدین عبدالرحمٰن کا کام سامنے آیا۔ مختلف رسائل نے اقبال نمبر شائع کئے۔ اقبال کو نظر انداز کرنے کے سلسلے میں بھارت جیسے بڑے ملک نے جو بڑی غلطی کی تھی اس کی بالآخر تلافی کی۔

سوال:۔ اقبال پاکستانی کے قومی شاعر ہیں انہیں تصور پاکستان کا خالق سمجھا جاتا ہے۔ ان کی اس حیثیت کو بھارت میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے؟

جواب:۔ اس بات میں شک نہیں کہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں جو خطبہ دیا تھا اس میں تصور پاکستان موجود ہے۔ اور انہوں نے قیام پاکستان کے لئے جو خطوط وضع کئے تھے پاکستان انہیں خطوط پر قائم ہوا۔ وہ ایک سیاسی جماعت کے سربراہ تھے اور انہوں نے ایک سیاست داں کے طور پر خطبہ دیا تھا مگر میں سیاست کو ان کی شاعری سے منسلک نہیں کرتا۔ ہم ان کی شاعری کے عاشق ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ میں اقبال کی ہر بات تسلیم کر لوں۔ اقبال نے بھی رومی کے خیالات کو پورے طور پر تسلیم نہیں کیا۔ شاعری کو قبول کرنا دوسری بات ہے ہندوستان میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اقبال نے تصور پاکستان نہیں پیش کیا تھا۔ مگر وہ لوگ مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ یا پھر انہیں حقائق کا علم نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت کہ اقبال کے خیالات

اور افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآن و حدیث ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے باقی تمام نظریات کو مسترد کر دیا ہے۔ ہمارے مطالعے میں خرابی یہ ہے کہ پاکستان میں علامہ اقبال کے صرف ۱۹۳۰ء کے خطبہ کو اہمیت دی گئی ہے اور ہندوستان میں صرف "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کو اہمیت دی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۶ء میں اپنی مشہور نظم "شعاعِ امید" لکھی جس میں انہوں نے ہندوستان کے فلسفہ اور علم کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اسی طرح نظریۂ پاکستان پیش کرنے کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ انہیں ہندوستان سے نفرت تھی۔ وہ تو جھگڑا ختم کرنے کے لئے دو خاندانوں کو بانٹنا چاہتے تھے۔ وہ تو امن دامان چاہتے تھے۔ اقبال یہ تو نہیں دیکھ رہے تھے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تین جنگیں ہوں گی۔ اور نہ ہی انہوں جنگوں کی خاطر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔

سوال:۔ آپ نے اقبال کے بارے میں جو کام کیا ہے ذرا اس کی تفصیل بتائیے۔

جواب:۔ میں نے اقبال کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے کام کیا کہ بھارت جیسا بڑا ملک اقبال کی شاعری سے محروم نہ رہے۔ میں نے کئی سطحوں پر کام کیا اقبال پر میری دس کتابیں ہیں ان میں سے تین کتابیں ان کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہیں۔ میری ایک کتاب اقبال اور مغربی مفکرین ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو میں واحد کتاب ہے۔ علاوہ ازیں میں نے یونیورسٹی آف ماسکو لینن گراڈ یونیورسٹی ریگا (لیٹویا) یونیورسٹی، تاجکستان یونیورسٹی، الیسٹ ویسٹ یونیورسٹی تسگاکو، نارتھ ایسٹرن اے مائے یونیورسٹی تسگاکو، انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن یونیورسٹی آف ٹورنٹو، اسلامک سنٹر برما اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں علامہ اقبال کے بارے میں لیکچر دیئے ان لیکچرز پر مشتمل کتاب "AQBAL-MIND AND ART"۔ لاہور میں نیشنل بک ہاؤس نے شائع کی ہے۔ اس کے علاوہ "اقبال اور کشمیر" اور "اقبال اور اس کا عہد" نامی کتب شائع ہوئیں۔

سوال:۔ آپ جموں یونیورسٹی سے تشریف لائے ہیں۔ اور آپ کے علاوہ دیگر حضرات بھی یہاں آتے ہیں کیا پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں کو سری نگر آنے دیا جاتا ہے؟

جواب:۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا ڈومیسائل جموں کا نہیں ہے میری مستقل رہائش دہلی میں ہے۔ اور آل احمد سرور بدایوں میں رہتے ہیں۔ ہم دونوں جموں اور سری نگر سے تعلق نہیں رکھتے۔ اب رہا سوال کا دوسرا حصہ تو اس معاملے کا تعلق ویزا سے ہے پاکستان سے اکثر لوگ جموں وکشمیر آتے رہتے ہیں۔

سوال:۔ کیا ثقافتی وفود کے تبادلے اور فنکاروں کے ایک دوسرے کے ممالک کا دورہ کرنے سے بھارت اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہوسکتے ہیں؟

جواب:۔ اس طرح یقیناً تعلقات بہتر ہوسکتے ہیں لیکن فنکار، ادیب اور شاعر سیاسی فیصلوں پر تو اثر انداز نہیں ہوسکتے۔ ہم تو صرف ماحول بہتر بنا سکتے ہیں ہر سطح پر تعلقات کو بہتر بنانا تو حکومتوں کا کام ہے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ میں فیصل آباد سے کراچی پہنچا۔ مگر مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ رن آف کچھ میں پاکستان اور بھارت کے مابین لڑائی شروع ہوگئی ہے یہاں تک کہ کراچی کے چیف کمشنر ہاشم رضا اور ممتاز حسین نے میرے لئے سیکورٹی کا انتظام کیا تو مجھے اس انتظام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا مجھے بحفاظت ایرپورٹ پہنچایا گیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جنگ وجدل اور اختلافات سیاست داں ہی قابو پا سکتے ہیں۔ ہم تو صرف فضا کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

روزنامہ جنگ کراچی
جمعہ ایڈیشن
۲۸ مارچ سنہ ۱۹۸۶ء

منظومات

تلوک چند محروم

دُعا

دنیا میں سعادت ہو میسّر تجھ کو
رکھّے محفوظ ذاتِ برتر تجھ کو
اے نورِ نظر[1]! یہی دُعا ہے میری
حاصل ہو فروغِ ماہ و اختر تجھ کو

("رباعیاتِ محروم" تیسرا ایڈیشن صفحہ ۳۸۴)

[1] فرزندِ مصنّف جگن ناتھ آزاد

تلوک چند محروم

بیٹے کے نام

یہ دعا ہے راحتِ جانِ حزیں تیرے لئے
دورِ عالم ہو مسرّت آفریں تیرے لئے
باطنِ مہر و مہ و انجم پہ ہو تیری نظر
جابجا ہو جلوۂ نورِ یقیں تیرے لئے
آسمانوں سے ہو تجھ پر بارشِ الطافِ حق
باغ گلہائے وفا کا ہو زمیں تیرے لئے
زیست کی تلخی جو ہو تیرے مقدر میں کہیں
وہ دعاؤں سے مری ہو انگبیں تیرے لئے
مشکلاتِ دہر کو مشکل نہ سمجھے دل ترا
سہل ہو ہر منزلِ دنیا و دیں تیرے لئے
اِن دعاؤں کے سوا اِن آرزوؤں کے بغیر
پاس میرے سیم و زر کوئی نہیں تیرے لئے

عزم و استقلال و تسکیں ہوں سدا ہمدم ترے
راستی صدق و صفا ہوں مونسِ پیہم ترے

بک رہی ہے آہ اپنی قدر و قیمت بھول کر
دورِ حاضر میں جوانی عشرتِ امروز پر
عیش و عشرت کی تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں
نوجوانوں کے دلوں میں آج اے لختِ جگر

عمر بھر جمعیّتِ خاطر کو پا سکتے نہیں!
یہ پریشانِ دل و جاں یہ پریشانِ نظر
وقت سے پہلے ہوا جاتا ہے تاراجِ خزاں
بے ریاضت، بے حفاظت نوجوانی کا شجر
عمر بھر اس کی غلامی ہے بشر کے واسطے
گر جوانی میں نہ ہو مغلوبِ نفسِ حیلہ گر

شُکرِ ایزد! دل ترا ہشیار ہے فرزانہ ہے
ہر روش میں راہ و رسمِ عام سے بیگانہ ہے
خوب شے ہے راہ و رسمِ عام سے بیگانگی
میری نظروں میں اسی کا نام ہے فرزانگی
بے نیازِ فکر ہیں افلاس ابنائے زماں
عام ہے اس دور میں تقلید کی دیوانگی
لائقِ تحسیں ہے کارِ خیر میں تقلیدِ عام
عقل سے حاصل ہے اس تقلید کو پروانگی
بہہ رہا ہے اک جہاں جذبات کے سیلاب میں
مستقل رہنا لبِ ساحل پہ ہے مردانگی
دل کی تسکیں کے لئے تفریح گاہوں تک نہ دوڑ
تا کنارِ بام ہے پروازِ مرغِ خانگی
حق تجھے مائل بہ تقلیدِ حق اندیشاں کرے
رہروِ سر منزلِ راہِ صفا کیشاں کرے

نیرنگِ معانی
طباعتِ دوم ۱۹۶۴ء
صفحہ ۱۲۴-۱۲۶ -

جوشؔ ملیح آبادی

درسِ فراموشی

۲۶ مارچ ۱۹۵۶ء کے "ریاست" میں مسٹر جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے شکوہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ آپ کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد ہندوستان کے ادیبوں، شعراء، علمی حلقوں اور آپ کے دفی جذبات کیا ہیں۔ اس نظم کے جواب میں حضرت جوشؔ نے ایک نظم بھیجی ہے، اور اپنے خط میں لکھا ہے کہ:—

"آزاد کی نظم پڑھ کر آنسو نکل آئے اور وہ آنسو اس نظم کے سانچے میں ڈھل گئے۔"

نظم یہ ہے

"ایڈیٹر ریاست"

جو کڑکتی تھی سرِ دیوِ شقاوت پر کبھی\
اے رفیقِ سرو قامت! اس کماں کو بھول جا

لرزہ براندام تھا جس سے غرورِ خسروی\
اس بہادر شاعرِ ہندوستاں کو بھول جا

جس کی ہر موجِ نفس تھی صد پیامِ انقلاب\
بن پڑے تو اب اس آشوبِ جہاں کو بھول جا

اے جگن ناتھ! اے جوانِ مخلص و آزادہ رو!\
ایک دور افتادہ پیرِ ناتواں کو بھول جا

اے گلِ شاداب! برگِ زرد کا ماتم نہ کر
اے بہارِ آسودہ! پامالِ خزاں کو بھول جا
اب کلاہِ ناخدائی کج کر اپنے فرق پر
بازوئے ملّاح و موجِ بادباں کو بھول جا
اپنے سر پر باندھ دستارِ امیرِ عود و چنگ
تاجِ میرِ حلقۂ رامش گراں کو بھول جا
شمعِ ایوانِ طرب کو گُل ہوئے مدّت ہوئی
سوزِ حرفِ جشن و سازِ گُل رُخاں کو بھول جا
یادِ محرابِ گُل افشاں میں نہ ہو یوں اشکبار
زلفِ لیلائے سخن کے سائباں کو بھول جا
اب جسے ٹھہرا چکے ہیں جُرمِ اربابِ وفا
تجھ سے ممکن ہو تو اُس اُردو زباں کو بھول جا
شہر یارِ لشکرِ اشراق و مستی کو نہ ڈھونڈ
خوابِ کیف و خیمۂ روحانیاں کو بھول جا
الاماں! احساسِ بربادی آل و خانداں
اس ہلاکِ آل و صیدِ خانداں کو بھول جا
دیکھ ان نوخاستہ زندوں کا سودِ مستقل
اے مرے دوست! ایک مردے کے زیاں کو بھول جا
باغ کی ان تازہ دم چٹکی ہوئی کلیوں کو دیکھ
باغباں کی زندگی کیا باغباں کو بھول جا
اب نہ رکھ اُمّیدِ سیرِ معجزاتِ زندگی
شامِ خیرا فشان و شیبِ نوجواں کو بھول جا
نوعِ انسانی کے دل جیا ہیں گے صدہا خیر خواہ

اِک رفیقِ دوستان و دشمناں کو بھول جا

حسن کی جو کان تھا اُس دیدہ ور کو محو کر
باغ کی جو آن تھا اُس آشیاں کو بھول جا

شمع پر خود فرض تھا جس کا طوافِ متصل
اپنے اُس پروانۂ آتش بجاں کو بھول جا

حسنِ یوسف خود خریداری کو آتا تھا جہاں
رنگ ہائے نو بہ نو کی اُس دُکاں کو بھول جا

حُسن کو ملتا تھا رنگِ خواب جس کی تاب سے
عشق کی اُس قدسی کو اُس کہکشاں کو بھول جا

بخشتی تھی قامتِ خوباں کو جو تشریفِ ناز
شعر کی اُس کارگاہِ پرنیاں کو بھول جا

جس میں جولاں تھا سرودِ زندگی کا سوز و ساز
اُس حدیثِ نغز کو اُس داستاں کو بھول جا

جس پہ رقصِ دلبراں تھا جس پہ لحنِ مطرباں
اُس زمیں کو کیا دل جا اُس آسماں کو بھول جا

سینۂ ہندوستاں میں جو دھڑکتا تھا کبھی
اے دلِ آفاق! اُس قلبِ تپاں کو بھول جا

شام جب ژولیدہ مُو تھی صبح جب آئینہ رُو
اُن دنوں کو اُس فضا کو اُس سماں کو بھول جا

عکس جس پر ڈالتا تھا مہ وشوں کا بانکپن
جوئے دل کے اُس خمِ آبِ رواں کو بھول جا

جانتا تھا جو مقاماتِ حدیثِ دیگراں
اُس امانت دارِ سِرِّ دلبراں کو بھول جا

خوشنوا مرغانِ دہلی کی نوا سنجی پہ جھوم
لکھنؤ کے طوطیٔ شکر فشاں کو بھول جا

اپنے دیپک سے جلاتا تھا جو کعبے کے چراغ
دیر کے اس روحِ پرور نغمہ خواں کو بھول جا

گوش بر آوازِ رہبر تھا نغمہ جس کے لئے
اپنے اس آوارۂ کوئے بتاں کو بھول جا

طاقِ زر! اپنے چراغِ منزلِ کا ماتم نہ کر
ہند! اپنے شاعرِ جادو بیاں کو بھول جا

دیدۂ یعقوب جنسِ رفتہ پہ گریاں نہ ہو
شہرِ کنعاں، یوسفِ بے کارواں کو بھول جا

اے درخشاں میکدے! جام و سبو کو توڑ دے
اے گل افشاں مغبچے! پیرِ مغاں کو بھول جا

اب جو گہوارہ ہے تیرے دشمنانِ نطق کا
جوش! تو بھی اس دیارِ دوستاں کو بھول جا

ہفتہ وار ”ریاست“ دہلی
۱۶ اپریل ۱۹۵۶ء

منوّر لکھنوی۔ دہلی

جگن ناتھ آزاد کے نام

رہِ ادب میں ذرا اور تیز گام آزاد
جہاں پاؤں اٹھانا ہو کارواں کے لئے
تمہارے واسطے نیا سبو جو خضر کی ہم زباں
دعائیں دوں بھی اگر عمرِ جاوداں کے لئے

کرو تم اپنے دل سے اُن کو شرمندہ
چلے ہیں گھر سے نکل کر جس امتحاں کے لئے
وطن میں رہ کے غریبِ دیارِ وطن ہیں
وہ پھول ہو جو نہ کانٹا ہو گلستاں کے لئے

تمہیں بھی دیتے ہیں تعمیر کے لئے دعوت
وہ خار و خس جو مہیا ہیں آشیاں کے لئے
بہائیں یہ بھی سرِ جوئے دودھ کی نہریں
اُٹھاتے رہو ذرّوں کو کہکشاں کے لئے

تمہارے طرزِ سخن پر ہزار بار نثار!
غذا یہ خوب ملی ہے نشاطِ جاں کے لئے
میں فکرِ نو کا اسے شاہکار کہتا ہوں
جگہ بہت ہے مرے دل میں دیگراں کیلئے

اپنا دیس، دہلی
۱۰ فروری ۵۳ء

راغب مرادآبادی۔ (کراچی)

رُباعیات

○

پاکیزہ خیال، پاک دل، پاک نہاد
خوش خلق، خوش اطوار، خوش فکر اُستاد
فرزند تلوک چند محروم کے ہیں
نازِ ہندوستاں جگن ناتھ آزاد!

(قلم برداشتہ) کراچی۔ ۱۰/مئی ۸۱ء

○

اُردو کے بہی خواہ نہ ہوں گے ناشاد
آئے گی نہ اب ان کی زباں پر فریاد
بھارت میں بھی مستقبلِ اُردو راغب
اِس دور میں روشن ہے بقول آزاد[1]

(قلم برداشتہ) کراچی ۱۸/مئی ۸۱ء

[1] جگن ناتھ آزاد

○

سرمایۂ زندگی ہے احباب کی یاد
برآئی بفضلہ مرے دل کی مراد
ہیں خستہ نگاہِ شوق انبالہ میں
شیدائی اقبال، جگن ناتھ آزاد

(قلم برداشتہ) انبالہ۔ ۵/مارچ ۳۳ء

نشور واحدی (کانپور)

مکتوبِ منظوم

بہ جگن ناتھ آزاد بہ سلسلۂ اقبالیات

ز اوراقِ چیدہ خیال آفریدی
ز ماضی گلستانِ حال آفریدی

ز شاخ و گل و برگ ہائے پریشاں
تو گلدستہ کردی جمال آفریدی

ز روز و شب و صبح و شام رسائل
بہ میلادِ اقبال سال آفریدی

چناں نسبتے کسب کردی ز دانش
کہ از قالِ تحقیق حال آفریدی

زماں" را مکاں" ساختی در تماشا
ز اسبابِ ممکن محال آفریدی

فنِ تازہ دانش آراستن را
جواب آفریدی سوال آفریدی

ہم از پرتوِ میر قاسم بہ گلشن
بہ کشمیر صبحِ کمال آفریدی

بدانش گہہِ دہلوی از ظہیرے
جمال آفریدی جلال آفریدی

بہ ضربِ کلیمی بہ قصرِ گلیمی
بہ جبریلِ تحقیق "بالِ" آفریدی

بیا راستی "بزمِ اقبالیاں" را
برائے نشوئے مقال آفریدی

برادرِ گرامی قدر حضرت جگن ناتھ آزاد کی نذر

اُردو کا پرستار جگن ناتھ آزاد
خوش خلقی کا معیار جگن ناتھ آزاد
تہذیبِ بزرگانِ سلف کی تصویر
شائستہ کردار جگن ناتھ آزاد

بہ دولت کدہ جناب سلطان رشک
مدیر ماہنامہ "نیرنگِ خیال"
(راولپنڈی)

ناچیز
قمر تعلیمی (راولپنڈی)
۱۵ اگست ۸۹ء

جگن ناتھ آزاد

کشش صدیقی (حیدرآباد سندھ)

شقاوت کے اس عہدِ بیداد میں
محبت کے جذبوں سے آباد ہیں
تعصب کے محکوم ہیں سارے لوگ
بس اپنے جگن ناتھ آزاد ہیں

روزنامہ "جسارت" کراچی
۱۰ مئی سنہ ۱۹۸۱ء

جمیل ساغر کوموزی
دھاروار (کرناٹک)

نذرِ آزاد

(اقبال صدی لیکچرز کے لئے جگن ناتھ آزاد کی دھارواڑ میں تشریف آوری)

خبر کر دو چمن والوں کو گلشن میں پکار آؤ
دکن میں وادیٔ لولاب سے آزاد آئے ہیں
وہی جن کو زمانہ عاشقِ اقبال کہتا ہے
زہے! وہ شاعرِ مشرق کی خوشبو ساتھ لائے ہیں
وہی کشمیر کی وادی جسے جنت کہے دنیا
جہاں کلیاں مہکتی ہیں جہاں پُرنور سائے ہیں
اسی کشمیر کی رنگینیوں کو بھر کے دامن میں
لُٹانے کے لئے اب حضرتِ آزاد آئے ہیں
اخوت کی جہاں بانی محبت کی جہانگیری
تو پھر کیوں آپ سوچیں گے یہ اپنے وہ پرائے ہیں
گدا کے ڈر سے منعم کو نہ یاں بخشش کا ہو یارا
یہ وہ درویش ہیں جو گنج تاروں ساتھ لائے ہیں
جہاں میں رسمِ دلداری انہی کے دم سے زندہ ہے
کہ قدرت نے انہیں اندازِ محبوبی سکھائے ہیں

نمونہ دیکھنا چاہو جو مشرق کی شرافت کا
انہیں دیکھو کہ خود چل کر ہمارے بیچ آئے ہیں
سخنوران کو کہ باتیں پھر نہ ایسی سن سکوگے تم
یہ اہلِ دل ہیں ان کے دل میں دو عالم سمائے ہیں
کروگے ناز اس پر تم نے ہے آزاد کو دیکھا
یہ قدرت ہے خدا کی دو نا ہاتھ سے گھر میں آئے ہیں
جو چاہو دیکھنا اقبال کو دیکھو انہیں لوگو
یہی سمجھو ہمارے درمیاں اقبال آئے ہیں

دسمبر ۱۹۷۶ء

بانو طاہرہ سعید (حیدرآباد)

خوش آمدی آزاد

آیا ہے دور سے کوئی مہمان دل نواز
مدت کے بعد شہر ہوا پھر سے سرفراز
یہ شہر آرزو ہے محمد قلی کا شہر
نغمے کا علم و فضل کا زندہ دلی کا شہر
شعر و ادب سے پیار ہے اکثر عوام کو
جیسے لگاؤ ہوتا ہے بادہ سے جام کو
ہم لوگ وہ ہیں جو غم دوراں میں ہیں مگن
ہم لوگ وہ ہیں چاک گریباں ہیں پھر بھی مگن
دولت نہیں نہ ہو پہ بڑے دل کے امیر ہیں
شاہوں کو جن پہ رشک ہو ایسے فقیر ہیں
لے کر خلوص آئے ہیں بہر خوش آمدید
"آزاد" کا ورود ہے اہل قلم کی عید
"آزاد" وہ ہے جس پہ خود اردو کو ناز ہے
اقبال کا سفیر ہے "دانائے راز" ہے
اے دوست درمیان محبان خوش آمدی
آزاد دلنواز و غزل خواں خوش آمدی
جاں رانثار مقدم راہ تو کردہ ایم
دردانۂ یگانۂ دوراں خوش آمدی

در آشیانِ بلبلے چوں طاہر سعید
اے گُل سخن شناس زِ سخنداں خوش آمدی

۱۲ مئی ۱۹۷۶ء
حیدر آباد۔

منشاء الرحمٰن خاں منشا

ناگپور

سپاسنامہ

حکّام اعلیٰ اور ناموران ملک وملّت کی خدمت میں سپاسنامے تو پیش ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن یہ بندۂ ناچیز یہ ادبی سپاسنامہ "ستاروں سے ذرّوں تک" اور "نیرنگ" کے اس لائق مصنف جگن ناتھ آزاد کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے جس کی اُردو دوستی اور حقیقت بیانی مشہور عام ہے۔

نظم بتدائی ہند مشاعرہ ۱۸ راوتی (برلا) میں پڑھی گئی جناب آزاد میر محفل تھے۔۔۔۔۔۔"

منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

خوشا نصیب کہ آیا ہے اپنی محفل میں
وہ ایک شاعر روشن بصر شگفتہ دماغ
بجا ہے جس کو کہیں ہم خلوصِ نیت سے
زباں کا مونس و حامی، ادب کا چشم و چراغ
خیال و فکر ہیں جس کے سخنوروں کا امام
بہت بلند ہے علم و ادب میں جس کا مقام
عجیب بات ہے آزاد نام پاکر بھی
یہ بن کے پھرتا ہے اُردو کا بندۂ بے دام

خوشا نصیب کہ آیا ہے اپنی محفل میں
وہ ایک شاعرِ روشن بصر، شگفتہ دماغ

نیاز و جوش سے ملتی ہے جس کو دادِ سخن
ظفر علی بھی سمجھتے ہیں جسکو صاحبِ فن
مجھے اگر کوئی پوچھے تو میں کہوں منشا
یہی ہے نازشِ اُردو، یہی ہے فخرِ وطن

کلام جس کا حقیقت کی ترجمانی ہے
بیانِ زیست ہے تفسیرِ زندگانی ہے
جو اس کی گردشِ نوکِ قلم سے نکلا ہے
وہ شعر نہیں وقت کی کہانی ہے

خوشا نصیب کہ آیا ہے اپنی محفل میں
وہ ایک شاعرِ روشن بصر، شگفتہ دماغ
بجا ہے جس کو کہیں ہم خلوصِ نیت سے
زباں کا مونس و حامی ادب کا چشم و چراغ

۴ ؍ مئی سنہ ۱۹۴۹ء

جگن ناتھ آزاد

اُردو پہ نظر تیری جو آزاد رہے گی
پھر اس پہ کسی کی بھی نہ بیداد رہے گی

گر اس کا یوں ہی تو جو نگہبان رہے گا
پھولے گی پھلے گی یہ سدا شاد رہے گی

ہم نام[لہ] جو آزاد تھے وہ تیری طرح تھے
ان ہی کی طرح تجھ سے یہ آباد رہے گی

حکیم ناصر الدین
نظامی دواخانہ۔ شاہراہِ لیاقت
کراچی

لہ مولوی محمد حسین آزاد
مولانا ابوالکلام آزاد

یحییٰ امجد

جگن ناتھ آزاد کے نام!

خطۂ افسردہ وہ جس کا میانوالی ہے نام
اس کے اِک اِک ذرّۂ روشن کو صبحوں کا سلام
جس کے محنت کش جواں غیرت کی اِک تصویر ہیں
ظلم کی راتوں میں جو اِک نعرۂ شبگیر ہیں
جس کی مٹی پر لہو ہے مولوی گُل شیر کا
جس کی للکاروں سے ایوانِ ستم میں زلزلہ
سرمد و منظور تھے اے دوست جس صحرا کے پھول
جس میں تھا محرومؔ کی آواز کو حسنِ قبول
اور امجد بھی ہے جس کی مہرباں گلیوں کی دھول
تو جہاں بھی ہو اُسی مٹی کا اِک فرزند ہے
تجھ کو وہ محبوب ہے اور اُس کا تو دلبند ہے

لاہور۔
۹ر دسمبر ۱۹۷۷ء

جعفر حسن جعفر
استاذ شعبۂ اُردو
گورنمنٹ کالج پتوکی (ضلع قصور)
گھر کا پتہ - ۱۰۰ فیروز پور روڈ - لاہور

جگن ناتھ آزاد

پاکستان کی دعوت پر آزاد جگن ناتھ آئے ہیں
علامہ اقبال سے جن کا رشتہ ہے وجدانی بھی:
دل اُن کے اندازِ تغزل سے کیسے تسخیر نہ ہوں
ہے محروم کا لہجہ بھی کشتی کی ہزار الحانی بھی
جعفر آؤ ہم بھی چلیں اور اُن کی زیارت کر آئیں
جن کی ذات اور فن کے ہیں مدّاح اسعد ملتانی بھی

جعفر
۱۱ دسمبر ۱۹۷۷ء

گورچرن سنگھ گوھر
گھلاڑی منڈی - نابھا

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے نام

ہو مبارک تجھے کردار کی جدت کا صلہ!
ہو مبارک تجھے جانسوزی حسرت کا صلہ!
تو نے اقوام کی پونجی کی حفاظت کی ہے
ورنہ ذات کی اس درجہ عنایت کی ہے

تو نے پوجا ہے جو اقبال کی فنکاری کو
تو نے پرکھا ہے جو دیندار کی سرشاری کو
سازِ مشرق کے ترانے کی حفاظت کی ہے
ایک انمول خزانے کی حفاظت کی ہے

شوکتِ شعر سے انکار کیا لیڈر نے
وعظِ بدذوقیٔ افکار کیا لیڈر نے
تو نے ہر کشتیٔ لرزاں کو سنبھالے رکھا
حسنِ گلزار و بیاباں کو سنبھالے رکھا

دیر تھوڑی سی ہے غش میں اجالا ہوگا
تیرے ایثار کا انداز نرالا ہوگا
تو نے بجھتے ہوئے انگارے کو زندہ رکھا
ختم ہوتے ہوئے آثار کو زندہ رکھا

تیری انسندر سے لاکھوں کی زباں پنجابی
مسجدِ شہر میں مُلّا کی اذاں پنجابی
گرمئ شعلۂ آواز کا کہنا کیا ہے
لحنِ داؤد کی ہمراز کا کہنا کیا ہے

مِل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر
نوحۂ گرم کی تاثیر سے تعمیرِ حیات
نالۂ سوزِ تغزل سے مسیحائی کر

محترم جگن ناتھ آزاد کی نظم

نذرِ اقبالؒ سے متاثر ہو کر

تمہاری نظم یہ سرچشمۂ معانی ہے
بصد خلوص ہوئی نذرِ حضرتِ اقبالؒ
عقیدتوں کی نشانی حقیقتوں کا بیاں
نگارشات کا تحفہ محبّتوں کا کمال
تمہارے دیدۂ بینا کا میں ہوا قائل
مجھے بھی چشمِ حقیقت شناس مِل جائے
اسیرِ حلقۂ زنجیرِ نا اُمیدی ہے
گلوں کا روپ عطا ہو کلی یہ کھِل جائے
تُو بُت پرست بھی اقبالؒ کا ہوا مدّاح
جو نام کے تھے مسلماں وہ اُس کے تھے دشمن
پڑھا ہے تو نے جو اقبالؒ اب پڑھاتا ہے
علومِ رومیؒ عصرِ جدید کا مخزن!
بلند بختی پہ تیری میں رشک کرتا ہوں
مرے نیاز کا تجھ کو سلام ہی پہنچے

کبھی ملے مجھے لمحہ تری رفاقت کا
نہ ہو سکے تو تمنائے خام ہی پہنچے
مجھے پسند یہ ترکیب تیری خوب آئی
میں آ رہا ہوں دیارِ مزارِ غالب سے
تمہاری عجز بیانی ہے یا کوئی اعجاز
نموئے فکر ہوئی ہے ترے مطالب سے
سیالکوٹ سے کچھ دور تو نہیں جموں
نگاہِ لطف تو محتاجِ بام و در بھی نہیں
مری دعا ہے سدا خوش رہے جہاں بھی رہے
نہ ہو یہ ہو مرے اخلاص کا اثر بھی نہیں

ؔ۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں یونیورسٹی (کشمیر۔ انڈیا) میں اقبالیات پڑھاتے ہیں۔ مشہور شاعر تلوک چند محروم کے فرزند ہیں۔ وطن مالوف عیسیٰ خیل۔ لاہور میں تعلیم پائی۔

ریاض احمد پرواز

نوٹ:۔ یہ بریز محبت نظم میں کہیں "تم" اور کہیں "تو" سے خطاب کیا گیا ہے شاعری کو ضابطوں سے جکڑنے والے کے نزدیک تو یہ عیب ہے لیکن علامہ اقبال نے اس راز کو اس شعر میں فاش کیا ہے۔

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

(مدیر "لمحے")

منصور احمد سلیم

بنام جگن ناتھ آزاد

بسلسلہ یاد اقبال جناب علی سردار جعفری کی زیرِ صدارت حیدرآباد سندھ
میں ۲۲ اپریل کو منعقدہ مشاعرے کا ایک تاثر

کل مرے شہر کی گلیوں میں تھی جس بزم کی دھوم
ہو گئی ختم سُنا کر غمِ دل کی روداد
آہ! جس بزم کا عنواں ہو "بیادِ اقبال"
نام اقبال کا آئے نہ وہاں بھول کے یاد
اِک ترے حسنِ عقیدت نے کیے پھول نثار
اِک تری ذات نے بس اس کو کہا "زندہ باد"
آئینہ تو نے دکھایا ہمیں حق گوئی کا
کون ہے دے جو تری جرأتِ بیباک کی داد
کون اب کفر شکن کو بھلا کافر لکھے
شکریہ تیرا تہِ دل سے جگن ناتھ آزاد

روزنامہ جسارت کراچی۔ ادبی ایڈیشن
۳ مئی ۱۹۸۲ء

ایک شعر

یہاں کون شاعر ہے دلّی میں بسمل
جگن ناتھ آزاد ہے اور میں ہوں

بسمل سعیدی ٹونکی

صابر آفاقی

جگن ناتھ آزاد کے حضور

اے مرے آزاد میرے دوست میرے ہم قلم
کھا رہا ہے مجھ کو روز و شب تری فرقت کا غم

وصل کا لمحہ فراقِ مستقل میں ڈھل گیا
جو دلِ حساس تھا وہ ایک پل میں ڈھل گیا

کتنا اچھا تھا کہ مجھ سے آشنا ہوتا نہ تو
زخمِ فرقت دے کے یوں مجھ سے جُدا ہوتا نہ تو

وہ سراپا وہ محبت بھول سکتا ہی نہیں
تیری باتیں تیری صورت بھول سکتا ہی نہیں

سینہ میرا رشکِ گلشن دل ترا گلزار ہے
درمیاں دونوں کے حائل آہ! اِک دیوار ہے

میں گلِ صحرا ہوں تو بھی اِک گلِ طناز ہے
مجھ کو تجھ پہ فخر ہے اور تجھ کو مجھ پر ناز ہے

خیمۂ گُل میں رہیں گی بند مہکاریں کہاں
بوئے گل کو روک سکتی ہیں یہ دیواریں کہاں

مجھ کو خوشبو سے غرض ہے رُوح کا جویا ہوں میں
صابر آفاقی ہوں اور آفاق سے اُونچا ہوں میں

میں نسیمِ صبح ہوں تم سے لپٹنے آؤں گا
صورتِ نافہ خیالوں میں سمٹنے آؤں گا

مظفر آباد

۹ر جولائی ۱۹۷۴ء

بانو طاہرہ سعید
(حیدر آباد)

تاثرات[1]

قوس قزح کے رنگ دکھا کر چلے گئے
ہلچل سی وہ دلوں میں مچا کر چلے گئے
تیور میں کچھ مٹھاس تھی کچھ گہری تلخیاں
چہرے پہ سوزِ دل کی علامت نہاں عیاں
طرزِ نگاہ عظمت گیتا لئے ہوئے
ہر سانس تھی کوی کی کویتا لئے ہوئے
اشعار جیسے حسن کے تیور رواں دواں
یا قلبِ مضطرب کے شرارے یہاں وہاں
رومان، رنگ، راگ کی دنیا لئے ہوئے
دردِ فراق و داغِ تمنا لئے ہوئے
غزلوں کی داستاں سے جو فرصت ذرا ملی
اُس نے سنائی جھوم کے پھر ایسی بانسری
لمحوں میں ساری بزم کا نقشہ بدل گیا
ہر قلب گویا نور کے سانچے میں ڈھل گیا

---

[1] حیدر آباد میں بیگم عائشہ رشاد کے ایک محفل شعر میں حضرت جگن ناتھ آزاد سے جمہور نامہ سن کر۔ طاہرہ۔ (۲؍جنوری ۶۰ء)

آنے لگی فلک سے ندا واہ واہ کی
اُٹھنے لگی زمیں سے صدا آہ آہ کی
رومیؔ نے پوچھا کون سا شیریں دہن ہے یہ
اقبالؔ نے کہا کہ مرا ہم وطن ہے یہ
سعدیؔ کو وجد آگیا حافظؔ اُچھل پڑے
حالیؔ کی چشم شوق سے آنسو نکل پڑے
القصّہ اُس نے صدیوں کا جادو جگا دیا
حسنِ ازل کے چہرے سے پردہ اُٹھا دیا
تخلیقِ کائنات کے منظر دکھا دیئے
پیغمبروں کے چرنوں کے درشن کرا دیئے
گوتم، کرشن، نانک و عیسیٰ کے نور سے
روشن ہوا ضمیر تجلّیٔ طور سے
لیکن جب آیا نام مدینے کے چاند کا
ہر ذرّہ جگمگا اُٹھا خورشید بن گیا
دنیا تمام نور سے معمور ہو گئی
جو بھی خلش تھی زیست کی کافور ہو گئی
مدّت سے جو ملول تھا دل شاد ہو گیا
بندِ غمِ حیات سے آزاد ہو گیا
نغموں کی رات تھی کہ عبادت کی رات تھی
وہ یادگار رات قیامت کی رات تھی
یوں کروٹیں بدلتی ہے اِس انجمن کی یاد
غربت میں جیسے آئے کسی کو وطن کی یاد

٥٥٥

اِک شاعرِ عظیم کی افسوں طرازیاں
اور عائشہ رشاد کی مہماں نوازیاں
ایسے ہیں نقش جن کو مٹایا نہ جا سکے
وہ خوابِ طاہرہ جو بھلایا نہ جا سکے

اپنی محفل اپنے دوست

- ڈاکٹر جاوید اقبال
- علی سردار جعفری
- احمد ندیم قاسمی
- آلِ احمد سرور
- ڈاکٹر معزالدین
- ڈاکٹر خلیق انجم
- مسیح الدین احمد صدیقی
- مسیح الدین احمد صدیقی
- فکر تونسوی
- محمد طفیل
- خواجہ غلام محمد صادق
- اعجاز صدیقی
- سراج الدین ظفر
- سید خلیل اللہ حسینی
- صالحہ عابد حسین
- خاتون
- بشریٰ رحمان

○

ہائی کورٹ۔ لاہور

مورخہ ۵؍ جولائی ۱۹۸۱ء

مخترمی برادر جگن ناتھ آزاد۔ سلام مسنون

آپ کا خط مل گیا۔ خیریت معلوم کرکے خوشی ہوئی۔ میں تو سارے خط ہوائی ڈاک کے ذریعہ بھیجتا ہوں۔ خدا جانے کیوں تاخیر ہوئی۔ بہر حال یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ کا سامان اور بالخصوص مسودے واپس مل گئے ورنہ آج کل ہوائی جہازوں میں سفر کرنے سے ایسی صورت عام پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ گلہ ضرور ہے کہ آپ کراچی آئے اور لاہور کا رُخ نہ کیا۔ بلکہ ابوظہبی، اندر دبئی پھرتے رہے لیکن لاہور کا چکر نہ لگایا۔

واقعی پچھلی مرتبہ لاہور میں آپ کے طیارے کے نکل جانے کا واقعہ مجھے بھی خوب یاد ہے۔ بہر حال خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے یعنی ہمیں بھی آپس میں بیٹھنے کے لئے اڑھائی تین گھنٹے مل گئے اور آپ بھی بالآخر کراچی پہنچ گئے۔ امید ہے تب کراچی پہنچ کر کوئی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا۔

زندہ رود کی جلد دوم (حیاتِ اقبال کا وسطی دور) آج ہی آپ کے گھر کے پتہ پر رجسٹرڈ بک پوسٹ کرکے بھجوادی ہے۔ کتاب ملنے پر اطلاع دیجئے گا۔ آج کل تیسری جلد کی تحریر میں مصروف ہوں جو اگلے سال شائع ہوگی۔ پہلی جلد زندہ رود نے تو پاکستان میں Literary Award حاصل کیا ہے اور اقبال پر اُردو زبان میں بہترین کتاب (۱۹۷۷ء سے لیکر ۱۹۷۹ء تک) قرار دی گئی ہے۔ اب دیکھیں دوسری جلد کیسے ملے ہے۔ واقعی یہ اچھا خیال ہے کہ آپ پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لئے Visiting Professor کی شکل میں آجائیں۔ لاہور، راولپنڈی وغیرہ کے علاقوں میں آپ کے ہزاروں مداح ہیں۔ آپ نے پچھلی مرتبہ دیکھا ہوگا کہ لاہور کے لوگوں نے آپ کے ساتھ کس قسم کی محبت اور شفقت کا اظہار کیا تھا۔ یوم اقبال کے جلسہ پر سب نے آپ کی تقریر کی بہت تعریف کی اور کئی دنوں تک نوائے وقت

ہیں آپ کے چرچے ہوتے رہے۔

ہائی کورٹ میں میرا پتہ بالکل محفوظ ہے۔ بچوں کے لئے آپ نے جو کتاب آپ نے ارسال کی تھی وہ مل گئی تھی۔ البتہ یہ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس کی رسید آپ کو بھیجی یا نہ بھیجی۔ میرا خیال ہے رسید نہ بھیجی گئی۔ بالکل رسید بھیجنا یاد نہ رہا۔ میرے [1] گھر کا پتہ بھی محفوظ ہے۔ دونوں پتے محفوظ ہیں۔ گھر کا پتہ بھی آپ نے درست لکھا ہے۔ معرفت۔ ۱۸۔ مین گلبرگ۔ لاہور۔

امید ہے آپ بخیریت ہونگے۔

خیراندیش

جاوید اقبال

[1] کاغذ کے مٹ جانے کی وجہ سے یہ لفظ نہیں پڑھا جاسکا۔ مدیر

○

۱۲ فروری ۱۹۷۷ء

برادرم تسلیم

اقبال کی نظم کی شوٹنگ کرنے کے لئے میں خواجہ احمد عباس کے ساتھ مئی کے مہینے میں کشمیر آنا چاہتا ہوں۔ اس وقت آپ کی موجودگی ضروری ہے۔ اس سے پہلے دہلی میں شنکر شاد مشاعرے میں ملاقات ہوئی تو تفصیلات طے کریں گے لیکن ایک چیز کا ابھی سے پتہ لگائیے کہ کیا کشمیر میں کوئی ایسا مقام ہے جہاں لالہ کے جنگلی پھول افراط سے پہاڑوں کے دامن میں کھلتے ہوں۔ "پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن" کی تصویر کے لئے ایسے مقام کی ضرورت پڑے گی۔ کیا کشمیر سے باہر کہیں لالے کے پھول زیادہ فراخ دلی سے کھلتے ہیں۔

دوسری بات یہ دریافت کرنا ہے کہ مہاتما گاندھی کے جس کارٹون پر اقبال نے یہ قطعہ لکھا تھا: "بیا را بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی خیز است،،" کیا وہ اصل پرچہ کہیں مل سکتا ہے ہندوستان یا پاکستان میں اس واقعہ کی صحت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا پرچہ کا نام جان بُل تھا اور کیا وہ اردو

زبان میں نکلا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ مجھے مسجد قرطبہ کی بہت اچھی تصویریں چاہیئے۔ ہسپانیہ کے سفارت خانہ کو خط لکھ رہا ہوں اور آپ کو بھی توجہ دلا رہا ہوں۔ (۱) مسجد قرطبہ باہر سے (۲) اندر سے۔ آپ نے تو وہ مسجد دیکھی ہے۔ ممکن ہے آپ اس وقت کچھ تصویریں اپنے ساتھ لائے ہوں۔

کیسے کشمیر کی سردی کا کیا حال ہے۔ اُمید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔

آپ کا

سردار جعفری۔

○

فسانہ خواں

عقب دیال سنگھ لائبریری

بسنت روڈ۔ لاہور

۸ر جون ۵۷ء

برادرِ عزیز۔ سلام شوق

نہایت شرمندہ ہوں کہ زندگی کی بے ترتیبیوں کا مقابلہ نہ کرسکا اور آپ کو اتنے طویل عرصے سے خط نہیں لکھا۔ لیکن یہ یقین فرمایئے کہ آپ کی یاد اور آپ کی محبت میرے دل میں بدستور تازہ ہے۔ آپ ان چند محبوب شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں سوچنا بھی ذہن کی بہشت بن جاتا ہے۔

مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں سکے کی de-evaluation سے ایک مہینہ پہلے "آجکل" میں میری ایک غزل ـــــ

بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو ترے حسن کا دیا جلا ہو

شائع ہوئی تھی جس کا معاوضہ تیس روپے مقرر ہوا تھا۔ مگر ڈی ویلیوشن کے باعث یہ رقم مجھے نہ بھیجی جا سکے۔ اب وہاں لکھنؤ میں ہمارے ایک بزرگ ہیں جو

مفلسی کے ہاتھوں مبالغے کی حد تک پریشان ہیں اور کوڑی کوڑی کے محتاج۔ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا اگر آپ میری یہ رقم اُن کے نام منی آرڈر کردیں اور اس کام میں ایک لمحے کی بھی کوتاہی نہ کریں۔ میں آپ سے یہ تک کہہ دیتا کہ آپ اپنی جیب سے انہیں کچھ روپے بھجوا دیجئے مگر پھر خیال آیا کہ جب میرے چند روپے آپ کے دفتر میں موجود ہیں تو آپ کو تکلیف دینے کی فی الحال ضرورت نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور تازہ غزل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اسے بھی آجکل میں شامل فرما دیجئے اور اس کا معاوضہ بھی انہی بزرگ کے نام بھیج دیجئے میری طرف سے آپ کو کلی اجازت ہے۔ یہ آپ کا دوگنا احسان ہوگا۔

اُن کا پتہ یہ ہے۔ جناب سید ناصر حسین صاحب معرفت حکیم سوڑے والے
جھوائی ٹولہ لکھنؤ

مخدوم مکرم حضرت مخدوم صاحب کی خدمت میں آداب۔ محبِّ گرامی حضرت جوش صاحب کو سلام محبت۔

آپ کا بھائی
احمد ندیم قاسمی۔

○

مجتبیٰ آزاد 31.5.85

میں ۲۸ کو آپ کا منتظر رہا۔ بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ خاص طور سے جاوید اقبال کی زندہ رود کی تیسری جلد سے متعلق۔ ایسا لگتا ہے آپ واپس بھوپال چلے گئے۔ ثابت یہ ہوا کہ آئندہ نہ آپ کی تحریر کا اعتبار کرنا چاہیئے نہ تقریر کا۔ تحریر میں شماروں میں آنے کا وعدہ کرکے نہیں آتے اور تقریر میں ملنے کا وعدہ کرکے نہیں ملتے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ کیا بات ہے کس عالم میں ہیں۔ جس اسکالر کے وایوا کے سلسلے میں آپ کو بلانا تھا۔ اس کی رپورٹ ابھی تک نہیں آئی نہ جانے کیوں۔

مخلص آل احمد سرور

Dr. M. Moizuddin
90-B-2. Gulberg III
LAHORE

۶۸۴

F 36-2/80-IA-633

22.3.1980

محبِ مکرم آزاد صاحب تسلیم و نیاز

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۱ر مارچ موصول ہوا۔ کرم فرمائی کا شکریہ۔ حافظ و اقبال کی رسید میں نے دیدی تھی۔ تعجب ہے خط کہاں تلف ہوگیا۔ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ تبصروں کے تراشے بھی ملے تھے آپ نے جس محبت و خلوص سے میرا ذکر کیا ہے اس کے لئے سراپا شکرگزار ہوں مجھ سے جہاں تک ممکن ہے خدمتِ اقبال میں ہمہ وقت مصروف ہوں۔ آپ جیسے مخلص دوست اور مولانا صباح الدین جیسے کرم فرما بزرگ سے کبھی تحسین کے چند کلمے سُن لیتا ہوں تو بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ورنہ آج کل تو دوست یاں کم ہیں اور بھائی بہت۔

پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز، اسلام آباد کے ڈائرکٹر جنرل مسیح الدین صدیقی صاحب نے آپ کے پاکستان آنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ یہ معلوم کرکے اور بھی مسرت ہوئی کہ ۲۰ر اپریل تک آپ پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ ۲۱ر اپریل کی شام کو اقبال اکیڈمی کی جانب سے علامہ اقبال کے یومِ وفات کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ صدارت وفاقی وزیرِ تعلیم جناب محمد علی خاں ہوتی صاحب فرمائیں گے۔ آپ سے نہ صرف اس میں شرکت کی درخواست ہے۔ بلکہ گزارش ہے کہ اقبال کے فکر و فن کے کسی پہلو پر ایک مقالہ پڑھ کر ہمیں ممنون فرمائیں لاہور کے علاوہ دوسرے صوبوں کے بھی ممتاز اقبال اسکالر شریک ہونگے۔ براہ کرم اپنے پروگرام کی تفصیل سے جلد مطلع فرمائیں تاکہ اس تقریب میں آپ کی شرکت کا اعلان کردوں اور دعوت نامے میں مقالہ پڑھنے والوں کی فہرست میں آپ کا نام شامل کرسکوں۔ جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کی اہلیہ محترمہ کی بیماری کی خبر سے تشویش ہے دست بدعا ہوں کہ

اللہ تعالیٰ ان کو صحتِ کلی عطا فرمائے اور آپ سکون سے اپنے علمی کاموں میں مصروف ہوں۔ ابھی حال ہی میں ہماری بیوی بھی سخت بیمار تھیں ایک بڑے آپریشن کے بعد اب بفضلہ تعالیٰ اچھی ہیں۔ میں آپ کی ذہنی الجھنوں کا قیاس اچھی طرح کر سکتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ہر چہ آید بر سر اولادِ آدم بگذرد۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی پتھروں کی نقل فراہم کی تھی۔ میں اُن کا شکر گزار ہوں اقبال اکادمی کی تازہ مطبوعات اور اقبال ریویو کے پرچے انشاءاللہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

آپ کا مرسلہ مضمون بھی مل گیا ہے۔ نوازش کا شکریہ۔ اسے انشاء اللہ اقبال ریویو کے کسی شمارے میں جلد شائع کروں گا۔ تلمیحات اقبال، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کی ایک کاپی اگر لا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

آپ سے انشاءاللہ اب بالمشافہ گفتگو ہوگی۔ اقبال اور مغربی مفکرین کے متعلق میں ڈاکٹر سلیم اختر سے دریافت کر کے آپ کو لکھونگا۔

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ فقط والسلام۔

نیاز مند۔

معز الدین۔

○ (انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی)

آزاد صاحب۔ آداب

اقبال پر دس ہزار صفحے کا مقالہ لکھ کر دیکھئے ہم اُسے بھی شائع کریں گے اور فخر سے شائع کریں گے۔ یہ مقالہ جولائی کے کسی شمارے سے شروع ہوگا۔ واقعی سری نگر میں ایسی مصروفیات رہیں کہ آپ سے ملاقات کا مزہ نہیں آیا۔ اس دِن اگر آپ کھانے پر نہ بلاتے تو اتنی ملاقات بھی نہ ہوتی۔ دہلی کب تشریف لا رہے ہیں۔

آپ کا

خلیق انجم

Janab Jagan Nath Azad
Director Public Relation
P.T.B. Raideng Road
Srinagar
(J&K)

اکادمی ادبیات۔ پاکستان ○

۱۲ جنوری ۱۹۸۰ء

محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب۔ آداب عرض

آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا قیام علم و ادب کے فروغ کے لئے ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے عمل میں لایا گیا ہے۔ اکادمی کے مقاصد کی ایک نقل منسلک ہے۔

علامہ اقبال کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلے میں منعقدہ تقریبات بالخصوص عالمی کانگریس میں آپ نے شرکت تو فرمائی تھی لیکن آپ کا قیام تدریسی مصروفیات کی بنا پر بہت مختصر رہا۔ پاکستان کے علمی اور ادبی حلقے آپ کی مسلّمہ ادبی خدمات کے معترف ہیں اور اہلِ قلم آپ سے ملنے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ اپنی سہولت کے مطابق ایک بار پھر پاکستان تشریف لائیں۔ اور ہمیں شرفِ میزبانی عطا کریں۔

اس ضمن میں آپ سے گزارش ہے کہ آپ دس دن کے قیام پر مبنی ایک پروگرام وضع کریں اور اس میں اپنی آمد کی ممکنہ تاریخ اور وہ مقامات جہاں آپ تشریف جانا چاہیں اور احباب کے اسمائے گرامی تحریر کر دیجئے جن سے آپ ملاقات کرنا چاہیں۔

ہم آپ کے جواب کے منتظر ہیں تاکہ آپ کی منشا کے مطابق پروگرام کو آخری شکل دی جا سکے۔

مخلص

مسیح الدین احمد صدیقی

ڈائریکٹر جنرل

○

۶ مارچ ۱۹۸۰ء

مکرمی پروفیسر صاحب۔ تسلیمات

میں اِدھر چند دنوں کے لئے کراچی گیا ہوا تھا۔ واپسی پر آپ کے ۱۸ فروری

اور ۲۱ فروری سنہ ۱۹۸۰ء کے لکھے ہوئے خطوط ملے۔ جواب میں قدرے تاخیر ہوئی اور آپ کو انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔

آپ کا مجوزہ دورۂ پاکستان (۲۰ اپریل تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۰ء) بہت مناسب ہے۔ اور ہم اس ضمن میں ملک کی جامعات اور دوسرے اداروں کے مشورے سے ایک پروگرام مرتب کر رہے ہیں۔ جیسے ہی تاریخوں کا تعین ہو گیا ہم آپ کو فوری طور پر مطلع کر دیں گے۔

آپ نے اپنے پہلے خط میں علامہ اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسوّدات نظم کی فوٹو کاپیوں کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو قیامِ پاکستان کے دوران مطلوبہ فوٹو کاپیاں مہیّا کر دی جائیں۔

احترامات فائقہ کے ساتھ۔

نیازمند

سمیع الدین احمد صدیقی

ڈائریکٹر جنرل

محترمی پروفیسر جگن ناتھ آزاد صاحب

معرفتہ

سفیر پاکستان۔ نئی دہلی (بھارت)

○

پہلی جولائی

آزاد۔ دی گریٹ

مختصر نظم کی طرح مختصر نثر عرض ہے کہ کیا آپ فکرؔ کے لئے ایم۔ ایل۔ اے ہوسٹل سری نگر میں ۱۵ جون سے دس بارہ دنوں کے لئے ایک کمرہ ریزرو کرا سکتے ہیں۔

جواب تار سے بھیجو۔ تار کے پیسوں کا حساب کتاب قیامت کے دن کریں گے

فکر تونسوی

نقوش
لاہور

برادرم۔ سلام مسنون

آپ کے تینوں مضمون مجھ تک پہنچ گئے ہیں۔ دلی شکریہ۔ جس بھائی نے مضامین نقل کئے ہیں اُنہوں نے اکثر جگہوں پر ہمیں بھی گڑبڑایا۔ بہرحال ٹٹول ٹٹول کے ہم آپ کے مفہوم یا مدعا تک پہنچ ہی جائیں گے۔

آپ نے مجھ سے خلیفہ اقبال حسین صاحب کے بارے میں ایک دو مرتبہ پوچھا۔ اس کے بعد وہ صاحب مجھے نہیں ملے۔ ایک بار اُن کے ایک عزیز مجھے ملے تھے۔ اُنہوں نے غالباً یہ کہا تھا۔ انتقال ہوگیا ہے۔ بہرحال آپ قتیل شفائی صاحب غالب کا لونی سمن آباد کے پتے پر خط لکھ کر موصوف سے بھی پوچھ لیجئے۔

آپ نے جو کتاب مجھ سے طلب کی ہے۔ وہ انشاءاللہ پہنچے گی میں نے منگوا رکھی ہے۔ ملتے ہی بھجواؤں گا۔

سرور صاحب سے کہیں اگر اُن کا مجھے اس موقع پر بھی مضمون نہ ملا۔ تو پھر میں اُن سے زندگی بھر اس نوع کی درخواست نہ کروں گا۔ کیوں کہ میں جن سے محبت کرتا ہوں ٹوٹ کر کرتا ہوں تو بھی اسی شدت سے! ــــ اُن کا وعدہ تھا ایک مضمون وہ بھیجوں گا جو جامعہ میں پڑھوں گا اور ایک وہ جو صرف آپ کے لئے لکھوں گا۔ بہرحال میری گزارشات اُن تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد چپ سادھ لیں اللہ مالک ہے۔!

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

آپ کا
محمد طفیل
۷ر جولائی ۱۹۷۷ء

Government of Jammu & Kashmir
Ministry of Development
3-4-51.

سری نگر کشمیر

مکرمی بندہ جناب آزاد صاحب

آپ کا خط مجھے کچھ دیر سے ملا اور پھر پنڈت جی کی تشریف آوری بھی جواب دینے میں حائل ہوئی۔ صدیقی صاحب کے بارے میں جموں میں یہ رائے طے پائی تھی کہ سری نگر میں موسم بہتر ہونے پر انہیں براہ راست کشمیر پہنچانے کا انتظام کیا جائے گا۔ غالباً اس فیصلہ کی اطلاع صادق صاحب کے ذریعہ سے آپ کو بھی مل گئی ہو گی۔ کچھ تو موسم کی خرابی اور کچھ جموں میں بجٹ کے سلسلے میں ہماری مصروفیات کی بنا پر انتظامات ابھی تک نہیں ہو سکے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم صدیقی صاحب کی تکلیف اور آپ دوستوں کی پریشانیوں سے بے خبر ہیں۔ انشاءاللہ سری نگر میں موسم ٹھیک ہو جانے پر (جس کی توقع ہفتہ دس روز میں کی جاتی ہے) تمام انتظامات مکمل ہو جائیں گے اور صدیقی صاحب اپنی کسی از حمت کے یہاں آنے کے قابل ہو سکیں گے۔

اگلے ہفتے میں جموں میں ہوں گا اور وہیں سے باقی تمام امور کا انتظام بھی کر دوں گا۔ آپ مطمئن رہیئے۔ اور صدیقی صاحب کو بھی یقین دلیجئے۔ تاباں صاحب اور پرکاش پنڈت بھی اس سلسلے میں آپ ہی کی طرح بے تاب اور مضطرب ہیں انہیں بھی میری طرف سے اطمینان دلا دیجئے۔

جموں میں قیام کے دوران میں، اگر دہلی جانے کا موقع میسر آیا تو ضرور نیاز حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

اگر سردار جعفری دہلی میں ہوں تو اُن تک میرا سلام شوق پہنچا دیجئے گا۔

خیر اندیش

صادق

۱۔ خواجہ غلام محمد صدیقی مرحوم اس زمانے میں پرتاپ اسپتال سری نگر کشمیر کے وزیر تعلیم اور وزیر ترقیات تھے

The SHAIR Monthly
Bombay.

۷ر جولائی ۷۷ء

برادرِ مکرم آزاد صاحب۔ تسلیم

"شاعر" کا "ہم عصر اردو ادب نمبر" تیزی کے ساتھ کتابت و طباعت کی منزل سے گزر رہا ہے۔ اُسے اور زیادہ وقیع و خوبصورت بنانے کے لئے طے کیا گیا ہے کہ اس میں قلم کاروں کی تصاویر بھی ہوں۔

از راہِ کرم اپنی بالکل نئی پاسپورٹ سائز تصویر (جس میں چہرہ بڑا ہو) جلد سے جلد بھیج دیجئے۔ دیر نہ کیجئے گا۔
شکریہ
مخلص۔

آپ کی غزل — اعجاز صدیقی
"ہو گئے رخصت یہاں سے ہائے کیا کیا آشنا"
شائع ہو رہی ہے۔ امید کہ یہ اب تک قطعاً غیر مطبوعہ ہو گی۔

○

بھائی جان!

آپ محوِ خواب ہیں اور خلل انداز ہونا مناسب نہیں۔ آپ کی محبت اور عنایت ہی کی بنا پر یہاں سے نہایت مطمئن جا رہا ہوں اور افسوس بھی ہے کہ نہ مل سکا۔ بہرحال کراچی یا دہلی میں شرفِ قدمبوسی حاصل کروں گا۔ برادرِ محترم عرش صاحب جناب اختر صاحب اور قبلہ جوش صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے گا کاش آپ کی عنایات اور محبت مجھ پر ناچیز پر اور زیادہ ہو۔!

خادم
ظفر ۱۵۔ ۱۳ر مارچ ۵۹ء

(باقی حاشیہ صفحہ) بعد میں ریاست کے وزیر اعظم بنے۔ اُنہی کے دور میں بلکہ اُنہی کی مساعی سے
[illegible]

○

۲ر جون

جناب جگن ناتھ آزادؔ صاحب

یہ جان کر صدمہ ہوا کہ جس شعلہ سے شرارۂ آزاد ٹوٹا تھا وہ شعلۂ روشن بجھ گیا یعنی آپ کی والدۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا یقین مانئے کہ آپ کے اس غم میں ہم سب برابر کے شریک ہیں اور ہم سب کی دعا ہے کہ خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مخلص

سید خلیل اللہ حسینی

صدر اقبال اکیڈمی

○

۱۲ر جنوری

برادرم آزادؔ صاحب۔ تسلیم

آپ کا خط صادق صاحب پر مضمون کی فرمائش کا ملا۔ میں ضرور اُن پر کچھ لکھتی مگر سید ین صاحب کی جدائی کا ابتک ذہن پر اتنا اثر ہے اور اتنے کاموں کا بوجھ بھی ساتھ ہی مجھ پر ہی ہے کہ جنوری کے آخر تک تو لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں اتنی دیر ہو کہ فروری کے وسط تک مضمون بھیج سکوں تو کوشش کروں گی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں محموزہ کہاں اور کیسی ہیں؟ ڈاکٹر صاحب دعا کہتے ہیں وہ بھی بیحد معروف ہیں

خاکسار

صالحہ عابد حسین

(باقی حاشیہ صفحہ ۔۔۔ کا) سے مراد کمال احمد صدیقی ہیں۔ ۴۔ طارق صاحب پہلے آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی میں ملازم تھے۔ پھر ایم پی بنے۔ اس کے بعد جموں کشمیر میں ٹورزم کے وزیر مقرر ہوئے۔ بعد میں گورنمنٹ آف انڈیا کی فلم امپورٹ ایکسپورٹ آرگنائزیشن کی صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ (مدیر)

لہ یہ میرے عزیز دوست صلاح الدین ظفر مرحوم کی تحریر ہے اس خط کا تعلق بمبئی کے مشاعرے سے ہے ہیں

○

115/5 Drigh Colony
KARACHI - 25
11th Feb — 1962

جگن بھیّا! خلوص بیکراں

خیریت خواہ بخیریت۔ آپ کا خط مس علی کے نام آیا تھا جس میں چند سطور میرے لئے بھی تھیں۔ ان گنت بار اُنہیں پڑھا اور ہر بار ایک نیا پن محسوس ہوا بھیا جو خلوص مجھے ان مختصر سے الفاظ میں ملا وہ شاید کسی طویل خط میں بھی نہ ملتا۔ لیکن خط کیونکہ مس علی کا تھا اس لئے اُنہیں واپس کرنا پڑا۔ میں نے اپنے گھر میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی بتایا سب آپ کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔ جواب میں تاخیر ہوئی جس کی معافی چاہتی ہوں۔ اس کی وجہ والدہ کی علالت تھی اب وہ ٹھیک ہیں تو پہلی فرصت میں آپ کے سامنے حاضر ہوں

بھیّا دنیا میں ہزاروں واقعات نگاہوں سے گزرتے ہیں لیکن چند تو ابدی یادگار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیسے کہ آپ کا ملنا ہمارے لئے ایک یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ خیر اگر زندگی رہی تو پھر کبھی ملیں گے۔

اور سنائیے ہماری بھابی وغیرہ کس طرح ہیں؟ اُن سے ہمارا سلام کہیئے۔ اور گھر کے دیگر افراد کون کون ہیں اُن کے متعلق بتائیے۔ اور سب کو حسب مراتب سلام و دعا کہیئے۔ آجکل ہم لوگ تو رمضان شریف کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ آپ سنائیے آج کل کیا مشاغل ہیں۔ کوئی نیا تازہ کلام؟ اگر نیا نہ ہو تو پُرانا ہی سہی جواب میں تاخیر نہ کیجئے گا۔ انتظار رہے گا۔ زیادہ آداب

۱۱ فروری ۶۲ء

آپ سے بہت دور آپ کی بہن

خاتون

(باقی حاشیہ صفحہ ... کا) قتیل شفائی ساحر لدھیانوی کے یہاں مقیم تھے سراج الدین ظفر دوسری جگہ ... [illegible] (۳۱۳)

۲۶ اگست ۱۹۸۶ء

لائقِ صد احترام پروفیسر جگن ناتھ آزاد جی۔ تسلیمات!

میں حج بیت اللہ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ پچھلے ہفتے لوٹی تو آپ کا خوبصورت سفرنامہ منتظر ملا۔۔۔ خوش نصیب!

بیحد ممنون ہوں، عنایتِ مشفقانہ پر مسرور بھی۔۔۔ ابھی پڑھا نہیں صرف ورق گردانی کی ہے۔ ورق ورق پر موتی بکھرے نظر آئے۔ ذرا اپنے آپ میں واپس آؤں۔ پڑھ کر مفصل لکھوں گی۔ لکھا کیا ہوگا۔ یہ بتانا ہوگا۔ ہم سے نو آموزوں نے کیا کچھ سیکھا۔۔۔؟

خدا آپ کو سلامت رکھے آمین۔ اور ادب میں تازہ جھونکے آپ کی جانب سے آتے رہیں۔

با احتراماتِ فراواں
بشریٰ رحمان

انتظاریہ

ڈاکٹر منظر اعظمی

سخن دلنواز کا عالم شاعر جگن ناتھ آزاد

بعض لوگ بہت اچھے شاعر ہوتے ہیں مگر بہت اچھے تو کیا اچھے عالم بھی نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایک اچھے عالم کے لئے اچھا شاعر بھی ہونا ضروری نہیں۔ اور ایک اچھا شاعر اچھا عالم بھی ہو اور ایک اچھا نقاد بھی اس کی ضمانت دینا بہت مشکل ہے اور اگر یہ سب خوبیاں بھی ہوں تو اس کا ایک اچھا انسان بھی ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ ان ساری خوبیوں کو سمیٹ کر کوئی شخصیت دُر آید کہ نا آید ہی کی منزل میں ہوتی ہے اور بایدو شاید ہی چمن میں ایسے کسی دیدہ ور کی آمد کی بشارت مل سکتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی علمی اور ادبی خدمات ایسی کسی بشارت سے کم نہیں۔

جگن ناتھ آزاد بہت پیارا انسان ہے۔ خلیق، ملنسار، نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو۔ اس کی میٹھی ترنم اور باوقار گفتگو استغنا سے کے لائق ہوتی ہے۔ مگر محنت، جانفشانی اور تلاش و تحقیق میں ان کی سرگرمیاں جوانوں کے لئے بھی باعثِ رشک ہیں۔ ان کو اس کثرت سے علمی و ادبی لطائف اور واقعات یاد ہیں کہ ساری محفل پر چھا جاتا ہے اس کی پاریابی، گفتگو کی دل پذیری اور

سخنِ دلنواز کی لطافتوں سے دل کی بند کلیاں کھل جاتی ہیں۔ اس کی سادہ روی اس کی کشادہ جبینی اور اس کی نرم دلی بگڑی کو سنوارتی اور روٹھوں کو منا دیتی ہے مولانا روم نے اگرچہ شیرِ خدا اور رستمِ دستاں جیسے انسانوں کی تلاش میں شیخ کو چراغ دے کے پورے شہر میں پھرایا تھا اور وہ نہ ملا۔ مگر اگر اس شیخ کو جگن ناتھ آزاد ملا ہوتا تو وہ غنیمت سمجھ کر اس سے ضرور بغل گیر ہو گیا ہوتا۔ اور پھر جس کو محروم جیسے نیک خو، صلح کُل اور بلند انسان نے پروان چڑھایا ہو۔ جو علامہ تاجورؔ، حفیظؔ و سالکؔ اور فیضؔ و تاثیرؔ سے مستفید ہو جس کے ذوقِ علم و شعر کو جوشؔ اور فراقؔ کی صحبتوں نے جلا بخشی ہو۔ جس نے ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے تعلیم حاصل کی ہو۔ جس پر علامہ اقبالؔ کے کلام دانکار کی سایہ گستری ہو۔ اس کے فیضِ صحبت ۔۔۔ سے انکار کرنا زاہد کے سبحۂ زنّار کو شاخِ طوبیٰ میں لٹکتے دیکھنے کے برابر ہے۔ یہ شاعری نہیں، ایک دبے سے بھی زیادہ اس کو قریب سے دیکھنے پرکھنے اور برتنے کا حاصل ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری اور اس کی علمی خدمات کا جائزہ لینے سے پہلے میں اس سطحی گفتگو کا ذکر ضرور کر دوں گا جو دو ایک ادیبوں کی زبانوں پر کھٹے آم کے ذائقے کی طرح نازل ہوتی رہی ہے کہ اس کو جو بین الاقوامی شہرت اور امتیاز ملا ہے اس میں تشہیر زیادہ ہے اور حقیقت کم اور یہ کہ وہ ماہر اقبال تو ہے اچھا شاعر نہیں اس کی شاعری اور علمی خدمات کا ذکر تو بعد میں کروں گا۔ فی الحال عرض یہ کرنا ہے کہ حقائق کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنا آخر کس معیار سے غلط ہے۔ کیا اس کی ترقیم کرنا غلط ہے کہ وہ دو درجن سے بھی زیادہ اُردو اور انگریزی کی کتابوں کا مصنف اور مؤلف ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں اور کہکشاں اس کے وہ شعری مجموعے ہیں جن کی جید علمائے ادب نے پذیرائی کی، جن کے متعدد ایڈیشن نکلے اور اب مزید دو مجموعے "جستجو" اور "بوئے رمیدہ" کے نام سے زیرِ طبع ہیں۔ کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس کے کلام کے انتخابات شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور بہت سی کتابوں اور نظموں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے کیا جھوٹ ہے کہ اس کی بہت سی طویل

نظموں شائع ہوئیں۔ جن میں سے اردو، بھارت کے مسلماں، جمہور نامہ اور ماتم نہرو وغیرہ کو قابلِ ذکر مقبولیت حاصل ہوئی اور اُردو، اور بھارت کے مسلماں، تو وہ نظمیں ہیں جو ایک رسالے سے دوسرے اخبار و جرائد میں اور ایک زبان سے دوسری زبان پر الہامات اور نغمات کی طرح منتقل ہوتی رہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے بے شمار توسیعی خطبات اور لیکچرس دیئے اور متعدد بین الاقوامی ادبی اجتماعات میں تقریریں کیں تو کیا اخبار اور رسالے والے اس کا ذکر نہ کرتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس پر کئی ایک کتابیں، پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے اور مختلف رسالوں کے نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ کیا یہ بھی افواہ ہے کہ اس کو مختلف اعزازات، انعامات سے نوازا گیا اور اکابرینِ علم و ادب نے اس کی پزیرائی کی۔ اگر یہ سب حقیقت ہے تو اس کا ذکر کس طرح غلط ہو سکتا ہے حقائق کا انکار کرنے سے کسی شخص کا نہ علمی قد گھٹ سکتا ہے اور نہ اس کے ادبی وقار میں کمی آ سکتی ہے البتہ دوسروں کو اپنے قد کے برابر لانے والوں کی سعئی حقیر کی قلعی ضرور کھل جاتی ہے۔ بالکل اس شترمرغ کی طرح جو ریت میں اپنی گردن گاڑ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ سب خیریت ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب راچہ گناہ

اصل میں گفتگو کیفیت کی ہے۔ اس لئے اس کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جانا ہے جگن ناتھ آزاد نے جس عہد میں آنکھ کھولی اس میں اردو نظم نگاری مناظرِ فطرت اور حبِ وطن کے موضوعات سے آگے بڑھ کر فکر و فلسفے کی دہلیز بھی پار کر چکی تھی۔ محمد حسین آزاد اور حالی نے جس موضوعی شاعری کی ابتدا کی تھی اس میں حبِ وطن اور اتحاد و اتفاق خاص موضوع تھے جس کو چکبست، نظر، رواں اور محروم وغیرہ نے کبھی شخصی مرثیوں کے واسطے سے کبھی تحریکِ آزادی کی پرجوش حمایت کے ذریعہ اور کبھی مل جُل کر غلامی اور استعماریت سے نجات حاصل کرنے کے جذبات کو اُبھار کر کافی وسیع کر دیا تھا۔ اپنی ابتدائی شاعری میں اقبال نے اپنے کمالِ فن اور بلیغ فکر کے ذریعہ اس موضوع کو اور بھی بسیط کر دیا۔ یہ ایسے موضوعات تھے جو اس عہد کی شاعری کے امتیازات میں سے تھے اور شاعری کے اس رویے سے جگن ناتھ آزاد کا

متاثر ہونا فطری تھا۔ اسی طرح وہ سماجی موضوعات جو حالیؔ، آزادؔ، اقبالؔ اور چکبستؔ اور دوسرے شعراء کے یہاں عموماً پائے جاتے ہیں۔ وہ خیر اور اخلاقی قدروں کو ابھارنے کے سلسلے کے ہیں جن کو ایک کلاسیکی رچاؤ، لفظوں کے خوبصورت استعمال اور چست بندشوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا رہا۔ جگن ناتھ آزادؔ اردو کے اسی شعری رویے سے زیادہ قریب رہے اس لئے یہ اُن کی شاعری کا خاص رویہ بن گیا۔ اس رویہ میں مایوسی، غمناکی اور ٹوٹے ہوئے تاروں پر ماتم کرنے کے بجائے آفتابِ تازہ سے گرمی لے کر سامانِ سفر مہیا کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ملتا ہے۔ یہ وہ رجائی رویہ ہے جس کو اقبالؔ نے ایک مربوط پیام بنا کر پیش کیا۔

جگن ناتھ آزادؔ کا شعری امتیاز تقسیم ہند سے کچھ پہلے نمایاں ہونا شروع ہوا چنانچہ اُن کے پہلے مجموعۂ کلام 'بیکراں' میں پہلی نظم ۵ ر اگست ۱۹۴۷ء ہی پر ہے۔ اگرچہ اس میں ایک نظم امیدِ موہوم ۱۹۴۴ء کی بھی شامل ہے۔ مگر بیشتر نظمیں اور غزلیں تقسیم ہند کے آس پاس ہی کی ہیں تقسیم وطن ہی سے متاثر اُن کی ایک اور خوبصورت نظم 'پس پردہ' بھی ہے۔ اس کے علاوہ 'آزادی کے بعد' 'کلکتہ' 'آزاد ہند فوج' 'پناہ گزین' وغیرہ بھی اس کی غماز ہیں۔ اسی طرح 'نوائے پریشاں' میں اس موضوع پر طرح طرح سے اظہارِ خیال ہے اور 'وطن میں اجنبی' تو ہجر و فراق اور یادِ وطن کی ٹیسوں سے بھر پور ہے۔ یہی حال کہکشاں نام کے انتخاب کا بھی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کے اثرات اس کی غزلوں میں بھی در آئے ہیں مثلاً 'بیکراں' کی ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے ؎

ترتیبِ نشیمن کیا ہو گی آرائشِ گلستاں کیا ہوگا
آغازِ بہاراں کچھ تو بتا انجامِ بہاراں کیا ہوگا

اندازہ طوفاں ہوتا ہے طوفاں کے قریب آ جانے سے
ساحل پہ بسیرا کرنے سے اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا جاتا ہے آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبل انساں کیا ہوگا

ایک اور غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

فضا کو دیکھ کے ذوقِ نظر پہ کیا گزری
نہ پوچھئے ہوسِ بال و پر پہ کیا گزری

تمھیں کچھ اس کی خبر بھی ہے اے چمن والو
سحر کے بعد نسیمِ سحر پہ کیا گزری

ہجرت اور ہجرت کے بعد یادِ وطن کی یہ ٹیس آزادؔ کے ذہن و فکر پر تادیر غضب خون ماری رہی اور

طرح طرح سے احساساتِ شعری پیکر اختیار کرتے رہے ہیں۔

تری محفل سے جو ارمان و حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

دردِ حیات تیرے فسانے کہاں گئے ۔ دل جن سے زندہ تھا وہ ترانے کہاں گئے
جن کے طفیل باغ و بہاراں تھی زندگی ۔ وہ دوست وہ حبیب نہ جانے کہاں گئے

اس طرح تحریکِ آزادی اور تحریکِ آزادی کے ممتاز رہنماؤں سے اظہارِ عقیدت بھی آزاد کی نظموں کا محور بنتے رہے۔ انھوں نے ٹیگور، نہرو اور آزاد سے کافی پرجوش طریقے سے اظہارِ محبت کیا۔ ادبی دنیا میں جن اعیان سے ان کو عقیدت تھی اُن پر بھی اُن کی نظمیں ملتی ہیں۔ مثلاً محروم، اقبال، تاجور، کیفی اور سالک وغیرہ۔ اس طرح اُردو شخصی مرثیوں کی روایت کے بھی وہ امین ہیں۔ اوپر جس روایت کا ذکر کیا گیا اس میں مناظرِ فطرت سے دلچسپی اور ایک رومانی اندازِ نظر کی بھی کارفرمائی تھی۔ آزاد کے یہاں یہ انداز بھی ملتا ہے جس کی ترجمان اُن کی نظمیں 'سرِ محبت'، 'شکنتلا'، 'ایک آرزو'، 'استفسار' اور 'کسولی' وغیرہ ہیں اس اندازِ نظر کی کارفرمائی اور اس روایت کی پاسداری ان کے کم و بیش تمام ہی مجموعہ ہائے کلام میں پائی جاتی ہے

یہ نہیں ہے کہ آزاد اپنے آس پاس ادبی دنیا میں ہونے والے انحرافات اور تجربوں اور نئے رویوں سے باخبر نہ ہوں۔ مثلاً حلقۂ اربابِ ذوق لاہور اور حلقۂ اربابِ علم لاہور کی ان دونوں انجمنوں کے ادیبوں اور شاعروں سے اُن کے تعلقات تھے وہ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے ادبی رہنماؤں میراجی اور راشد کے تجربوں سے واقف تھے مگر حالی، اقبال، چکبست اور محروم کا شعری اندازِ نظر اور مذاق اُن کے ادبی مزاج کو کچھ ایسا پختہ کر گیا تھا کہ وہ اس طرف نہ جا سکے۔ اس کے باوجود اُن کے پہلے ہی مجموعہ 'بیکراں' میں 'دائرے' اور

سکوت جیسی بے قید نظمیں بھی ہیں۔ اس عہد میں اردو میں ہئیت کے جو تجربے ہو رہے تھے
خصوصاً گیتوں کا جو رجحان جوش زن تھا۔ آزاد نے اس کی بھی کوشش کی مگر گیت کے طرز پر
وہ خوبصورت نظمیں بن گئیں۔ اس لئے کہ ان کے مزاج کی نظمیت ان کو کسی اور طرف مڑنے
ہی نہیں دیتی تھی۔ چاندنی اتری پھلواری میں' اے کشورِ ہندوستاں' وغیرہ اس طرح
کی نظمیں ہیں۔ اس عہد کی ایک اہم ادبی تحریک۔ ترقی پسند ادبی تحریک بھی ہے۔ آزاد کو
ادب میں ترقی پسند نقطۂ نظر کافی پسند رہا ہے اور شاید اب بھی ہے مگر وہ ترقی پسندی
کو اوڑھنا بچھونا نہ بنا سکے۔ ان کی دوستی فیض، جعفری، ندیم، ساحر، مجروح سبھی سے رہی
کچھ ترقی پسند نقطۂ نظر کی پسندیدگی اور کچھ جوش کے فیضِ صحبت نے ان کے یہاں راست
بیانی کو کافی نمایاں رکھا۔ جس سے وہ حلقۂ اربابِ ذوق کے اہلِ نظر شعراء کے طرزِ شعر اور
رویے سے اور دور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جدید شعری رویے اور نئی شاعری کو الا ماشاء اللہ
انہوں نے بھی پسند نہیں کیا بلکہ بیشتر منہ ہی بناتے رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جس
شعری رویے اور افادی نکتۂ نظر کے پاسدار تھے اس کا طرزِ شعر گوئی ترقی پسند شعراء کے
اندازِ سخن سے زیادہ قریب تھا مگر جگن ناتھ آزاد کا کمال یہ ہے کہ وہ اس طرز کی اس
شدت سے دور ہی رہے جس کے سرخیل حضرت جوش ملیح آبادی تھے اور جن کے اثر سے
سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری اور تیغ الہ آبادی وغیرہ نہایت پرجوش
انداز اور گھن گرج کے ساتھ سرمایہ داروں پر شعروں کے ہتھیار سے یلغار کر رہے تھے
پھر بھی ان کے یہاں اس طرح کے اشعار مل ہی جاتے ہیں اور وہ بھی غزل میں سے

نواہائے فردا سے بیتاب ہو کر زمانہ نئی کروٹیں لے رہا تھا
سنبھل کر — اب ذرا تختِ شاہی خبردار ہو جائیں اورنگ و افسر

نئی زندگی ہے اب بحر و بر میں، نئی زندگانی ہے اب دشت و در میں
نئی زندگانی ہے کوہ و کمر میں، یہ جدت کے انداز اللہ اکبر

تعفن کی دنیاؤں میں رہنے والو، کھلی سرزمینوں کے عالم میں آؤ
نگاہیں اٹھاؤ ہر اک سمت دیکھو مہکتی ہوئی نو بہاروں کے منظر

نظم کسان کے یہ دو شعر بھی دیکھئے ۔

دیہات میں رہ کر شہروں کے گلزار کو مہکانے والے

ہر ایک کو نعمت دے دے کر خود نانِ جویں کھانے والے

یہ پھل ہے تیری کمائی کا رونق ہے جو بازاروں میں

ہے تیری جنسِ وفا پنہاں کے اِن انباروں میں

لیکن راست بیانی کے باوجود ان کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں ایک ٹھہراؤ، سنجیدگی، وقار اور ایک خاص قسم کی شائستگی ذوق پائی جاتی ہے جو اقبالؔ، چکبستؔ، محرومؔ، نظرؔ اور رواںؔ وغیرہ اور اُن کے متبعین کا خاص امتیازِ شعری ہے ۔ مثلاً ۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا

بتا اے پیرِ میخانہ یہ مے خانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو یہ تم نے کیا فسوں پھونکا

خدا کے گھر پہ کیا گزری صنم خانوں پہ کیا گزری

آزادؔ کی نظموں میں عموماً تشبیہوں اور استعاروں کا اکہرا نظام ملتا ہے ۔ البتہ اُن کی ترکیبوں اور بندشوں میں چستی اور انتخاب کا رنگ چوکھا ہوتا ہے ۔ اقبالؔ کی نظموں کی طرح تغزل کی کیفیت سے سرشار تو نہیں مگر ان کی نظمیں اور غزلیں انداز و آہنگ میں اس طرح مماثل اور ہم مزاج ہیں کہ ان اصناف کی تفریق مشکل ہو جاتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادؔ اپنے مزاج کی مرنجان مرنجی اور باہمہ ہونے کے سبب ہر نکتۂ نظر سے قریب رہے اور ہر ایک سے استفادہ کیا مگر کسی ایک کے ہو کے نہ رہ گئے ۔ وہ فیضؔ کے بھی دوست رہے اور سردار جعفری کے بھی ۔ فیضؔ سے انھوں نے نرم اور سنبھلا ہوا لہجہ لیا مگر اُن کی خوبصورت ترکیبوں اور اُن کے اندازِ استعمال اور اُن کے لفظوں کی گہری معنویت کی لطافتوں سے مستفید نہ ہو سکے ۔ سردار جعفری کی راست بیانی

توڑے لیکن مگر اُن کے طرزِ گفتار کو اپنانے سے گریز کیا۔ وہ جوشؔ کے بھی مداح رہے اور برسوں اُن کے فیضِ صحبت سے استفادہ کیا مگر جوشؔ کے گھن گرج سے دور ہی رہے اور صرف اُن کے موضوعات پر قناعت کی۔ فراقؔ سے اُن کا برسوں تک یارانہ رہا مگر وہ فراقؔ کی لوچ دار، نرم بھاشائی اسلوب کی گداختگی تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ وہ علامہ تاجورؔ نجیب آبادی کے حلقۂ تلمذ میں شامل رہے مگر متاثر اقبالؔ سے رہے۔ علامہ تاجورؔ بھاشائی اسلوب کے قائل اور فارسی ترکیب کے استعمال سے گریزاں تھے۔ مگر اقبالؔ کی ساری فکر ہی فارسی کی خوبصورت ترکیبوں کی مرہونِ منت ہے۔ علامہ تاجورؔ نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں اردو شاعری اور بلینک ورس کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اُس کے آخر میں نظم و نثر کی اصلاح کے لئے ایک ... پروگرام بھی دیا جس میں اردو سے عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو نکال کر عام فہم ہندی میں لکھنا اُردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنا۔ اردو شعروں میں لیلیٰ مجنوں، رستم و سہراب اور نرگس و گُل کے بجائے ہندی مضامین اور ہندی تشبیہات کا استعمال کرنا وغیرہ نکات شامل تھے۔ اسی طرح انہوں نے ایک اور مضمون "اُردو نظم ہندی بحروں میں" بھی شائع کیا جس میں کہا کہ :-

> "اردو شاعری کو نئی بنانے کی کوشش کرنا ہر شاعر کو اپنا فرض سمجھنا چاہیئے۔ اگر ملک کے دس سربرآوردہ شاعر بھی اُردو نظمیں ہندی وزنوں میں کہنا شروع کر دیں تو ایک ہی سال میں ہندوستانی جذبات کا سیلاب دجلہ کے بجائے گنگا کے رُخ بہنے لگے گا"[1]

لیکن آزادؔ اپنے اُستاد کے اس شعری لائحۂ عمل پر عمل نہ کر سکے۔ اس لئے کہ اُن کے شعری افق پر اقبالؔ کے فکر و فن کا سورج اتنی تیزی سے چمک رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس کی حیات بخش تپش سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ علامہ تاجورؔ کے زیرِ اثر اُن کے شعری مزاج میں ہندیت کا اثر تو باقی رہا مگر شعری ڈکشن اور ڈکشنری دونوں پر اقبالؔ کے

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون 'نئی شاعری اور جدید شاعری' از فتح محمد ملک، شمولہ نئی شاعری، مرتبہ افتخار جالب لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء۔ ص ۱۳-۱۱۲۔

اثرات کی بجلیاں چمکتی رہیں۔ تحدیہ ہے کہ اے کشورِ ہندوستاں، جیسی نظم میں جو ہیئت کے اعتبار سے گیتوں کے طرز سے زیادہ قریب ہے۔ شاید ہی کوئی بند جس سے علامہ تاجور کی روح سرشار ہو سکے۔ البتہ اقبال و جوش عزوز خوش ہوئے ہوں گے۔ مثلاً۔

اے کشورِ ہندوستاں　　اے خطۂ جنت نشاں

اے سجدہ گاہِ قدسیاں

اے منبعِ انوارِ حق　　اے کعبۂ روحانیاں

اے قبلۂ عرفانیاں　　اونچا رہے تیرا نشاں

اے کشورِ ہندوستاں

اقبال کے شعروں پر آزاد　　جہاں ایک طرف اُن کے کمالِ فن کی غماز ہیں کہ انہوں نے اقبال کے شعروں کی روح کو اپنے شعری آہنگ میں اس طرح جذب کر لیا ہے کہ آزاد کے شعر اقبال کے شعر اور اقبال کے آزاد کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے شعری لب و لہجے کی بھی گواہی دیتی ہیں کہ وہ کس مکتبۂ فکر سے زیادہ قریب ہیں نمونتہً چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

ممتاز و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو
انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو
اربابِ رعونت کو رعونت کی سزا دو
اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے
بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے
تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ یہیں سے
گرما دو غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

میرا دل مطمئن طالبِ نان
قیدِ جہاں سے بری گرچہ بظاہر اسیر
مجھ میں نہ پیدا ہوا شوقِ لباسِ حریر
"میرا نشیمن نہیں درگہہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اُن کے پورے کلام میں اقبال کی تراکیب، الفاظ اور فکر و فن کے اثرات کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ اُن کے عہد کے یہ سارے بڑے شاعر مختلف رویے کے نمائندے اور منفرد طرزِ اظہار کے علمبردار تھے۔ چکبست و محروم، میراجی راشد، علامہ اقبال، جوش و فراق، فیض و سردار و آزاد سب کے قریب رہے اور ان متضاد شعری رویوں اور اندازِ نظر میں توافق اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اس طرح اپنا ایک الگ رنگ اور ایک الگ آواز پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس آواز کی خاص شناخت، متانت، تازگی و تنوع، قدرتِ بیان، فلسفیانہ انسانی مسائل میں تفکر اور زبان کا وہ کلاسیکی رچاؤ اور لطافت ہے جس کے سرے میر و غالب تک پہنچے ہوئے تھے۔ آزاد کی شاعری اس دور کے مخلص انسان کی آواز ہے جو انسان کی نیکی اور عظمت کی افادیت کا قائل ہے جس کے یہاں عشق و جنس کا ابتذال نہیں۔ انسانیت کا وہ دمکتا حسن ہے جس پر یزداں بھی مرشلہ ہے۔ یہ وہ بے تعصب شاعر ہے جو اعلانِ حق کرنے میں نہیں جھجکتا۔ اُردو کی عظمت کا پرچم اس وقت بلند کیا جب وہ قابلِ گردن زدنی تھی۔ بقول قاضی عبدالغفار "یہ نظم اردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے جس کی تعریف میں اس لئے نہیں کرتا کہ مادری زبان اُردو ہے یا میں انجمن اردو ترقی کا سکریٹری ہوں بلکہ اس لئے کرتا ہوں کہ یہ نظم اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا ایک جزو ہے..... آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ واری فتنے کی آگ میں گزر کر آوارۂ وطن ہو کر ہندوستان آئے اور ابھی ادبی تعصبات کی اس گندگی سے انھوں نے

اپنا دامن بچا لیا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بلند مقام ہے اور ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے وہ تو غیب کی آواز ہے۔ وہ تو زندگی کی ایک نوید ہے۔

یہ وہ شے ہے جو نائے ایک ہی در پر حریفوں کو
مئے کہنہ پلا کے ایک مرکز پر حریفوں کو
غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلم پیار کی بولی

اس طرح تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کو جس طرح رنج والم اور مایوسی کے تاریک اور خطرناک بادل اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے ان کو معرفتِ ذات، خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ اور اسلاف کا سوزِ دروں اور ولولہ پیدا کرنے کی دعوت دینا جگن ناتھ آزاد کا وہ بڑا کارنامہ ہے جس پر اسلامی دنیا ہمیشہ فخر کرتی رہے گی اور جس ٹھہرے ہوئے اور انداز میں ان کو قرآن میں تفکر پر مائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فکر و فن کے لحاظ سے اور طرزِ احساس و اظہار کے پہلو سے بھی اسے اقبال کا شعری اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہی تب و تاب وہی دردمندی اور وہی تفکر و تدبر اقبال کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں
کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں
اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہو ترساں

بھارت کے مسلماں

بھارت کا تو فرزند ہے بیگانہ نہیں ہے
یہ دیس ترا گھر ہے تو اس گھر کا مکیں ہے
تابندہ ترے نور سے اس گھر کی جبیں ہے
کس واسطے افسردہ و دلگیر و حزیں ہے

پہلے کی طرح باغِ وطن میں ہو نواخواں

بھارت کے مسلماں

قرآن کی تعلیم سے پھر درسِ بقا لے

پھر روح میں پیغام محمدؐ کو بسا لے

گزرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بلا لے

روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے

ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انساں

بھارت کے مسلماں

ماحول کی ہو تازہ ہوا تجھ کو گوارا!

درکار ہے تہذیب کو پھر تیرا سہارا

کر آج نئے رنگ سے دنیا کا نظارا

چمکے گا پھر اِک بار ترے بخت کا تارا

ہو جائے گی تاریکیٔ ماحول گریزاں

اس نظم میں بھارت کے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی گئی تھی اس جذبہ کے لیے کہ مبلغین اسلام قریہ قریہ پھرتے رہے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتے رہے کہ اس ماحول میں تمہیں خود جو سوچنا چاہیئے تھا تم نہیں سوچ سکے اور ایک غیر مسلم انہی راہوں کی درخشانی کی طرف تمہاری توجہ مرکوز کر رہا ہے۔ حیرت و عبرت کی بات ہے کہ تم سے پوچھ رہا ہے اور تم نقشِ دیوار بنے ہوئے ہو۔ بتاؤ سے

اسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں؟

انسان کی تعظیم فراموش ہوئی کیوں؟

باطن کی وہ تنظیم فراموش ہوئی کیوں؟

اخلاص کی اقلیم فراموش ہوئی کیوں؟

حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالمِ نسیاں

یہ نظم "الجمعۃ" سے "معارف" اور "معارف" سے دوسرے متعدد رسائل و جرائد میں منتقل ہوئی۔ الگ سے چھاپی گئی اور زبان زدِ عام ہو گئی۔ یحییٰ اعظمی نے اعترافِ تشکر کے عنوان سے نظم لکھی اور آزاد کا شکریہ ادا کیا۔ ہمدردِ مسلماں کا خطاب دے کر اسد ملتانی نے بھی اظہارِ امتنان کیا۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا۔

"جب ۱۹۵۲ء میں اُن کی نظم 'بھارت کے مسلمان' دہلی کے 'الجمعۃ' اخبار میں پڑھی۔ تقسیم ہند کے بعد یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے بڑی پریشانی اور مایوسی کا تھا۔ وہ طرح طرح کے مسائل و مصائب میں گھرے ہوئے تھے۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے مسلمانوں کے زخم پر مرہم رکھ دیا ہے۔"[1]

مولانا شاہ معین الدین ندوی ایڈیٹر 'معارف' اعظم گڑھ کا تاثر تھا۔ کہ

"یہ نظم جس اخلاص سے لکھی گئی ہے اور جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب و تنگ نظری کے اس تاریک دور میں بھی انسانیت کی شمع گل نہیں ہوگئی ہے۔"[2]

اُن کی دوسری نظموں، غزلوں اور رباعیوں کی طرح اس میں زبان کی صفائی، روانی اور تسلسل اور ترنم کے ساتھ مصرعوں بلکہ لفظوں تک میں جو اخلاص، پاکیزگی اور نفاست ذوق کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ اقبال کی نظموں کی یاد دلاتی ہے خصوصاً شکوہ اور جوابِ شکوہ کی۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ مخالفین کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے اور انھوں نے اس پر آزاد کی لے دے بھی کی۔ اس سلسلے کے گواہ روزنامہ پرتاپ کے مہلشے نیپالی کا تبصرہ اور وہ دوسری تحریریں ہیں جو مختلف اخباروں میں شائع ہوئیں اس کی اثر پذیری اور حق گوئی و بے باکی کی ایک بے نظیر کوشش کے طور پر ہی میں اس کو آزاد کا ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

---

[1] مضمون جگن ناتھ آزاد کو خصوصی جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ، مرتبہ محمد ایوب واقف، علمی مجلس دہلی ۱۹۸۰ء صفحہ ۱۲۳

[2] ایضاً ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اُن کی ایک اور مشہور طویل مگر ادھوری نظم "جمہور نامہ" ہے جس پر ایک مفصل مضمون ڈاکٹر گیان چند جین نے "جگن ناتھ آزاد کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی۔ جمہور نامہ" کے عنوان سے لکھا۔ اور حاصلِ کلام کے طور پر کہا:۔

"اس طویل نظم اور اس کے متنوع بیانات کو دیکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ آزاد کو مسلسل بیان پر بڑی قدرت ہے۔ طویل نظم کے وسیع و عریض بیابان میں وہ تھک نہیں جاتا۔ الفاظ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ بیٹھتا بلکہ ہر جگہ پوری قدرت اور خود اعتمادی کے ساتھ لکھتا چلا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے چستیٔ بندش میں فرق نہیں آتا۔ بھرتی کے الفاظ کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ پیچھے جو نمونے دیئے گئے ہیں اُن سے شاعر کی قادر الکلامی اور پختہ کاری کا اندازہ ہوا ہوگا۔ کئی ہزار اشعار کے مسودے میں ایسے اشعار جو محلِ نظر ہوں صرف اتنے ہیں کہ ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں" [۱]

نمونے کے چند شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

یہ راجے سب عوامی رائے کے پابند رہتے تھے	نتیجہ تھا کہ جتنے لوگ تھے خورسند رہتے تھے
عوامی رائے کا اظہار اک مجلس میں ہوتا تھا	وہ ہو اقرار یا انکار اک مجلس میں ہوتا تھا
حکومت اصل میں یہ اکثریت کی حکومت تھی	شرافت کی صداقت کی عدالت کی حکومت تھی
نظامِ امروز کا یعنی نظامِ پارلیمانی	اسی بھارت کا ہے وہ ہے نہ امریکی نہ برطانی

اسی طرح اُن کی بعض دوسری طویل اور مختصر نظمیں جو مختلف دانشوروں اور رہنماؤں کی وفات پر لکھی گئی ہیں اردو میں شخصی مرثیوں کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہیں ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے صحیح لکھا ہے کہ

"اردو کے شخصی مرثیوں نگار شعراء میں جگن ناتھ آزاد کا نام ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ فکری اعتبار سے آزاد اقبال سے بہت زیادہ

---

[۱] شمولہ جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ۔ از محمد ایوب واقف۔ ص ۳۷

متاثر ہیں۔ اقبال کی مشعلِ خیال سے آزاد نے جتنی روشنی پائی ہے
وہ شاید دوسرے شاعروں کے یہاں نہ مل سکے"۔[1]

اس طرح کی نظموں میں "ماتم نہرو"، "ماتم سالک"، "رفیع صاحب کے مزار پر" اور "ابوالکلام آزاد" وغیرہ مشہور ہیں۔

آزاد کی رباعیاں بھی کم اہم نہیں۔ ان چراغوں میں اقبال، جوش اور فراق جیسوں کے چراغوں کی لو شامل ہو گئی ہے جس سے اُن کی روشنی کی کرنیں زیادہ تابناک ہو گئی ہیں۔

زمین و آسماں در سینۂ من | مکان و لا مکاں در سینۂ من
زبانم وہ کہ پیشِ تو کنم فاش | نمی گنجد فغاں در سینۂ من

بیباک گھٹاؤں کے سلام آئے ہیں | سرمستی و رندی کے پیام آئے ہیں
اے رحمتِ ساقی کو ترسنے والے | وہ دیکھ چھلکتے ہوئے جام آئے ہیں

وہ کاکلِ دلنواز مہکی مہکی | ہر بات کلی کی طرح مہکی مہکی
ہنگامِ سحر بھی ہے ہے رقص کناں | اے دوست تری نظر وہ بہکی بہکی

احساس میں تو دمک رہی ہے گویا | پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں | شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

آزاد کی غزلوں میں بھی وہی نفاستِ شعری، شائستگی اور لہجے کی متانت اور پاکیزگی ملتی ہے جو اُن کی بیشتر نظموں کی خصوصیت ہے۔ اُن کے شعروں میں مسرت اور بصیرت دونوں کے سامان ہیں۔ اُن کے غزلیہ کلام میں نظمیہ شاعری کی طرح

---

[1] مضمون "اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد" از ڈاکٹر عبدالستار دلوی، مشمولہ جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ ص ۹۳

پختگی، سوز و دردمندی اور لطافت پائی جاتی ہے۔ اُن کے قلبی واردات اور احساسات میں خلوص اور صداقت کی فراوانی ہے۔ خیالات میں جو نفاست اور پاکیزگی ہے وہ اُن کے شعروں کو بلند کر دیتی ہے۔ اُن کے یہاں غم کے ہلکے احساس کے باوجود یاس و مایوسی کا وجود نہیں۔ احترامِ آدمیت، زیست کی توانائیوں اور انسان کی صلاحیت پر اُن کا یقین پختہ ہے۔ اس لئے اُن کی غزلوں میں بھی ولولے کی ایک خاص جھنکار سنائی دیتی ہے۔ غزلوں میں نظمیت کے عناصر ضرور ہیں مگر ایسے نہیں کہ چیخ و پکار اور نالہ و شیون بنجائے۔

گلشن میں خامشی ہے مرے اس سوال پر ٹھہرے گا کاروانِ نسیم سحر کہاں
تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر دامن دیا ہے دامن نے نشتر راہوں میں
انسانیت خود اپنی نگاہوں میں ہے ذلیل اتنی بلندیوں پہ تو انساں کبھی نہ تھا
مطمئن ہوں زیست سے زیست بار ہے تو کیا زہر پی رہا ہوں میں ناگوار ہے تو کیا
خزاں کے تند بگولو ذرا ٹھہر جانا چمن کے ساتھ نہ مٹ جائے آبروئے چمن

دلِ ناداں یہاں خاموش رہنا نہ ہو جائے مزاجِ دوست برہم
یہ قطرے آنسو نہیں اے چشمِ ظاہر بین دوست اپنی پلکوں پر لئے بیٹھے ہیں اک افسانہ ہم
آزاد چل کوئی نئی دنیا تلاش کر جلوے یہاں بقدرِ مذاقِ نظر کہاں

یہ ٹھیک ہے کہ آزاد کے یہاں اچھوتی اور نادر ترکیبیں اور نئے استعارے نہیں۔ اُنھوں نے بیشتر اپنے بزرگوں ہی کی تراکیب پر قناعت کی ہے۔ اُن کی غزلوں میں چشمِ ظاہر بیں، عشرت کدۂ جادوئے بابل، سحرِ مغانہ، عشقِ جنوں خیز، حریفِ رخِ جاناں، نگارِ ناپید، تہذیبِ کہنہ، بند و سلاسل، پابندیٔ ساحل اور اس طرح کی دوسری ترکیبیں ہی ملیں گی۔ ان میں کوئی نیا پن نہیں۔ اسی طرح دیوانوں، افسانوں، پیمانوں اور میخانوں میں بھی کوئی نئی چیز نہیں اور نہ اُن میں کوئی معنویت ہی ہے لیکن اپنے احساس کی شدت، فکر کے تنوع اور لہجے کی پاکیزگی کے ذریعے وہ اپنی منفرد آواز اُن کے ذریعے بھی پالیتے ہیں اور اس طرح سے اپنا اعتبار باقی

رکھتا ہے۔ یہ چیز اس کو ممتاز شعراء میں جگہ دلا دیتی ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آزاد کے یہاں کلام میں جو پختگی اور کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے وہ دراصل اُن کی اقبالؔ، چکبستؔ، محرومؔ، جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ سے استفید ہونے کا نتیجہ ہے اور فارسی اور اُردو کے کلاسیکی شعراء کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا بھی مگر اس کا کمال یہ ہے کہ ان چھتنار درختوں کے سائے میں رہنے کے باوجود وہ اپنی شاخ الگ نکال لیتا ہے۔ یہی اس کو صفِ اوّل کا شاعر بناتی ہے ڈاکٹر تاثیر نے صحیح کہا ہے کہ

"جگن ناتھ آزاد کا کلام غزل، نظم، قطعہ، رُباعی ادبیت میں رچا ہوا ہے۔ اس کی وہی ادبی ادایات ہیں جو غالبؔ، اقبالؔ، چکبستؔ حسرتؔ موہانی اور جوشؔ میں وجہ مشترک ہیں۔ الگ الگ شخصیت اور طرزِ اظہار کے باوجود یہ ایک گداز طبیعت، اور دردمند، دل حساس شخصیت کا کمال ہے۔ ایک محبت کرنے والے عالی ظرف دوست کی گفتگو ہے جو بہت سی باتیں چشم سخن گو اور جنبشِ ابرو سے کہہ جاتا ہے..... وہ جسے بلاغت کہا جاتا ہے..... آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے یعنی دل و دماغ کا نور ہے اس ہیجانی دور میں صحیح ادبی توازن کو برقرار رکھنا بڑی شخصی عظمت کی نشانی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی"۔

(جگن ناتھ آزاد کے پہلے مجموعۂ کلام 'بیکراں' پر تبصرہ)

پروفیسر احتشام حسین کا بھی کہنا ہے کہ

"آزاد کی نظموں اور غزلوں دونوں میں لطافت ملتی ہے کیونکہ وہ نظموں میں بھی اس غنائیت اور تغزلانہ کیفیت کو برقرار رکھتے ہیں جس سے غزل خالص داردانی چیز بنتی ہے۔ آزاد کی شاعری ہمارے دور کے اس مخلص انسان کی آواز ہے جو انسان کی عظمت

اور نیکی پر بھروسہ رکھتا ہے اور جسے خیالات کے اظہار پر قدرت ہے"۱؎
جس شخص کی شاعری کا یہ عالم ہو وہ ایک ممتاز اور اچھا شاعر نہیں تو اور کیا ہے
جن کو اس کی شاعری اچھی نہیں معلوم ہوتی اُن کو اپنا علم اور ذہن ضرور ٹٹولنا
چاہیئے۔ شاید تکلیف کا پتہ چل جائے۔

اب آیئے اس کی علمی شخصیت کی طرف جو نثر میں زیادہ ظہور کرتی ہے
نثر میں جو تنوع، تفکر، وسعت مطالعہ اور ادب و فلسفہ پر گرفت نظر آئے گی
وہ بہت کم اہلِ علم کو نظر آئے گی۔ اس کا اسلوبِ نثر ہر جگہ ایک ہی نظر آئے گا
وہی گفتگو کا انداز، وضاحت، شگفتگی، سلاست، صاف ستھری مگر دلچسپ نثر جس
میں الجھاؤ نہیں۔ منطقی ربط و تسلسل اور واقعات اور واردات کا ایسا بہاؤ جو بیشتر
اس کے علم اور حافظے کے کناروں کو چھو کر نکلتا ہے۔ اس نے تین سفر نامے
ایک یادداشت، ایک خاکوں کا مجموعہ، چھ علمی اور ادبی تصنیفیں، ایک درجن کے
قریب تالیفات، سیکڑوں مضامین اور انگریزی میں دو کتابیں تصنیف کیں
کئی ایک زیرِ طبع اور کئی زیرِ ترتیب ہیں۔ اقبال کی تفصیلی زندگی پر کئی جلدوں
میں ایک گراں قدر تصنیف روداد اقبال کی تین جلدیں مکمل ہو چکی ہیں۔ بچوں کے
ادب پر بھی ان کی تین کتابیں ہیں۔ مضامین کا مجموعہ "نشانِ منزل" اور اقبال سے
متعلق اس کی دوسری کتابیں اس کے توضیحی انداز نقد اور وسعتِ علم کی گواہ ہیں
اقبال پر اس کی خدمات زیادہ وقیع ہیں۔ مگر مضامین کے تنوع کو دیکھتے ہوئے
کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے عصر کے ادبی رجحانات، نظم و نثر کی مختلف اصناف اور
تحقیق و تنقید کے موجودہ طریقوں اور معیار سے واقف ہے

"نشانِ منزل" میں شامل عنوانات ہی علم و ادب کے مختلف پہلوؤں پر اس
کی معلومات کی گواہی دیتے ہیں۔ حسرت موہانی اور اقبال، ہندوستان کے تہذیبی
عناصر اور اُردو، جوش ملیح آبادی کی دو نظمیں، ترقی پسند شاعری، رام لال کا فن، فرحت

۱؎ مضمون نسیمہ آشنا از پروفیسر احتشام الدین مشمولہ نگین ناقد آزاد۔ ایک مطالعہ از محمد ایوب واقف صفحہ ۹

کی رامائن' خورشید احمد جامی' جدید اردو شاعری' ہندوستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد عالمی معیار اور اردو' ادیب اور ادبی تخلیق' انشا پردازی' فکر اور جذبہ غالب اور اقبال' اقبال اور عالمی کانگریس' اردو زبان اور اس کا صحیح استعمال' اردو شاعری میں جدید رجحانات' مخدوم کا فی البدیہہ کلام' کچھ یادیں دوسرے ملکوں کی' امر سنگھ منصور ایک خط اور اس کا جواب' جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ' اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہت سے اور مضامین لکھے۔ خصوصاً فراق کے بارے میں۔ انہوں نے فراق کی شعری حیثیت اور ان کے شعری مزاج کی جو تصویر کشی کی ہے وہ خاصی مشہور ہوئی۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں' میں ۲۲ ادیبوں اور شاعروں کے دلچسپ خاکے' یادیں اور ملاقاتوں کے دلچسپ بیانات شامل ہیں۔ یہ صرف خاکے نہیں بلکہ نئی معلومات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں اور ان میں خاکہ نگاری کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان میں ۲۲ بزرگوں کے ٹکڑے ٹکڑے مگر منضبط سوانح بھی ہیں ان کے کردار کی پرچھائیاں بھی اور ان کی ادبی شخصیت کی روشنی بھی ان کا علمی قد بھی' اور آزاد سے ان کے روابط بھی۔ بقول سلیم اختر "آنکھیں ترستیاں ہیں" کے ۲۲ سوانحی مضامین دراصل وہ آئینے ہیں جن میں آزاد نے اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کی یادوں کے محبت بھرے مرقعے سجائے ہیں۔ یوں دیکھیں تو یہ تمام مضامین مل کر' خود دیکھ' کی صورت اختیار کر کے خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کے رنگ دکھاتے ہیں۔ وہ شخصیت جس کا سارا حسن اور دلکشی محبت' خلوص' جذبات' لگن اور عجز و انکسار سے جنم لیتا ہے۔[1]

ان کے سفرنامے بھی لاجواب ہیں۔ شگفتہ انداز تحریر میں پُر از معلومات سفرنامے "دو ہفتے جنوبی ہند میں" پشکن کے دیس میں' کولمبس کے دیس میں' پہلا سفرنامہ اپنے عنوان ہی سے اپنی نوعیت بنا دیتا ہے۔ پشکن کے دیس میں' آزاد کے سفرنامہ

---

[1] مقدمہ از ڈاکٹر سلیم اختر مشمولہ آنکھیں ترستیاں ہیں' از آزاد' مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۸۲ء ص ۱۵۔

روس کی یادگار اور تیسرا امریکہ اور کناڈا کے اسفار پر مشتمل ہے۔ میرے گزشتہ روز و شب ادب و شعر سے متعلق ان کی ایک یادداشت ہے جو دلچسپ بھی ہے اور معلومات افزا بھی بچوں کے ادب میں بچوں کا اقبال' اور اقبال کی کہانی بچوں کے نکتۂ نظر سے بڑی اچھی کتابیں ہیں۔ بچوں کی نظمیں اور ریڈیائی فیچر بھی بچوں کے ادب میں قابلِ ذکر تخلیقات ہیں۔ ان کی تالیفات اور اُن پر اُن کے مقدمے صاف ستھرے وقیع ہیں۔ یہی کچھ اُن کی اُردو نثر میں قابلِ ذکر مصنف کی حیثیت سے ایک امتیاز عطا کرتا ہے مگر اُن کی ایک بہت ہی زیادہ ممتاز، مشہور اور نمایاں حیثیت ماہرِ اقبالیات کی بھی ہے۔ جس سے وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

اقبال کے سلسلے میں اُردو میں انھوں نے اقبال اور اُس کا عہد، اقبال اور مغربی مفکرین، اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری' اقبال اور کشمیر' فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو اور محمد اقبال جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ انگریزی میں اقبال۔ پوئٹری اینڈ فلاسفی اور اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ لکھی۔ اس کے علاوہ اقبال کی تاریخ پیدائش' اقبال کا اسلاف' اقبال کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں خصوصاً اقبال عالمِ انسانیت کی شاعر کی حیثیت سے وغیرہ موضوعات پر انھوں نے تحقیق و تنقید کا جو حق ادا کیا ہے اس نے اُنہیں حلقۂ اہلِ علم میں نمایاں مقام عطا کر دیا ہے۔

ان ساری کتابوں کا احاطہ اور محاکمہ کرنا اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ البتہ اقبال کے تعلق سے اُن کی گراں قدر خدمات کا ذکر ضرور کر دوں گا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ اور شعری عظمت کے مختلف گوشوں پر اُن کے بیسیوں مضامین کے علاوہ اردو میں اُن کی چھوٹی بڑی اقبال پر آٹھ کتابیں ہیں۔ دو کتابیں انگریزی میں بھی ہیں۔ اقبال سے متعلق بچوں کے لئے دو کتابیں 'بچوں کا اقبال' اور اقبال کی کہانی' بچوں کے ذہن میں اس عظیم شاعر کے نقش نہایت خوبصورتی سے بٹھاتی ہیں۔ اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری ذرا بڑی عمر کے طلبا کے لئے اور محمد اقبال بڑی عمر کے عام لوگوں کے لئے نہایت عمدہ کتابیں ہیں۔ مرقع اقبال میں نہایت ہی نفاست کے ساتھ اقبال کی

مستند کہانی تصویروں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ اقبال اور کشمیر میں اقبال اور کشمیر اور اہل کشمیر سے ان کے جذباتی روابط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال اور اس کا عہد اس سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی ہے اقبال اور مغربی مفکرین ہے۔

اقبال اور اُس کا عہد' ان تین توسیعی خطبات پر مشتمل کتاب ہے جو فاضل مصنف نے کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر لکھے تھے۔ سفر اقبال کا ہندوستانی پس منظر، اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب و لہجہ اور اقبال اور اس کا عہد' یہ تین خطبات ہیں جن کی وقعت اور نوعیت ان کے عنوانات ہی سے ظاہر ہے۔ اس کتاب نے شاعر آزاد کو ایک اہل نظر ماہر اقبال کی حیثیت سے پیش کرنے کا آغاز کیا۔ اہل علم ادیبوں اور محققوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اس کی ان تاثرات کے ساتھ پذیرائی کی۔

"جگن ناتھ آزاد شاعر ہی اچھے نہیں بلکہ نثر کے بھی اچھے اور سلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں۔ اُن کے یہ تین لیکچر شعر و ادب، نقد و نظر اور اسلامیات کے طلباء کے پڑھنے والوں قابل ہیں۔ سلیس شگفتہ انداز میں باتیں خوب پتے کی کہہ گئے ہیں۔ اور حقیقت تصوف وغیرہ کے سلسلے میں بانوں باتوں، تو جا بجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم کیا معنیٰ مسلم فاضلوں کے لئے بھی باعثِ فخر ہو سکتے ہیں"۔

(مولانا عبدالماجد دریاآبادی)

"جگن ناتھ آزاد نہ صرف شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اقبال ابتدا ہی سے ان کا محبوب شاعر رہا ہے۔ آزاد والہانہ حد تک اقبال کے مداح ہیں۔ لیکن ان مضامین میں اُن کی شیفتگی نے کسی جگہ غیر منطقی شیفتگی کی صورت اختیار نہیں کی۔ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے جو کچھ ان مضامین میں لکھ دیا ہے وہ اقبالیات میں ایک اضافہ ہے اور بڑا مستحسن اضافہ"۔

(علامہ نیاز فتحپوری)

اُن کی گراں قدر تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" جب چھپی تو لوگوں کو اور بھی حیرت ہوئی اور اہلِ قلم اُن کی وسعتِ مطالعہ کے قائل ہو گئے۔ اس میں مصنف نے مغرب کے تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر فلاسفرس اور اہلِ علم شاعروں کے مختلف نظریات کا نہایت ہی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اور اقبال نے اُن سے کہاں تک استفادہ کیا اور کہاں رد کر دیا اُن سب مسائل کا احاطہ ہو گیا ہے اور اس طرح سے ہوا ہے کہ خود اقبال کے تصورات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

ملٹن، گوئٹے، فشلے، نیتشے، برگساں اور دوسرے فلسفیوں کے خیالات مختلف موضوعات خصوصاً مردِ کامل، خودی و بیخودی، عشق، عقل، وجدان، خدا اور کائنات، زمان و مکان، حرکت و عمل اور اس طرح کے دوسرے تصورات کے بارے میں اقبال اور مغربی مفکرین میں کہاں تک اشتراکِ خیال تھا اور کہاں اختلاف شروع ہوتا ہے۔ ان سب کا احاطہ ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اقبال نے سبھی کو پڑھا سبھی کی اچھی اور مفید باتیں لیں اور ان تصورات کو رد کر دیا جو اُن کے اسلامی اور قرآنی پیغام اور فلسفۂ حیات سے متضاد اور مخالف تھے یہی نہیں انہوں نے ہندوستانی مفکرین اور ہندوستانی تصور ویدانت اور تصور عمل پر بھی اسی طرح غذا اصفادع کدر کا عمل کیا اور ان سب نظریات و تصورات کے ان اجزا کو جو اسلامی نکتۂ نظر کے مطابق یا مماثل تھے اپنے فکر و فن کا مواد و موضوع بنایا۔ اور اس طرح غواصی کر کے نہ جانے کہاں کہاں سے موتی اکٹھا کئے جسے اپنی فکرِ روشن سے اس طرح تب و تاب بخشی کہ وہ اور بھی تابناک ہو گئے۔ اور ایک نئے انداز سے آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اس کتاب کی اس طرح پذیرائی کی۔ آزاد کو انہوں نے لکھا کہ

> "اقبال پر آپ کی نظر جس طرح عالمانہ اور Reverential ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ میرا خیال ہے اور دعا بھی کہ آپ کو اقبال پر کہنے کا استناد کا درجہ حاصل ہو جائے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں۔"
>
> (رشید احمد صدیقی)

"آپ نے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے اس کے لئے آپ کو بہت پڑھنا پڑا ہوگا۔ آپ نے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ دلائل اور تجربے پر مبنی ہیں میں بڑی حد تک اُن سے متفق ہوں۔ آپ نے جن جن مفکرین کو چُنا ہے اُن کے تصورات کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔" (ڈاکٹر یوسف حسین خاں)

اقبال اور مغربی مفکرین' پر موافق و مخالف تنقید ہوئی۔ بعض حضرات نے تو کچھ اعتراض و اختلاف بھی کیا۔ لیکن اُن کی نوعیت بیشتر اس طرح کی تھی کہ انھوں نے موجودہ میتھاڈالوجی کے کتابی اصولوں کی پابندی نہیں کی اور خیالات اور نتائج سے اختلاف کیا بھی تو وہ اس طرح کہ یہ کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ ان دو وقیع کتابوں کی طرح دوسری دو انگریزی کتابوں نے بھی اُن کی شہرت اور اُن کے وسعتِ علم کو دور دور تک پھیلا دیا۔ 'اقبال پائنٹ اینڈ آرٹ' کی رسمِ اجراء تو لاہور ہی میں ہوئی جس کی صدارت علامہ اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے کی۔ مختلف ادیبوں اور دانش وروں نے مقالے پڑھے اور اس کتاب کے حوالے سے آزاد کی علمی خدمات کو سراہا۔ اس طرح 'اقبال پوئٹری اینڈ فلاسفی' کی بھی اہلِ علم نے پذیرائی کی اور اس طرح آزاد ماہرِ اقبال کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر جانے جانے لگے یہ خدمات کوئی معمولی نہیں ہیں۔ ان کا اقبالیات کا مطالعہ خاصا وسیع اور گہرا ہے۔ انہوں نے اقبال کے متعدد غیر مطبوعہ اشعار' غزلوں اور نظموں اور اُن کی شانِ نزول پر بڑے معلومات افزا مقالے لکھے۔ اقبال کی تاریخ پیدائش' اقبال کے اسلاف اور دوسرے مختلف پہلوؤں پر بڑی فاضلانہ تحقیق پیش کی۔ کیا یہ چیزیں ثابت نہیں کرتیں کہ وہ ایک ممتاز شاعر ہی نہیں ایک بڑے عالم اور اچھے نقاد بھی ہیں۔

مطالعہ اقبال کے سلسلے میں آزاد نے تین پہلوؤں پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ پہلا یہ کہ اقبال کے اسلامی پیغام و فکر سے ان کی شعری حیثیت مجروح نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ادب و شعر کی بیشتر عالمی اور عظیم تخلیقات بنیادی طور پر مذہبی ہی ہیں۔ دوسرا یہ کہ اقبال صرف مسلمانوں ہی کے شاعر نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کے شاعر تھے یا اُن کو مفکرِ پاکستان

سمجھ کر محض پاکستان کے مفکر شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا بھی صحیح نہیں۔ اس طرح انکو محدود کر دینا ہوگا۔ تیسرے یہ کہ اقبال محض مصلح قوم، مجدد، مفکر اور حکیم الامت ہی نہیں تھے بلکہ وہ اُردو اور فارسی کے ایک عظیم شاعر بھی تھے اور فنِ شعر میں بھی اُن کے اجتہادات اور خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں بڑے وقیع پہلو ہیں اور ان پر آزاد نے اپنے متعدد مقالوں میں بڑی فکر انگیز بحثیں کی ہیں۔ پہلی بات کے سلسلے میں اُن کی رائے بڑی واضح اور دو ٹوک ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشے میں رچی بسی ہوئی تھی۔ یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اوّل سے آخر تک نمایاں ہے لیکن یہ اقبال اور کلامِ اقبال کے لئے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس بنا پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر کر سکتے ہیں۔ ملٹن اور ڈانسٹے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے۔ تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کے کلام میں ہندو دھرم سے عشقِ بے پایاں کا ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عشق مذہب عشقِ بنی نوعِ انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے۔ ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو اسے کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے۔" [1]

اقبال اور اس کا عہد، میں "جاوید نامہ" کا تجزیہ کرتے ہوئے آزاد نے اقبال کی وسعتِ نظر کی داد دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس فلسفہ کے باریک نکات کو جسے ہندوستانی فلسفہ یا ہندو فلسفہ کہا جاتا ہے اقبال نے شیوجی کی زبان سے بیان کر کے جس طرح فارسی شعر و ادب میں زندہ جاوید کر دیا ہے اس کی سعادت اقبال کے علاوہ کسی اور ہندوستانی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اور بھارتی سنسکرتی کے تحفظ اور نشر و اشاعت کا دعویٰ کرنے والا تو شاید اس مقام کے

---

[1] حرفِ اول۔ "اقبال اور اس کا عہد" از جگن ناتھ آزاد۔ ناشر الادب لاہور ۱۹۶۱ء۔ ص ۱۱-۱۰

> قریب تر پہنچے ہوں گے"۔ [1]
>
> "گیتا کی تعلیم فارسی شاعری میں غالباً صرف دو بار منتقل ہوئی ایک تو فیضی کے ذریعہ سے کہ انھوں نے شہنشاہ اکبر کے کہنے سے گیتا کا فارسی میں ترجمہ کیا اور دوسرا اقبال کی اس نظم میں جو بھرتری ہری کی زبان سے کہلائی گئی ہے"۔ [2]

دوسری بات کے سلسلے میں عرض یہ ہے جب اقبال کی شعری فکر کا سرچشمہ قرآن ہی ہے تو لامحالہ قرآن کا پیغام اور اس کے مخاطب دونوں ہی اقبال کے احاطۂ شعر میں در آئیں گے۔ ان کے ممتاز تصورات قرآنی ہونے میں شبہ نہیں اور یہ وہ تصورات ہیں جو اقبال کی عظمت کی شناخت ہیں۔ اس لئے فطری طور پر جس طرح قرآن ایک خاص نظریۂ حیات اسلام کے نام سے ساری دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ جو اس راہ کو اختیار کرے گا وہی سیدھی راہ والا اور اللہ کی پارٹی کا ہوگا اور وہی صحیح معنوں میں زندگی، کائنات اور خدا اور ان کے باہمی روابط کے سلسلے کے تمام علوم کا واقف کار ہوگا اور جو ان روابط کو نہ سمجھ سکے وہ فرقۂ جاہلوں میں سے ہوگا گویا پیغام تو سب کے لئے ہے مگر جو اسے قبول کرلے ان کو ایک صالح معاشرے کے سلسلے میں مزید احکام و ضوابط کی پابندی کرنی ہوگی اور اس طرح کے لوگ ہی مسلمان کہلائیں گے اس طرح سے خطاب ایک بڑے دائرے سے بھی ہے اور اس سے نکلے ہوئے چھوٹے دائرے سے بھی۔ اس طرح سے اقبال کا پیغام بھی بنیادی طور پر سبھی کے لئے ہے پوری بنی نوع انسانی کے لئے مگر جب تفصیلات میں جائیں گے تو تجدید و استحکام کی خاطر خطاب مسلمانوں ہی سے ہوگا ہم سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکلے گا کہ اقبال صرف مسلمانوں ہی کے شاعر ہیں۔ جس طرح خدا رب الناس ہے رب المسلمین نہیں۔ محمدؐ رحمۃ للعالمین ہیں رحمۃ المسلمین نہیں اسی طرح قرآن اور اس کا پیغام بھی ساری دنیا کے لوگوں کے لئے ہے محض مسلمانوں

---

[1] شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر مشمولہ اقبال اور اس کا عہد۔ از جگن ناتھ آزاد۔ ناشر الادب لاج سرینگر ۱۹۵۹ء ص ۱۴۱-۱۴۲

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ص ۱۴۴

کے لئے نہیں۔ البتہ جو اس سے فیضیاب ہوں وہ ایک الگ امت بن جاتے ہیں۔ اس میں رنگ، نسل، علاقہ، ملک اور مذہب کسی کی بھی کوئی قید نہیں۔ ہر وہ شخص جو اسلام کو سمجھ کر شعوری طور پر اختیار کرے وہ ایک خاص گروہ بن جاتا ہے اور وہی خدا سے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہی راہِ خدا کی پسندیدہ راہ ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام اور یہ وہ چھوٹا دائرہ ہے جو بڑے دائرے ہی سے نکلا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ معرفت خدا کی بنیادی چیزوں کے مخاطب تو سبھی ہوتے ہیں مگر جب اس میں سے ماننے والے منتخب ہو جاتے ہیں تو مخاطب محض انہی سے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اقبال کا پیغام ہے تو سب کے لئے مگر مسلمانوں کے واسطے سے ہے اس لئے وہ مسلمانوں کے ہوتے ہوئے بھی سب کے ہیں۔ اس میں ہندو اور مسلمان کے دائرے کی بات کہیں نہیں آتی اور یہ محض غلط فہمی ہے کہ مسلمان کو مخاطب فرض کر لینے سے مخاطبین کی صف سے ہندو یا دوسرے غیر مسلم نکل جائیں گے۔ جیسے قرآن کے مخاطب اوّل صحابۂ کرام تھے مگر پیغام آنے والے زمانوں کے تمام مسلمانوں کے لئے بھی تھا۔ حکم دیا جا رہا ہے پیغمبر کی بیویوں کو مگر اس کا اطلاق ہوتا ہے تمام مسلمان عورتوں پر۔ یہ الہامی کتابوں اور شاعری کا خاص اسلوب ہوتا ہے۔ مثلاً اقبال جب کہتے ہیں کہ ؎

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دلنوازی کی خوبی دوسروں کے یہاں نہیں ملے گی۔ لیکن سلیقہ خود اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اسلام کی سعادت کے سبب صحیح مسلمان کے یہاں جو معیار ہوگا وہ دوسروں کے یہاں نہیں ملے گا۔ یہیں یہ غلط فہمی بھی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانیت اسلامیت سے کوئی بڑی چیز ہے۔ یہ غلط فہمی اسلام کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور غالباً اس کے سب سے بڑے سبب مسلمان ہی ہیں۔ انسانیت سے مراد انسان میں خیر اور معروف کی وہ فطرت ہے جو نیکی، شرافت، خلوص، ہمدردی، محبت، قربانی، حسن سلوک، دیانت داری، رحم، انصاف اور اس طرح کی اخلاقی قدروں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور ظاہر ہے اس میں ہندو مسلمان یا مسلم غیر مسلم کی کوئی

قید نہیں۔ بلکہ آج تو یہ نسبتاً ہندوؤں اور غیر مسلموں میں زیادہ ملے گی مسلمانوں میں کم لیکن اسلام کی تعلیمات اور احکام کے تحت نہ صرف ان قدروں کو جِلا ملے گی بلکہ یہ زندگی کے گوشے گوشے پر محیط ہوگی۔ اور جو اعلیٰ معیار اور نمونہ اسلام کے طفیل سامنے آئے گا ساری دنیا میں ڈھونڈنے سے وہ کہیں نہ ملے گا۔ مثلاً پڑوسی سے حسنِ سلوک کی عادت بہت سے لوگوں میں مل سکتی ہے مگر یہ معیار کہ پڑوسی سے حسنِ سلوک کی اتنی تاکید کی گئی کہ صحابہ کرام یہ خیال کرنے لگے کہ شاید وہ ہماری جائدادوں میں حصہ دار بن جائیں گے اور عمل کا یہ حال تھا کہ ایک صاحب جتنا گوشت خرید کر جب بھی اپنے گھر لاتے پڑوسی کے یہاں اتنا ہی ضرور پہنچاتے اور جب پیسے کم ہوتے تو اپنے گھر ناغہ کرتے مگر پڑوسی کے یہاں ناغہ نہ ہونے دیتے اور اس میں جب یہ بھی شامل کرلیں کہ پڑوسی غیر مسلم تھا تو معیار اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ اس کی مثال کسی بھی مذہب، قوم یا گروہ کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اور یہی نہیں اسلام کے طفیل انصاف معاملات، ضبطِ نفس، حسنِ سلوک، امن وجنگ کے مسائل، عہدو پیمان اور اسی طرح کے دوسرے انسانی اخلاق وکردار کا معیار اتنا بلند ہوگیا کہ خود بعد کے مسلمان اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ معمولی سی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں بڑی سے بڑی مہذب قوم کے بھی معیارِ اخلاق بدل جاتے ہیں مگر اسلام کے نہیں بدلتے۔ اس لئے اسلامیت یا اسلامی اخلاق انسانیت سے کوئی الگ چیز نہیں اسی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس لئے اگر اقبال نے اسلام کو اپنا موضوع شاعری بنایا تو یہ عالم انسانیت یا تمام بنی نوع انسان کے لئے بھی اتنا ہی سود مند تھا جتنا مسلمانوں کے لئے۔ اس پہلو سے اقبال کے یہاں تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اور وہ نہ صرف مسلمانوں کے شاعر تھے اور نہ ہندوؤں کے بلکہ ساری دنیا کے تھے۔

اپنے ایک مضمون "اقبال — صرف مسلمانوں کے شاعر" ؟ میں جگن ناتھ آزاد کہتے ہیں۔ کہ

"معلوم نہیں بعض غیر ملکی طالب علمانِ اقبال کے دل میں یہ بات کیوں

گھر کر گئی ہے کہ اقبال کی شاعری ہندو اور مسلمان کے دائرے میں محصور ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب اقبال پر وہ بیسیوں کتابیں ہوں جن میں اقبال کو ایک بہت ہی محدود انداز میں پیش کیا گیا ہے۔۔۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔"[1]

میں عرض کروں گا کہ دراصل یہ اسلام کی تعلیمات کے ناقص فہم اور آج کے مسلمانوں کو نمونہ بنا لینے کے سبب ہے اور اقبال نے اپنے کلام میں جو کچھ بھی پیش کیا ہے اس کا سرچشمہ براہ راست قرآن یا نمونہ کے لئے قرنِ اوّل کے مسلمان تھے۔ اقبال کے یہاں مردِ کامل کی توانائیوں، خوبیوں اور ٹوٹتے ہوئے تارے کے مہِ کامل بن جانے کے خوف سے ستاروں کے سہمے جانے کی ساری باتوں کا ماخذ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی۔ آج کے نمازی اور مجاہد ان کے پیشِ نظر نہیں تھے۔ اس لئے کہ وہ جس خُلقِ عظیم کے مالک تھے اس کی مثال دنیا کے کسی کونے میں نہ ملی ہے اور نہ مل سکے گی۔

اقبال کے مفکرِ پاکستان ہونے کا مسئلہ یہ ہے کہ الہ آباد کی مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں اقبال نے جو کچھ کہا تھا ممکن ہے آج کے پاکستان کی وہ بنیاد نہ ہو، اس پہلو سے مفکرِ پاکستان کہہ کر اُن کو محدود کر دینا ہوگا اور یہ بات آج کے ہند و پاک تعلقات کے پس منظر میں اور بھی نقصان دہ ہے مگر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ "ملت از وطن است" کی جس بحث میں انھوں نے ایک الگ اُمت کا تصور پیش کیا تھا یہ وہی تصور ہے جو دو قومی نظریے کی بنیاد ہے اس پہلو سے وہ مفکرِ پاکستان ضرور ہو سکتے ہیں۔ اب رہ گئی یہ بات کہ اقبال مصلحِ قوم اور مجددِ وقت ہی نہیں عظیم شاعر بھی ہیں اس میں کوئی دو رائے نہیں بشرطیکہ اس میں یہ مقصد نہ ہو کہ اُن کے کلام کے

---

[1] مضمون "اقبال — صرف مسلمانوں کے شاعر؟" مشمولہ نشانِ منزل۔ از آزاد۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، جون ۱۹۸۲ء۔ ص ۱۸۱۔

موضوعات پر زیادہ زور نہ دیا جائے بلکہ صرف فنِ شعری پر گفتگو کی جائے تو یہ اقبال کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی اور نقدِ کلام کے ساتھ بھی۔ البتہ جو لوگ اس فلسفی شاعر کو رحمتہ اللہ علیہ کے بانس پر لٹکائے پھرتے ہیں اس کو ایک انسان ہی رہنے دیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ان سارے موضوعات پر آزاد کی فکر انگیز بحثیں ان کی کتابوں اور ان کے مقالوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جو بلاشبہ ہمارے لئے بصیرت کا سبب بھی ہیں اور آزاد کی وسعتِ قلم کی دلیل بھی۔ اور میری اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ۔ آزاد ایک ممتاز شاعر ہی نہیں ایک بڑے عالم اور ایک اچھے نقاد بھی ہیں۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق